

ستمبر 2018

ماہنامہ
دکھن



ماہنامہ

کرناٹک دسترخوان

چاند نگر روپہ اف پی پبلیکیشنز

دکھن

MEMBER
APNS
CPNE

بانی ————— محمود باقر فیصل
نیکران ————— محمود ریاض
مدیر ————— نادرہ خاتون
مدیر اعلیٰ ————— عامر محمود
نائب مدیر ————— شجاع حمید
مدیر ذمہ داری ————— اہتدایہ الصیون
رشتہ نگاریات ————— خالدہ جیلانی
قانونی مشیر ————— نور الدین سرکی اینڈ کمپنی
ایڈووکیٹس اینڈ بزنس کونسلرز



آئی بی ایل ٹریٹمنٹ بھی میراث

لیزر لائٹ ٹریٹمنٹ جیسا نکھار

بہترین میراث کے لئے دنیا بھر میں جلد کے امیرین لیزر ٹریٹمنٹ کی مدد پر اپنا لونی کا استعمال کرتے ہیں۔ اگر کسی ٹریٹمنٹ صرف ایک کریم سے مل جائے تو؟
اب لیزر لائٹ ٹریٹمنٹ بھی میراث کے لئے "میراث لونی ایڈوانسڈ ٹی ڈائن" ہے۔
اس کا طاقتور ٹی ڈائن فارمولا لیزر لائٹ کی طرح جلد کی گہرائی تک جاتا ہے۔ سیاہ خلیات کو صاف اور روشن کر کے جلد کو نکھارتا ہے۔
لیزر لائٹ ٹریٹمنٹ جیسے نکھار کے لئے صرف میراث لونی کا جیت فارمولا۔

Fair & Lovely | ADVANCED
MULTI VITAMIN™

لیزر لائٹ ٹریٹمنٹ ہے اور جلد کے لونی ایڈوانسڈ ٹی ڈائن (Intense Pulsed Light) ہے۔



مستقل سلسلے

- | | | | | | |
|-----|------------|----------------|-----|-------------|--------------------|
| 254 | ادارہ | موتی پختے ہیں | 245 | شعاع عید | کرن کرن خوشنلو |
| 252 | ڈوبیہ شریف | مُسکراتی کرتیں | 249 | بشری محمود | بادول کے در کے سنے |
| 255 | ذوالقنین | تہل پہ در ہلا | 251 | شگفتہ سیلان | نہنہ شہر لپیٹتے |
| 256 | مدیرہ کرن | نامے میکر نام | 248 | خالہ جیلانی | شام کی چائے |

کرن
37- اردو بازار کراچی

ستمبر 2018
جلد 41 شماره 6
قیمت 70 روپے

پبلشر آذریاض نے ابن حسن پرچنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔
Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872
Email: kiran@khawateendigest.com Website: www.khawateendigest.com

حمد
توحید
11 دامن علی واصف
11 بہادر شاہ ظفر

انٹرویو

- | | | | | | |
|-----|-------------|-------------|----|---------------|--------------------|
| 54 | اکل رضا | جواب دہستی | 12 | شایین رشید | خوشنلوں کے رنگ |
| 120 | منعم ملک | بندر کو اڑے | 19 | شایین رشید | مایا علی سے ملاقات |
| 202 | صائمہ قریشی | لذت نعم عشق | 24 | علی عباس | میری بھی سنیے |
| | | | 28 | سمرالناہ قیسم | مقابل ہے آئینہ |

ناولٹ

- | | | | | | |
|-----|-------------|---------------------|----|------------|---------------|
| 95 | تنزیلہ ریاض | غم ہے یا خوشی ہے تو | 30 | فیج چوہدری | شب نیم کی سحر |
| 158 | سحر ملک | آنچل میں ساکنے | | | |

افسانے

- | | | |
|-----|-------------|--------------|
| 116 | ماہوش طالب | میسرہ |
| 151 | گل ارباب | تیسری بیوی |
| 49 | عزیز دلی | ست رنگا جیون |
| 236 | ماہم اوزدین | گرہ |
| 199 | بشری ماما | جھوٹی |
| 241 | ام ہانی | بھولا جو فرض |

قرسٹالائن بک گیسٹری
پاکستان (سالانہ) ----- 700 روپے
ایشیاء افریقہ یورپ ----- 6000 روپے
امریکہ کینیڈا آسٹریلیا ----- 7000 روپے
subscriptions@khawateendigest.com

ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے رچل ماہنامہ شعل اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی نوعیت کی کاپی رائٹنگ یا نقل و کتب یا دیگر قسم کی کاپی رائٹنگ یا اشاعت یا اشاعت کے لیے بلاشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی کارروائی کا حق رکھتا ہے۔

(مسلمی) سال کا آغاز ہو رہا ہے۔

اسلامی سال کا پہلا اور آخری دو دن ہی بیسے قربانی کی عظیم مثالوں کی یاد دلاتے ہیں۔
حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں اپنے فرزند کو قربانی کے لیے پیش کر دیا۔
تو اسے رسول حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دین کو بچانے کے لیے اپنے اہل بیت اور فقار کے
ساتھ میدانِ کربلا میں جامِ شہادت نوش کیا۔ آپ کے مقابلے میں ایک بڑا لشکر تھا جو جنگی ساز و سامان سے
لیس تھا لیکن آپ نے حق کے مقابلے میں باطل کا ساتھ نہیں دیا اور اپنی اور اپنے اہل خاندان کی جان کا نذرانہ دے
کر دنیا کو تباہ کر دیا۔ باطل خواہ کتنی کثیر تعداد میں کیوں نہ ہوں کثرتِ حق کی دلیل نہیں ہے۔ جو سچ اور حق
کی راہ پر ہوتے ہیں انہیں وقتی طور پر شکست ہو سکتی ہے لیکن بالآخر وہی کامیاب ٹھہرتے ہیں۔ وقت کا فیصلہ
ہی درست اور آخری ہوتا ہے۔ آج حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قربانی کو دُنیا تسلیم کرتی ہے۔
انہوں نے باطل کے سامنے سر نہیں جھکا یا، وہ کثرت سے مرعوب نہیں ہوئے اور حق و صداقت کی راہ
میں جان دے کر مثال قائم کر دی۔ انہوں نے اس حکمران کو تسلیم نہیں کیا جس میں اخلاقی بُرائیاں تھیں۔
ہمیں سوچنا چاہیے کہ نواسۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کس مقصد کے لیے
جان دی تھی۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے محبت کا تقاضا ہے کہ ہم حق و صداقت کی راہ پر چلیں، صرف زبانِ نبوت
اور عقیدت کافی نہیں۔

اس شمارے میں،

۱۔ "خوشیوں کے رنگ" عبدالغنی کے حوالے سے شایین رشید کا خصوصی سرے،
۲۔ اداکارہ "مایا علی" سے شایین رشید کی ملاقات،
۳۔ اداکار "علی عباس" کہتے ہیں "میری بھی بیٹے"،
۴۔ اس ماہ "سورۃ النساء" کے مقابلے میں آئینہ،
۵۔ "شبِ فم کی سم" درخشاں ہدوی کا سلسلہ وار ناول،
۶۔ نگہت عبد اللہ کا سلسلہ وار ناول "ہوائیں رُخ بدل گئیں"،
۷۔ "یاد و بستی" میں رضا کا مکمل ناول،
۸۔ صائمہ قریشی کا مکمل ناول "لذتِ عم عشق"،
۹۔ "بند کواڑ" منور ملک کا مکمل ناول،
۱۰۔ "عینے یا خوشی کیے تو" تنزیلہ ریاض کا ناول،
۱۱۔ "سورۃ ملک کا ناول" آپچل میں ستارے،
۱۲۔ عزیز بن ولی، ماہ وشن طالب، بشری ماہا، گل ادیب، ماماہ اوزلین اور اُم بانی کے افسانے اور مستقل سلسلے،
مصنعت،
کرن کا دستِ خوان، کرن کے ہر شمارے کے ساتھ علیحدہ سے مفت حاصل کریں۔



اے ربِ سموات تیری ذات دراپے
ہیبت سے تیری کوہِ گراں کا پناہ ہے

انسان بے چارہ تجھے کیا جان سکے گا
ادراک کی دُنیا میں تجھے دُشمن نہ ملے

ہیں تیرے ہی اندازِ غزنی و امیری
دیتا ہے کبھی اور کبھی مانگ رہا ہے

معلوم ہے اتنا کہ ہمیں کچھ نہیں معلوم
جانا ہے کہ کیا جانے گا جو جان گیا ہے

ہر سمت ہے وجہ اللہ عیاں خالقِ احسن
خود آئینہ خود دیدۂ حیران ہوا ہے

واصف علی واصف



کشتہ ہوں کس کے طرہِ عنبرِ شمیم کا
خوشبو ہے میری خاک سے دامنِ نسیم کا

گلشن ہو غلد کا کہ چمن ہو نعیم کا
کیا دل لگے ہے تیری گلی کے مقیم کا

دولت سے عشق کے مرا ہر قطرہ مرثک
تکمہ ہے میری جیب میں دُربِ یتیم کا

دکھلاؤں سوزشِ دل بے تاب ہم اگر
کا پ اٹھے شعلہِ خوف سے نازِ حیم کا

آنکھوں میں اپنی نور اسی سے ہے اے ظفر
یہ مردِ مک ہے سایہ محمدؐ کے میم کا

بہادر شاہ ظفر

جب میگزین آپ کے ہاتھ میں آئے گا بقرہ عید گزر چکی ہوگی۔ مگر اس کے اثرات باقی ہوں گے۔ لہذا سروے حاضر ہے کیونکہ عید الفطر ہو یا عید الاضحیٰ کرن میگزین میں سروے نہ ہو، کچھ ادھورا پن لگتا ہے۔ سوال کچھ یوں ہیں کہ.....

- 1- کیا آپ جانور لینے خود منڈی جاتے ہیں یا دوسروں کی خدمات حاصل کرتے ہیں / کرتی ہیں۔
- 2- اس عید پر اپنی پسندیدہ ڈش خود پکاتے / پکاتی ہیں یا کس سے پکواتی ہیں / پکواتے ہیں۔

خوشیوں کے رنگ

شاین رشید

کے دن وہ پکواتی ہوں۔ خود نہیں پکاتی کیونکہ جب پکوانے کی سہولت ہو تو کیا ضرورت ہے خود پکانے کی۔“



ارتجی قاطمہ :- (آرٹسٹ)

1- ”میں دو جوہیات کی بناء پر منڈی نہیں جاتی اور نہ ہی جانوروں کے قریب جاتی ہوں۔ منڈی اس لیے نہیں جاتی کہ ڈھیر سارے جانوروں کی بدبو مجھ سے برداشت نہیں ہوتی اور دوسری یہ کہ جب جانور گھر آ جاتے ہیں تو ان سے خواہ مخواہ پیار ہو جاتا ہے پھر ان کو ذبح ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی..... مجھے جانوروں کی بدبو سے تھوڑی البرجی ہو جاتی ہے۔“

2- ”گائے کا گوشت تو میں بالکل بھی نہیں کھاتی۔ البتہ بکرے کی ”کلیجی“ مجھے پسند ہے تو عید



دانش تیمور: (آرٹسٹ)

1- ”بچپن میں بہت شوق تھا منڈی جانا اور اپنی پسند سے جانور خرید کر لانا..... پھر انہیں کھانا پلانا..... اور بچپن ہی نہیں بڑے ہوتے تک یہ شوق برقرار رہا اور برقرار ہے۔ مگر اب مجبوری یہ ہے کہ ٹائم نہیں ملتا اس لیے خود نہیں جاسکتا۔ البتہ جب جانور گھر آتے

ہیں تو پھر جو بھی تھوڑا بہت ٹائم ملتا ہے ان کی سیوا ضرور کرتا اور دوسروں کو بھی خاص ہدایت کرتا ہوں کہ ان کا خیال رکھیں۔“

2- ”عید کے دن مجھے کلیجی کھانا پسند ہے اس لیے فرمائش کر کے پکواتا ہوں۔ فرمائش کیا، سب کو پتا ہے کہ دانش کو کلیجی پسند ہے بکرے کی، تو بس قربانی کے بعد کلیجی ڈش جو چاہے پر چڑھتی ہے وہ ”کلیجی“ ہوتی ہے۔“



اقبال بانو :- (ڈرامہ نگار + افسانہ و ناول نگار)

1- ”خوش قسمتی سے ہمارے تو اپنے ڈیرے پہ سب جانور پل کر جوان ہو رہے ہوتے ہیں اور یہ سب جانور ہمارے اپنے ذاتی ہوتے ہیں..... میرے بیٹے ٹیپو کو جانوروں سے بہت لگاؤ ہے تو اس کی خوشی کی خاطر جو جانور قربانی کے لیے ہوتے ہیں انہیں عید سے دو تین دن پہلے گھر لے آتے ہیں..... اور پھر سنت کے مطابق ان کا بہت خیال رکھتے ہیں..... اور پھر عید کے دن اللہ کی راہ میں قربان کر دیتے ہیں۔“

2- ”عید کے دن تو کوئی ایک ڈش نہیں بلکہ ڈشز کا انتظام ہوتا ہے۔ عید کے پہلے دن کلیجی، نمک والا بھنا ہوا گوشت اور بخنی پلاؤ بنتا ہے اور الحمد للہ یہ ساری کو کنگ میں خود ہی کرتی ہوں..... شام کے لیے

یا پھر دوسری صبح کے لیے پائے، بناتی ہوں..... تو بس یہ اہتمام ہوتا ہے اور مہمان آ جائیں تو پھر اور بھی زیادہ مزا آتا ہے ان کی خاطر مذاکرات کر کے..... عموماً لوگ عید کے دن باربی کی ضرور کرتے ہیں۔ مگر ہم نہیں کرتے کیونکہ باربی کی تو کہیں سے بھی جا کر کھایا جا سکتا ہے۔ مگر عید کے انٹیشنل پکوان تو پھر عید پر ہی ہوتے ہیں۔“

دہاج علی (آرٹسٹ + ماہ تمام فیم ”تقی“)

1- ”جی..... جی..... بکر خریدنے منڈی ضرور جاتا ہوں اور بہت مزا آتا ہے۔ بہت شوق اور دلچسپی کے ساتھ یہ کام سرانجام دیتا ہوں۔“

2- ”اور عید کے دن خاص فرمائش کر کے اپنی پسندیدہ ڈش پکواتا ہوں اور وہ ڈش ”کلیجی“ کی ہوتی ہے..... خود پکانے کا شوق نہیں ہے۔“



فصیح باری خان :- (معروف رائٹر + ڈرامہ نگار)

1- ”دل تو چاہتا ہے کہ خود جاؤں۔ مگر ٹائم ہی نہیں ملتا، لہذا یہ ساری ذمہ داری اپنے بھائی پہ ڈالی ہوئی ہے اور میں بالکل بھی اس معاملے میں اس کا ساتھ نہیں دیتا۔“

2- ”خود تو مجھے کچھ بھی پکانا نہیں آتا اور نہ ہی

مجھے شوق ہے، البتہ کھانے پینے کا بہت شوق ہے اور بقرہ عید کے دن ہنر سیف ضرور بنواتا ہوں..... اور یہ کام بھی خود نہیں کرتا بلکہ اس کی ذمہ داری بھی گھر والوں پہ ڈال دیتا ہوں۔“

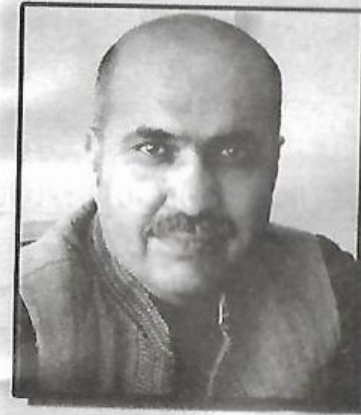


امیر ارشد:- (آرٹسٹ)

1- ”بقرہ عید تو میرے لیے بہت اہمیت رکھتی ہے۔ حالانکہ بڑی ہو گئی ہوں، بچے کی ماں بھی ہوں۔ پھر بھی میرا بچپنا نہیں ختم ہوا اور بقرہ عید کے موقع پر ساری حرکتیں بچوں والی ہی ہوتی ہیں۔ بچے جب شور مچاتے ہوئے گلی محلے سے گزرتے ہیں تو میں بھی یہ سنیں دیکھنے کے لیے گیٹ پہ چلی جاتی ہوں..... اور جہاں ہم رہتے ہیں وہ اپارٹمنٹ کافی بڑا ہے، تو وہاں جب سب اپنے جانور خرید کر لاتے ہیں تو ایک چھوٹی سی بکرا منڈی کا گمان ہوتا ہے اور میں تو اتنی دیوانی ہوں کہ جب ہمارے گھر میں گائے اور بکرے آتے ہیں تو ان تصاویر فیس بک پہ، انسٹا گرام پہ ضرور لگاتی ہوں..... اور جانوروں کی بہت خدمت کرتی ہوں۔ انہیں اپنے ہاتھوں سے کھلاتی ہوں۔ گائے کا چارا اپنے ہاتھوں سے بناتی ہوں..... اور پھر قربانی کے دن اداس بھی بہت ہو جاتی ہوں، کیونکہ مجھے اپنے جانوروں سے پیار بھی بہت ہو جاتا ہے بس یہی زندگی، خوشی اور اداسی کا نام، مگر اللہ کی راہ میں قربان

کر کے غریبوں میں گوشت بانٹ کر بھی عجیب سی خوشی محسوس ہوتی ہے کہ اللہ نے ہمیں توفیق دی ہے کہ ہم یہ فریضہ انجام دے سکیں۔“

2- ”بقرہ عید پہ میں خود ہی کوئنگ کرتی ہوں..... کیونکہ ہمارے والد صاحب کی خاص ہدایت ہوتی تھی کہ کھانا گھر کی خواتین ہی پکائیں لی اور ہمارے یہاں تینوں دن دعوت کا اہتمام ہوتا ہے تو تینوں ہی دن پکوان پکتے ہیں۔ پہلے دن پلاؤ بنتا ہے اور پلاؤ کے ساتھ شامی کباب کا ہونا بہت لازمی ہے۔ دوسرے دن ماشاء اللہ سے چار پانچ کلو کی بریانی بناتی ہوں اور خود ہی پکاتی ہوں۔ اس کے ساتھ کچے قیے کے کباب ہوتے ہیں۔ اس طرح تیسرے دن کا بھی اہتمام ہوتا ہے..... ہاں..... میٹھا چونکہ مجھے پسند نہیں تو وہ میں بناتی بھی نہیں۔“

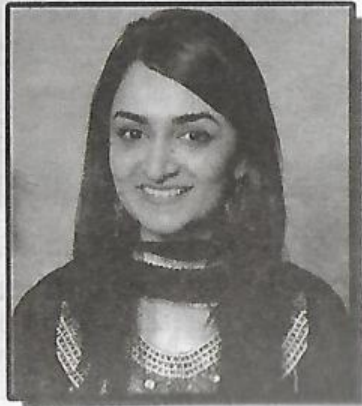


ظفر معراج:- (لکھاری + ڈرامہ نگار)

1- ”میرا تعلق ایک خانہ بدوش قبیلے سے ہے جو ”کیٹل فارمنگ“ پہ گزارہ کرتے ہیں۔ ہمارے یہاں جانور خریدائیں بلکہ پالا جاتا ہے تو ہم جانور لینے نہیں بھی نہیں جاتے بلکہ قربانی کے جانور کو پالتے ہیں اور پھر قربانی کرتے ہیں۔“

2- ”میں سبزی خور انسان ہوں، گوشت سے رغبت نہیں ہے، البتہ دنبے کے گوشت کا پلاؤ مجھے

بہت پسند ہے، تو عید کے دن خاص طور پر پکواتا ہوں۔ اسے ہم ”کابلی پلاؤ“ کہتے ہیں اور اس پلاؤ کی باقاعدہ دعوت کرتا ہوں اپنے دوستوں اور عزیزوں کو بلا کر، قربانی کا گوشت مجھے ”ہیوی“ لگتا ہے..... اس لیے نہیں کھاتا۔“



کیف فرہادی:- (آرٹسٹ)

1- ”بچہ بتاؤں..... کوئی برا نہ مان جائے..... میں بقرہ عید اس انداز میں نہیں مناتی جس انداز میں ہمارے پاکستان میں منائی جاتی ہے۔ جب میں چھوٹی تھی اور تقریباً سات یا آٹھ سال کی تھی تو میں نے اپنے سامنے جانور کو ذبح ہوتے دیکھا تھا۔ وہ میری زندگی کا ایک بہت ہی ڈراؤنا دن تھا اور بہت ہی ایک ہمایا تک بچ رہا تھا۔ کیونکہ خاصی کم عمر تھی۔ وہ ہنسی مگر کاجر بہ تھا یا دل کا خوف کہ میں نے شعور میں آنے کے بعد اپنے آپ کو اس بات سے روک دیا کہ میں اس میں حصہ لوں اور گھر والوں نے میرا ساتھ دیا کہ وہ میرے سامنے قربانی نہیں کرتے تھے..... تو بس وہ میری زندگی کا پہلا اور آخری تجربہ تھا۔“

2- ”عید کے دن ہمارے گھر میں بہت سارا یعنی ہکا پھکا کھانا پکتا ہے کیونکہ ہر طرح قربانی اور خون دیکھ کر دل خراب ہو رہا ہوتا ہے پھر خون کی بدبو بھی ناقابل برداشت ہوتی ہے اس لیے گوشت والی

کوئی ڈش کھانے اور پکانے کا دل نہیں چاہتا۔ عید کے دن کھٹی دال اور چاول مجھے بہترین کھانا لگتا ہے اس لیے وہی پکاتی ہوں اور میرے میاں بھی اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ بقرہ عید کے دن ہکا پھکا کھانا ہو..... بقرہ عید منانا ایک مذہبی فریضہ ہے اور بہ حیثیت ایک مسلمان کے ہم قربانی کا پیسہ کسی ٹرسٹ یا ویلفیئر کو دے دیتے ہیں اور ایسا ہم کئی سالوں سے کر رہے ہیں..... اللہ ہماری قربانی کو قبول فرمائے۔“ (آمین)

سید افرار علی تاش:- (فاؤنڈر + مدر ”شی“ فاؤنڈیشن انٹرنیشنل)



1- ”میں بڑی عید جسے ہم بقرہ عید بھی کہتے ہیں، ملتان میں کرتا ہوں، کیونکہ وہاں ہمارے خاندان کے جو غریب غریب لوگ ہیں میں ان کو بھی اپنی خوشی میں شریک کرنا چاہتا ہوں بلکہ کرتا ہوں..... اور دو بکرے لیتا ہوں، خود بکرا منڈی جاتا ہوں اور اپنی پسند سے لے کر آتا ہوں اور یہ آج سے نہیں بلکہ بیس پچیس سال سے یہ روایت چلی آ رہی ہے کہ میں کسی پہ بھر و سنا نہیں کرتا بلکہ خود ہی جا کر جانور خریدتا ہوں۔“

2- ”جب تک میری والدہ حیات تھیں میں عید کے دن ان کے ہاتھ کی پکی ہوئی چٹنی بہت شوق سے کھاتا تھا..... 2003ء میں ان کی وفات کے بعد اب یہ فرمائش میں اپنی بہن سے کرتا ہوں کیونکہ ان

HEMANI

Live Natural

Advance Herbal Beauty Cream

ایڈوانس ہر بل بیوٹی کریم

Free from Mercury

مرکری سے پاک



Glowing | Anti Wrinkle | Anti Acne

Meri Choice
Meri Recommendation



Dr. Shaista Lodhi

www.hemaniherbal.pk #HarPalHerbal hemaniherbals

کے ہاتھ میں ”ماں“ والا ڈالکتہ ہے اب تو فرمائش نہیں کرنی پڑتی بلکہ وہ خود۔“



صائمہ قریشی:- (آرٹسٹ)

1- ”ارے جناب یہ ہمارا کام نہیں ہے یہ تو ہمارے گھر کے مردوں کا کام ہے۔ میں بھی جی جانوروں کی خریداری میں حصہ نہیں لیتی بس میرے میاں صاحب جاتے ہیں اور اپنی پسند کے جانور خرید کر لے آتے ہیں۔“

2- ”ہاں..... کھانے کا شعبہ میرا ہے اور میری ماں کی تربیت اور میرا شوق کہ مجھے کھانے پکانے کا بہت شوق ہے۔ اور عید کے موقع پر بہت قسم قسم کے کھانے پکاتی ہوں۔ جیسے بریانی، پلاؤ، تورمہ، شامی کباب، چپلی کباب، کڑاہی وغیرہ وغیرہ۔ ہر کھانا مجھے پکانا آتا ہے اور ماشاء اللہ میرے ہاتھ میں ڈالکتہ بھی ہے۔“

مصطفیٰ پوھدری:- (آرٹسٹ 4 مین شو فیم)

1- ”جب چھوٹا تھا تو اپنے بڑوں کے ساتھ خاص طور پر اپنے والد کے ساتھ جانوروں کی خریداری کے لیے ضرور جاتا تھا۔ مگر اب ایک وقت نہیں ہوتا پھر بڑے بھی ہو گئے ہیں تو پہلے واسے شوق رہے نہیں ہیں۔ اب اگر جاتے بھی ہیں تو اس لیے کہ بھی جانور نہیں خریدیں گے تو قربانی کیسے ہوگی..... چنانچہ گھر



عاطف حسین:- (ڈائریکٹر + پروڈیوسر)

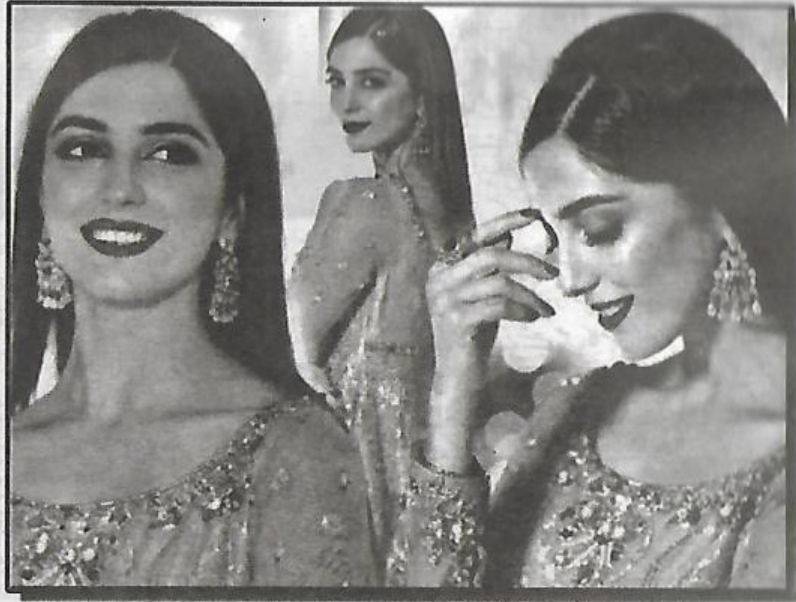
1- ”قربانی کا جانور خود لینے جاتا ہوں، کیونکہ

مَایا علی سے ملاقات

شاین رشید

”پہلی فلم اور وہ بھی ہاؤس فل..... کیا امیدیں تھیں اور کیا محسوس ہو رہا ہے؟“
☆ ”سچ بتاؤں تو بہت ڈر لگ رہا تھا۔ اصل میں میں بہت بڑی تنقید نگار ہوں، کسی کی فلم دیکھوں یا ڈرامہ اس میں سے تنقیدی پوائنٹ ضرور نکال لیتی ہوں..... اور میں ہی کیا سب ہی ایسا کرتے ہیں سو فیصد تو کوئی چیز بھی برقیٹ نہیں ہوتی..... جو فلمیں ہمارے یہاں کی ریلیز ہو چکی ہیں اس پہ بھی کچھ لوگ پسند کرتے ہیں اور کچھ نہیں..... لیکن اللہ کا شکر ہے کہ لوگوں نے فلم کو بھی اور میرے کام کو بھی بہت پسند کیا ہے..... اور مجھے امید ہے کہ آئندہ جب

”ایک نئی سنڈریلا“ سے شہرت پانے والی ”مایا علی“ نے کبھی سوچا بھی نہیں ہوگا کہ وہ ایک دن سلور اسکرین پہ بھی جلوہ گر ہوگی..... کوئی ایک سیریل کوئی ایک سٹیل ڈرامہ، کوئی ایک لمحہ انسان کی زندگی کا ٹرنگ پوائنٹ بن جاتا ہے یا وہ بہت اونچا اڑنے لگتا ہے یا ایک دم نیچے آگرتا ہے..... اور اس لحاظ سے ”مایا علی“ بہت خوش قسمت ہیں کہ ”نئی سنڈریلا“ نے ان کے لیے ترقی کی راہیں کھول دیں اور ”طیفا ان ٹریل“ نے فلم کے لیے راہیں ہموار کر دیں۔“
☆ ”کیا حال ہیں؟“
☆ ”مئی اللہ کا شکر ہے۔“



وجہ ثانی:- (نیوز انسکر)

1- ”جانور کی خریداری چونکہ سبت ابراہیمی ہے اس لیے ضرور حصہ لیتا ہوں۔ بچپن بہت یاد آتا ہے کہ ضرور جایا کرتے تھے اپنے بڑوں کے ساتھ اور خوب انجوائے کرتے تھے..... اب مصروفیات کی وجہ سے وقت کم ملتا ہے مگر پھر بھی جاتا ضرور ہوں..... اور چاہے میں کتنا ہی مصروف کیوں نہ ہوں عید کے دن جانور کی قربانی اپنے ہاتھ سے کرتا ہوں۔“
2- ”قربانی اپنے ہاتھ سے کرنے کا شوق ہے مگر پکانے کا کوئی شوق نہیں ہے، یہ شعبہ بیگم کا ہے اور وہ ہی کرتی ہے۔ کیونکہ اس کے اور امی کے ہاتھ میں بہت ذائقہ ہے اور یہ انہی کی ذمہ داری ہے کہ عید کے دن کیا کرتا ہے اور گوشت کس طرح بائنا ہے اور کیا پکوان پکانے ہیں اور کس طرح تقسیم کرتا ہے۔“

☆☆

یہ اللہ کا حکم ہے اور قربانی تب ہی قبول ہوتی ہے کہ آپ اپنی پسند کا جانور لائیں اس سے پیار کریں اور خدمت..... خیر خدمت کا نام، تو نہیں ملتا مگر پھر بھی تھوڑا بہت خیال ضرور رکھتا ہوں..... اور ایسا کرنا بھی پڑتا ہے اپنے بچوں اور اپنی نئی نسل کی خاطر کہ انہیں معلوم ہو کہ قربانی کیا ہے اور ہمارے فرائض کیا ہیں۔“
2- ”مجھے سارا سال بقرہ عید کا انتظار رہتا ہے۔ اس لیے کہ قربانی کے جانور کی بچہ کی اپنی ہی لذت ہوتی ہے اور میں خاص طور پر بچہ پکواتا ہوں اور اس دن میں ناشتا بھی اسی کا کرتا ہوں۔“

کبریٰ خان: (آرٹسٹ)



1- ”نہیں، نہیں..... میں تو بالکل بھی حصہ نہیں لیتی۔ مجھے عجیب سی اسمیل آتی ہے، البتہ گھر جب آتے ہیں تو پھر تھوڑی بہت خدمت خاطر ضرور کر لیتی ہوں کہ یہ سنت ابراہیمی ہے۔“

2- ”میں تو نہیں پکاتی..... البتہ گھر میں جو کچھ بھی پکاتا ہے میں خوشی خوشی کھا لیتی ہوں۔“



کوسنائی ہوں۔ جب میں نے پہلی بار پی ٹی وی کا ایک شو کیا تو گھر میں کسی کو نہیں بتایا۔ مگر جب پروگرام دیکھا تو خاموش رہے اور یہ بات تب کی ہے جب میں انٹرن شپ کر رہی تھی۔ پھر ایک اور شو کی آفر ہوئی تو میں نے والد صاحب سے اجازت مانگی۔ مگر والد صاحب نے سختی سے منع کر دیا کہ خبردار۔۔۔۔۔۔ میں کب باز آنے والی تھی۔ سوچا کہ ایسے موقع کب ملنے ہیں، لوگ ترستے ہیں پی ٹی وی کے پروگراموں میں کام کرنے کے لیے اور مجھے اللہ تعالیٰ موقعہ دے رہا ہے اور میں نخرے دکھا رہی ہوں۔ میں نے والد کو بتائے بغیر شو کرنے کی حامی بھر لی کہ والد صاحب کب پی وی شوق سے دیکھتے ہیں سوائے خبروں کے۔۔۔۔۔۔ اور پروگرام بھی ”عید شو“ تھا خیر پروگرام ریکارڈ ہوا، عید کے دن پیش کیا گیا۔ والد صاحب اتفاق سے پی وی آن کر کے بیٹھ گئے، پروگرام شروع ہوا اور۔۔۔۔۔۔ والد کی تیوریاں بل کھانے لگیں۔۔۔۔۔۔ مجھے بلایا، پوچھا ”یہ کون لڑکی ہے“ میں نے صاف جھوٹ بول دیا کہ یہ لڑکی میں نہیں ہوں۔ والد صاحب بہت سختی سے پیش آئے اور کہا کہ آئندہ تم مجھے پی وی اسکرین پر نظر نہ آؤ۔ والد نے تو بہت سختی کی لیکن والدہ نے بہت سپورٹ کیا اور کہا کہ کام کرو مگر حدود پار نہ کرنا۔۔۔۔۔۔ اور شکر ہے کہ مجھ سے میرے والدین کو کبھی شکایت نہیں ہوئی۔ والد بھی آج بچا ہوتا ہی گئے۔“

”پھر اداکاری کی آفر آئی ہوگی؟“

”نہیں ایسا نہیں تھا۔۔۔۔۔۔ ہوا یہ کہ مجھے معلوم ہوا کہ اداکاری کے لیے آڈیشن ہو رہے ہیں۔ میں نے سوچا کہ تلاش کرنی ہوں اگر کامیاب ہوگی تو واہ واہ۔۔۔۔۔۔ ہوئی تو۔۔۔۔۔۔ آڈیشن دیا۔ اگلے دن پی ٹی وی آ گیا کہ تم نے آپ کو ایک ڈرامے کے لیے منتخب کر لیا ہے۔ اس کے تعاون سے میں نے ڈرامہ کر لیا اور اسی ڈرامے کے دوران ایک اور آفر آ گئی۔ مگر کہا گیا کہ اس کے لیے آپ کو لاہور جانا

تو پھر اداکاری گنجائش کیارہتی ہے۔“

”کام کا تجربہ کیسا رہا؟“

”تھوڑی پریشانی ہوئی کیونکہ پہلا بڑا پروجیکٹ تھا، پہلا تجربہ لیکن اللہ کا شکر ہے کہ سینئرز نے اور خاص طور پر علی ظفر اور احسن رحیم نے بہت مدد اور حوصلہ افزائی کی۔“

”پریشانی کہاں ہوئی؟“

”کہیں بھی نہیں۔۔۔۔۔۔ چونکہ پہلا فلم تھی تو دو تین بار مکالمے بھول جاتی تھی۔ مگر اس بات پر ڈانٹ نہیں پڑی بلکہ بڑے آرام سے ڈائریکٹر نے سمجھایا کہ آپ کو کیا کرنا ہے۔“

”من مائل کی سیدی سادھی لڑکی کو فلم میں ایک بالکل مختلف رول ادا کرنا پڑا۔۔۔۔۔۔ مشکل ہوئی؟“

”من مائل تو ڈرامہ تھا جو رول ملا کر لیا۔۔۔۔۔۔ جو کہا کر لیا، فلم کا بھی یہی حال ہے۔ لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ ”طیقا ان ٹریل“ میں میرے مزاج کا کردار تھا۔۔۔۔۔۔ جو میں اصل زندگی میں ہوں ویسی ہی اس فلم میں بھی نظر آتی ہوں۔ میری زندگی کے قریب تھا یہ کردار۔۔۔۔۔۔ اور مجھے بہت مزہ آیا فلم میں کام کر کے۔“

”اللہ کرے کہ آپ مزید فلموں میں بھی کام کریں اور بہترین ہیروئن کہلا لیں۔ کھر میں کوئی اور بھی ہے اس فیلڈ میں؟“

”کوئی اور۔۔۔۔۔۔ اڑے ہمارے گھر کا ماحول

ایسا کہاں کہ کوئی اس فیلڈ میں آنے کا سوچے۔۔۔۔۔۔ میں بھی بس اس لیے آگئی کہ میں نے ماس کیو گلیشن میں ماسٹرز کیا تھا اور انٹرن شپ کے لیے ”جیو“ گئی اور رپورٹنگ کے شعبے میں کام کیا اور خوب انچوائے کیا اور میں اس شعبے میں آگے بڑھنا چاہتی تھی مگر والد صاحب جو پہلے ہی مخالف تھے انہوں نے مجھے مزید کام کرنے سے منع کر دیا۔۔۔۔۔۔“

”اچھا۔۔۔۔۔۔ پھر ڈراموں میں آنے کی اجازت کیسے دے دی؟“

”یہ بھی بڑے مزے کی کہانی ہے، میں آپ

کسی فلم میں کام کروں گی تو لوگ اس طرح پسند کریں گے۔“

”ہر پہلا کام انسان کو کسی نہ کسی انجانے خوف میں مبتلا کرتا ہے اور یہی جملہ ذہن میں گردش کر رہا ہوتا ہے کہ پتا نہیں کیا ہوگا۔ پی وی پہ جب پہلی انٹروی دی تو کیا احساسات تھے؟“

”یہی احساسات تھے کہ پتا نہیں لوگ پسند کرتے ہیں یا نہیں، مگر ڈراموں سے بھی فیڈ بیک بہت اچھا ملا اور اب تو خیر کافی ٹائم ہو گیا ہے اور کافی کام بھی کر لیا ہے تو اب ڈر نہیں لگتا اب بہت زیادہ پر



اعتماد ہو گئی ہوں۔“

”فلم میں کام کرنے کی آفر آئی تو کیا کیفیت تھی؟“

”حیرانی اور خوشی کے ملے جلے تاثرات تھے۔۔۔۔۔۔ مجھے اس فلم کے ڈائریکٹر نے فون کیا اور ایک دم سے کہا کہ فلم میں کام کریں گی۔۔۔۔۔۔ تو فوری طور پر تو میں نے ”لیس“ نہیں کیا البتہ ٹائم مانگا اور پھر اپنے قریبی لوگوں سے مشورہ کیا اور یہ معلوم کیا کہ اس فلم کی کاسٹ میں کون کون ہے اور جب کاسٹ معلوم ہوئی



پھر مجھے ”من مائل“ میں بہترین اداکارہ کا ایوارڈ مل گیا۔ مگر افسوس کہ اس خوشی کے موقع پر والد صاحب اس دنیا سے جا چکے تھے اور جب مجھے ایوارڈ ملا تو میں بہت روتی تھی۔

☆ ”فیوچر میں کیا کرنا چاہتی ہیں؟“
☆ ”میری خواہش ہے کہ میں فیوچر میں ایک عدد ریستوران کھولوں جہاں بہت مزے مزے کے کھانے ملیں۔ کیونکہ میں خود کھانے کی بہت شوقین ہوں۔“

☆ ”اور وہ گھر بنانے کی خواہش؟“
☆ ”ارے ہاں۔۔۔ وہ تو میری امی کی خواہش ہے اور میں اپنی ماں کی خواہش ان شاء اللہ ضرور پوری کروں گی۔ امی کی خواہش ہے کہ ”لان“ والا گھر ہو جہاں وہ بیٹھ کر علی الصباح کا نظارہ کر سکیں جہاں سورج کی کرنیں ان کا استقبال کریں۔“
☆ ”ابتداء سے لے کر آج تک قدم قدم پہ کامیابیاں ملیں، نام کا اثر ہے یا محنت کا؟“
☆ ”جیسا کہ آپ سب کو معلوم ہے کہ میرا

اصلی نام تو مریم تنویر ہے۔ مریم میرا نام اور تنویر والد صاحب کا نام ہے۔ چونکہ میں بچپن میں اکثر بیمار ہو جایا کرتی تھی تو سب کہتے تھے کہ اس کا نام بدل دیں۔ مگر والد صاحب نہیں مانتے تھے کیونکہ بقول ان کے کہ یہ نام ان کی والدہ نے رکھا تھا۔ بس گھر میں سب نے مایا کہنا شروع کیا تو بس ”مایا“ ہی سب کی زبان پر آ گیا اور جب میں شو بزم میں آئی تو سب نے مشورہ دیا کہ تمہیں ”مایا“ کے نام سے ہی اپنے آپ کو متعارف کرانا چاہیے۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔“

☆ ”گویا لوگوں کے مشورے سے چلتی ہیں؟“
☆ ”ایسا نہیں ہے۔۔۔ فیصلہ تو میں اپنے دل کا مانتی ہوں یا پھر کوئی اگر بہت اچھا مشورہ دے دے تو اس کا مانتی ہوں۔ لیکن یہ بھی ہے کہ میں مشورہ سب سے لیتی ہوں۔“

☆ ”شہرت ملنے کے بعد عموماً لوگ اپنے پرانے ساتھیوں کو بھول جاتے ہیں۔۔۔ آپ کی طرف کیا پوزیشن ہے؟“

☆ ”میں نے زندگی میں بہت کم دوستیں بنائیں اور جو بنائی ہیں وہ ابھی تک ہیں۔۔۔ اور بس میری دو ہی دوست ہیں۔۔۔ بہن اللہ نے دی نہیں۔۔۔ اس لیے والدہ ہی دوست کی صورت میں ساتھ رہیں اور ہیں۔۔۔ ہاں بس ایک چھوٹا بھائی ہے۔۔۔ بس یہی میری کل کائنات ہیں۔ والد صاحب کے بارے میں میں نے بتایا کہ وہ انتقال فرما چکے ہیں۔“

☆ ”ایک ہی بھائی۔۔۔ محبت تو بہت ہوگی؟“

☆ ”جی۔۔۔ جی۔۔۔ الحمد للہ۔۔۔ مگر ہم دونوں میں لڑائیاں بھی بہت ہوتی ہیں۔۔۔ حالانکہ میرا بھائی مجھ سے پانچ سال چھوٹا ہے۔ ہم دونوں میں بحث مباحثہ بھی بہت ہوتا ہے اور اس میں ٹکرا رہوتی ہے مجھے تو اپنا بھائی اپنی جان سے بھی زیادہ پیارا ہے۔“
☆ ”سین کو اچھا بنانے کے لیے کیا حکمت عملی

اپنائی ہیں؟“

☆ ”تہنہ۔۔۔“ ”مزے کی بات یہ کہ جب کوئی سنجیدہ سین ہوتا ہے تو میں پیٹڈ فری لگا کر خوب سنجیدہ گانے سنتی ہوں اور موڈ بنالیتی ہوں اور جب کوئی ہلکا سا گانا مزلے دار سین ہوتا ہے تو پھر تھرل والے گانے سنتی ہوں۔“

☆ ”صرف موڈ بنانے کے لیے گانے سنتی ہیں؟“

☆ ”ارے نہیں۔۔۔ میری تنہائی کی ساتھی ہی میری میوزک ہے، جو کہ ہر وقت میرے ساتھ ہے۔ پیٹڈ فری کے ذریعے میں ہر وقت میوزک انجوائے کرتی ہوں۔“

☆ ”ڈانٹ کا خیال رکھتی ہیں؟“

☆ ”بہت زیادہ۔۔۔ کیونکہ میڈیا میں رہنا ہے تو پھر اس چیز کا خیال تو رکھنا ہی پڑتا ہے۔۔۔ کچھ لوگ کتنا ہی کھائیں ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا مگر میرے ساتھ تو یہ خیال ہے کہ زیادہ ”ہوا“ بھی لگ جائے تو موٹی ہو جاتی ہوں۔۔۔ اپنے آپ کو فٹ رکھنے کے لیے روزانہ جم جاتی ہوں۔۔۔ کھانے پینے کو بہت دل چاہتا ہے مگر ”من مارنا پڑتا ہے۔“

☆ ”کھاتی ہیں؟“

☆ ”ہاں۔۔۔ ہاں پکا تو لیتی ہوں۔ نہاری، دال، ماش، کھاتی بھی ہوں۔۔۔ مگر بھی بھی۔۔۔ اور کھاتی بھی ہوں۔ ڈانٹ کے پکر میں بہت سے اچھے اور لالچ کھانوں کے ڈانٹ بھی ہوں۔“

☆ ”اپنا تھریٹ سن کر کیسا لگتا ہے۔ شرماتا ہے؟“

☆ ”بہت اچھا لگتا ہے۔۔۔ شرماتی تو نہیں ہوں، البتہ شرم بہت ہوتا ہے اور میری امی کو مجھ پر زیادہ شرم ہوتا ہے۔“

☆ ”غصہ آتا ہے؟“



☆ ”غصہ بہت آتا ہے اور بہت برا رد عمل ہوتا ہے۔ تو پھر چھوڑ بہت کرتی ہوں اور خاص طور پر موبائل فون کی بہت شامت آتی ہے۔۔۔ بہت نقصان کر چکی ہوں۔“

☆ ”کیا چیزیں آپ کی کمزوری ہیں؟“

☆ ”بارش، اچھا موسم، اچھی میوزک، خوب صورت مقامات اور اللہ تعالیٰ کی ہر تخلیق۔۔۔“

☆ ”گھر، شوہر، بچے ہر لڑکی کا خواب ہوتے ہیں؟“

☆ ”کچھ کہیں گی اس بارے میں؟“

☆ ”بالکل ہوتے ہیں۔۔۔ اور میرے بھی ہیں۔“

☆ ”محبت خوب صورت جذبہ ہے، جب اللہ کو منظور ہوگا، سب کچھ مل جائے گا۔“

☆ ”اور اس کے ساتھ ہی ہم نے مایا علی سے اجازت چاہی۔“

☆☆



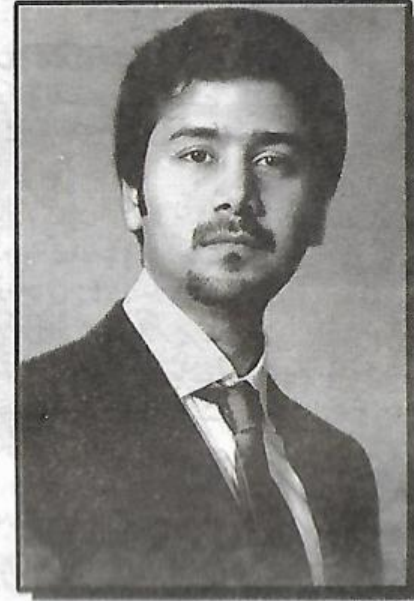
(17) ”مجھے پسند ہے؟“
 ”تعریف کے بجائے تنقید..... میں چاہتا ہوں
 کہ لوگ مجھے میری خامیاں بتائیں تاکہ میں اپنے
 آپ کو مزید اچھا کر سکوں۔“
 (18) ”آج کی فکر زیادہ ہوتی ہے یا کل
 کی؟“
 ”آج کی..... کل کے لیے زیادہ نہیں
 سوچتا..... جو آج کا دن ہے وہ زیادہ اچھا گزرتا
 چاہیے۔“
 (19) ”چھٹی کا دن گزرتا ہوں؟“
 ”اپنے بستر پر..... اس سے اچھی جگہ کوئی اور ہو
 ہی نہیں سکتی۔“
 (20) ”عورت کے لیے میری سوچ؟“
 ”حسین ہو مگر ذہن بہت ہو..... ذہانت جس
 پر ہماری ہوتی ہے۔“
 (21) ”شاپنگ میں پہلی ترجیح؟“
 ”جوتے، مجھے یہی چیز پسند ہے..... اور قیمتی
 سے قیمتی جوتا بھی پسند آجائے تو بخوبی نہیں کرتا۔“
 (22) ”کھانا انجوائے کرتا ہوں؟“
 ”اپنے بیڈ پہ اور ہاتھ سے کھاتا ہوں کہ سنت

”سو فیصد اپنے ٹینٹ سے آیا..... کیونکہ ابا
 سے ٹینٹ ورٹھے میں ملا۔“
 (8) ”پہلی کمائی سیلبر ہٹ کی؟“
 ”بالکل کی دو ہزار والدہ کو دیے اور تین ہزار
 سے اپنی شاپنگ کی۔“
 (9) ”شوہر میں آکر معلوم ہوا کہ.....؟“
 ”لوگ بہت پسند بھی کرتے ہیں، پیار بھی
 کرتے ہیں۔ مگر قبول نہیں کرتے۔“
 (10) ”ٹیلی میں سب سے پیاری شخصیت؟“
 ”میرے ابا، بہت عزیز ہیں مجھے..... ان کی
 کوئی بات ٹال نہیں سکتا۔“
 (11) ”نیند کتنی پیاری ہے؟“
 ”بہت پیاری ہے۔ اٹھ کر دوبارہ سونے کو دل
 چاہتا ہے۔ مگر کام بھی بہت ضروری ہوتا ہے۔ وہ کہتے
 ہیں تاکہ ”کمانیں گے نہیں تو کھائیں گے کہاں سے۔“
 (12) ”بھوک برداشت ہو جاتی ہے؟“
 ”ہرگز نہیں..... مزاج بہت چڑچڑا ہوا جاتا ہے
 ۔ فضا آتا ہے۔ میرے خیال میں ایسا ہونا نہیں
 چاہیے۔“
 (13) ”دوست بنانا ہوں؟“
 ”بہت کم..... بس جو بن گئے سو بن گئے۔“
 (14) ”ایکسا پلنڈ ہوتا ہوں؟“
 ”اپنا پروجیکٹ کے لیے..... جب کوئی
 پروجیکٹ مل جاتا ہے تو طواغیل ہوتی ہے کہ جلدی
 آن لائن ہوجاتی ہے۔“
 (15) ”انگلی بری لہو کے ساتھ مسائل شیئر
 کرتا ہوں؟“
 ”اپنے والد کے ساتھ..... کیونکہ وہ ہی میرے
 لیے سب کچھ ہیں۔ ان کے بعد اپنی بیگم سے۔“
 (16) ”برداشت؟“
 ”برداشت تو بہت ہے مگر غصے کا بھی تیز ہوں
 اور غصے میں چلاتا بھی بہت ہوں..... اور ضدی بھی
 ہوں۔“

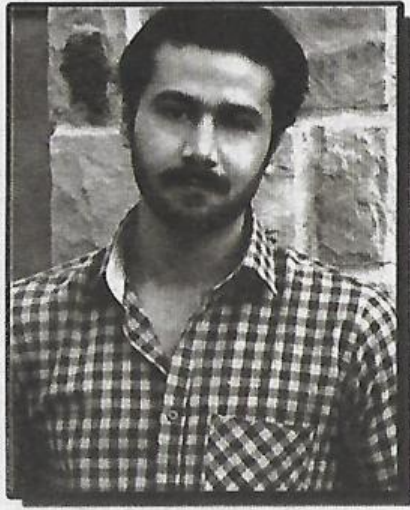
میری بھی سنتے

علی عباس

شاہین رشید



(1) ”نام؟“
 ”علی عباس۔“
 (2) ”پکارا جاتا ہوں؟“
 ”بٹی کے نام سے۔ ویسے لوگ علی کہتے ہیں مگر
 بے تکلف لوگ بٹی کہتے ہیں۔“
 (3) ”دنیا میں آمد؟“
 ”11 فروری 1986ء۔“
 (4) ”گھر کا لیڈر؟“
 ”بچوں میں تو میں ہی ہوں۔ میرے بعد بہنیں
 (5) ”تعلیم؟“
 ”پڑھا کو تھا۔ اس لیے ایل ایل بی بھی کیا۔
 ”سی ایس ایس“ کر لیا اور اداکاری کی خاطر ”این سی
 اے“ سے بھی تعلیم حاصل کی۔“
 (6) ”شادی؟“
 ”الحمد للہ..... اور اللہ نے اولاد کی نعمت سے
 بھی نوازا ہوا ہے۔“
 (7) ”شوہر میں کون لایا؟“



”فصیحہ..... مجھ میں غصہ بہت ہے۔ چاہتا ہوں کہ کم ہوئے۔“
 (42) ”حاصل کرنا چاہتا ہوں۔“
 ”بہت ساری کامیابیاں، بہت ساری شہرت، بہت زیادہ عزت۔“
 (43) ”مشورہ لیتا ہوں؟“
 ”اپنے ابا سے، اپنے دل سے، اپنے دماغ سے اور کرتا وہی ہوں جو میرا دل کہتا ہے۔“
 (44) ”بدلہ لیتا ہوں؟“
 ”نہیں نہیں..... ایسا کچھ نہیں، معاف کر دیتا ہوں اور اگر مجھ سے بھی کبھی غلطی ہوتی ہے تو فوراً اس کا اعتراف کر کے سوری کر لیتا ہوں۔“
 (45) ”فریش رہتا ہوں؟“
 ”جب گھر آتا ہوں اور اپنی فیملی کے ساتھ وقت گزارتا ہوں..... یا پھر لاہور ابا کے پاس جاتا ہوں۔“
 (46) ”کھانا پینا چھوڑ دیتا ہوں؟“
 ”جب انسان بے بس ہو تو غصہ کھانے پر ہی لگتا ہے۔ میرا بھی یہی حال ہے..... غصے میں کھانا پینا چھوڑ دیتا ہوں..... اور خاموشی اختیار کر لیتا ہوں۔“
 (47) ”میری زندگی کا بہترین دور؟“
 ”جو گزر گیا وہ بچپن تھا اور اب جو گزر رہا ہوں وہی زندگی کا بہترین دور ہے۔“
 (48) ”ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں؟“
 ”جی..... ہمیشہ لیٹ ہو جاتا ہوں۔ کبھی بھی جانا ہوتا۔“
 (49) ”کن رسموں کے خلاف ہوں؟“
 ”شادی بیاہ میں جو فضول رسمیں ہوتی ہیں۔ ان پر بے دردی پیسہ خرچ کیا جاتا ہے اس کے خلاف ہوں۔“
 (50) ”دل بہلاتا ہوں؟“
 ”ابھی میڈک اور ٹی وی کے مختلف پروگراموں سے۔“

(51) ”ایک دعا جو ہر وقت لیوں پر رہتی ہے؟“
 ”اے اللہ میرے والدین کو سلامت رکھ اور مجھے ان کی خدمت خاطر کرنے کی توفیق عطا فرما اور یہ کہ میں اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوا سکوں۔“
 (52) ”کسی آتی ہے؟“
 ”جب غیر سنجیدہ لوگ سنجیدہ کام کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔“
 (53) ”بچپن کا پسندیدہ تہوار؟“
 ”عید، شب برات اور بڑا ہوا تو بسنت بہت بھایا۔“
 (54) ”فٹ رہنے کے لیے کیا کرتا ہوں؟“
 ”ایکسر سائز..... ایک زمانہ تھا جب میرا وزن 87 کے جی تھا۔ دن رات محنت کی اور اپنے آپ کو نارٹل کیا۔ اب تو اللہ کا بہت کرم ہے۔“
 (55) ”شہرت مسئلہ بن جاتی ہے؟“
 ”جب آپ عام لوگوں کے سامنے نہ آتا چاہتے ہوں اور چھپنے کی کوئی جگہ بھی نہ ہو۔“
 ☆☆

بھی ہے اور مزاج بھی آتا ہے۔“
 (23) ”میں ڈرتا ہوں؟“
 ”لوگ اکثر کہتے ہیں کہ میں فلاں کیڑے مکوڑے سے ڈرتا ہوں۔ یا فلاں چیز سے ڈرتا ہوں..... مگر کچ پوچھیں کہ میں ”بیماری“ سے ڈرتا ہوں۔ ہر وقت دعا کرتا ہوں کہ اللہ زندگی دے تو صحت والی۔“
 (24) ”جلدی شادی کیوں کی؟“
 ”ابا کو دادا بننے کا بہت شوق تھا۔ ہا ہا ہا.....“
 (25) ”اگر میں.....؟“
 ”اگر میں پاور میں آ گیا..... کوئی بڑا عہدہ مل گیا تو سارے سیاست دانوں کو ایک کشتی میں بٹھا کر بچہ دریا میں ڈبو دوں گا۔“
 (26) ”میرے پاس ذخیرہ ہے؟“
 ”جو توں کا۔“
 (27) ”موڈ خراب ہو جاتا ہے؟“
 ”جب سب چٹھیاں انجوائے کر رہے ہوں اور میں کام کر رہا ہوں۔“
 (28) ”افسوس ہوتا ہے؟“
 ”جب کوئی ہماری جدوجہد کو تسلیم نہ کرے اور یہ سمجھے کہ بغیر کسی کوشش کے اللہ میاں نواز رہا ہے..... اللہ بھی محنت کرنے والوں کا ہی ساتھ دیتا ہے۔“
 (29) ”اظہار کتنا ضروری ہے؟“
 ”بہت زیادہ..... خواہ خوشی کا ہو، دکھ کا ہو یا محبت کا۔ میں نے کئی لوگوں کو ایسے تین مواقعوں پہ بہت بے حس دیکھا ہے۔“
 (30) ”بہت نقصان اٹھاتا ہوں؟“
 ”جب سچ بولتا ہوں۔ سچائی کو تسلیم کرنا بہت مشکل ہے۔“
 (31) ”کھانے کے لیے مخصوص جگہ؟“
 ”کوئی نہیں..... جہاں پتا چلتا ہے کہ یہاں کا کھانا اچھا ہوتا ہے وہیں کھا لیتے ہیں۔ نئی نئی جگہ بھی آزمانی چاہیے۔“

کتابخانه

انداز ہوتا ہے۔“

مفت ریا جارہا ہے۔

☆☆

بچن اور آپ

۱۔ ملازمین کو پن اور آپ میں انعام کا حق وافر ار دیا ہے۔ اور اس کی جانب سے تسمیہ طاہرہ
 ۲۔ ماہنامہ کرن مفت دیا جا رہا ہے۔

رخ چوہدری

سچائی کا سر

لندن کے انتہائی سرد موسم میں بڑھیا نائٹ کلب کی عمارت کے نیچے بیٹھی ہر آتے جاتے بندے کے آگے ہیٹ کر کے اپنے بیمار شوہر کی دوا اور کھانے کے لیے پیسے مانگ رہی تھی کہ اچانک ٹی اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ وہاں سے گزرتے ہوئے بڑھیا کی جمع شدہ رقم لے کر بھاگ جاتی ہے۔

”سلیم منزل“ کے اکلوتے چشم و چراغ سلیم الدین جن کی والدہ حمیدہ خاتون ان کی شادی اپنی برادری یعنی نوابی رسم و رواج والی لڑکی سے کرنا چاہتی ہیں اور ان کے شوہر نواب علیم الدین اپنے دیرینہ دوست ملک غیاث کی بہن شگفتہ کو بطور بہو پسند کر آتے ہیں اور اس پسند میں سلیم الدین اور دونوں بہنوں کی پسند شامل ہوتی ہے مگر حمیدہ خاتون مختلف زبان، مختلف ثقافت اور کم تعلیم یافتہ بہو کو دل سے قبول نہیں کرتیں اور دن رات کڑھا کرتیں۔

ظہیر احمد ایک سرکاری افسر ہیں مزاجاً انتہائی مزاج، اکھڑ، بات بات پر بیوی کی بے عزتی اور اس پر ہاتھ اٹھانا اپنی شان سمجھتے ہیں۔ ظہیر احمد اور رقیہ کے دو بیٹے، دو بیٹیاں ہیں اسامہ، شمینہ، نگلیل اور جمیل۔ ظہیر احمد کے بڑے بھائی کبیر احمد سخت ضرور تھے مگر بیوی پر ہاتھ اٹھانے کو مرد کی بزدلی اور کمزوری سمجھتے ہیں۔ ان کے دو بیٹے عابد اور ساجد جو اسامہ اور شمینہ کے منگیتر ہیں اور تین بیٹیاں جن میں دو نگلیل اور جمیل کی منگیتر ہیں اور ایک کسی کزن بھانجے کے ساتھ بیاہی جاتی ہے۔

اب آگے پڑھیے۔

چھٹی قسط



”او کے! میں نکلتی ہوں موسم کا موڈ تو خاصا بگڑا ہوا لگ رہا ہے۔“ رویکا نے جھک کر اپنا بیگ اور گاڑی کی چابیاں اٹھائیں۔

”میں! تو کہہ رہی تھی کچھ اور رک جاؤ اور راہی بھائی کے لیے دال چاول لیتی جاؤ۔ ان کو پسند ہیں۔“

”ارے! ایسے ویسے راہی تو جان ہے ہر دیکھی چیز میں، ٹھیک ہے بنا لو پھر۔ خوش ہو جائے گا اپنی پسندیدہ چیز دیکھ کر اور میرا بیٹ بوجھنا بھی برداشت کرے گا۔“ رویکا نے بیگ واپس میز پر رکھا اور بیٹھی۔

”ہائے! آئی ہاؤ آر یو۔“ اب یہ نبھانے نجمہ کی کس ہنسی کی بیٹی تھی مگر کبھی بڑی حسین لڑکی کی طرح آزاد سی لباس سمیت ہر چیز سے بے نیاز۔

”آئی ایم فائن ایڈ یو۔“ اور اس کے پاس آنٹی کے حال احوال کا جواب دینے کا ٹائم بھی نہیں تھا بیگ لہراتی اسے بائے کرنی چاہتی تھی۔

”دیکھا تم نے یہ تو چلن ہیں یہاں کی نسل کے، خیر تم کافی پوٹھنڈ بڑھ گئی ہے۔ کھانے میں تھوڑی دیر ہے۔“ نجمہ نے اس کی طرف گرم گرم کافی کا گنگ بڑھایا جس سے اٹھتا دھواں ماحول کی تھنڈک میں زیادہ اڑاؤ نہ بھر سکے۔ جلد ہی تھنڈا ہونے لگا۔ رویکا سب لیتی رہی وہ واقعی گرم کافی ہی پینا چاہ رہی تھی۔

”ہاں، بات تمہاری درست ہے نجمہ مگر اس کا ذمہ دار ہم اپنی اولاد کو نہیں بھڑا سکتے۔ ہم نے خود ان کو اس راستے پر ڈالا ہے۔ جس پر چل کر ہم یہاں تک پہنچے ہیں۔ یہ میرا تمہارا مسئلہ ہی نہیں نجمہ، ہر پاکستانی کا مسئلہ ہے جو یا تو اپنے اپنے سسرالیوں سے ڈر کر بھاگے ہیں۔ یا کمانے کی غرض سے آئے ہیں۔ اب چونکہ اوکھلی میں ہم نے سردے دیا ہے۔ تو موصول کی ضرورت بھی برداشت کرنا پڑیں گی نا۔“

نجمہ اور رویکا سوچ کے ایک بیچ رہیں اس لیے ایک دوسرے کا دکھ سمجھ سکتی تھیں۔

”دینے رویکا! تمہارے اپنے خاندان یا سسرال میں۔ کوئی عزیز رشتے دار۔“ رویکا نے کافی کھنڈا سب لیا۔ اور اکتا کر کہا۔

”ارے! بھئی نجمہ! کہا نا میرا میکا اور سسرال ہے بھی نہیں۔ ہوتے تو میں خود آخر کرتی۔“

”لیکن راہی بھائی تو بتا رہے تھے کہ تم لوگوں کے جڑواں بیٹے بھی ہیں۔“ نجمہ کی اس بات پر رویکا چونک کر نجمہ کو دیکھا جیسے اس نے رینگے ہاتھوں چوری کرتے پکڑ لیا ہے۔ اس کے چہرے پر کرب ناگ کی شاہ اتری، ہونٹ سکڑے، آنکھوں کی نمی کو نجمہ نے دیکھ لیا اور اس نمی کو انگلی کے پوروں میں سیٹھتے بھی دیکھ لیا۔ ہونٹوں پر زبردستی کی مسکراہٹ سجا کر رویکا بھر پھڑکی ہوئی۔

”اچھا! ایسا ہے تو اپنے راہی بھائی سے پوچھنا وہ جڑواں بیٹے کہاں ہیں اور پلیز جاؤ دیکھو تمہاری دال دال کپ ہے تو دے دو۔ راہی کا موڈ اچھا ہو جائے گا۔ ورنہ دیر ہوئے پروہ کھری کھری سنائے گا، ہانگوں کی طرح۔“

رویکا کے اس طرح تیور بدلتے دیکھ کر نجمہ کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر ہلکا سا مسکرا کر چین کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

”اچھا! تو فرجاد میاں، تمہارا تعلق فیصل آباد سے ہے۔“ راہی نے اپنے سامنے کھڑے نوجوان کو دیکھ کر راہی کی اپنے اسٹور کے لیے دی گئی آن لائن نوکریوں کے لیے دیے گئے ایڈ پر آیا تھا۔ ٹھیک ٹھاک پاکستانی خور و نو جوان قابل توجہ تھا۔ ہاتھ میں ڈگریوں کا پوٹ فوٹیو بھی تھا۔

”جی سر۔۔۔۔۔!“

”تو پھر بیٹھ جاؤ۔ میرا پاکستانی شہری یوں پرانے ملک میں میرے ناسننے یوں مودب کھڑا ہو۔ مجھے

بہادر راہی کی اچھائی، پاکستان اور پاکستانیوں سے محبت سے متاثر ہو کر بیٹھ گیا۔

”بہادر! یاں۔ ہر چند کہ میں نے خود آن لائن ایڈ دیا تھا اپنے اسٹور کے لیے اور چاہتا بھی ہوں کہ وہ زیادہ اپنے ہی ملک کے نوجوانوں کو جاب دوں۔ مگر بیٹا میری دلی خواہش یہ ہے کہ میرے اسٹور کا قابل ہیں۔ اتنا پڑھتے ہیں تو۔ اپنی قابلیت سے اپنے ملک ہی کو فائدہ پہنچائیں مگر۔۔۔۔۔“

راہی ارادہ سا ہو گیا اور اشارے سے اپنے درکر کو کافی لانے کا اشارہ کیا اور کچھ دیر میں کافی آ گئی۔ مگر راہی کی ہائیں فرجاد کو کچھ بھائی نہیں تھیں۔ تاہم وہ چپ چاپ کافی پیتا رہا۔ پھر دماغ کی زمین پر کھلتے کیڑے

”آپ ہائل درست کہہ رہے ہیں سر۔۔۔۔۔ سوری ٹو سے کہ آ۔۔۔۔۔ آپ جب ملک سے اتنی محبت کرتے ہیں تو آپ یہاں۔۔۔۔۔ مطلب!“

اس بات پر راہی نے ایک کرب تاک سانس لیا جو اس کے سینے کو چیرتا ہوا فضا میں تحلیل ہو گیا۔ پھر اس نے زبانی سے مسکراہٹ کے ساتھ۔ فرجاد کو دیکھا۔

”بیٹا! یہ انسان بھی ناں بڑی عجیب چیز ہے۔ کبھی تو ارادوں کی پختگی سے فولادی دیواریں توڑ ڈالتا۔ تو کبھی کبھی اتنا مجبور ہے بس کہ خود کو مجبور یوں کی مرضی کے حوالے کر دیتا ہے۔ پھر وہ جہاں چاہیں اس کو لے جاتے۔ میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا ہے۔ خیر میاں مجھے جھوڑا پانی سناؤ۔۔۔۔۔ انٹر ویو تمہارا ہے۔ لے تم آ رہے ہو۔“ راہی نے قدرے ہنس کر کہا تاکہ فرجاد خوف زدہ نہ ہو جائے۔

”اوہ سوری۔۔۔۔۔! سریوں ہی پوچھ لیا تھا۔ میری اسٹوری تو یہ ہے کہ نڈل کلاس کا نوجوان ہوں۔ بڑی پڑھا ہوں۔ والدین نے پیٹ کاٹ کاٹ کر اچھی ڈگریاں دلوائیں کہ دن اچھے آجائیں گے، ان کی دلی وجہ سے۔ مگر جب بیٹا صاحب ڈگری یافتہ ہو گیا تو اسے جاب ملتی ہے، کسی ہونٹ میں پیرے کی۔ باہل ان پڑھ بیٹھ کر ڈیٹا سوری کی تو۔۔۔۔۔ سر انسان مصیبت تو اچھے دنوں کے لیے جھیلتا ہے ناں، وہ بھی ناں۔“

فرجاد فرار پر اپنا حق سمجھتا ہے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ نے میرے بوڑھے والدین کی دعا میں سن لی ہیں۔ میں یہاں آپ کو پشیمان ہوں۔ اگر آپ ہم جیسے پاکستانی نوجوانوں کو یہ پلیٹ فارم نہ دیتے تو میں ابھی بھی۔۔۔۔۔“

فرجاد نے کرتے۔۔۔۔۔ شاید فرجاد کی آنکھوں کے کنارے پھلکے تھے۔ تین بہنیں، بیوہ بھابھی اور بوڑھے۔۔۔۔۔ ان دنوں تک تیرتے آگئے تھے۔

”انتہی سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

”ایٹ آل۔۔۔۔۔ اللہ تعالیٰ ہے ناں۔“

☆☆☆

فرجاد کا اٹھا ہاتھ میکا کی انداز میں نیچے آ گیا۔

”ہاؤ۔۔۔۔۔ تم ہوتے کون ہو تم سے باز پرس کرنے والے۔۔۔۔۔ میں تمہارا باپ ہوں۔“

”راہی! سراسر گوشی ماں ہی سن پانی چپکے سے منیبہ نے اس کا ہاتھ دبایا۔ ارمغان سپاٹ چہرہ لیے۔

”اچھا! انداز بھی نہ بھایا۔

”میرے ہونٹ ارنڈ نا! میں کسی کا مجرم نہیں اوکے۔ جو کام کیا ہمیشہ لیگل کیا۔ پوچھو اپنی

”اب لو اپنی گواہی کی ضرورت کی کہ محسوس ہوئی۔

”ہاں! میں ساجد! یوں بیٹے کو وضاحتیں دے رہے ہیں؟“

”اس لیے کہ بیٹے نے باپ کو وضاحتی عدالت میں لا کھڑا کیا ہے۔ تو بتاؤ، میں کسی کا مقروض نہیں ہوں نہ ان کا، نہ تمہارا اور نہ ہی دوسری بیوی اور بیٹیوں کا۔“ ساجد کو احساس نہیں ہوا غیر محسوس انداز میں وہ اپنا پاپاں بازو دبائے لگا۔

منیبہ نے ارمغان کو گھورا اور خود ساجد کو پکڑ کر دوسرے کمرے میں لے گئیں۔

ارمغان ایڑیوں پر گھومتا واپس مڑا اور سیدھا سرمد کے پاس جا پہنچا۔ وہ دوست جو اس کو بھائیوں جیسا تھا اور اس کی زندگی میں یہی ایک دوست تھا جس سے وہ ہر بات شیئر کرتا تھا۔

”یار سرمد! ابھی بھی سمجھتے ہیں کہ انہوں نے اپنے سارے فرائض ادا کر دیے۔ یار وہ..... وہ کیوں نہیں سمجھتے ہیں..... میں اپنی شناخت چاہتا ہوں۔ اس گھر میں جو ہمارے دادا ابا کا گھر ہے، جہاں دوسرے بہن بھائی کزنز پورے حق اور استحقاق سے رہ رہے ہیں اور ہم یہاں بغیر کسی شناخت کے رہ رہے ہیں۔ ہم نے ہماری ماں نے ڈر کے سائے میں سارا بچپن گزارا ہے۔“

اب وہ اپنے دوست سرمد کے سامنے دل کھولے بیٹھا تھا۔

”بات! تمہاری درست ہے ارمغان مگر یار..... پو آ رہی کہ تمہارے والدین حیات ہیں۔ والد کا سایہ ماں کا سایہ سر پر موجود ہے۔ ہم تینوں بہن بھائی کو دیکھو، دنیا کی ہر نعمت ہے، دولت ہے، بہترین بزنس ہے۔ مگر ماں بابا ہمیں اس وقت چھوڑ کر گئے جب میں بمشکل اٹھارہ سال کا تھا۔ دو بیٹیں سعدیہ حادیہ..... میرے حوالے کر گئے۔ اللہ کریم کا شکر کرو والدین حیات ہیں، ہماری طرح وقت اور حالات کی کڑی دھوپ تم لوگوں کو چھو کر بھی نہیں گزرتی۔“

زندگی میں کچھ ایسے دوست ہوں جو آپ کو شکر کا راستہ دکھادیں تو اللہ کا شکر اُنہ پھر بھی بنتا ہے۔ ارمغان پل بھر کے لیے خود کو مجرم سا محسوس کرنے لگا اپنے والدین کا۔

”ہاں یار۔ تم ٹھیک کہہ رہے ہو مگر میں بس وہاں اپنے دادا کے گھر میں سب کے ساتھ اسی حیثیت کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں اور اپا کیوں گریز پائیں یہ سمجھ میں نہیں آتا۔“

”چلو یہ بات سمجھ میں آجائے گی۔ گھر چلو آج سعدیہ نے خود اپنے ہاتھوں سے مٹن بریانی بنائی ہے اور یہ دیکھو جن آ یا ہے۔ ارمغان بھی اسے کیسے گاؤں ضرور آئیں۔“

سرمد نے باقاعدہ اپنا موبائل اس کے سامنے رکھ دیا وہ پڑھ کر زیر لب مسکرا دیا۔

”تو چلیں..... اچھا وہ تمہارے کزن ہمایوں صاحب ہوں گے۔“ میز سے اٹھتے ہوئے ارمغان نے اپنے موبائل اور چابیاں اٹھاتے ہوئے پوچھا تو سرمد نے بھی اپنی چابی اٹھائی اور دونوں کافی ہاؤس سے باہر نکلے۔

”ہاں کل ہی تو وہ دعویٰ ٹور سے آیا ہے..... کیوں؟“ سرمد نے چابی سے گاڑی کا دروازہ کھولا تو ارمغان نے پارکنگ میں کھڑی اپنی گاڑی کو دیکھا۔ اس سوال پر پلٹا۔

”کچھ خاص تو نہیں..... بس کچھ عجیب سا لگتا ہے۔“

”عجیب.....! ارے یار ہمایوں اتنا ہینڈم ہے اتنا گڈ لکنگ ہے کہ جہاں سے گزرتا ٹکڑیاں..... دیکھتی رہ جاتی ہیں۔“

”ہاں، ہاں ہے تو واقعی ایسا ہی..... چلو نکلو میں بھی اپنی گاڑی نکالتا ہوں۔“

☆☆☆

”ارے واہ! آج ہماری شیف صاحبہ نے کیا بنایا ہے۔“ ہمایوں نے اندر قدم رکھا ہی تھا۔ بریانی کی خوشبو نے جکڑ لیا اور سعدیہ جو اس کے متاثرین میں سے تھی، دھڑکتے دل کے ساتھ چپ کھڑی رہی۔ حادیہ نے شوگی

.....

نے مٹن بریانی بنائی ہے۔ کیونکہ کل آپ مٹن بریانی کو یاد کر رہے تھے۔ تو آج ہماری

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

باقاعدہ بیٹیاں سمجھتا تھا۔

سعدیہ خود سمد کی طرح گہرے سانولے رنگ کی قبول صورت لڑکی تھی، بد نصیبی سے پاؤں میں ہلکا سا لنگہ بھی تھا۔ اتنی معمولی شکل اور اس معذوری پر، وہ بے حد پیارے اور محبت کرنے والے دل کی مالک تھی اور اس دل میں وہ ایک گفام کو داخل کر چکی تھی۔ اور اپنے کالج کے دل میں رکھے اس محبت کے شوق سے کو وہ اتنی حفاظت سے رکھتی کہ سانس بھی احتیاط سے لیتی جبکہ عادیہ اپنی والدہ کی طرح بہت خوب صورت تھی، شوخ اور نرٹ کھڑی بھی۔ وہ گھر کی چھوٹی تھی سب ہی اس کے ناز و تحریے اٹھاتے اور وہ اپنا حق سمجھ کر اٹھاتی تھی۔ حتیٰ کہ اپنی ذات میں آپ انجمن اور خود پسند سماجیوں بھی اسے بڑے بھائی والا پیار اور مان دیتا۔

ہمایوں لاوارث کی سی حیثیت رکھتا تھا۔ مگر ایوب صاحب نے اپنے بڑے اس کا بھی حصہ رکھا تھا۔ جبکہ سمد کرتا دھرتا ضرور تھا مگر ہمایوں کو اس کی حیثیت کے ساتھ رکھتا، جبکہ ہمایوں اکثر اپنے پاس موجود لاوارثی کے کارڈ کو استعمال کرتا۔ تو حساس دل سمد اور سعدیہ ٹپ جاتے۔ سعدیہ کی زندگی کا محور صرف ہمایوں تھا۔ اس کی محبت، اس کی طلب، اس کا حصول بھی اس کی دعا تھا۔ اور ہمایوں کے دل میں کیا تھا یہ سوائے اللہ کے اور کوئی نہیں جانتا تھا۔

”اور ہمایوں! تمہارا دینی ٹور کیسار ہا۔“ ارمغان سمد کا صرف دوست تھا اس لیے پوچھ رہا تھا۔
”ہاں، اچھا تھا۔ لیکن ایک گڑبڑ ہو گئی یار سمد۔“

☆☆☆

”کہا تھا ناں تم سے یار ساجد کے ہوش ناخن لو۔ جذباتی فیصلے انسان کی عقل کو بہا کر لے جاتے ہیں ہمیں ان کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔ دوستیوں کے سوار کو بھی کنارے لگتے نہیں دیکھا۔ مگر تم۔ تم پر اس وقت کا ایسا بھوت سوار تھا کہ نئی ٹولی دہن پر۔“
ساجد فکری طور پر بہت خود پرست اور ضدی انسان تھے۔ جو سن میں سماجی وہ گزر گزرتے۔ خود غرض اسے کہ اپنی خواہش کے سامنے ہر رشتہ ہر مصلحت دم توڑ دیتی اور آج اگر وہ کسی مشکل میں تھے تو یہ ان ہی کے فیصلوں کی وجہ سے تھا۔ مگر وہ خود کو کسی کا مجرم نہیں سمجھتے تھے۔

”بھائی جان! یہ آپ کن چکروں میں پڑ گئے ہیں میں اپنے کسی فیصلے پر نہ تو نادم ہوں نہ شرمندہ۔ دوسری شادی میرا حق تھا۔ اور حق کو حاصل کرنا گناہ نہیں۔ سب جانتے تھے کہ شمیم مجھے ہرگز پسند نہیں مگر پھر زبردستی جذباتی دباؤ میں لا کر، اس پیار کو میری زندگی کا عذاب بنا کر، میرے منہ میں باندھ دیا گیا اور۔۔۔۔۔ اس نے کیا دیا مجھے تین عدد بیٹیاں جبکہ شمیم میرے تین بیٹوں کی ماں ہے۔ میرے بیٹے میری پہچان ہیں۔ میرے نسل کا جلتا چراغ ہیں۔“

شمیم نے نفرت اور اکتاہٹ میں ساجد اسی موڑ پر کھڑے تھے اور تین عدد بیٹیاں اس کے جرائم میں اضافہ بن کر شامل ہو گئی تھیں۔ عابد چپ چاپ ان کی باتوں کے تناظر میں سوچ رہے تھے کہ اب وہ اپنے اس ضد بھائی کو کیا مشورہ دیں۔
”تو اب کیا پرابلم ہے۔“ عابد نے کافی کاسپ لے کر مگ میز پر رکھا تو ساجد جن کے چہرے پر بہت باتوں اور حقائق کی کٹی اور الجھاؤ تھا۔
”بتایا تو ہے بھائی جان کہ میرے بیٹے اب اپنی پہچان چاہتے ہیں خصوصاً ارمغان مجھ سے ناراض ہے۔“ ساجد نے پریشانی میں پھر سگریٹ ساگایا۔
”تمہیں یاد ہوگا ساجد۔ یہ وہ تھا کہ میں نے تمہیں اس وقت آگاہ کر دیا تھا مگر اس وقت تم

”کچھ بھی کر س نہیں بھائی، مگر شمیم اور میرے بیٹوں کو گھر لے آئیں۔ سارہ اور عمارہ سے مجھے کوئی خطرہ نہیں مگر۔۔۔۔۔ زارا آسانی سے یہ حقیقت تسلیم نہیں کرے گی۔ بہت ضدی اور سخت لڑکی ہے۔“
بڑے سے بڑے فرعون پر بھی جب مشکل آتی ہے تو۔۔۔۔۔ وہ اپنی غلطی تسلیم کرتا چلا جاتا ہے۔ ہر چند کہ ساجد اپنی غلطی تو تسلیم نہیں کر رہے تھے کیونکہ نکاح ثانی ان کا حق تھا۔ البتہ اس بات کو چھپانا وہ اپنی غلطی مان رہے تھے۔
”مجھے بھی زارا ہی سے ڈر ہے۔ وہ بہت ہنگامہ کرے گی۔ خیر اللہ مالک ہے۔ سب سے پہلے میں اسماء سے بات کرتا ہوں۔ ہم اپنی بیگمات کو اہمیت دیں نہ دیں وہ ہماری اچھی مشیر اور ساتھی ہیں۔“

☆☆☆

”ای! ام! شاء اللہ آج تو بی بی بالکل سیٹ ہے۔“ شمیم کا بی بی چیک کر کے زارا اٹھٹھو اس کو پکارتے ہوئے ایک میز پر رکھا اور مسکرا کر ماں کو دیکھا جو آج خاصی فریش لگ رہی تھیں۔
”کاش! نہیں میڈیکل میں ایڈمیشن مل جاتا میری کتنی خواہش تھی کہ تم ڈاکٹر بنو۔۔۔۔۔ مگر۔“ شمیم ادا سی سے

”ارے ام! اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا تو مل ہی جاتا۔ اب کیا کیا جائے۔ ویسے امی دعا کریں میرا نام کسی اے کے سمجھتے کے ڈپارٹمنٹ میں آ جائے تو بہت اچھا ہوگا۔“
”آ جائے گا ان شاء اللہ! سب سے اچھی سب سے فرماں بردار بیٹی ہو۔ کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے یا میں باری جزواں بہن ہوں یا تم میری۔“ یہ کہہ کر شمیم بڑا اکل کے نہیں تو زارا ماں کو دیکھتی رہی۔
”لیکن اللہ کرے کہ تمہارا نصیب میرے جیسا نہ ہو۔ تمہیں قدر کرنے والا عزت دینے والا۔۔۔۔۔ محبت کرنے والا شوہر ملے۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔“ شمیم کے اندر جیسے سارے دکھ چھینے لگے۔ نفرت، بے عزتی، ناقدری کون لہان سے گھاؤ نہیں لگائے تھے ان کے شوہر نے ان کے دل حزیں پر۔ شمیم کی آنکھیں بھیک لگیں۔ بیٹی نے مارے اسو اپنے اچھل میں تارے سمجھ کر سمیٹ لیے۔

”اگر آپ ایسا چاہتی ہیں امی تو کم از کم آپ کی اس بیٹی کا نصیب اس گھر میں نہ لکھا ہو۔ کیونکہ میں نے

”مکائی جی! اے دیکھو میری بیٹیوں نے دن رات لگا کے تمہارے کپڑوں پر کڑھائی کی ہے دیکھ لو۔“ پتو دھو بن نے بڑی سی گٹھڑی لاکر میزہ کے سامنے کھول دی جس میں ریشمی سوئی پتی کپڑے تھے جن پر پتو کی ہنرمند بیٹیوں نے دھاگوں کی قوس و قزح بکھیر دی تھی۔

”میزہ خوشی سے شرٹ پٹیں اور دوپٹے اٹھا اٹھا کر دیکھ رہی تھیں۔“
”بائے پتو! قسم سے تیری بیٹیاں بڑی ہنرمند ہیں۔ واقعی بہت اچھا نقش کام کیا ہے۔“ تعریف سن کر پتو کا خون بڑھ رہا تھا۔

”ہنر تو بہت ہے مکائی جی، پر نصیب ہی خراب ہیں۔ ایک بیوہ ہوگئی ایک طلاق لے کے آگئی ہے تیسری کا رشتہ نہیں ہو رہا۔ اب میں ہی ان کی سب کچھ ہوں۔“
احوال زندگی سناتے سناتے ماسی پتو رونے لگی۔ دوسروں کو اچھے کپڑے سجا کر رنگوں کی دھنک اڑانے والی پتو کا دوپٹا پھٹا ہوا تھا۔ میزہ ادا اس ہوگئی اور اپنے بیک سے پیسے نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھے۔

”دل! چھوٹا نہیں کرو پتو، اللہ ہے ناں سب کا مالک۔“
”رب تو تمہارا ڈیرہ آباد رکھے۔ جی سدا سخی رکھے۔ آمین۔“ پتو دعائیں دیتی چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی شاہی تالابی آگئیں۔ کپڑوں کو دیکھ کر گویا ان کی آنکھیں پھیل گئیں ایک ایک کپڑا اٹھا کر دیکھنے لگیں۔

”ہائے امی جی! ایسے سو بنے کپڑے۔“
”خبردار۔ کڑیوں بے کسی۔ اینٹاں کپڑے آں تے میلی نظر پائی۔“
”تو اماں جی تسی دی حد کر دے او، اسی تو بڑی پاکیزہ نظراں نال دیکھ رہے آں۔ یہ نہ تو میں نے لینا ہے۔ امی جی۔“ شاہی نے نفیس سے شقون کا..... ہم رنگ دھاگوں اور موتیوں سے سجاوہ چٹا خود پر پھیلا لیا تو میزہ نے جھٹ گھٹ کر تہ کر دیا۔

”آ کھیاں ناں کراے سارے کپڑے میریاں بچھیاں لئی نے..... تو اوڈے لئی نہیں۔“
”اوں! او! اچھا اچھا۔“ شاہی سب سے چھوٹی تھی ٹھوڑی سی ضد کے بعد مان گئی اسی وقت غزین اور اکبر بھی آگئے۔ کپڑوں کے ڈھیر کو دیکھ کر دونوں ہنس پڑے۔

”او اماں جی! اے کی اے۔“ غزین نے مسکراتے ہوئے پھیلے ہوئے رنگ برنگ کپڑوں کو دیکھا۔
”ہائے پتر۔ اے سارے کپڑے تیر پاں کراچی والی بہناں دے نے۔“
”لو پور سنو یعنی کراچی شہر دیاں کاچ پو نیورسی وچ پرھن والیاں لڑکیاں اے پیئڈ وکڑے پان گئیاں..... پتر جی تو اوڈی ماں جی ناں بس۔“ اکبر نے بھی مذاق اڑایا..... تو کچھ وہم میں میزہ بھی پڑ گئیں کہ پہلے جب وہ بچوں کے کپڑے بیچا پالے جایا کرتی تھیں اس وقت بچیاں چھوٹی تھیں اب ہو سکتا ان کو پسند نہ آئیں۔

”اچھا! جی نہ پسند آئیں گے تو اپنے نوکروں کو دے دیں گی۔ پھر میں تو خالی ہاتھ نہیں جاسکتی ناں۔“
کپڑوں کو سمیٹتے ہوئے میزہ نے اپنا خوف اور وہم بھی لپیٹ دیا۔
”او ایسی وی کوئی بات نہیں ہے امی جی۔ آج کل تو کڑھائیوں کا بڑا فیشن ہے۔ وہ ہی آپ کے دور کی کڑھائیاں گوٹے کناری والے کپڑے آرہے ہیں۔ وہ عازرہ ہے ناں وہ مجھے فون پر بھی بتاتی رہتی ہے اور تصویریں بھی سینڈ کرتی ہے۔“ تابندہ ساری تفصیل بتا رہی تھی۔

”عازرہ.....!“ غزین کے خیالوں میں ایک سنہری سی رنگت والی کول سی لڑکی ابھری جو اکثر اسے ذومعنی میسر کیا کرتی، وہ پڑھتا مسکراتا اور ڈیلیٹ کر دیتا۔ اس وقت بھی وہ اس کے نام پر مسکرایا اور اٹھ گیا۔ ڈیوڑھی کی طرف بڑھتے ہوئے تالابی کی آواز اس کی سماعتوں سے مکرانی۔

”کال میں دانٹوں کی اوٹ میں رکھا۔ پان دان بند کیا انگلیوں پر لگا کھٹا چونا..... اپنی لمبی سی نوک دار زبان بانٹا اور یہ تمام کارروائی انہوں نے انتہائی سکون اور اطمینان کے تمام تقاضے پورے کرتے ہوئے کی۔ پان لایا ایک طرف گاؤٹیکے کی اوٹ میں رکھ کر انہوں نے اپنی صاحب زادیوں کو کچھ ایسی کبھی نظر سے دیکھا کہ ابلی سب خود میں سٹ گئیں۔ ڈھیلی چوٹی کے بل جو کسی کزن کو دیکھ کر کھل گئے تھے، کس لیے گئے۔ کرلی بالوں کی آزادلوں کو کان کے پیچھے چھپے رہنے کی ہدایت کر دی گئی۔ سر سے اترا دوپٹا باقاعدگی سے سر پر آگیا۔ یہ تو ان جہاں کی ایک کبھی نظر کا کمال تھا۔ اچھی زبان کے جو ہر ٹھٹھکیں تو نا معلوم دختران کا کیا حال ہو۔

”ہوں! تو اگر آپ لوگ اب اپنے اپنے راز فاش کرنے سے فارغ ہوگئی ہوں تو ہم بھی وہ کہہ دیں جس لیے ہم نے آپ لوگوں کو یہاں تشریف آوری کی زحمت دی ہے۔“
سر دگر جھٹکھا لیج..... تہذیب اور سلیقہ کا جامہ پہننے بجز کی طرح آر پار ہوتے الفاظ پر چاروں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

”جی والدہ.....!“ شفق نے جھٹ آگے بڑھ کر والدہ کا فرشی غرارہ فرش سے اٹھا کر تخت پر رکھا۔
”کیسے ناں اماں جان.....!“ مہک نے آگے بڑھ کر والدہ کے منہ کے اطراف سے بہتی پیک کو اپنے فون کے آچل میں جذب کیا۔

”ہم منتظر ہیں۔ اماں جان۔“ صبا نے ماں کے پاؤں اپنی گود میں رکھ کر دبانے شروع کر دیے، سب سے چھوٹی عاتکہ نے دیکھا کہ اس کی چالاک بہنوں نے والدہ کو اپنے حصار میں لے کر مورچے سنبھال لیے کچھ چھوڑا ہی نہیں۔
عاتکہ کو چاہی پلوسی کے لیے کوئی میدان خالی نہ ملا تو وہ جھٹ آگے بڑھیں والدہ کے سر پر سے بھاری کام والا بانسہ کا یا اور جویں تلاش کرنے لگیں تو کٹن جہاں نے جھٹکے سے اپنا سر پیچھے کیا۔

”کیا کر رہی ہیں آپ عاتکہ جہاں.....“
”وہ..... وہ والدہ ہم نے سوچا ہم آپ کی جو کس ہی نکال دیں۔ رکیے ہم تلاش کرتے ہیں۔ یہ آج کل کی باتیں ہی بڑی چالاک ہوگئی ہیں، چھپ جاتی ہیں۔“ اور کٹنوں میں عاتکہ نے والدہ کے بال بکھیر دیے مگر جوں نہ لی۔
البتہ والدہ کسی بھٹنی کا روپ ضرور اختیار کیں۔ اوپر سے پڑی بڑی آنکھوں سے کھورتی ہونٹوں کے سرخ بہتی پیک..... اف بالکل ہی تو بھوت لگ رہی تھیں۔ چاروں بہنیں اس پر متفق ہونے کے لیے ہاں ہاں..... اپنے کام میں مصروف نظر آئیں۔ جبکہ عاتکہ تن تھا والدہ کی تیز دار نظریں زدیں تھیں۔

عاتکہ ناٹوں! جب آپ پیدا ہوئی تھیں تو ہم غفر صاحب کے سامنے خدشے کا اظہار کیا تھا کہ ہمیں اماری یہ بیٹی قتل۔ فارغ لگتی ہیں مگر وہ نہیں مانے مگر آپ تو اب گامے بگا ہے۔ اسی کا ثبوت بھی دیتی رہتی ہیں۔ ہم ہمیشہ کڑوا تیل استعمال کرتے ہیں۔ ہمارے سر پر جو کس خود کشی کرنے آئیں گی کیا۔“ کٹن کی آواز نے تیز ہوئی، سب نے عاتکہ کو گھورا جو شیمانی سے اپنے ہاتھ مائل رہی تھی۔

”آپ، آپ..... آپ کا اندازہ بالکل درست ہے..... اماں جان آپ عاتکہ خاتون کا طبی معائنہ ضرور لےوائے۔“
”میں شفق آما کی حمایت کرتی ہوں۔ والدہ۔“ مہک نے بھی عاتکہ کے خلاف حق و وث استعمال کیا تو صبا نے سوچا وہ اگر وٹ نہیں ڈالیں گی تو ہو سکتا ان کا طبی معائنہ کرایا جائے۔

”اماں جان۔ عاتکہ ابھی کم سن ہیں ابھی علاج شروع ہو جائے تو ہو سکتا ہے..... ٹھیک ہوئی جائیں۔“
”ٹھیک کہہ رہی ہیں صبا خاتون آپ کا علاج بھی ساتھ شروع ہو جائے کیونکہ ہمیں آپ دونوں کی عقل۔ شدید تحفظات ہیں۔ خبر اس وقت میں نے آپ لوگوں کو ایک دوسرے کے خلاف بولنے کے لیے نہیں بلایا۔

بلکہ یہ کہنے کے لیے بلایا ہے کہ آپ چاروں کسی گمان میں مت رہیے گا۔ آپ لوگوں کی شادیاں ہم اس تیز بیر خاندان میں ہرگز نہیں کریں گے۔ تیز بیر کہتے ہوتے انہوں نے بے چاری چھالیکہ کی پسلیاں ہی تو چبا ڈالیں۔ تیز بیر..... ہم سمجھ نہیں والدہ۔“ چاروں کے ذہنوں میں ایک سوال ایک زبان ہو کر نکلا تو والدہ چڑچڑہاں چباتے ہوئے یہ بیسی پیک اگال دان میں پھینکی۔

”جی ہاں..... یہ جو آپ لوگوں کی دادی حضور ہیں ناں ان کی وجہ سے ہمارا نوابی خون تیز بیر بن گیا۔ آپ لوگوں کے دادا نواب ابن نواب اور دادی..... آہ..... بد قسمتی ہے آپ کے دادا کو پنجاب کی جاہل اجد قسم کی خاتون شگفتہ بیگم جن کو آپ لوگوں کی زبان دادی جان..... دادی جان کہتے سوکتی ہے۔ ان کی وجہ سے ہمارا خاندان..... خیر ہماری تو قسمت پھوٹی تھی جو اس خاندان میں شادی ہوگئی مگر ہم آپ لوگوں کی شادی یہاں نہیں ہونے دیں گے اور نہ ہی آپ لوگوں کی قسمت پھوٹنے دیں گے۔“

”پھوٹنے دیجیے والدہ۔ وہ..... وہ ہمارا مطلب ہے۔ پھر ہماری قسمت کس دیوار سے پھوڑے گا۔“ کہا تو صرف شفق ہی نے تھا مگر ترجمانی سب کے جذبات اور خیال کی ہوگئی تھی۔ اس لیے سبھی شکلیں بنائے والدہ کے جواب کے لیے ان کو دیکھتی رہیں جو کوشش تو کر رہی تھیں ہونٹوں کے کناروں سے پیک کا بھاؤ روک سکیں مگر کامیاب نہیں ہو پا رہی تھیں۔

”ہاں خوب کہا آپ نے، کہ آپ لوگوں کی قسمت کہاں پھوڑیں۔ ارے ہم آپ کی اکلوتی والدہ محترمہ ہیں آپ لوگوں کے بھلے کے لیے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ آپ چاروں کے نکاح ہم اپنے بھانجوں اور بیٹیوں سے کریں گے۔ ہم مانتے ہیں کہ وہ لوگ معاشی طور پر بہت زیادہ محکم نہیں مگر ہیں تو نواب ابن نواب۔“ اس اعلان پر چاروں کی چاروں سلگ اٹھیں۔

”والدہ! ہمارے نصابی لکڑن صرف معاشی طور پر ہی نہیں ذہنی اور جسمانی طور پر بھی غیر مستحکم ہیں۔ دیکھ زردہ چھڑی کی مانند۔“

”واہ! مہک شاید پہلی بار اچھی بات نکلی منہ سے..... شاید غلطی سے۔“ شفق کے کنبیلے لہجے میں کی گئی تعریف پر مہک سلگ اٹھی۔

”خاطر جمع رکھیے شفق آبا، آپ سے تو آج تک ایسی غلطی سرزد ہوئی ہی نہیں۔ ہمیں باتیں بناتی ہیں۔ شفق اور مہک آپس میں الجھ پڑی تھیں۔“

”اوہو! پاؤں..... یہ کیا آپ لوگ آپس میں الجھ پڑیں۔ ان دیمک زردہ چھڑی کو توڑنا ابھی باقی ہے۔“ صبا اور عائشہ نے بڑی بہنوں کو گھورا۔ گلشن جہاں نے سینک کی اوٹ سے اپنی صاحب زادیوں کو گھورا۔

”سبھی گئی تھیں ان سب کو، ان کی بات بری لگی ہے۔ مگر وہ اپنی بات منوانا اچھی طرح جانتی تھیں۔“ آپ لوگ کچھ بھی کہیں سوچیں، سمجھیں ہم فیصلہ کر چکے ہیں کہ آپ سب کی شادیاں ہمارے میکے میں ہی ہوں گی۔ اس لیے اپنے دوھیالی تانا زادا پچھی زاد بھائیوں کو بھول جائے۔“

”مشکل ہے.....!“ چاروں نے دھڑکی نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

”ہمیں نے جو کہنا تھا..... کہہ چکے، لہذا اپنے دوھیالی رشتے کے بھائیوں سے دور رہیے۔“

”مشکل ہے.....“ پھر چاروں صندے کے اس صفحہ پر بیٹھا ہوئیں۔

”عائشہ! آپ جائے اور گھر کی تمام خواتین مطلب اپنی بہنوں کے لیے۔ دھاگے سوئی اور اپنا اپنا فرنگ لے کر ہال کمرے میں آجائیں، آج ہم آپ سب کو امور خانہ داری کے ساتھ ایک نیا ٹکا بھی..... متعارف کروائیں گے۔“

”ہمارے دلوں کو تار تار کر کے والدہ ہمیں نیا ٹکا متعارف کروائیں گی۔“ عائشہ افسردہ سی باہر آئی تو گھر لڑکے باہر کرکٹ کھیلنے جا رہے تھے۔ سب نے باجماعت اسے دیکھا۔ شمعون نے ہارون کو ہوکا مارا۔

”کیا ہوا۔“ ہارون آگے بڑھا۔

”بالکل خیریت ہے۔ اماں جان نے آپ سب کو بتانا تھا کہ..... کہ آپ سب ہال کمرے میں جمع ہو جائیں۔“

عائشہ کی ذہنی حالت کچھ بڑبڑہورہی تھی والدہ کی باتوں سے، اس نے جومنہ میں آیا بول گئی۔ گھر کی لڑکیوں کا بیٹنام گھر کے لڑکوں کو سنایا۔ شمعون ہارون اور فیصل روپا کی شکل بنا کر بولے۔

فاتحہ خوانی کس کی ہے، شفق آپا کی مہک آپا کی صبا کی..... یا پھر تمہاری!“ اس بات پر عائشہ شمعون کو گھورتی بولی۔

”جس طرح آپ لوگ ہماری ناقدی کرتے ہیں..... اسے دیکھتے ہوئے لگتا ہے کہ ہمیں والدہ کی بات مان لینی چاہیے۔ وہاں کم از کم ہماری قدر تو ہوگی۔“

☆☆☆

عمارہ حسب عادت لیٹنے ہی خراٹے لینے لگی تھی، زارا اسٹڈی ٹیبل پر کوئی آرٹیکل لکھ رہی تھی۔ وہ فری لانس رائٹر تھی وہ جن ایڈیٹور پر بھتیجی بولنا چاہیے تو وہ قلم کاغذ سنجال کر بیٹھ جاتی اور اپنی سوچ کو الفاظ میں ڈھال کر کاغذ پر اتار لی جاتی۔ وہ منفرد سوچ رکھتی تھی، ایسا نہیں تھا کہ وہ خود عورت ہے تو عورت کو مظلوم ثابت کرنے کے لیے وہ سوچ کی عدالت میں کھڑی ہو کر عورت کے حق میں دلائل دے۔ بلکہ اس کے نزدیک زیادتی..... زیادتی تھی نوازہ زیادتی کے نشانے پر عورت ہوتی یا مرد، وہ اپنی سوچ لفظوں میں ڈھال کر کاغذ پر اتارتی اور مختلف اخبارات یا رسائل میں چھپنے کے لیے بھیج دیتی۔ اس کی یہ بات فہد کو بہت پسند تھی وہ جان کر دانستہ طور پر اس کی تحریر ڈھونڈ کر پڑھتا پھر سوالات کرتا۔ بھی تو زارا جواب دیتی کبھی فہد کے سوال اسے چونکا دیتے تو کبھی فہد اس کے خیالات کی پیش میں حدت محسوس کرنے لگتا، ہرٹ ہو جاتا۔ اس کے مردوں کے بارے میں خیالات پڑھ کر۔

”یار سائی! خالہ! تمہاری یہ بقرابطہ قسم کی بیٹی کو ہم مردوں سے نفرت کیوں ہے.....؟“ وہ کوئی ایسا آرٹیکل پڑھتا جس میں زارا نے مردوں کے خلاف لکھا ہوتا۔ تو وہ سیدھا شمینہ کے پاس آ جاتا۔ وہ معصوم شکل بنائے اتنے پیار سے کہتا کہ شمینہ اسے پیار کر لیتیں۔

”میرے شہزادے یہ بات تو تم نفرت کرنے والی سے پوچھو ناں، کیوں کرتی ہے وہ مردوں سے نفرت۔“ اور پھر وہ فرماں بردار بچوں کی طرح اخبار ہاتھ میں لیے زارا کے سامنے آ کر اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا

والدہ ہر اتنا تو زارا گہرا سانس لے کر اخبار اس کے ہاتھ سے لے کر میز پر رکھتی۔

”میں سب مردوں سے نفرت نہیں کرتی۔ میں صرف ان مردوں سے نفرت کرتی ہوں۔ جو عورت کو خصوصاً

اپنی بیویوں کو پاؤں کی جوتی سمجھتے ہیں۔“

”ہاں تو وہ اسی لائق ہوں گی تو ان کے شوہران کو سمجھتے ہوں گے ناں پاؤں کی جوتی..... اس میں ایسا کیا

اچھا تو میری مسکین ماں اور تمہاری سمجھ دار ماں اس قابل ہیں۔ اس لائق ہیں کہ میرے ابا تمہارے ابا، ان کے شوہر حضرات ان کو بات بے بات ماحول لوگ دیکھے بغیر ڈھیل و خوار کریں۔ ہاں بتاؤ میری اور تمہاری ماں

کی بات کی حق دار ہیں کیا۔ بولو.....“ زارا نے دلائل دیے تو بیل بھر کو فہد چپ ہو گیا۔

”بھئی! تو وہ بھی سوچنا کہ اس کی سائی خالہ اور ماں اتنی اچھی ہیں پھر ان کے ابا حضرات ان کو ڈھیل کیوں

کرتے ہیں پھر اندر رگوں میں دوڑتا خون..... باپ اور تایا کو درست قرار دے دیتا کہ ہو سکتا ان کی مائی اور خالہ میں ہو کوئی بات ایسی کہ ان کو ڈانٹ پڑتی ہے۔

”کس سوچ میں ہو۔ بتاؤ ناں امی اور اسماء خالہ میں ایسی کون سی خامیاں ہیں جو ابابا اور تایا جان ان معصوم عورتوں کو ذلیل کرتے ہوئے نہیں دیکھتے ہیں، تنہائی میں یا محفل میں..... اپنی مردانگی کے قدموں تلے روند ڈالتے ہیں ان کی عزت کو..... انا کو..... ایسے مردوں سے نفرت ہے مجھے..... جو عورتوں کی عزت نہیں کرتے احترام نہیں کرتے اور کم و بیش تم اور سعد بھائی بھی ایسے ہی ہو، ابابا اور تایا جیسے۔“

”تو؟“ ہند کی انار پر چوٹ پڑی تو وہ بھی ڈھٹائی سے بولا تو زارا اسلگ گئی۔ اس نے اپنے آرنیکل والا اخبار بک شلف پر رکھا پھر اس کی طرف بولی۔

”اوکے جاؤ یہاں سے اور پھینکس تم نہیں جانتے تم نے میری کتنی بڑی الجھن دور کر دی۔ تھینک یو سوچ۔“

”پانی!“ وہ جانے کب تک خیالوں میں کم رہتی کہ عمارہ نے نیند میں پانی کہا تو اس نے چونک کر عمارہ کو دیکھا گلاس میں پانی ڈالا اور اس کا شانہ ہلا کر اسے پانی دیا۔

”شکر یہ زارا آپ..... بڑی پیاس لگی تھی۔“ عمارہ منون ہوئی۔

”تھیں تب پیاس نہیں لگتی..... چلو سو جاؤ اب یہ آپیاں کہاں گئیں۔“ عمارہ تو دوبارہ خراٹوں میں الجھ گئی تھی

زارا، سارہ کو دیکھتی باہر بالکونی میں آ گئی جس کی گرل سے ٹیک لگائے سارہ کھڑی تھی۔ زارا نے اس سے کوئی سوال نہیں کیا۔ چپ اس کے شانے سے شانہ لگا کر کھڑی ہو گئی۔ سارہ نے چپکے سے آنسو اچھل میں جذب کر لیے۔

”وہ..... وہ آرنیکل کمپلیٹ ہو گیا تمہارا.....“ سارہ نے ہاتھ بوخا کر آم کے پیڑ سے پتا توڑا جو حن میں لگا تھا اور ان کے کمرے کی بالکونی تک پہنچ گیا تھا۔

”نہیں۔ ابھی ادھورا ہے۔“ زارا گرل سے پشت لگا کر سینے پر ہاتھ باندھ کر سارہ کو دیکھنے لگی۔

”کیوں؟“ سارہ اس سے کتر رہی تھی۔

”امی اور آپ کی وجہ سے..... خیر چھوڑیں بحث فضول ہے۔ دیے اگر میں ہوتی ناں تو اب جیسے سعد بھائی سے منگنی توڑ دیتی۔“

”ہمیشہ کی بات زارا نے بر ملا ہرادی تو سارہ کے اندر سے اک گہرا سانس گویا سانس کی نالی کو چیرتا ہوا باہر آیا۔“

”لیکن میں تمہاری جگہ پر نہیں اور تم میری جگہ پر نہیں۔ بلکہ میں تو کہوں گی کہ تمہیں بھی تسلیم کی خوشحال یعنی چاہیے۔“

”اس لیے کہ یہ تم گمراہی وضع نہیں بدلیں گے۔“

”ہاں!“ سارہ بلا وجہ ہی پتوں کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کر رہی تھی، زارا اب دیکھ رہی تھی۔

”آپ تو امی کے سانچے میں ڈھلتی جا رہی ہیں آپنی! لیکن شاید میں تم کی اس داستان کا مظلوم کردار نہ بن سکوں۔“

زارا نے گہرا سانس گہری رات کی خاموش خاموش فضا میں لیا اور اپنے کمرے کی تین سیڑھیاں چڑھنے کے لیے پہلے اسٹیپ پر قدم رکھا کہ سارہ کے جملے نے قدم روک دیے۔

”یہ جو محبت ہے ناں زارا بڑی سخت حکمران ہے۔ جب دل کے تخت پر بیٹھ کر جذبات کی وزارتوں کو اپنے کنٹرول میں لیتی ہے تو ناں..... بندہ اس حکمران کی غلامی میں آ کر سکون اور خوشی محسوس کرتا۔ اس غلامی میں اسے زندگی کی خوشیاں نظر آتی ہیں۔“ پھر چاہے حکمران کوڑوں سے مارے یا.....“ سارہ کی بات ادھوری تھی کہ زارا واپس چلی۔

”ممن اس بابہ“ تم کرملہ ان کی غلامی آپ کو میاں دے ہو۔ آئی..... میں یہ غلامی کسی صورت اختیار نہیں کرانی میں تو عزت اور وقار کی نریدار ہوں۔ جو کم از کم اس گھر کے مردوں کے پاس تو ہے نہیں اپنی بیویوں کو..... لے لے لے..... آئی جان..... امی جان بھی اب اتنے محبت کی سزا بھگت رہی ہیں۔ ناؤ یو رٹرن۔ شب بخیر۔“

زارا جا کر شاید سو بھی چلی تھی۔ سارہ وہیں کھڑی تھی اور اس بار وہ اپنے نہیں زارا کے بارے میں سوچ رہی تھی بلکہ اس نے اکثر ابابا کے منہ سے اس کے لیے باغی لڑکی سنا تھا۔

”یا اللہ! رحم فرما میں یہ لڑکی کیا سوچ رہی ہے..... کیا کر رہی ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس گھر کی ہر لڑکی ہمارے بپا اللہ نے شاید اسی گھر کے لڑکوں کے ساتھ لکھے ہیں تو..... تو پھر کیسا احتجاج اور کیسی بغاوت۔ مگر..... مگر زارا یہ دونوں کام ضرور کرے گی۔ یا اللہ پھر کیا ہوگا تو ہی جانتا ہے۔“

☆ ☆ ☆

”گڈ..... ویری گڈ، رانی۔ یہ فرجاد تمہارے درکرز کی ٹیم میں بہت ہی اچھا ایڈیشن ہے۔ آئی لایک اٹ، ہینڈم، گڈ لکنگ، ابجو کیڈ بہت اچھا ہے۔ اس کے بات کرنے کا انداز دھیمالہجہ تو بہت ہی امپر یسو ہے۔“

رو بیکا کو فرجاد واقعی بہت پسند آیا تھا۔ اور گرم گرم کافی پیتے وہ مسلسل اس کی تعریف کر رہی تھی۔

رانی نے آنکھ داناں میں لکڑی..... رکھتے ہوئے..... منظر اکر اسے دیکھا۔

”شکر ہے میڈم! آپ کو میرا بھی کوئی فیصلہ پسند آیا۔ فرجاد واقعی اس قابل ہے کہ اس پر ہم نقل ٹرسٹ کر لے..... کام لے سکتے ہیں۔“ واپس اپنی جگہ پر آ کر رانی نے اپنا گنگ اٹھایا۔

”ہوں۔“ رو بیکا نے پر خیال انداز میں ہوں کو کھینچا اور رانی کے ہاتھ سے کافی کا گنگ لے کر مائیکرو ویو میں رکھا اور چندہر سینڈنگ لگا کر باہر نکال کر دوبارہ شوہر کو دیا تو وہ اس مہربانی پر ہنسا۔

”لگتا ہے تمہیں، فرجاد واقعی بہت پسند آیا ہے۔“

”ٹھیک کہہ رہے ہو مگر میں جو سوچ رہی ہوں شاید وہ سوچ ابھی تمہارے دماغ میں داخل نہیں ہوئی۔“

”نہیں۔ فرجاد جیسے اچھے لڑکے کو دیکھ کر میرے دماغ میں بھی سوچوں نے سر ابھارنے شروع کر دیے ہیں۔ اپنی دے تم بتاؤ کیا سوچا ہے۔“

”دیکھو! نجمہ اپنی بیٹیوں کے لیے پاکستانی لڑکوں کے رشتے چاہ رہی ہے تو ہو سکتا ہے۔ فرجاد ان ہی کی کسی بیٹی کا نصیب ہو۔“

اس بات پر رانی کچھ دیر کے لیے چپ ہو گیا۔ اس نے تو فرجاد کو دیکھتے ہی ٹٹی جیسی بد تمیز بیٹی کو فرجاد جیسے مائیک، پڑھے لکھے پاکستانی شوہر کے حوالے کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ یہ رو بیکا نے کیا کہہ دیا تھا۔ انور بھی اپنی لایوں کے لیے پریشان تھا اور فرجاد، انور کو بھی بہت پسند آیا تھا۔

”ارے بھئی، وہ بچہ پاکستان سے اپنے مسائل حل کرنے کے لیے آیا ہے اور ہم خود غرضی سے اسے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کریں۔ مجھے یہ بات خطی مناسب نہیں لگتی۔ ابھی اسے سبٹ ہونے دو..... انور اور نجمہ کی لایوں کے لیے ہم کوشش کرتے رہیں گے ابھی فی الحال فرجاد کی رہائش کا پرائیم ہے۔ تم کہو تو اپنی انیکسی دے لایوں کو جب وہ میٹل ہو جائے گا تو چلا جائے گا۔“

رانی کی بات پر رو بیکا کو کوئی اعتراض نہیں ہوا۔

”ہوں ٹھیک ہے۔ نیور مائنڈ۔ کہہ دو اسے شفٹ ہو جائے۔“

اور یوں شاید شادی کے اتنے سالوں میں پہلا معاملہ جوان دونوں کے درمیان طے پایا اور صلح اور اتفاق پایا گیا۔ مگر شاید وہ لوگ بھول گئے تھے کہ ان کی زندگی کے کھیل کا تیسرا فریق بھی ہے۔ جوان کی بیٹی ہے

جس کا نام ٹی ہے۔ ”اسپاسیل..... اسپاسیل! انکیسی میں ہم سب دوست بیٹھے ہیں مل کر۔ ڈیڈ کا سروٹ نہیں رہ سکتا۔“

اس اطلاع پر ٹی نے حسب عادت اپنے کمرے کا حلیہ بگاڑ دیا تھا۔
”کم آن بے بی! تم ہر بات میں اپنے ڈیڈ کے خلاف جانا چھوڑ دو۔ بی از یور فادر آفٹر آل۔“ چیزیں سمیٹ کر ان کی جگہ پر رکھنے ہوئے روبیکا نے اسے گھورا۔

”سوواٹ! ان کا سروٹ انکیسی میں نہیں رہے گا تو نہیں رہے گا۔“ کمرے سے نکل کر وہ کوریڈور میں رکھے دائیں بائیں گلیوں کو گھوم کر دیکھ کر گرائی آگے بڑھتی رہی۔ روبیکا پیچھے آتے ہوئے سب کو سیدھا کرتی رہتی۔

”ٹی! میں تمہیں کہہ چکی ہوں تمہارے ڈیڈ کا بی بی شوٹ کر جاتا ہے ان کو غصہ مت دلایا کرو۔ ہر معاملے میں تم ان کے سامنے کھڑی ہو جاتی ہو۔ مگر اب نہیں..... کل ہی راہی کے ڈاکٹر نے مجھے ان کے بارے میں خوف ناک باتیں بتائی ہیں۔“ روبیکا نے راہی کی طبیعت کو مزید خوف ناک بنایا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ فرجاد کے معاملے میں باپ بی بی کا گھراؤ ہو۔

”اوہ! کم آن..... مام..... کم آؤٹ فرام دیسی بیوی..... ہونہہ۔ آئی جسٹ بیٹ ٹیکل دیسی بیوی مجتبیٰ، باتیں۔“ یہ میرا گھر ہے میں کسی ایرے غیرے کو اپنے گھر میں رہنے کی اجازت نہیں دے سکتی۔ یونو مام، ہم نے بیڈ بنالیا ہے..... اور میرے فرینڈز یہاں آیا کریں گے۔ ہم پریکٹس کیا کریں گے..... اور یہ بات آپ ڈیڈ کو ضرور بتادیں۔ بائے۔“

مغرب کی گود میں پرورش پا کر بڑی ہونے والی والدین کی اکلوتی بیٹی، ٹی۔ ہمیشہ کی طرح اپنا فیصلہ بنا کر چلتی بنی اور بالکونی سے گیٹ تک جاتی بیٹی کو دیکھ کر روبیکا نے گہرا سانس لیا۔

”یا اللہ! اب متوقع ہنگامہ باپ بیٹی آمنے سامنے اور میں، ریفری اف.....!“

☆☆☆

”میں آپ کا بہت ممنون ہوں سر۔ آپ نے میرے پردست شفقت رکھا۔“ فرجاد کو راہی نے اختیارات دے دیے تھے بہت اچھی نوکری مل جانے پر فرجاد، راہی کا احسان مند ہو رہا تھا۔

”ارے میاں چھوڑو یہ شکر یہ احسان..... اللہ تعالیٰ ہے سب کا خالق مالک اور..... اور وہی سب کے مسائل کے حل کے لیے رزق کے وسیلے پیدا کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے مجھے تمہارے وسیلے کے لیے چنا بھی تو یہ میرے لیے مقام شکر ہے کہ پروردگار نے مجھے اپنے بندے کا وسیلہ بنا دیا اور تم خوش ہونا۔ یہاں پر۔“ راہی نے پیار بھری نظر فرجاد پر ڈالی۔ وہ ہاتھ باندھے ممنون کھڑا تھا۔

”کیوں نہیں سر۔ مجھے تو اللہ تعالیٰ نے میری طلب اور چاہت سے زیادہ نواز دیا ہے۔ میں اپنے رب کا بے حد شکر گزار ہوں ورنہ میں نے بہت سے اپنے جیسے لوگوں کو..... مجبور ہو کر مجرم بننے بھی دیکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اجر دے۔ آمین۔“

”اچھا اور تو کوئی پرابلم نہیں تمہیں یہاں پر، آج سے تم میرے لیگل ایڈوائزر ہو۔“
”بہت شکر یہ سر!“ احساس ممنونیت سے فرجاد مزید جھک گیا۔

”میں جلد ہی تمہاری رہائش کا بندوبست کر دوں گا۔“
”ارے سر۔ آپ اس چیز کے لیے بالکل فکر مند نہ ہوں۔ میں نے اسٹور میں اپنے سونے کی جگہ تلاش کر لی ہے۔“

”اسٹور میں!..... ارے میاں وہاں تو چیزوں کا اڑھام ہے۔ ہر چیز کی بھرمار ہے اور کام چور وہاں صفائی

”اے! اے! اے! اے!“

”آپ فکر نہ کریں سر، وہ ندیم ہے ناں اس نے اور میں نے مل کر اسٹور کو خود صاف کر لیا ہے۔ آپ چاہیں

بات لڑتے کرتے۔ فرجاد کی نظریں گلاس وال کے باہر نکلیں تو اندر کا راستہ بھول گئیں۔ اس کی نظریں ٹی پر ٹپکتی تھیں..... اور بغیر کسی آواز کے دل کے دروازے بھی کھل چکے تھے۔ کیا تھا اس چہرے میں..... ان کے ہاتھوں میں..... ان کی لٹوں میں..... جو کس کر بنائی گئی پونی سے اڑا کر باہر آ رہی تھیں۔ سردی سے سرخ کال..... کیا تھا اس نمکین چہرے میں کہ نظریں..... بھٹک گئیں راستہ بھول گئیں۔ وہ تو اچھا ہوائی جو کہ اس وقت بی بی کے ساتھ تھی یہیں آگئی ورنہ فرجاد کی نظریں بھی اس کے ساتھ ہی نہیں رخصت ہو جاتیں۔

ٹی اپنی معصوم اور نمکین پرکشش پرستیشی کے ساتھ شانے پر بڑا سٹھیلانا بیگ لٹکانے اندر داخل ہوئی۔ عجیب و غریب حلیے میں بھی فرجاد کو یقین تھا کہ یہ یقیناً وہی لڑکی ہے اور اس وقت تو وہ گرتے گرتے بچا جب وہ سیدھی راہی کی طرف بڑھی ان کے گلے لگ کر اس کے گال پر پیار کرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”ہائے ڈیڈ!“
”ڈیڈ! فرجاد پر جیروں کے آسمان آن گئے تھے۔“

☆☆☆

”میرا خیال ہے کہ اب ہمیں سعد اور سارہ کی شادی کر دینی چاہیے۔“ عابد کی بات پر اسماء نے چونک کر ان کو دیکھا۔ پھر خمینہ کو..... جس کے کھانا کھاتے ہاتھ رک گئے تھے۔ یہ رشتے تو طے تھے۔ مگر یوں اچانک کوئی مشورہ کیے بغیر شادی کے اعلان پر سب کے گویا ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

”جی ہاں ہے۔ اس میں اتنا حیران پریشان ہونے والی کون سی بات ہے۔ دونوں کی عمر اب شادی کی ہو گئی ہے۔ سعد بزنس سنبھال چکا ہے تو اب زندگی کی دیگر ذمہ داریاں بھی سنبھال لے۔ تاکہ ہم دوسروں کے بارے میں بھی سوچیں۔ کیوں آپ کوئی اعتراض ہے۔“

”عابد نے کانٹے سے بوٹی لگا کر منہ میں رکھتے ہوئے کہا تو خمینہ کو نوالہ کھاتے پھندا لگا، وہ زور زور سے کھانے لگیں۔ ساجد نے زہرا کو دفتر سے خمینہ کو گھورا۔“

”لیجیے کر لیجیے بھائی آپ شادی..... ہماری تو بیگم صاحبہ کو تو خوشی ہوئی ہو سانس ان کے حلق میں پھنس جاتی ہے۔ سانس نکلے لگتی ہے ان کی تو۔ سارہ لے جاؤ والدہ صاحبہ کو یہاں سے..... زندگی عذاب بنا کر رہی ہوئی ہے اس بے کار وجود نے میری تو۔“

”یوں بھری محفل میں خمینہ کو ذلیل کر دینا تو ساجد کا معمول تھا مگر آج زارا کو شدید غصہ آیا، ابا پر..... اس نے ماں کو ساتھ لگا باور اٹھ کر باہر آ گئی۔ سارہ بھی جانے لگی تو سعد نے اس کو گھورا۔“

”زارا! سادھ گئی ہے ناں چچی جان کے..... بیٹھو آرام سے۔ ابا جان کی بات ابھی مکمل نہیں ہوئی۔“
”جی!۔“ ماں کے سامنے میز ڈھلی دوبارہ بیٹھ گئی۔ اور پھر شادی کی بات آئی گئی ہو گئی۔ خپ چاپ کھانا

ایسا کیا۔ بچے اٹھ کر جا چکے تھے۔ دونوں بھائی اٹھ کر لاؤنج میں آ گئے۔ دونوں کے چہرے پریشان لگ رہے

”ابا! نے باری باری دونوں کو دیکھا۔“
”عابد! ایسی پریشانی والی بھی کوئی بات نہیں آپ لوگ ڈیٹ بتائیں الحمد للہ شادی کی تیاری تو چند دن میں

ست روگاہی حوں



*MWER

دونوں نے اسماء کو دیکھا پھر ایک دوسرے کو دیکھا۔
 ”ٹھک ہے پہلے تو آپ ہمیں اچھی سی گرین ٹی پلوایے پھر آپ سے کچھ باتیں شیئر کرنی ہیں۔“
 شاید پہلی بار عابد نے بڑے اچھے انداز میں بات کی ان سے کچھ شیئر کرنے کی عزت دی تو اسماء کھل اٹھیں۔
 ”زے نہیب ابھی لیجیے۔“ اسماء تیزی سے چن کی طرف چلی گئیں۔ تانیہ اور ثانیہ سارہ کو چھیڑ رہی تھیں۔
 ”آج نہیں تو کل اس گھر میں چاندی بھا بھی آئے گی۔“

”بھا بھی میری بھا بھی تم جیو ہزاروں سال۔“

یہ فہد تھا۔ اس نے خوشی سے سارہ کو گھما ڈالا۔ یہ لوگ بہت خوش تھے۔

”سچ عمارہ! کتنا مزا آئے گا ہم..... خوب شور مچا کر کریں گے۔“

”ہاں، ہم ہر رسم کی کمر اکسیم بنائیں گے۔ مہندی والے دن تو۔“ سارہ شرمائے جا رہی تھی سعد بالکل عین

سامنے کھڑا اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

”یار سارہ بھا بھی۔ گھونگھٹ نکالو..... یہ بندہ ناں آپ کو شادی سے پہلے ہی گھور گھور کر.....“ فہد نے

آگے بڑھ کر سارہ کا دوپٹا اس کے سامنے گھونگھٹ کی طرح نکال دیا۔

”ارے اوجا چاقیدو..... میری کو چھوڑو..... اپنی ڈھونڈو کہاں ہے جو میدان چھوڑ کر بھاگ گئی۔“

”شرماگئی ہوگی یقینی۔ وہ کیا ہے ناں بڑی شرمیلی ہے ہماری دہن۔“

”جاؤ۔ دیکھو انکار رہی نہ کرو۔ ابا جان ہماری شادی پر تم دونوں کا نکاح کرنا چاہ رہے ہیں..... اور یہ

چچا جان کی خواہش ہے۔“

”ہائے نہیں..... سچ، سچ کہہ رہے ہوں ناں۔ ہائے مر ہی نہ جاؤں شرم سے۔“ فہد نے ثانیہ کا آٹھل خود پر

پھیلا لیا۔ تو سب ہنس پڑے۔

”ماشاء اللہ! اللہ تعالیٰ میرے بچوں کی خوشیوں کو دائم بنھے۔“ شوہر اور دوپور کے لیے گرین ٹی لے جاتے

ہوئے انہوں نے ان سب کو دیکھا اور خوشی سے دعا دیتی چلی گئیں۔ لاؤنج میں آئیں تو دونوں بھائی سنجیدہ شخصیں

بنائے بیٹھے تھے۔

”خیریت تو ہے ناں سب۔“

”جواب نہ چاہتے ہوئے بھی دونوں بھائیوں کو اسماء کو ہر از بنا پڑا۔“

”کیا.....؟“

☆☆

(باقی آئندہ ان شاء اللہ)

سروے کی شخصیت

ماڈل مروجہ دلی

میک اپ روز بیانی پارلر

فیشن گرائی موسمی رجسٹرا

برآمدے میں رکھی جا رہی تھی۔ اسے کافی دیر گزر چکی تھی۔ گھنٹوں کے گرد بازو لپیٹے جا رہی تھی۔ پر انگلی پھیرتے ہوئے اس کا دل اور دماغ جزئیات کے بجھو نچال سے زلزلے کی کیفیت میں تھا۔ کچھ دیر پہلے ہی اس کی اماں واپس آئی تھیں اور انہوں نے جو خبر سنائی وہ غیر متوقع ہرگز نہیں تھی، مگر پھر بھی اس کا دل ٹوٹ گیا وہ سری باب۔

وہ ایک مشرقی لڑکی تھی۔ جس کا رشتہ بچپن میں طے کر دیا گیا تھا۔ اسے سمجھا گیا کہ حامد ہی اس کا ہونے والا شوہر ہے۔ اس کے علاوہ نہ تو وہ کسی کو دیکھنے اور نہ ہی کسی کے بارے میں سوچے۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ تانیا کے انتقال کے وقت وہ سولہ سال کی تھی۔ ان کے اس دنیا سے جاتے ہی تانی نے اسے بھونانے سے انکار کر دیا۔ دونوں گھروں میں خوب ہنگامہ ہوا۔ حامد کے دل میں بھی وہی ہستی تھی۔ مگر تانی کو اتنے سالوں سے اپنے اندر چھپا کر رکھی نفرت کو اگلنے کا یہ سنرا مویخ ملا تھا، وہ اسے ضائع نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ دیو رانی، جھٹائی کی آپس کی نفرت میں پیتے ہوئے ان دونوں کا دل ٹوٹ کر دھول ہو گیا۔ ابا بے حد اداں رہتے۔ انہیں اپنی بھر جانی سے کم از کم اس گھٹیا پن کی امید تو کبھی نہیں تھی۔ البتہ حامد روتے ہوئے ان کے پاس آیا تھا۔ مومنہ اسے صرف اس لیے پسند نہیں تھی کہ وہ ایک عرصہ اس کی منگیتر کے درجے پر فائز رہی۔ وہ

کزن کی حیثیت سے بھی اسے بہت اچھی لگتی۔ اس کی عادات، سادگی، مزاج میں ٹھہراؤ اور میچورٹی نے اس کے ہر رنگ کو برا کر دیا تھا، وہ اسے ہر طرف چھائی ہوئی محسوس ہوتی۔ مگر اب جیسے سب کچھ دھندلا چکا تھا۔ وہ اس کا عکس ڈھونڈنا رہتا، مگر ناکام ہو جاتا، اس نے ابا سے بات کی، اپنی مجبوری بتائی کہ اگر وہ مومنہ سے شادی کے لیے ضد کرتا ہے تو اس کی اماں اسے دودھ نہ بچھنے کی دھمکی دیتی ہیں۔ اس کی آواز زاری بن کر وہ اناؤکھ بھول گئی۔ مگر دل میں ایک تسلی ضرور تھی کہ وہ اگلی ہی اس راہ کی مسافر نہیں تھی۔ بدکھ تو اماں کو بھی تھا، ان کی پھول جیسی بیٹی دن بہ دن کمزور ہوتی

جاری تھی۔ مگر بے عزتی کا احساس شدید اور وہ اسی احساس کو دل میں جگہ دے کر بیٹھی تھیں۔ حامد کو بے عزت کر کے کھر سے نکالا۔ اسے بھی کہہ دیا کہ وہ آج کے بعد حامد کو نہ سوچے۔ اس نے ان کی بات مان لی۔ اس کے علاوہ اس کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔

کچھ ہی ماہ بعد حامد کی شادی کا اٹھا شور۔ دونوں گھرانوں میں موت بنا تھا۔ کسی خوشی میں غمی شرکت یا دعوت کا سوال ہی ناپید۔ خاندان کے لوگوں نے آکر صلہ صفائی کی کوشش کی، لیکن بے سود۔ حامد ابا سے ملنے آیا۔ دوبارہ معافی مانگی۔ انہیں زبردستی اپنے ساتھ نکاح میں لے کر گیا۔ فاطمہ بی بی نے خوب شور مچایا، مگر وہ نتیجے کے ساتھ چلے گئے۔ اتنے مہینوں میں وہ اس حقیقت کو قبول کر چکی تھی اور یہ بات بھی سمجھ گئی کہ عزت سے بڑھ کر کچھ نہیں ہوتا۔ ان دونوں کی شادی ہو بھی جاتی تو یہ محبت اور لگاؤ چند ماہ کا ہی مہمان ہوتا۔ تانی اپنا اصل رنگ دکھائیں، وہ حامد سے شکایتیں کرتی، روتی، دھوتی گھر آتی۔ ایک فساد، ایک ہنگامہ ہی بنا رہتا۔ اس لیے جو ہوتا ہے اچھے کے لیے اچھا ہوتا ہے۔ یہ سوچ کر اس نے اپنی آنکھ سے ایک آنسو بھی ضائع نہ کیا اور بالکل نارمل رہنے لگی۔ مومنہ کو پرسکون دیکھ کر فاطمہ کے بے چین دل کو بھی قرار آیا۔ ماں تھیں وہ اس کی۔ دل کے حال سے باخبر مگر مجبور اور بے بس۔

ابھی اس نے پونی ورشی میں داخلہ لیا ہی تھا کہ خاندان سے باہر رشتے آنا شروع ہو گئے۔ وہ ہڑوا لگی۔ متعلق ٹوٹنے کے بعد اس نے اگر حامد کو نہیں سوچا تھا تو کسی اور کو دل میں جگہ دینے کا خیال بھی اسے نہیں آیا۔ یہ سب اس کے لیے ان لحاظ ناقابل قبول تھا، مگر فاطمہ کو جلدی تھی۔ حامد کی شادی کو ڈیڑھ سال ہو چکا تھا اور ان کی بیٹی اب تک کسی سے منسوب بھی نہیں ہوئی تھی۔ فاطمہ کو لگتا کہ ان کی جھٹائی کے دل میں لادو پھونٹے ہوں گے مگر ان کے ٹھکرانے کے بعد سے مومنہ اب تک ان چاہی ہے۔ فاطمہ چاہ کر بھی اس سوچ سے خود کو آزاد نہ کر سکتی تھیں۔ ساری عمر انہوں

میں کوئی دلچسپی نہیں۔ جنہیں آپ کی تکلیف کا احساس نہیں، وہ میری تکلیف اور درد کو کیسے سمجھیں گے؟ ابا ہر بات سمجھتے تھے، ایک دنیا کی سی تھی۔ اس بات سے کیسے منہ پھیر سکتے تھے، لیکن یہ بات بھی سچ تھی کہ وہ اب دوبارہ مومنہ کو رونے کے لیے نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ بیٹی اپنے گھر رونے پر انہیں منظور تھا، مگر لوگوں کے طعنوں اور باتوں کو برداشت کرنے کے لیے ماں، باپ کے گھر بڑی ریس پر قطعاً نا منظور۔ سو انہوں نے فیصلہ لیا، مگر مومنہ بھی اڑ گئی۔ فاطمہ بھی حاکم صاحب کی ہم نوا تھیں۔ مستقیم کے گھروالوں کی جانب سے دباؤ شدید تھا۔ شادی سر پر تھی۔ ان کے ہاتھ بالکل خالی۔ وہ لوگ سادگی سے شادی کے بھی حق میں نہیں تھے۔ عجیب ذہنیت کے لوگ تھے۔ شادی سادگی سے کروائی تو ناک کٹ جائے گی۔ بہو خالی ہاتھ آئے گی تو انہیں سو سوتے ملیں گے۔ دنیا کیا کتنی کیا نہیں، اس کی پروا تھی۔ اس بات کا کوئی احساس نہیں تھا کہ اس بوڑھے باپ پر کیا گزر رہی ہوگی جو اس حادثے کے بعد سے یہ مشکل اپنے پیروں پر چلتا ہے اور جوان بیٹی اس کے گھر پر موجود ہے۔ اس لفیل کے دل کی کیا حالت ہوگی جس کی کمائی سے اس گھر کی ہر ضرورت پوری ہوتی تھی۔ وہ دو عورتیں جس کی ذمہ داری ہیں، وہ شرمندگی سے اس کی جانب دیکھنے سے بھی گریز رہاں ہیں۔ اپنی ضروریات کا ذکر کرنے سے خوف زدہ، جو باتیں سمجھنے کی تھیں، ان کی طرف کسی کی توجہ نہیں تھی، سوائے مومنہ کے۔ اس نے ایک کوشش کی۔ اپنے ہونے والے، ہم سفر سے بات کی کوشش۔ کیا وہ اس کی بات مانے گا؟ کچھ سمجھے گا؟

کانتے ہاتھوں سے اسے کال ملا کر لرزتے ہونٹوں سے اپنی بات اس کے سامنے رکھی۔ اسے بتا دیا کہ اس کے والدین اپنے سر کی چھت بچ کر اسے مستقیم نامی مراد شوہر کی صورت دے گے۔ اپنے طور اس کا مستقبل محفوظ کر دے گے، مگر اسے یہ سودا منظور نہیں۔ وہ سادگی سے اس کی زندگی میں شامل ہونا چاہتی ہے۔ اگر اس کے گھر والے چاہتے ہیں کہ شادی ان کی مشا

آپ اپنا سب کچھ بچ کر مجھے ایک ایسے لوگوں کے ہالے کرنا چاہتے ہیں جنہوں نے آپ کی تکلیف اور زہری کو محسوس نہیں کیا۔ انہیں صرف اس بات پر غرض ہے کہ ہو مگر آجائے اس چکر میں ہو کے باپ چاہیں سب کچھ بچ دیں، انہیں ان مسئلوں

میں کوئی دلچسپی نہیں۔ جنہیں آپ کی تکلیف کا احساس نہیں، وہ میری تکلیف اور درد کو کیسے سمجھیں گے؟ ابا ہر بات سمجھتے تھے، ایک دنیا کی سی تھی۔ اس بات سے کیسے منہ پھیر سکتے تھے، لیکن یہ بات بھی سچ تھی کہ وہ اب دوبارہ مومنہ کو رونے کے لیے نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ بیٹی اپنے گھر رونے پر انہیں منظور تھا، مگر لوگوں کے طعنوں اور باتوں کو برداشت کرنے کے لیے ماں، باپ کے گھر بڑی ریس پر قطعاً نا منظور۔ سو انہوں نے فیصلہ لیا، مگر مومنہ بھی اڑ گئی۔ فاطمہ بھی حاکم صاحب کی ہم نوا تھیں۔ مستقیم کے گھروالوں کی جانب سے دباؤ شدید تھا۔ شادی سر پر تھی۔ ان کے ہاتھ بالکل خالی۔ وہ لوگ سادگی سے شادی کے بھی حق میں نہیں تھے۔ عجیب ذہنیت کے لوگ تھے۔ شادی سادگی سے کروائی تو ناک کٹ جائے گی۔ بہو خالی ہاتھ آئے گی تو انہیں سو سوتے ملیں گے۔ دنیا کیا کتنی کیا نہیں، اس کی پروا تھی۔ اس بات کا کوئی احساس نہیں تھا کہ اس بوڑھے باپ پر کیا گزر رہی ہوگی جو اس حادثے کے بعد سے یہ مشکل اپنے پیروں پر چلتا ہے اور جوان بیٹی اس کے گھر پر موجود ہے۔ اس لفیل کے دل کی کیا حالت ہوگی جس کی کمائی سے اس گھر کی ہر ضرورت پوری ہوتی تھی۔ وہ دو عورتیں جس کی ذمہ داری ہیں، وہ شرمندگی سے اس کی جانب دیکھنے سے بھی گریز رہاں ہیں۔ اپنی ضروریات کا ذکر کرنے سے خوف زدہ، جو باتیں سمجھنے کی تھیں، ان کی طرف کسی کی توجہ نہیں تھی، سوائے مومنہ کے۔ اس نے ایک کوشش کی۔ اپنے ہونے والے، ہم سفر سے بات کی کوشش۔ کیا وہ اس کی بات مانے گا؟ کچھ سمجھے گا؟

کے مطابق ہوتا تو انہیں پھر تاریخ مومنہ کے گھر والوں کی مرضی سے رکھنا پڑے گی۔ اس کال کے بعد اگلی صبح مستقیم کی ماں نے فاطمہ کو بلایا اور واپسی میں انکار کھینچا دیا۔ ان کے ہونہار بیٹے کے لیے لڑکیوں کی کمی نہیں تھی۔ وہ ایک فلاش بھوکا کیا کرتیں۔ انہوں نے شادی توڑ دی۔

وہاں تو فاطمہ ضبط کرتی رہیں، مگر شوہر کے سامنے ایسے رویے جیسے کوئی مر گیا ہو۔ وہ بھی ٹھیک نہیں۔ دکھ اسے بھی بے تحاش تھا، مگر وہ کرتی بھی کیا۔ رونے سے بھلا کیا حاصل ہوتا؟ ان کا علاج اب بھی چل رہا تھا۔ سالوں کی بچت تیزی سے خرچ ہو رہی تھی۔ وہ سوچتی رہتی کہ کیا کرے۔ ابھی اس کا گریجویشن بھی مکمل نہیں ہوا تھا۔ پونی ورثی میں بھی اس کا ذہن الجھا رہا تھا۔ اس کی شادی ٹوٹنے کے بعد سے انہیں دل کا عارضہ بھی لاحق ہو گیا تھا۔ فاطمہ بھی بیمار رہیں۔ گھر کے حالات خراب سے بدتر ہونے لگے۔ کوئی مہمان گھر آتا تو ان کے پاس اس کی خاطر تواضع کے لیے رقم نہ ہوتی۔ ان کے سامنے روکھی سوچی چائے رکھتے وقت اس کا دل خون کے آنسو روتا۔ حاکم صاحب اس بیمار اور ناتواں وجود کے ساتھ بھی نوکری ڈھونڈتے، مگر ناکام ہو جاتے۔ ادھار چڑھنے لگا۔ ماں کے سارے بال سفید ہو گئے۔ حامد خود بال بچوں والا ہو چکا تھا، مگر اس سے جتنا بن بڑا وہ کرنا مگر سب سے چھپ کر۔ مومنہ کا سر مزید جھک جاتا۔ وہ تعلیم مکمل ہونے کے انتظار میں تھی۔ ہاں اتنا ضرور تھا کہ یوشن سے ملنے والی رقم پہلے وہ فضول کاموں میں خرچ کر دیتی تھی، مگر اب انہی پیسوں سے اپنی یونی کے اخراجات نکالتی۔

مومنہ سلائی کڑھائی میں بے حد ماہر تھی۔ اپنی شادی کے لیے اس نے ایک سے ایک جوڑے تیار کیے تھے۔ اپنے ہاتھوں سے ایک ایک سوٹ بنایا تھا۔ یونی میں ہونے والے فنکشن کے لیے اسے کپڑوں کی ضرورت پیش آئی تو اس نے انہی میں سے ایک جوڑا نکال کر پہن لیا۔ سفید رنگ کی قمیص پر ست رنگ

دھاگے اور سوئی سے کیا گیا باریک اور نازک کام بے حد خوب صورت لگ رہا تھا۔ اس کی کلاس کی تمام لڑکیوں نے اندریوں کی طرح پوچھنا شروع کر دیا۔

”یہ کہاں سے ہوئی؟“
”واؤ، بہت حسین ہے یہ تو۔“
”کتنی کی ہے؟ مجھے بھی ایسی ہی چاہیے۔ اس کی قیمت کیا ہے؟“

”تین ہزار۔“ اس نے جھجکتے ہوئے اندازہ لگا کر بتائی۔
”واٹ؟“ اسے یہ واٹ سن کر لگا جیسے قیمت زیادہ بتا دی ہو۔

”انتا سستا؟ کون پاگل ہے ایسا؟ مجھے بھی ذرا بتاؤ۔“

شینا چلائی۔ وہ گھبرا گئی۔
”کچھ دن پہلے میں نے ایک ڈریس لیا، صرف گلے پر ہاتھ کا کام کیا ہو تھا۔ سات ہزار میں پڑی تھی۔ پلیز یار مجھے بھی بنا کر دو۔ انتا سستا اور اتنا اچھا کام۔“

”ہمارے جاننے والے ہیں ان کی بیٹی سے کروایا تھا یہ کام۔“ وہ جھجک کر جھوٹ بول گئی۔

”مجھے بھی کروا دو۔ اور اگر ہو سکے تو مزید سیچلرز کی تصاویر بھی بھجوا دینا۔ ہو سکتا ہے میرے گھر میں بھی کوئی بنوانا چاہیے۔“ گھر آکر وہ ان باتوں کو سوچتی رہی۔ اس کے دل غ نے کام کرنا شروع کیا۔

اگر میں ایسا کرتی ہوں تو اس میں کیا برائی ہے؟ محنت سے گھر بیٹھ کر کماؤ۔ جب تعلیم مکمل ہو گئی، تب جب ڈھونڈ لوں گی۔ کسی کو بتانے کی ضرورت ہی نہیں کہ یہ کام میرا ہے۔ اب دوستوں سے پیسے لیتی اچھی تو نہیں لگوں گی شرمندگی الگ۔ اس نے سوچا اور عمل کرنا شروع کر دیا۔ پہلے ہفتے ہی اس پانچ جوڑوں کا کام ملا، جسے اس نے کئی ہی گھنٹے بیٹھ کر مکمل کیا۔ اس کی نازک انگلیوں میں سویلیاں چھنے سے نشان پڑ گئے تھے۔ ہاتھ تھک جاتے، مگر وہ لگی رہی۔ فاطمہ کو اس کا یونی سے آنے کے بعد کا سارا وقت کمرے میں گزارنا عجیب محسوس نہ ہوا، کیونکہ وہ ویسے بھی کتابی کیزا تھی اور اس قصے کے بعد سے زیادہ ہی خاموش طبع ہو گئی تھی۔

لڑکیوں کو کپڑے دے کر جب ہزار ہزار کے کئی نوٹ اس کے ہاتھوں میں آئے تو وہ آبدیدہ ہو گئی۔ یہ چند ہزار کمانے میں ہی اس کی آنکھوں کے نیچے حلقے پڑ گئے تھے اور انگلیوں کی پوریں دیکھ کر لگتا تھا جیسے جتنے ننھے سوراخ ہو گئے ہوں۔

اور اس کا باپ اس گھر کا سربراہ دن رات ایک کر کے اس کی ہر خواہش پوری کرتا رہا۔ وہ آج بھی اس تھکن کا اندازہ کرنے سے قاصر تھی۔ گھر پہنچ کر اس نے وہ سارے پیسے ابو کے ہاتھ میں رکھے۔ وہ دکھی ہو گئے۔ اس کے ہاتھ چوم لیے۔ جذبات کو قابو رکھ کر اس نے اعلان کیا کہ وہ اب گھر میں سلائی کڑھائی سینٹر کھولے گی۔ روزانہ دو گھنٹے وہ اس سینٹر کو دے گی۔ امتحان میں بس دو ماہ رہتے تھے اور وہ ان کاموں میں ابھی تھی۔ اپنے اسے سختی سے منع کیا، مگر اب وہ عزم کر چکی تھی کہ اسے یوں ہاتھ پر ہاتھ دھر کر نہیں بیٹھنا۔ اس کی ذرا سی محنت سے اگر گھر کے حالات میں بہتری آتی ہے تو وہ محنت سے جی نہیں چرائے گی۔

فاطمہ نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ کچھ ہی عرصے میں ان کا کام پھیل گیا۔ مگر اس محنت کا لفظوں میں ذکر کرنا بے حد مشکل ہے جو انہوں نے کی۔ دن رات کی محنت نے سب بدل دیا تھا۔ مگر زرا کل اسے یاد آتا تو وہ حیران ہوتی۔ اس کے پاس صحت مند ہاتھ پاؤں تھے، دل غ تھا، مگر پھر بھی وہ کسی مجبزی کے انتظار میں تھی۔ محنت معجزہ ہی تو ہے۔ اسی سے زندگی میں تبدیلی آتی ہے۔ اس نے یہ بات جلدی سمجھ لی۔

گریجویشن ہوتے ہی اس نے فیشن ڈیزائننگ کے کورس میں ایڈمیشن لے لیا۔ تاکہ وہ اسی کام کو بڑے پیمانے پر شروع کر سکے۔ لہذا کو اس نے دکان کھلوادی تاکہ وہ بھی مصروف رہیں۔ اتنے علاج کے باوجود وہ اب بھی وہ ٹھیک طرح سے نہیں چل سکتے تھے۔ مگر وہ رٹھا کہ وہ جو خود کو ناکارہ سمجھ کر دیا وہ کاشکار رہنے لگا۔ اس مصروفیت کے بعد ان کے چہرے پر بھی مسکراہٹ ہوتی۔ اس ذرا سی عقل مندی کے باعث ان میں کچھ گیارہ زکس خوب طریقے

سے اس تک پہنچ رہا تھا۔ خدا نے نہ جانے کتنے اور لوگوں کے لیے اسے وسیلہ بنایا۔ بہت سی لڑکیاں اس کے پاس کام کرتی تھیں جنہیں وہ اچھا معاوضہ دیتی اور ساتھ ہی ساتھ تعلیم بھرے جاری کرنے میں مدد بھی کرواتا۔ ایک روز پونی شام کو وہ فرصت سے بیٹھی چائے کا کپ تھا۔ سوچوں میں گم تھی اور وہ سوچ رہی تھی کہ زندگی میں ہونے والا ہر حادثہ منفی کیفیات کے ساتھ ساتھ مثبت مواقعوں کی خوشبو بھی ساتھ لاتا ہے، مگر ہم اس پر غور نہیں کرتے۔ اگر اس کے لہا کا ایک سیٹلٹ نہ ہوتا، اس کی شادی نہ ٹوٹتی تو کیا وہ ان دو کاموں کو جانتی۔ بس اپنے کپڑے کا ڈھ لیے، کسی دوست کی فرمائش پر اسے بھی کچھ کی بن کر دے دیا۔ بات ختم، مگر اب نہ صرف یہ کام کاروباری شکل اختیار کر گیا تھا، بلکہ بہت سی لڑکیوں کو روزگار بھی میسر تھا۔ وہ مطمئن تھی۔ بہت خوش بھی۔

ان چار سالوں میں وہ بہت آگے بڑھ گئی تھی۔ مگر شادی کے نام سے اب بھی خوف زدہ تھی۔ تیسری بار کسی تجربے کی ہمت وہ خود میں نہیں پاتی تھی، مگر ارمان کی محبت اور اس کی ثابت قدمی نے مومنہ کا دل اس کی جانب موڑ ہی دیا۔ پیسہ ہونے کے باوجود اس نے شادی سادگی سے کرنے کی شرط رکھی، جسے اس نے فوراً مان لیا۔ سب کچھ اس کی سوچ سے بڑھ کر اچھا ہونے لگا تھا۔ صرف ایک تعمیری سوچ انسان کی زندگی سنوار کر رکھ دیتی ہے، ذرا سی محنت اور خدا پر بھروسہ آپ کو آسمان کی سیر کروا سکتا ہے۔ وہ سر اٹھا کر چلتی تھی۔ اس کا ہاتھ لینے والا انہیں اب دینے والا تھا۔ اور وہ اس کریم ذات کا جتنا بھی شکر ادا کر لی اتنا کم تھا۔

ارمان کے ساتھ ہنی مون پر جاتے ہوئے اس کے دل سے صرف شکر کے کلمے ادا ہو رہے تھے۔

☆ ☆

حاجہ سی

رنگ کسی پرانا بھی بچ سکتا ہے اسے اندازہ نہیں تھا۔
اس کا منگول چہرہ، اور اس پر سنہری رواں تازہ مٹی
کی طرح چمک رہا تھا۔

اس کے حسن سے زیادہ حیران کن بات یہ تھی
کہ اس کے لیے یہ تھی کہ اس کا ہاتھ اس کی طرف
بڑھا ہوا تھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ”وہ“ اسے بلا
رہا ہے۔ اس نے ایک لمحے کی دیر نہیں کی تھی اور اس
کی طرف بڑھی تھی۔ وہ اس کا ہاتھ تھام لینے کو بے
قرار تھی۔ اس نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا اور وقت جیسے
وہیں رک گیا۔ وہ بھی گوشت پوست سے پتھر میں
ڈھلی تھی۔

☆☆☆

اس پتھر کو ریمی نے واپس موم کیا تھا۔

”اوہ ہڈ حرام اٹھ جا۔۔۔“ اس نے اس کا کبیل
کھینچا تھا۔ لیکن ہڈ حرام، کھایا پیاسا حرام کیے پڑی
تھی۔ ریمی کو نیو یارک کی سخت سردی کے باوجود
ٹھنڈے پانی کا استعمال کرنا پڑا تھا۔ آدھے گلاس کا
چھپکا اس کے چہرے پر پڑا تھا اور وہ ایسے کانپ کر
اٹھی تھی جیسے سونامی سے تیرا آڑا ہو کر آئی ہو۔
”ریمی۔۔۔“ وہ چلائی تھی۔ ”یہ کیا بے ہودگی
ہے؟ زبان کو حرکت دیتے ہوئے جرم مانہ آتا ہے
کیا۔۔۔؟“

”زبان کو حرکت دینے سے جرم مانہ آتا تو
تمہاری طرف میرے کرٹوں بن چکے ہوتے۔۔۔“
ریمی نے کھڑکی کے پردے پیچھے کرتے ہوئے کمال

سیاہ زیتون جیسی رات کو کتروں والی کالی
شال نے اپنی اوڑھنی میں چھپا رکھا تھا۔ اس طرح
سے کہ اس کی سیاہ کتروں کی لکیروں کے نیچے ایک
روشن چاند کا عکس جھلکاتا ہوا نظر آ رہا تھا۔
حسن اگر مکمل حالت میں ہوتا تو اس سے بڑھ
کر ہرگز نہیں ہو سکتا تھا۔ سیاہ شوز، سیاہ ہینٹ، سیاہ
شرٹ، سیاہ ویسٹ کوٹ پر گولڈن ٹائی میں اس کا
سراپا دو دھیا رنگوں کی وہ آبشار تھا جو اندھیرے غار
میں سے نکلتی ہے اور سب کو منور کر دیتی ہے۔ سیاہ



بے نیازی سے کہا۔ ”وہ اوپر دیکھو..... اپنے ہی ہاتھ کا لکھا ہوا نوٹ.....“

برہانے اوپر دیکھا۔ جہاں اس کا ہی سائن کیا ہوا ایک پرچا لٹک رہا تھا۔ جس کی پہلی لائن میں تو لکھا تھا کہ ”مجھے زندگی کا ایک بھی لمحہ ضائع نہیں کرنا ہے۔“ دوسری لائن میں لکھا تھا کہ ”مجھے ہر صورت دنیا کا مقابلہ کرنا ہے۔“ اور تیسری میں لکھا تھا کہ ”اگر وہ تین بار کے اٹھانے پر نہ اٹھے تو اسے ایک گلاس پانی سے چکایا جائے.....“

”دیکھو میں تمہاری کتنی اچھی دوست ہوں۔ اوپر کے دو اصولوں پر تم بے شک عمل نہیں کر رہیں لیکن جولاں میرے لیے لکھی گئی ہے۔ میں اس پر کس طرح عمل پیرا ہوں اور تم مجھ پر غصہ ہو رہی ہو۔“ ریگی نے مسکراہٹ دیتے ہوئے کہا تھا۔

غصہ جھاڑتی وہ آگئی تھی اور واش روم میں چلی گئی تھی یہ کہتے ہوئے کہ..... ”کافی تیار کر دو۔“ تھوڑی دیر بعد وہ واش روم سے منہ دھو کر باہر نکلی تو ریگی نے اس کے ہاتھ میں کافی کاگ لٹکایا تھا۔ بے خیالی میں اور عادتاً اس نے دوسرا ہاتھ بھی بڑھا دیا۔ سینڈویچ وغیرہ یا کچھ بھی ساتھ کھانے کے لیے لےنے کے لیے..... لیکن ریگی کے دوسرے ہاتھ میں کچھ نہیں تھا۔

”بس کافی.....؟“ وہ مر جانے کے قریب تھی۔ رات بھی اس نے کم کھانا کھایا تھا اور اب پھر صرف کافی.....؟ نیو یارک کیا واقعی اتنا بے رحم تھا کہ اپنے مہمانوں کو بھوکا مار دینا چاہتا تھا۔

”سب ختم ہو چکا ہے۔“ ریگی نے کندھے اچکا کر کہا اور پھر جلدی سے رخ موڑ لیا۔ اس کے ہر وقت کے مسکراتے چہرے پر جب جب اداسی آ جاتی تھی تو وہ اسی طرح سب سے چھپ جانا چاہتی تھی۔ دو سال سے وہ چھپی ہی ہوئی تھی۔

”میں جلد ہی نوکری ڈھونڈ لوں گی۔“ اس نے روز بولے جانا والا فقرہ آج پھر بولا۔

”ہاں ڈھونڈ لو..... ورنہ موت ہمیں ڈھونڈ لے

گی۔“ ریگی میں بھی بہتے ہوئے بولی۔

تیار ہو کر وہ فلیٹ سے نکلنے لگی تو اس نے بس اتنا ہی کہا تھا۔ ”میں ایک جگہ انٹرویو کے لیے جا رہی ہوں۔“ لیکن ریگی جانتی تھی کہ گیارہ بجے کوئی انٹرویو نہیں ہوتا اور جتنی برہا کی قابلیت تھی اتنی قابلیت والوں کو جواب دینے کے لیے انٹرویو کے لیے نہیں بلایا جاتا بلکہ سیدھا کام پر لگادیا جاتا ہے۔

معلوم برہا کو بھی تھا لیکن وہ اپنے دل کو پھر یہ بہانہ دے کر کہ کام ڈھونڈنے کی شروعات کل سے کروں گی آج پھر ادھر ادھر گھوم کر وقت ضائع کرنے کے موڈ میں تھی۔ پہلے تو وہ بھگم بھگم کیتھی کے پاس پہنچی تھی۔

کیتھی برہا کی دوست تھی۔ اپنے فلیٹ میں اکیلی رہتی تھی اور جادوؤں کے کام کرتی تھی۔ آتا واتا اسے کچھ نہیں تھا لیکن وہ اس بات پر ایمان رکھتی تھی کہ ”جب سر پر پڑتی ہے تو سب آتی جاتا ہے۔“ سر کا تو پتا نہیں لیکن اس کے پیٹ پر غربت کی ایسی لانت پڑی تھی کہ اس نے تھوڑے بہت کے سیکھے ہوئے جادو کو ہی کام میں لانے کا سوچ لیا تھا۔

جس وقت برہا کیتھی کے فلیٹ میں پہنچی۔ کیتھی حسب معمول کمرے میں اندھیرا کیے اپنی دکان چکائے بیٹھی تھی۔ برہا کے پاس دوسری چابی تھی۔ اس لیے وہ خود ہی کمرے میں داخل ہوئی تھی اور اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہی کیتھی نے زخمی شیرنی کی سی آواز نکالی تھی۔ ”شش.....“ یہ آواز مہینوں کی ریاضت سی اب اتنی بھیاک ہو چکی تھی کہ اگر کسی ویرانی میں جا کر کبھی نکالی جاتی تو وہاں کے بھی سب کہتے، بلے، چوہے، کیڑے مکوڑے ہجرت کر جاتے.....

”شش.....“ اس جلالی انداز پر وہ سمجھ گئی تھی کہ اسے نہ تو روشنی کرنی ہے اور نہ ہی کچھ بولنا ہے۔ سر جھٹک کر وہ ایک طرف بیٹھ گئی۔

کیتھی کمرے میں میوم تیلوں کا دائرہ بنائے خود اس دائرے کے اندر بیٹھی تھی۔ چار پانچ لڑکیاں اس

دائرے کے باہر تھیں۔ کیتھی نے بدھا کی طرح آلتی پالتی ماری تھی اور کمر سیدھی کیے دونوں ہاتھوں کو گھٹنوں پر رکھے وہ فرش پر بیٹھی، گیان کی بڑی ”اوپنجی“ منزلوں پر، ان چڑھ رہی تھی۔ برہا بیگ سے فاکر نکال کر ٹیل فائل کرنے لگی۔

”آگئی..... آگئی..... مہاشکتی آگئی۔“ کیتھی چلائی تھی۔ پانچوں لڑکیاں ہم کراہ کر ایک دوسرے پر گری تھیں۔ وہ بڑی تسلی سے ٹیل فائل کرتی رہی تھی۔ جو سب ہو رہا تھا اسے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا نہ ہی اسے اس ڈرامے سے ذرا برابر خوف محسوس ہوتا تھا۔

”ڈرو نہیں..... بولو..... پوچھو..... جو پوچھنا ہے۔“ کیتھی نے جلدی بولنے کا اشارہ کیا تھا کیونکہ روح سے ملاقات کرنے کی اداکاری کرنے کا ڈرامہ اسے تھوڑی دیر میں ہی تھکا دیتا تھا۔

”میرے ماں باپ میرے شادی کے لیے رو بہن سے نہیں مان رہے۔ میں جانا چاہتی ہوں کہ کیا وہ مان جائیں گے۔ مان جائیں گے تو کیسے اور کب تک.....؟“ لڑکی کو کچھ زیادہ ہی آگ لگی ہوئی تھی۔

کیتھی فیض میں دیکھتی ہوئی خیالوں میں ایسے باتیں کرنے لگی تھی جیسے کسی روح سے بات کر رہی ہو۔

”جی..... جی..... جی.....“ اور پھر اس کے بعد اس نے ایک کاغذ پر کچھ لکھ دیا۔ برہا جانتی تھی کہ اس کاغذ پر کیا لکھا گیا ہے۔

دوسری لڑکی کا مسئلہ تھا کہ اس کا منگیترا سے نظر انداز کر رہا تھا وہ جاننے آئی تھی کہ اب وہ پہلے جتنی خوب صورت نہیں رہی یا منگیترا کی حرافہ کے چنگل میں ہے۔ اگر ایسا ہے تو وہ کیا کرے؟

کیتھی نے سب کے مسئلوں کے حل کاغذ پر لکھ دیے تھے۔ پھر روح کو بڑی ”عزت و احترام“ کے بعد واپس بھیج دیا تھا اور موم بتیاں بجھا دی تھیں۔ برہا نے اٹھ کر لائینس آن کر دیں۔ پانچوں لڑکیاں مسئلے حل ہو جانے پر ہنسی خوشی کمرے سے باہر نکل گئی۔

برہا نے ایک گہرا سانس لیا تھا۔

”کھلتی نہیں ہو لوگوں کو بے وقوف بناتے

ہوئے.....“ اس نے بدھا کے آسن سے اترتی کیتھی سے کہا تھا۔

”میں تو بس اپنی جاب کو ایمان داری سے نبھا رہی ہوں۔“ وہ فخر سے بولی تھی۔

”منہ دھولو مجھے تم سے کوئی ضروری بات کرنی ہے اور ڈر بھی لگ رہا ہے۔“ اس نے کہا تھا۔ کیتھی نے سیاہ چہرے کی سفید آنکھوں کے ڈیلے گھا کر اس کی طرف جلال سے دیکھا تھا۔ برہا نے اسے ہاتھ روم کی طرف دھکا دے دیا تھا۔

کیتھی نسلی ایشیا کی تھی۔ انڈیا کے ضلع آسام کی..... افریقی نہیں تھی۔ لیکن منہ پر سیاہ بوٹ پالش لگا کر بڑے آرام سے افریقی لگنے لگتی تھی۔ کیونکہ افریقہ کا جادو امریکا میں بہت مشہور ہے۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اسے اپنے فن میں ”کامیاب“ ہوتا ہے تو افریقہ جانا پڑے گا یا یہاں رہ کر ہی افریقی بننا پڑے گا۔ پہلا مسئلہ پیچیدہ تھا۔ دوسرا بوٹ پالش نے آسانی سے حل کر دیا تھا۔ اوپر سے قسمت سے اس کے دانت بھی سفید تھے۔

چنے سفید..... جن کی بدولت وہ افریقی کم اور بلیک فورسٹ بلیک زیادہ لگتی تھی۔ کہیں جادو کے بارے میں اس نے دو چار کہنا نہیں پڑھ رکھی تھی۔ تھوڑے بہت کرب بھی کر لیتی تھی۔ جس لیے لڑکیاں متاثر ہو جاتی تھیں اور اس کے پاس چلی آتی تھیں۔ کیونکہ کیتھی سب کا کام مفت میں کرتی تھی۔ کیتھی اپنے لیے کچھ نہیں مانگتی تھی۔ وہ تو روحوں کے پیغام ہوتے تھے جن کو وہ کاغذ پر لکھ دیتی تھی۔

”ایک فکرا کوٹ رات کو بارہ بجے فلاح پارک کی فلاح بیچ کے نیچے رکھ دینا۔“

”فلاح جگہ کوچی کے شوز رکھ دینا.....“

”فلاح جگہ.....“ لے اور مل کے میک اپ کا سامان..... اور یہ بتانے کی تو ضرورت نہیں کہ کیتھی ان جگہوں پر وقت مقرر سے پہلے موجود ہوتی تھی اور جوں ہی زمانے بھر کی ستائی لڑکیاں اپنی اپنی خواہشات کی وجہ سے وہاں کچھ چھوڑتی تھیں تو کیتھی انہیں اٹھا لیتی تھی۔ اس پر اس کا حق تھا۔ زندہ ہو کر بھی

بیوٹی پکس کا تیار کردہ

سوہنی ہیر آئل

SOHNI HAIR OIL

- کرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے
- نئے بال آگاتا ہے
- بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے
- مردوں، عورتوں اور بچوں کے لئے
- یکساں مفید
- ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے



قیمت = 150/- روپے

سوہنی ہیر آئل 12 جلی لیٹروں کا مرکب ہے اور اس کی تیاری کے مراحل بہت مشکل ہیں لہذا یہ خودی مقدار میں تیار ہوتا ہے۔ یہ بازار میں یا کسی دوسرے شہر میں دستیاب نہیں کر سکتے ہیں۔ ایک بوتل کی قیمت صرف 150/- روپے ہے، دوسرے شہروں میں آڈر بھیج کر رجسٹرڈ پارسل سے منگوائیں، رجسٹرڈ ڈالنے والے ختمی آڈر اس حساب سے بھیجیں۔

- 2 بوتلوں کے لئے 350/- روپے
- 3 بوتلوں کے لئے 500/- روپے
- 6 بوتلوں کے لئے 1000/- روپے

نوٹ: اس میں ڈاک خرچ اور بیکنگ چارجز شامل ہیں۔

منی آڈر بھیجنے کے لئے ہمارا پتہ:

بیوٹی پکس، 53- اورنگز ب مارکیٹ، سیکٹر 4، قذافی روڈ، جٹاں روڈ، کراچی
دستی خریدنے والے حضرات سوہنی ہیئر آئل ان جگہوں سے حاصل کریں
بیوٹی پکس، 53- اورنگز ب مارکیٹ، سیکٹر 4، قذافی روڈ، جٹاں روڈ، کراچی
مکتبہ محمد عمران ڈاٹ نیچسٹ، 37- اردو بازار، کراچی
فون نمبر: 32735021

”میں آج تمہارے ساتھ شو پر نہیں جاسکتا کیتی! مجھے ایک ضروری کام آگیا ہے۔“ جیڈ بھی فوراً اصل مد سے پراگیا۔

تم مجھے فون پر بتا سکتے تھے، خیر اب تم نہیں جانتے تو میں بھی نہیں جانتی۔“

”نہیں..... نہیں تم جاؤ کیتی! اتنی مہنگی ٹکٹ لی ہے میں نے۔“ جیڈ نے کہا۔ کیتی نے گھور کر اس کی طرف دیکھا۔ جیڈ گھبرا یا۔ ”میرا مطلب ہے تم نے.....“ جلدی ہی وہ غیرت سے بے غیرتی کی ڈگر پر واپس آگیا۔

”ٹکٹ واپس بھی نہیں ہو سکتی اب.....“ کیتی انفرنگی سے بولی۔

”تم اس کارٹون کو لے جاؤ نہ اسے ساتھ۔“ جیڈ نے صوفے پر بیٹھی برہا کی طرف اشارہ کیا۔

”زبان سنجال کر بات کر دو وری مون! میں صرف کیتی کی وجہ سے تمہارا لحاظ کرتی ہوں۔“

”میں بھی صرف کیتی کی وجہ سے تمہیں برداشت کرتا ہوں، سز دکا.....“

”اور میں قبر کے عذاب سے بچنے کے لیے تم دونوں کا لحاظ کر رہی ہوں۔“ کیتی نے دونوں کو ناموش کر دیا تھا۔

”ٹھیک ہے جیڈ! تم جاؤ۔ میں برہا کے ساتھ چلی جاتی ہوں۔ تمہیں کوئی کام تو نہیں برہا۔“ کیتی نے برہا سے پوچھا تھا اور پوچھتے وقت اس کے

پیرے پر مسکراہٹ دو آئی تھی۔ ”کام“ اور ”برہا“ کا ملحق جڑنے میں ابھی نجانے کتنا وقت درکار تھا۔

نام برہا سے روٹھا ہوا تھا۔ جو اس کے ہاتھ آئی نہیں ہاتھ یا شاید دونوں میں بریک اپ ہو گیا تھا اور اب

لو ان کی حالت نہیں کر دیا تھا۔

”نہیں.....“ وہ اپنی خفت چھپاتے ہوئے بولی۔

”اس کام چور کو کون کام پر رکھے گا۔“ مسئلہ حل نہ ہی جیڈ پر بار بار نظر کرتا چلا گیا تھا۔

”جس نے تمہیں رکھا ہوا ہے۔“ برہا نے پیچھے بیٹھ کر کہا۔ جیڈ کانوں میں انگلیاں دے کر باہر

روک نہ سکی کیتی! میں خود کو روک نہ سکی.....“

”کھڑکی میں کھڑی ہو کر مت چلاؤ..... ورنہ پھر میں پولیس کو بھی نہیں روک سکوں گی۔“ کیتی نے تبصرہ کیا۔

”اس نے میرے طرف ہاتھ بڑھایا اور میں نے بھی اس کا ہاتھ تھام لیا۔ میں کیسے انکار کرتی۔ اتنے دنوں سے تو میں اس کا انتظار کر رہی تھی۔ پھر

آج میں اس کا ہاتھ کیسے نہ تھامتھی۔ اس کا لمس میں ابھی بھی محسوس کر سکتی ہوں کیتی! ابھی بھی.....“ کھڑکی سے پلٹ کر وہ بولنے سے رکی تو اس نے کیتی کو دیکھا

جو پتھر بنی ہوئی تھی۔ آنکھیں اس پر مرکوز تھیں۔

”دوائی کھائی ہے آج تم نے اپنی؟“ کیتی نے پوچھا۔ اس سے بڑھ کر بے عزتی بھلا اور کیا ہو سکتی تھی۔

”میں سچ کہہ رہی ہوں کیتی! میرا یقین کرو۔ وہ خواب نہیں ہے، حقیقت ہے۔ وہ مجھے بلارہا ہے۔“

”تو دفعہ ہو جاؤ نا پھر اس کے پاس.....“ یہ کیتی نے نہیں کہا تھا۔ یہ آواز دروازے کے باہر

سے آئی تھی۔ برہا نے منہ بنایا پھر چپ ہو کر ایک طرف بیٹھ گئی۔ یہ کیتی کا بوائے فرینڈ تھا۔ جیڈ.....

جس نے برہا کی گفتگو سن لی تھی اور اب اندر داخل ہوتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔ ایک جالی اس کے پاس

بھی تھی۔ یہاں چابیوں کے معاملے میں کیتی کیوں اتنی فیاض تھی۔

برہا نے رخ موڑ لیا۔ اسے جیڈ بھی پسند نہیں آیا تھا۔ کیتی کی ہمت تھی کہ اس کے ساتھ چپک چپک بیٹھ جاتی تھی۔ اسے کھانا کھلائی تھی اور اس کے سامنے

ہی..... آج بھی وہ ایسا کرنے کا ارادہ رکھتی تھی تو برہا وہاں سے چل دینے کے موڈ میں تھی۔ لیکن اس کی نوبت

نہیں آئی.....

”میری پیاری کیتی! چابلی میں وہ مسخرے پن کی انتہا پر پہنچا ہوا تھا۔

”بات کیا ہے؟“ چنے سفید ڈیلیوں والی جادو گرنی کیسے نہ ڈانٹی۔

تو وہ روح ہی تھی۔

بے چاری لڑکیاں یہ سمجھ ہی نہ پاتی تھیں کہ کیتی فیس کیوں نہیں لیتی، اور نہ ہی یہ کہ روجوں نے فر کا کوٹ

گوچی کے شوز، نئے اور میل کا میک اپ کیا کرنے ہیں؟ اوپر سے اسے خوب نام آتے تھے۔ مہاشی، مہادیوی،

اندہ کار رانی، پاتال راہبہ..... جو ان کے مطلب تھے تھیں وہ سہم جاتی تھیں، جو نہیں جانتی تھی وہ گھبرا جاتی تھیں۔ کیتی کا خوب کام چل نکلا تھا۔

”کسی ایک روح سے بوٹ پالش بھی منگوا لیا کرو..... روز کی ایک تو لگ ہی جاتی ہوگی۔“ کیتی

باہر نکل کر چہرے پر کریم لگا رہی تھی۔ جب برہا نے تبصرہ کیا تھا۔

”کس کام سے آئی ہو.....“ کیتی نے اپنی بڑی بڑی گینڈے جیسے آنکھیں گھما کر اسے دیکھ

تھا۔ برہا ڈر گئی تھی۔

”زمانہ جو بھی کہے پر مجھے تم پر یقین ہے کیتی..... تم زیادہ نہ سہمی مگر ٹھوڑا بہت جادو تو جانتی ہی ہو..... اور میرا کام بنائیں کے کروگی۔“

”ہاں..... یہ تو ہے..... بولو.....“ وہ ایک ادا سے خود کو خشے میں دیکھتے ہوئے بولی۔ نخر سے کیتی کی گردن میں سریوں کا لینئر بلکہ ایفل ٹاور پڑ گیا

تھا۔

”پہلے وہ صرف مجھے دکھائی دیتا تھا۔ مسکراتا تھا اور غائب ہو جاتا تھا لیکن کل وہ مجھے اپنی طرف بلارہا

تھا۔ اس نے سیاہ لباس پہن رکھا تھا۔ سیاہ پینٹ، سیاہ شرٹ، سیاہ ویسٹ کوٹ، سیاہ شوز، جس میں اس کا

سفید چہرہ ایسے جگمگا رہا تھا جیسے تمہارے سیاہ چہرے پر تمہارے دانت.....“ کیتی پلٹی لیکن تب تک برہا اٹھ کر جھومنے لگی تھی۔ اس طلسم گر کے بارے میں

بتاتے ہوئے اس کی آواز لمحہ بہ لمحہ بلند ہو رہی تھی۔

”وہ چاند کی طرح روشن تھا۔ کوئی اتنا خوب صورت کیسے ہو سکتا ہے کیتی..... کیسے.....؟“ اس نے

کھڑکی کھول کر باہر صدا لگائی۔

”اس نے مجھے اپنی طرف بلایا اور میں خود کو

نکل گیا کہ ”بھوکتی“ رہو اب۔ کیتھی نے براہ کوا پر سے نیچے تک دیکھا۔

”خیر سے ہمیشہ کی طرح آج بھی مانگے کے کپڑوں میں ہو۔ جاؤ اندر سے میرے کپڑے پہن لو۔“ کیتھی نے اجازت دی تو وہ اندر سے گوچی گاچی کے ردحوں کے کپڑے پہنے چلی گئی۔

شام سے پہلے پہلے دونوں رات کے شو کے لیے تیار ہو چکی تھی۔ کیتھی میں بیٹھ کر برہانے پھر خواب کا ذکر چھیڑا تھا۔

”تم خوابوں کے مطلب جانتی ہونا کیتھی! مجھے بتاؤ کیا وہ میری زندگی میں آئے گا۔“

”شو کے بعد بتاتی ہوں۔“ کیتھی نے جان چھڑانے کی غرض سے کہا تھا لیکن شو کے بعد براہ کوا کیتھی سے کچھ بھی پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں رہی تھی۔ سارے جواب اسے خود ہی مل گئے تھے۔

☆☆☆

ہال چھوٹا لیکن عوام سے بھرا ہوا تھا۔ عوام بھی عجیب اخلاقت تھی۔ ایسے جیسے اس شو کے پرستار دوسری دنیا سے آئے ہوں۔ مرنے وغیرہ سے..... کیا شو تھا یہ.....؟ اسے تو اس چیز کا پتا ہی نہیں تھا۔ وہ تو کسی بت کی طرح کیتھی کے ساتھ ساتھ یہاں تک آگئی تھی۔

”کیتھی یہاں پر کیا کوئی میوزک کنسرٹ ہوگا؟ کسی سنگر نے آنا ہے یا تھیٹر لیے ہوگا؟“ اس نے کیتھی سے پوچھا تھا۔ کیتھی مسکرائی تھی۔

”نہیں کیا لگتا ہے کہ مجھے سنگر، میوزک اور تھیٹر لیے میں دلچسپی ہے۔ بے شک تم جادوگر نہیں ہو مگر فیاؤ شناس تو بنو..... سنو..... یہاں ابھی دنیا کا سب سے خوب صورت جادوگر آنے والا ہے اور وہ یہاں آکر اپنے جادو کا جادو چکائے گا۔“

”اوہ.....“ اس نے بے دلی سے کہا۔ وہ کیسے بھول گئی تھی کہ کیتھی کو کیتھی جیسے چیزیں ہی پسند ہوں گی۔ ”اچھا کیا تم نے بتا دیا۔ یعنی شور شرابا نہیں ہوگا۔ اب میں آرام سے سیٹ پر گردن گرا کر سو سکتی

ہوں۔“ کہہ کر وہ ساتھ ہی سونے کی تیاری کرنے لگی۔ چہرے پر ڈالنے کے لیے اس نے بیک سے رومال نکال لیا اور اسی وقت ہال کے پردے اٹھے تھے اور ایک شور بلند ہوا تھا۔ پروٹیم ایچ پر دو لڑکیاں پہلے سے فوج کی مریضہ جی کھڑی تھیں اور درمیان میں ایک ڈرم بڑا ہوا تھا۔ براہ سیٹ پر ٹیک لگائے سونے کے قریب ہی تھی۔ جب وہ ایچ پر آیا تھا۔ بقول کیتھی کے دنیا کا سب سے خوب صورت ترین جادوگر.....

جادوگر یا فسوں خیز، یا ساحر، طلسم گر..... کیا نام دیتی وہ اسے..... جس کی آنکھوں میں آدمی دنیا کی کشش تھی۔ سیاہ پنپٹ، سیاہ شور، سیاہ ویسٹ کوٹ اور گولڈن ٹائی..... میں وہ جھکی ڈیبا میں بند الماس کی طرح جگمگا رہا تھا۔

برہانے جھکنے سے گردن سیدھی کی تھی۔ ”اللہ.....“ اور اس کا دل دھک سے رہ گیا تھا یا دھک دھک کہیں رہ گئی تھی۔ یہ وہی تھا۔ ہاں یہ وہی تھا۔ کیتھی.....؟ اس کا دل کیا کہ وہ چلائے لیکن اس کی آواز بندھ گئی۔ وہ تو آنکھیں جھپکنا ہی بھول گئی تھی۔

جادوگر نے اپنا پہلا سٹیج کیا تھا۔ دلوڑکیوں میں سے ایک کو اس نے ڈرم میں بند کر دیا تھا۔ پھر دوسری والی لڑکی کو ایک کپڑے کے نیچے چھپا دیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد جب کپڑا کھینچا گیا تھا اور ڈرم بھولا گیا تھا تو دونوں لڑکیوں کی پوزیشن تبدیل ہو چکی تھی۔ کپڑے کے نیچے والی ڈرم میں سے نکلی تھی اور ڈرم والی کپڑے کے نیچے سے..... ہال تالیوں سے گونج اٹھا تھا۔ سوائے برہانے سب نے تالیاں بجائی تھیں۔

پھر دوسرا سٹیج کیا گیا تھا۔ جو پہلے والے سے بھی زیادہ جان دار تھا اور پھر تیسرے کی باری آئی۔

”اب ہمیں آپ میں سے ایک لڑکی چاہیے ہوگی۔“ جادوگر پہلی بار بولا تھا اور اس کی آواز سن کر برہانے کو محسوس ہوا تھا کہ اسے تو گلوکار بھی ہونا چاہیے اس کی آواز میں صدیوں کی ریاضت کی علامت

”م تان کی سی..... جوتیز چاندنی میں پارہ پارہ ابا بابت۔“

”کون دے گا میرا ساتھ.....“ جادوگر نے ہال میں موجود تمام لڑکیوں نے شور مچایا تھا۔ سب تیار تھیں۔

”آپ..... آپ..... نہیں آپ.....“ جادوگر اپنی انگلی کودا میں بائیں کرتا ہوا اس پر ٹکا تھا۔ برہانے کی ٹوٹی تھی۔

”آپ..... مس..... پلیز کم ہیئر۔“ وہ ادب سے اپنے پاس بلارہا تھا۔

”میں.....“ وہ بوکھلا گئی تھی۔ کیتھی نے اسے اپنی ماری بھی کہہ دتی مری کی نہ ظاہر ہو، فوراً اٹھ بائیں اور خوشی سے چلائے، لیکن وہ چلا نہیں سکی تھی۔ البتہ کھڑی ہو گئی تھی کیونکہ کیتھی نے اس کے پاؤں پر اپنی ”جی جی چوں چوں“ کی ہیل کی نوک چھوئی تھی۔

”پلیز ایچ پر آجائیں.....“ جادوگر ہاتھ اس کی طرف بڑھائے اسے بلارہا تھا۔ وہ بمشکل ایچ پر پہنچی تھی اور جیسے ہی پہنچی تھی جادوگر نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ (تو کیا خواب کی تعبیر پوری ہوئی؟)

”آپ یہاں پر اپنے سائن کر دیں یا کوئی بھی پیغام لکھ دیں۔“ اس نے ایک سلیٹ برہانے کے آگے کی گئی۔ تھوڑی دیر تو برہانے کو سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ وہ کیا لکھے..... پھر اس نے ایک مشہور کوٹ لکھ دیا تھا۔

”محبت صرف ایک دفعہ کا مار کہ ہے۔“

”اوہ.....“ جادوگر نے ہنسیوں اچکا کر اسے داد دی تھی۔ پھر وہ سامنے بلیک بورڈ کی طرف بڑھا تھا۔ اس پر پردہ ڈالا ہوا تھا۔ وہاں اس نے کوئی منتر پڑھا تھا اور ہاتھوں کو عجیب انداز سے حرکتیں دی تھیں۔

”اب کہ دوسرے جادوگر کرتے ہیں۔ پھر جب پردہ اٹھا گیا تھا تو اس کا کوٹ سامنے بلیک بورڈ پر بھی ہو رہا تھا۔ اس نے لکھا ہوا تھا۔ ”محبت صرف ایک دفعہ کا مار کہ ہے۔“

ہال ایک بار پھر سے تالیوں کا شور مچا تھا۔

”اب آپ بیٹھ سکتی ہیں۔“ اس نے اسے

واپس جانے کا اشارہ کیا تھا اور وہ واپس سیٹ پر جا کر بیٹھ گئی تھی۔ اگرچہ اس کا دل تو نہ کر رہا تھا۔ وہ تو وہیں جادوگر کے پاس ہی کھڑی رہنا چاہتی تھی۔ جادوگر کی تن کی خوشبو کی پٹیں ابھی بھی اس سے لپٹی ہوئی تھیں۔

☆☆☆

”یہ لڑکا وہ ہی ہے کیتھی! یہ لڑکا وہ ہی ہے۔“ ٹیکسی میں واپسی کے لیے بیٹھتے ہی وہ چلائی تھی۔

”اس لڑکے کا نام حمدان ہے اور میں اسی کے پاس جاب کے لیے جانے والی ہوں۔ اس کی ہیلپر کے طور پر.....“

”لیکن وہ تو میرے خواب میں آیا تھا۔ تم کس خوشی میں اس کے پاس جانے لگی ہو۔“

”تم نے میرے کمرے میں اس کا کوئی کارڈ وغیرہ دیکھ لیا ہوگا۔ وہ تصویر تمہارے ذہن میں نقش ہو گئی ہوگی اور اس طرح سے وہ تمہارے خواب میں آ گیا ہوگا۔ اسے صرف پیٹ کی خرابی والا خواب سمجھو میری جان.....“ کیتھی نے اس کے گال چھپھپھائے تھے۔

”لیکن خواب میں اس نے میرا ہاتھ تھام لیا تھا۔ مجھے بتاؤ اس کی کیا تعبیر ہے۔“

”میں نہیں جانتے ہی گئی تھی کہ اس کی تعبیر ہے کہ وہ واقعی میں ایک دن تمہارا ہاتھ تھامے گا۔ دیکھو آج ایسا ہو گیا ہے۔“ مکار کیتھی نے مکاری دکھائی۔

”کیتھی! مجھے اس سے دوبارہ ملنا ہے۔“ وہ ان بچوں کی طرح بولی جن کی سب سے بڑی خواہش بس کھٹی میٹھی گولیاں ہوتی ہیں۔ ”کیتھی پلیز، کچھ کرو ناں.....“

”کیا چاہتی ہو۔“ بے چاری گھر والوں سے کوسوں دور رہتی کیتھی جذباتی نہ ہوتی تو پھر کیا پتھر کی ہو جانی؟ ”اس لڑکے کی ہیلپر بنو گی؟“ کیتھی نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔ ”میرے انٹر ویو کی جگہ تم جاسکتی ہو۔“

”ہاں..... ہاں..... کیوں نہیں.....“ وہ خوشی سے چلائی تھی۔ ”لیکن مجھے جادو تو آتا ہی نہیں۔“

”تمہارے پاس ایک ہفتہ ہے۔ ایک ہفتے میں تم زیادہ نہ سہی لیکن تین کرب تو سیکھ ہی لوگی۔ وہ تین اس کے سامنے پیش کر دینا، آگے کی قسمت اور محنت تمہاری.....“

”میری پیاری کیتھی!“ وہ اس کے گال کو چومو چومو کرنے لگی۔

”جیڈ کی طرح مت کرو۔“

”مجھے جان سے مار دو، لیکن جیڈ سے نہ ملاؤ۔“

اس نے بناوٹ والے غصے سے کہا تھا۔ کیتھی ہنسی تھی۔

☆☆☆

”برہا.....؟“ اس نے اس کا نام پکارا تھا اور برہا کو لگا جیسے اسے خود بھی تو آج ہی پتا چلا ہے کہ اس کا نام برہا ہے اور اس کا نام کس قدر خوب صورت ہے یا اس کے پکارنے سے ہو گیا تھا۔

اس وقت وہ اس کی آفس میں اس کے سامنے بیٹھی تھی۔ ایک ہفتے میں تین کرب سیکھ لینے کے بعد وہ کیتھی کی جگہ خود انٹرویو کے لیے آگئی تھی۔ آفس اگرچہ بہت گھڑی تو نہیں تھا۔ لیکن وہاں ایک بہت ہی قیمتی چیز پڑی ہوئی تھی جس نے اس آفس کو جاندار بنا دیا تھا اور وہ قیمتی چیز خود حمدان ہی تھا۔ آسمان کو فتح کرنے کے بعد خاموشی سے بیٹھا آدمی۔

حمدان کے ہاتھ میں برہا کی فائل تھی۔ جہاں پر سے وہ اس کی ”ماضی کی کوتاہیاں“ مطلب ”کارکردگیاں“ دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنی سیٹ پر نہیں بیٹھا ہوا تھا بلکہ انڈر کیمیز پر آگیا تھا اور اب اس کے بے حد قریب میز کے ایک کونے پر ایک ٹانگ نیچے گرائے اور دوسری پروں ڈالے بیٹھا تھا۔ آج اس نے گرے کوٹ، گرے پیٹس پہن رکھی تھی اور ساتھ سفید شرٹ۔ اس کے سر اپنے سے اتنی تیز ”ڈارک ٹائٹ“ کی خوشبو برہا کو بے چین کر رہی تھی۔ آج وہ ہفتے بھر پہلے کے شو سے بہت مختلف لگ رہا تھا اور..... اور.....

”پہلے بھی کسی جادوگر کے پاس کام کیا ہے؟“

”نہیں حمدان! میرا مطلب ہے نہیں سر.....“ اس نے کہا تھا اور اس کی ”کارکردگیوں“ کی جانچ پڑتال کرتے ہوئے اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔

”تو پھر آپ میری ساتھ کیسے کام کریں گی۔ ایک بالکل ہی انجان انسان کیسے میرے لیے فائدے مند ثابت ہوگا۔ مجھے تو خود ابھی بہت کچھ سیکھنا ہے۔ بہت آگے جانا ہے۔ کیا تجربہ ہے آپ کو..... کیا جانتی ہیں آپ جادو کے بارے میں؟“

”میں جادو کے بارے میں سب کچھ جانتی ہوں سر!“

”مثلاً.....“ اس نے اس کی ”اسناد“ کی فائل پرے کر دی اور کندھے جھٹک کر اس کی طرف دیکھا۔ بخونوں کو بھی اوپر کیا۔

”مثلاً یہ ہے جادو کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ تقریباً تین ہزار سال قبل مسیح اس کے نشانات ملتے ہیں۔ مصریوں، سامریوں، مایا و اسیوں نے جادو کو اپنے اپنے طور پر عروج دیا۔ دنیا کا سب سے بڑا جادو مصر میں فرعون رمیسس کے دربار میں کھیلایا گیا اور.....“

”ایک منٹ.....“ وہ رٹے رٹائے تو تے کی طرح بول رہی تھی جب اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے درمیان میں ہی روکا تھا یا شاید ٹوکا تھا۔

”میں نے تم سے جادو کی تاریخ نہیں پوچھی۔“

”اب“ کے جادو کے بارے میں کیا جانتی ہو تم؟

اس نے اب کے لفظ پر زور دے کر کہا۔

”اب“ کے جادو کے بارے میں بھی میں سب کچھ جانتی ہوں سر!“ جواباً وہ بھی اب پر زور دے کر بولی۔

”اب..... جادو ساری دنیا میں پھیل چکا ہے خاص کر افریقہ اور بنگلہ دیش کا جادو پوری دنیا میں مشہور ہے۔ افریقی لوگ کنکروں کوٹھی میں بند کر کے انہیں ہلاتے ہیں پھر زمین پر پھینک دیتے ہیں اس طریقے سے وہ کسی انسان کا کیا پوری دنیا کا آؤ والا وقت بنا سکتے ہیں۔ بنگلہ دیش کے لوگ جادو

روٹی کے پتلے بناتے ہیں اور ان میں سونیاں باندھتے ہیں۔ ازبکستان اور پاکستان کے لوگ مانتوں پر لکھی تحریریں پڑھنے کے عادی ہیں اور.....“

وہ بولتی جا رہی تھی اور وہ اس کی طرف دیکھتا جا رہا تھا۔ ایک خفیف سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر اُس کر رہی تھی۔ جس نے برہا کو چپ ہو جانے پر زور کیا تھا۔

”آپ یہ ہی جانتا چاہتے تھے ناں.....؟“

”میں کالے جادو کے بارے میں نہیں جانتا۔ ہاتھ مائی ڈیز! مجھے جادوئی کرتوں کے بارے میں ناؤ۔ کیا جانتی ہو تو تم جادوئی کرتوں کے بارے میں.....“

”اوہ..... کرب.....“ وہ اچھل کر ”میں جادو کے کرتوں کے بارے میں بھی سب کچھ جانتی ہوں سر!“

”کوئی کرب آتا ہے تمہیں مس برہا!“ اب وہ جیسے اس کا مزالے لہ رہا تھا۔

”جی بہت سارے.....“ اس نے کہا۔ حمدان نے استغہامیہ اس کی طرف دیکھا، میز کے کونے سے اٹھا اور اپنی سیٹ پر جا کر بیٹھ گیا۔ پھر ہاتھ سے ایک اشارہ کیا کہ چلو پھر شروع ہو جاؤ۔ برہا بالکل بھی نہ ٹھہرائی۔ کیتھی نے اسے پورے ایک ہفتے کی مشق کے تین کمال کے جادوئی کرب سکھا دیے تھے۔

اب تو تاش کے پتوں والا تھا۔ دوسرا بازو کے لباس لاندہ سے بہت سے مورچکے نکالنا اور تیسرا بالوں سے تین تازہ پھول نکالنا۔ مشق سے وہ تینوں ماہر ہو چکی تھی یا سمجھتی تھی۔ لیکن ہائے ری

..... آنے والے وقت کا کہتا ہوتا ہے۔

وہ وہاں کرب دیکھانے کے بدلے اسی آفس کی ڈسک سے کوڈ خود کشی کر لینا پسند کرتی۔

اس نے اپنے بیگ میں سے تاش کے پتے اٹھائے اور ان کو اچھے سے چھیننا تھا۔

”اس ایک پر اپنے سائن کریں سر!“ اس نے ان کے آگے کیا۔ حمدان نے ایک نظر اسے

دیکھا تھا۔

”کریں ناں.....“ وہ مسکرا رہی تھی۔ بڑا اعتماد تھا اس میں کہ اب وہ حمدان کو ایسے متاثر کرے گی کہ اسے اپنے جادوئی کرب اس کے سامنے کم پڑتے محسوس ہوں گے۔ حمدان نے تاش پر سائن کر دیے تھے۔

”اب اس پتے کو آپ اپنے پاس رکھیے۔“

حمدان نے ایسا ہی کیا۔ وہ پھر سے تاش کے پتے چھیننے لگی۔ پھر اس نے ایک ایک پتے کو دیکھا۔ لیکن اسے کہیں اندر کسی بھی پتے پر حمدان کے سائن ہوئے نظر نہ آئے۔ اس نے پھر سے ایک ایک پتے کو دیکھا تھا۔ لیکن سائن والا پتا کہیں نہیں تھا۔ اللہ.....

اچانک اسے کچھ خیال آیا اور اس نے بیگ میں جھانکا۔ کاربن پیپر والا تاش بیگ میں ہی موجود تھا۔ جس پر ٹریس ہو کر حمدان کے سائن ایک اور پتے پر ابھر آئے تھے۔

”کیا ہوا.....؟“ وہ مسکرا رہا تھا۔

”سر وہ..... کرب غلط ہو گیا ہے۔“ اس کے پاس یہ کہنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا۔

”کوئی بات نہیں۔ کوئی دوسرا کرب کر کے دکھاؤ۔“ سیٹ پر فیک لگا کر جھولتے ہوئے وہ پیار سے بولا۔

”جی سر! ابھی لیں۔“ وہ پھر ایک نئی توانائی سے بولی اور گھڑی ہو گئی۔ اس نے ہاتھوں کو ”کراس“ کی شکل میں باندھا۔ پھر ان کو ایسے حرکت دینے لگی جیسے کرب نہیں کرائے کھیلنے لگی ہو۔ حمدان مسکرا رہا تھا۔ برہا اس کے سامنے بلیو بینڈ ماجرین جو بنی ہوئی تھی۔ پھر اس بلیو بینڈ ماجرین نے جھٹکنے سے اپنے بازو کے لباس کے اندر سے بہت سے مورچکے نکال لیے۔ حمدان سیٹ پر اچھلا اور کل کر بیٹھ لگا تھا۔

برہا اس کے اس طرح اچھل کر بیٹھنے کو سمجھ نہ سکی۔ اسے تو اس کے فن کی داد دینی چاہئے تھی لیکن..... پھر اس کا فن خود اس پر آشکار ہوا۔ مورچکے کی ڈنڈیوں کے بجائے اس کی کٹھن میں پنکھ تھے اور ڈنڈیاں کسی جھاڑوں کی طرح ہوا میں تھیں۔ اس کا کرب الٹا تھا۔

”اوہ سوری.....“ اس نے کہا اور پکھوں کو سیدھا کر کے پکڑ لیا لیکن اب دیر ہو چکی تھی۔ حمدان ہنسی کو قابو میں نہیں کر پا رہا تھا۔

”بس یا اور کچھ بھی ہے؟“ بڑا گھبراہٹ مچا رہا تھا۔

”جتنے بھر کی مشق کسی کام نہیں آئی تھی۔ اس کے دونوں کرتب خراب گئے تھے۔“

”ایک تیسرا بھی ہے۔“

”چلو..... وہ بھی دیکھ لیتے ہیں۔ اس کے بعد تم گھر جاسکتی ہو۔“ اس نے کہا۔ اب یہ پہلے دو کی ناکامی تھی یا اس کے دیکھنے کی گھبراہٹ کہ اس سے تیسرا کرتب کرنے کے لیے ہمت جمع ہی نہیں ہو پا رہی تھی۔

”تیسرا کرتب.....“ بڑا ہلکا سا گھبراہٹ مچا رہا تھا۔ اس کے دونوں تاثر اچھے نہیں پڑے تھے۔ خیر پھر بھی اس نے اپنا تیسرا اور آخری کرتب کرنے کا آغاز کیا تھا۔ کھڑے ہو کر بالوں کی پونی پکڑی، پھر گھوم کر بال لہرائے تھے۔ یہ واضح کرنے کے لیے کہ بالوں میں کچھ نہیں ہے۔ پھر دوسرے چکر میں پیچھے کمر سے جیکٹ تلے سے جلدی سے پھول نکالے تھے اور حمدان کے سامنے آتے آتے دوسرے چکر میں پھولوں والا ہاتھ حمدان کے سامنے کیا تھا۔ حمدان نے سوالیہ حنویں اٹھائی تھیں۔ برہانے اپنے ہاتھ کو دیکھا تھا۔ ہاتھ خالی تھا۔ پھر اس نے فرش پر دیکھا تھا۔ کمر سے پھول نکالتے سے پھول اس کی پکڑ میں نہیں آسکے تھے اور فرش پر گر گئے تھے۔ ہائے اللہ..... وہ دھک سے رہ گئی اور پھولوں کو خوں خوار نظروں سے دیکھنے لگی تھی کہ وہ اس کی پکڑ میں کیوں نہیں آئے تھے۔ حرامی نہ ہوں تو..... حمدان اپنی سیٹ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا اور..... وہ جھک کر پھول اکٹھے کرنے لگی تھی۔

”بس.....؟“ وہ سوالیہ گویا ہوا۔ سنجیدہ لیکن اپنا بنا لینے والی آواز سے۔

”جی.....“ وہ نظریں جھکا کر بولی تھی۔

شرمندگی کے مارے اس سے سر نہیں اٹھایا جا رہا تھا۔

”اوکے بائے! تم جاسکتی ہو۔“

”لیکن حمدان..... میرا مطلب سہ!“

”میں بہت مصروف ہوں۔ تمہیں تمہاری بات کہنے کا پورا پورا موقع دیا گیا ہے۔ جس میں تم ناکام رہیں۔ اب اس موقع پر ہی اور کا حق ہے۔“ اس نے دو ٹوک، حقیقی اور اصولی بات کی تھی۔ اس سے باہر نکلتے وقت بڑا ہی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ہنسنے پھر کر محنت کا کوئی پھل نہیں مل سکا تھا۔ وہ ناکام ہوئی تھی۔ کرتب دکھانے میں بھی اور اسے متاثر کرنے میں بھی.....

☆☆☆

”ایسا تو ہونا ہی تھا میری جان! تم نے اس موقع کو صرف اس سے ملاقات پر نسبت دی تھی۔“

جواب سے نہیں..... اگر تم اسے جواب کا ایک موقع سمجھ لیتیں تو دل لگا کر وہ سب سیکھتیں۔ جب میں تمہیں سب سکھا رہی تھی تو مجھے اندازہ تھا کہ تم اس سے ملنا ہی چاہتی ہو..... جبکہ میں چاہتی تھی کہ بے روزگار ہو تو تمہیں یہ جواب مل جائے۔ میرا کام مہاشکتی، مہادیوی چلا ہی رہی تھیں۔ لیکن پھر بھی نے مجھ سے میرا موقع بھی گنوا دیا۔ جبکہ میں دل سے یہ جواب کرنا چاہتی تھی۔ ایسی جاب کون نہیں چاہے گا۔ شہر شہر گھومو، پیسہ کماد، لوگوں کے دل جیتو اور جب جا دو گرا تیا پارا ہو تو.....“

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو کیتی!“ اس نے اتر کر کے کیتی کے سارے اندازوں کو جھٹکا۔

”کر دیا۔“ لیکن میں کیسے سیکھتی جا دو کیتی! میرا تو اس میں دل ہی نہیں ہے۔“

”دل تو ہمارا دواش روم صاف کرنے میں نہیں ہوتا میری جان! لیکن کرنا پڑتا ہے۔ زندگی ہر کام اپنی پسند کا کرنے کو نہیں ملتا۔ تم اپنی پسند جاب کب تک ڈھونڈتی رہو گی اور تمہیں یہ بھی نہیں ہوگا کہ تمہاری پسند کی جاب کون سی ہے۔“

”تم چاہتی ہو کہ میں جا دو سیکھ لیتی۔ مہاشکتی مہادیوی والا.....“

”تم سے یہ سب سیکھنے کو کون کہہ رہا تھا۔ میری جان! میں صرف کرتب کی بات کر رہی ہوں۔“ کیتی نے کہا تھا۔

برہا خاموش ہو گئی تھی۔ اس نے واقعی ایک دفع گنوا دیا تھا۔ اپنا بھی اور کیتی کا بھی۔

”تم ایک جاب کر لو گی۔ دو کر لو گی۔ کیا اس میں ترقی ہے؟ ہرگز نہیں۔ تم ایک بے وقوف کی طرح ماری زندگی ایک کام سے لگی رہو گی، چاہے اس میں بہار ادا ہو یا نہ..... چاہے اس میں ترقی کی موانع ہوں یا نہ..... جاب میں سال بعد تمہاری تنخواہ ایک ناس حد تک بڑھا دی جائے گی۔ دس ڈالر، بیس ڈالر، سو ڈالر۔ تم پیسوں کی ترقی تو شاید حاصل کر لو..... لیکن ذات کی ترقی کبھی بھی نہیں حاصل کر سکو گی۔ تو پھر تم وہی کام کیوں نہیں کرتیں۔ جس میں ابھی مشکل تو ہے لیکن آگے ترقی ہے۔ پیسوں کی ترقی اور ذات کی بھی..... ایک دم سے کچھ بھی حاصل نہیں کیا جاسکتا میری جان!“

”لیکن اس میں تو میرا دل ہی نہیں ہے کیتی!“

”تمہاری کسی میں بھی توجہ نہیں ہے۔ کسی میں دل نہیں ہے۔ تم کو راکھ کاغذ ہو۔ تم گھسے کی طرح بارادوں کام کر کے صرف پیسہ کمانا چاہتی ہو لیکن کوئی ذاتی کام کر کے نام نہیں کمانا چاہتیں۔“

”ہو سکتا ہے تم سب ٹھیک کہہ رہی ہو۔ لیکن یہ سب نہیں کر سکتی۔ سوری.....“ کہہ کر وہ کیتی کے دفات سے باہر نکل آئی تھی۔ کہیں جانے کو کوئی جگہ نہیں۔ اس لیے وہ ایلی ہی پارک میں چلی گئی۔ پہلے کافی عرصے سے وہ یہاں ہی تو آ رہی تھیں۔ اس میں ڈوبے یا چول کو دیکھ کر وہ اپنے اندر اس میں اتار دیتی تھی اور ایک جیسے ہم آہنگی کے نغموں میں چند لمحوں کو سب کچھ بھول کر خوش ملی کوشش کرتی تھی۔ اگرچہ ہر بار ناکام ہی ہوتی۔ کچھ کام وہ کر نہیں پا رہی تھی اور کوئی اسے مل نہیں دیتا تھا۔ ہنا کام کے اس ملک میں گزرا نہیں

تھا۔ بڑے عرصے سے وہ کبوتر کی طرح آنکھیں بند کیے بیٹھی تھی اور شتر مرغ کی طرح اس نے اپنا سر بھی ریت میں دب کر لٹکا رکھا تھا۔ لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا۔ خطرے، مشکلات، پریشانیوں، محرومیاں سب جوں کی توں ہی رہی تھیں۔

نارنجی گلاب کی سی شام آہستہ رومی سے ارغوانی نرگس میں بدل رہی تھی۔ جب وہ آنسو صاف کرتے ہوئے سنگی بیچ سے اٹھی تھی۔ اپنے فلیٹ تک واپس آتے ہوئے بھی وہ مردہ چال سے چلتی ہوئی ہی آگے بڑھتی رہی تھی۔ راستے سے اس نے اپنے اور رومی کے لیے کچھ کھانے کو خرید لیا تھا کیونکہ رومی نے اسے صبح ہی بتا دیا تھا کہ گھر میں پانی کے علاوہ اور کچھ ایسا نہیں ہے جسے چولے پر پڑھایا جاسکے۔ اس نے کچھ ستے سے مفتر لیے تھے اور کچھ سخت پیٹریاں۔

لفٹ خراب ہونے کے باعث وہ تقریباً سو سیڑھیاں چڑھ کر اوپر گئی تھی اور اپنے فلیٹ کے دروازے پر پہنچ کر دھک سے رہ گئی تھی۔ رومی فلیٹ کے دروازے کے باہر سارا سامان باندھے بیٹھی تھی۔

”کیا ہوا؟“ اس نے پوچھا اگرچہ پوچھے بنا ہی وہ جواب جانتی تھی۔

”وہی..... جس کا ڈر تھا۔ ہمیں کرایہ نہ دینے پر بے دخل کر دیا گیا ہے۔“ رومی نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ برہا کے پاؤں تلے سے پوری بلڈنگ نکل گئی تھی۔ مفتر اور پیٹریاں وہیں اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گری گئیں۔ جس لمحے کو وہ بڑے دنوں سے ٹال رہی تھی وہ دھماکے کی صورت ظہور پذیر ہوا تھا۔ گھر کے بند دروازے کے باہر اس طرح بے ترتیب پڑا ہوا سامان دل میں کیسے جھجھکا رہا تھا۔ اسے آج اندازہ ہوا تھا۔ وہ وہیں غم سے ڈھے جاتی، کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر لیتی، شتر مرغ کی طرح سر ریت میں دے لیتی کہ اچانک نجانے کیا ہوا۔ وہ اٹل قدموں بھاگتی ہوئی کیتی کے پاس آئی تھی۔ کیتی اپنے فلیٹ کا دروازہ بند کر کے کہیں باہر جا رہی تھی جب برہانے اس کا راستہ روکا تھا۔

”کبھی.....“ وہ ہانپتے ہوئے بولی تھی۔ ”مجھے جادو سیکھنا ہے۔“

☆☆☆

”ہر کام کی ایک شرط ہوتی ہے۔“ ایمان ”جادو کی بھی یہی شرط ہے اور جادو کا ایمان ہے۔ مستقل مزاجی..... جادو عجالت میں نہیں سیکھا جاسکتا، جادو سستی سے بھی نہیں سیکھا جاسکتا..... تو پھر یہ کیسے سیکھا جاسکتا ہے۔ جادو سیکھنے کے لیے دل کی دھڑکنوں کو گنتا پڑتا ہے۔ ان کی رفتار کے ساتھ چلنا پڑتا ہے۔ نہ کم نہ زیادہ..... نہ تیزی، نہ سستی، کیونکہ دل کی دھڑکن پر یہ دونوں صورت حال ہی اس کی موت کا باعث بنتی ہیں اور جادو پر اس کی بے ایمانی کا۔

ایمان حاصل کرنے کے لیے تمہیں اپنے بند ذہن کو چگانا ہوگا۔ لحوں میں صدیوں کو گنتے کا فن سیکھنا ہوگا۔ ایک ہاتھ سے دوا تھوں کا کام لینا پڑے گا۔ چیزوں کو دس مختلف الگ الگ آنکھوں سے دیکھنا پڑے گا اور دوسرے کی سوچ پلٹنے کے ہنر میں ماہر ہونے پڑے گا۔ کیا تم اس سب کے لیے تیار ہو؟“

”نہیں میڈم!“ اس نے ایسے نعرہ لگایا تھا جیسے فوجی پریڈ میں کھڑی ہو۔

ایک ماہ اس نے ٹریڈ منٹ کی تھی۔ وہ واقعی کورا کاغذ تھی۔ اس پر کچھ بھی لکھا جاسکتا تھا۔ پھر اس نے اس پر لکھ لیا۔ ”جادو.....“

ابھی تک اس کی زندگی میں کوئی مقصد ہی نہیں تھا۔ کوئی منزل ہی نہیں تھی۔ وہ آگ کی ڈوڈی کی طرح بلا مقصد ہی دنیا میں دائیں بے بائیں گھوم رہی تھی۔ لیکن اب جب اسے ایک واضح ہدف نظر آنے لگا تھا تو وہ بڑی پرجوش ہو رہی تھی۔

یہ اچھا ہے کہ جب آپ سے ملے نہ ہو سکے کے زندگی کیسے گزارنی ہے؟ زندگی میں کیا کرنا ہے؟ اپنے الگ راستے کیسے بنانے ہیں۔ تو بہتر ہے کہ کسی دوسرے کے بنائے راستے پر ہی چل لیں۔ یہ نہ چلنے سے، ہمت ہار کر بیٹھے رہنے سے بہر حال اچھا ہوتا ہے۔ زندگی آسان ہو جاتی ہے اور زندگی زندگی بھی

گلنے لگتی ہے۔

☆☆☆

پارٹی اوپن ایریا میں ہو رہی تھی۔ باغ پھولوں اور روشنیوں کے فوٹوں سے سجایا گیا تھا۔ باغ کے درختوں کے نیچے نشی رنگ کی روشنیاں جلائی گئی تھیں۔ جنہوں نے اندھیرے میں پام کے کاغذ کے رنگ میں ڈوبے بڑے بڑے پتوں کو ایک نئی اور اچھوتی شکل دی تھی۔ لالے کے سفید پھولوں کے گلدستے جا بجا رکھے ہوئے تھے۔ بنفشی اور سفید کے ملاپ والی یہ پارٹی حمدان کی طرف سے اس کے دوستوں اور کالج کے کلاس فیلوز کے لیے تھی۔ جہاں تھوڑی سے کوشش اور گاڑی بہت سی منتوں کے بعد اسے جانے کی اجازت مل گئی تھی۔

جب وہ اپنی ساری تیاری کر کے وہاں پہنچی پارٹی اپنے عروج پر تھی۔ رنگ اور خوشبوئیں، نور و قزح کی طرح سلیقے سے چاروں طرف پھیلی ہوئی تھیں۔ میوزک کا شور تھا لیکن یہ شور بھی سمندر لہروں کی طرح کانوں کو بہت بھلا معلوم ہو رہا تھا جس سے پارٹی دینے والا کا ڈوق جھٹک رہا تھا۔ طرف باوقار گہما گہما تھی اور اس گہما گہما میں وہ جسے والی کشش رکھنے والا میزبان ان سب کے درمیان کھڑا..... میزبان ہوتے ہوئے بھی مہمان دکھنے ہاتھ میں مشروب کا جام تھا اسے مسکرا رہا تھا۔ باغ کرتے ہوئے دونوں چیزیں جھٹکنے کو بے تار ہو جاتی تھیں۔ جام میں سے مشروب اور اس کے ہونٹوں سے پھول.....

اچانک تیز آواز سے چلتا میوزک ایک دم رکا تھا اور پھر اگلے ہی پل ساری لائٹس آف کر گئی تھیں۔ اندھیرا چھایا جانے پر لڑکے لڑکیوں نے مشترکہ ”ہو.....“ کی تھی۔

”کیا ہوا ہے؟“ حمدان نے اپنا خالی جام کے تھال میں رکھتے ہوئے اس سے پوچھا تھا۔

”میں ابھی دیکھتا ہوں سر!“ ویپر کہہ کر چلا تھا اور تب ہی میوزک والے انچ پر روشنی ہوئی۔

الٹ کی روشنی..... جو انچ کے درمیان میں اسے سرف برہا پر ہی پڑ رہی تھی۔ سب نے بے بسی کی آنکھوں کی طرف دیکھا تھا۔

”مسٹر حمدان.....“ برہانے مائیک پر حمدان کا نام لیا تھا۔ حمدان نے رخ موڑ کر انچ کی طرف دیکھا تھا اور پھر دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔

برہا کرائے کے ایک مہنگے اور نفیس لباس میں وہاں کھڑا، در بے حد خوب صورت لگ رہی تھی۔ اس نے اپنی آنے سے پہلے اس نے خود پر اور اپنے ہاتھوں پر خوب جان ماری تھی۔ میک اپ اس نے اپنی ساری سلیقہ سے کیا تھا کیونکہ اس کے پاس جو میک اپ تھا وہ امریکا کے مہنگے پارلوں میں ہی دستیاب تھا۔

..... تاہم اس کے پاس کوئی فراک نہیں تھی۔ اس نے اپنی فراک برہا کو کرائے پر لی پڑی تھی۔

”مسٹر کیرن.....“ یہ آپ کے لیے۔“ برہانے لہا تھا اور اپنے ہاتھ کو اپنے ہونٹوں کے پاس لاکر اسے پیار سے اور مدھرتا سے ایک پھونک ماری تھی۔

نہری برادہ، افشاں کی ایک لہر اس کے ہاتھ کی انگلیوں کی پروں سے اس کی پھونک کے زور اثر اٹھی تھی اور قوس بنائی، پیروں کے اوپر سے گزرتی، آؤنی والی حمدان تک گئی تھی۔ جمع حیرت سے ایک لمبی سی ”ا.....“ کر کے رہ گیا تھا۔ اس کے پہلے ہی کرب نے سب کی بصیرت کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ گردنیں اٹھ کر مڑ کر پتھر کی ہو گئی تھیں۔ رخنوں نے رخ بدلنے کا انکار کر دیا تھا۔

حمدان نے سینے پر ہاتھ باندھ لیے تھے اور اپنی اسے دیکھنے لگا تھا۔

پھر برہانے اپنے ہاتھ کو گھما کر برے پھٹکنے لگا۔ انداز میں کوئی چیز چھپائی تھی۔ ایک شیشے کا گلاس تھا۔ انہاں سے نکل کر فرش پر ڈور تک گیا تھا اور ان کے بجائے سیدھا کھڑا ہو گیا تھا۔ اس نے اپنا لہجہ نکال دیا تھا۔ دوسرا جام نکلا تھا۔ پھر تیسرا، چوتھا، پانچواں، شیشے کے جام نکلتے رہے تھے اور ایک پر ایک نکلتے رہے تھے۔ تین کے اوپر دو اور دو کے اوپر

ایک..... ہال نے تالیاں بجائی تھیں۔ برہا گھومی تھی اور جب سیدھی ہوئی تو اس کے ہاتھ میں مشروب کی ایک بند بوتل تھی۔ جسے اس نے وہاں ہی کھول کر چھ اوپر تلے دھڑے جاموں پر کھڑے کھڑے ہی اٹھایا شروع کر دیا تھا۔ پہلے سب سے اوپر والا جام بھرا تھا۔ پھر اس سے چھلک کر نیچے والے دو جام بھرے تھے اور پھر باقی کے تین..... اس نے سب سے اوپر والا جام اٹھا لیا تھا اور ایک اداسے چلتی ہوئی حمدان کے پاس گئی تھی۔ حمدان نے مسکراتے ہوئے وہ جام اس کے ہاتھ سے پکڑ لیا تھا۔

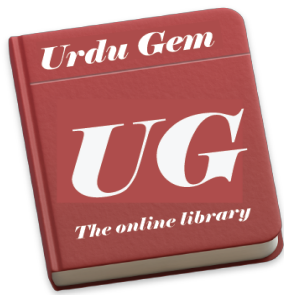
برہانے اس کا دوسرا ہاتھ تمام کرا سے اپنے سر کے اوپر کیا تھا اور پھر اسے پکڑے گھومنے لگی تھی۔ جمع یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ یہ کوئی رقص نہ تھا۔ بلکہ اس کے کمر کا پیک پوائنٹ تھا۔ اس کے لباس سے پھولوں کی پتیوں جھڑنے لگی تھیں۔ سب لوگ پھر سے حیرت میں مبتلا ہوئے تھے اور اس نے کرب سے خوب خوب لطف اندوز ہو رہے تھے۔

حمدان چہرے پر مسکراہٹ سجائے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے اسے متاثر کر دیا تھا۔

وہ گھومی تھی اور پھر گھومتی ہی رہی تھی۔ اس کے گلابی گھیردار فراک سے پھولوں کی پتیوں جھڑتی جا رہی تھی۔ جھڑتی جا رہی تھیں۔ ایسے جیسے ہال میں پھولوں کی بارش ہو رہی ہو۔ میوزک والے نے میوزک آن کر دیا تھا اور سارا ہال میوزک کی لہ پر اور اس کے چکر پر تالیاں بجانے لگا تھا۔ میوزک، تالیاں، چکر اور گرتے پھول..... ایسا سارے بندھ چکا تھا کہ فضا بھی رک رک کر اس منظر کو دیکھ رہی تھی۔

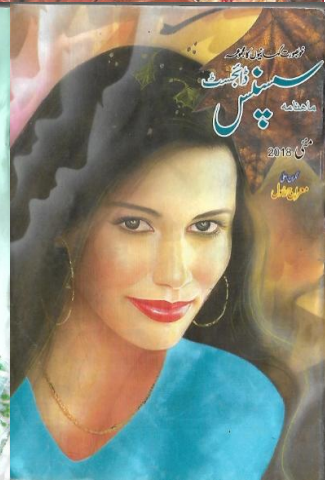
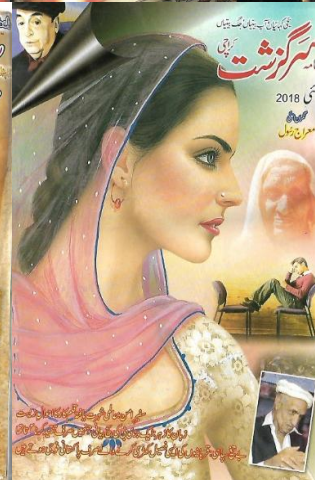
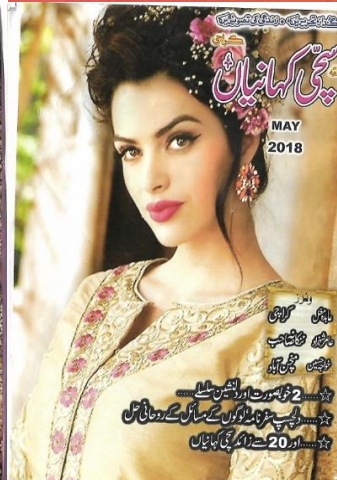
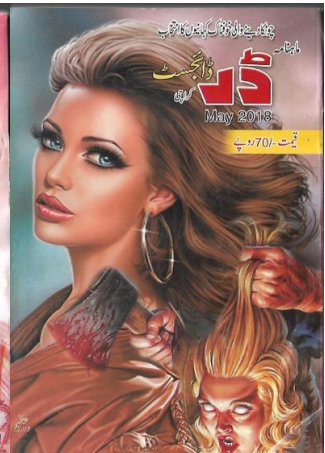
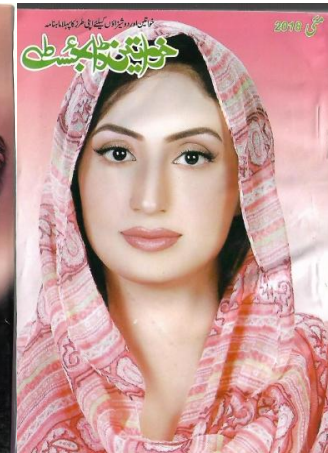
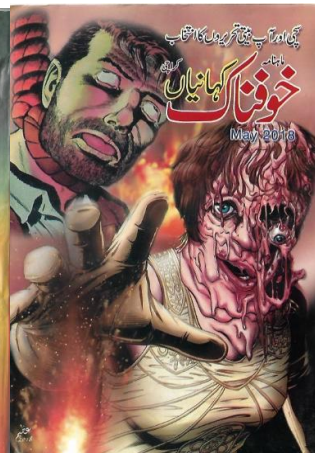
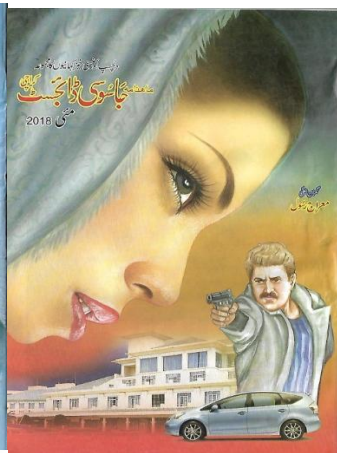
حمدان کیسے نہ اپنی پلکیں جھپکاتا بھولتا.....

وہ گھومتی جا رہی تھی، گھومتی جا رہی تھی۔ پھول جھڑتے جا رہے تھے۔ اتنی پتیوں اس نے اپنے لباس میں کہاں پوشیدہ کر رکھی ہوئی تھیں کہ وہ ختم ہونے میں نہیں آ رہی تھیں اور وہ بھی دیوانگی سے گھومتی جا رہی تھی۔ رکنا تو وہ جیسے بھول ہی گئی تھی۔ جب حمدان نے ایک جھٹکے سے اس کا کندھا تمام کر



UrduGem.com

URDU KA KHAZAANA



اسے روکا تھا۔ وہ جھپکے سے رکی تھی۔ میوزک ختم گیا تھا۔ تالیاں رک گئی تھیں۔ پھول جھڑنا بھی بند ہو گئے تھے۔ فضا بھی رک گئی تھی۔

”اتنے پھول.....؟ اتنے پھول تو جن میں بھی ایک ساتھ نہیں کھلتے۔“ حمدان نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا تھا۔ برہا مسکرائی تھی۔ وہ خوش ہوئی تھی اور ہنسنے لگی تھی۔ اس کی محنت رنگ لے آئی تھی۔

”کیا اس پھول کو میں اپنے گلدستے میں لگا سکتا ہوں؟“ وہ پوچھ رہا تھا۔ جبکہ جواب وہ جانتا تھا۔ ”اس پھول نے آپ ہی کے لیے خود کو خوش رنگ بنایا ہے مسٹر.....“ برہا فقرہ مکمل ہی کرنے لگی تھی کہ حمدان نے اس کے لبوں پر اپنی انگلی رکھ دی۔

”صرف حمدان.....“ حمدان نے کہا تھا۔ ”میری ٹیم کے لوگ مجھے صرف حمدان کہتے ہیں۔“ برہا مسکرائی تھی۔

اس محفل کے ایک اندھیرے کونے میں کھڑی حمدان کی دوست ”ملیسا“ یہ سب دیکھ رہی تھی اور اپنی آنکھیں جھپکنا بھول گئی تھی۔ برہا کے فن کی وجہ سے نہیں بلکہ حسد کی وجہ سے..... اس کی آنکھوں میں جلن کا سیاہ خون اترنے لگا تھا۔ جب سارے منظر کی تاب نہ لاتے ہوئے اس کا صبر جواب دے گیا تو اس کے ہاتھ میں موجود جام خود اس کے ہاتھ میں ہی ٹوٹ گیا اور اس کا ہاتھ زخمی ہو گیا۔ لیکن کمال ہمت تھی اس میں کہ اس نے آہ بھری نہ سسکی لی اور جو لوگ یہ دونوں کام نہیں کرتے..... پھر وہ کچھ انوکھا ہی کر کے دکھاتے ہیں۔

☆☆☆

برہا کی پہلی تنخواہ جو ملے پائی تھی۔ وہ اگرچہ بہت زیادہ نہیں تھی اور اتنی کم بھی نہیں تھی۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ یہ پہلی تنخواہ آنے والے بہت سی لکڑی کا پیش خیمہ ثابت ہوگی۔ لکڑی..... فن کی بھی، کام کی بھی، ذرات کی بھی اور پھر پیسوں کی بھی..... اسی میں سے اب وہ ترقی کرے گی۔ وہ چائے کے ادبی کا قول

ہے ناں کہ..... ”بے وقوف ہے وہ لوگ جو نوکر کر کے دوسروں کے لیے کام کرتے ہیں۔“ تو وہ بھی اب کسی کام نہیں کرے گی بلکہ کام کرے گی۔ اپنی محنت سے کسی کو ترقی نہیں دے بلکہ خود کو ترقی دے گی۔

ان کا پہلا شولنگنگ میں تھا۔ جس کی آٹھ افراد مشتمل ٹیم نے بھرپور تیاری کی تھی۔ لمبی میز جیوں طے کرتے برہا نے بھی ان کے قدموں سے قدم ملا دیے تھے۔ لیکن اس کے باوجود کچھ لوگوں نے برہا کے قدموں سے قدم ملانے کو اپنی جگہ جانا تھا جن میں سے ایک کا نام ملیسا تھا۔ وہ حمدان کی دوست بھی تھی اور ہیلپر بھی..... برہا کے حسن، اس نزاکت، اس کی معصومیت سے جلنے کے علاوہ ملا کے سچے دتاب کھانے کی ایک اور وجہ یہ بھی تھی حمدان نے صندوق والے کرتب میں برہا کو بھی بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ صندوق والا ایکٹ ملیسا ہی کرتی تھی۔ حمدان نے یہ ایکٹ برہا کو لے دیا تھا کیونکہ برہا بھی ان کی ٹیم میں تھی اور اسے مشکل کرتب سنبھال نہ سکتی تھی۔ لیکن حسد کی آگ جلتی ملیسا نے ہر بات کو غلط رنگ میں لیا تھا۔

برہا اس قدر محنتی ہو چکی تھی اور اپنے کام کو قدر جان لگا کر سمجھ کر کرتی تھی کہ وہ خود ہی اپنے جگہ بنانی چلی گئی تھی۔ وہ حمدان کی امیدوں پر اتری تھی اور پہلے ہی شو میں اس نے اپنا آپ ٹاڈ کر دیا تھا۔ برہا نے صندوق میں بند ہونا تھا اور حمدان نے اسی صندوق میں پانچ تلواریں گھسیٹنی صندوق کے اندر جا کر برہا نے جلدی سے اس میں چھپی ہوئی لکڑی کی پرتوں کو نکال کر محفوظ ہو کر جانا تھا اور انہیں پرتوں سے ٹکرا ٹکرا کر تلواروں میں مزینا جانا تھا اور برہا کو کچھ نہیں ہونا تھا۔ ظاہری ہے کہ پھر برہا نے خیر خیریت سے باہر نکل آنا اسی کا نام تو جادو تھا۔

دوسرا کرتب ملیسا کے ساتھ تھا۔ وہ کپڑے تبدیل کرنے کا تھا۔ ایک منٹ میں چندہ کپڑے

ان کا..... باہری لباس کے اندر ہی چندہ اور لباس ہوتے تھے۔ حمدان اس کے سامنے کپڑا الہا تا ملیسا تھا اور ملیسا کمال مہارت سے ایک ایک لباس اتارتی جاتی تھی۔ یہ کرتب بھی بہت جان دار تھا اور بہت شائقین بھی بہت متاثر ہوئے تھے۔

ایک ہفتے کے اندر اندر انہوں نے ایک ہی شہر میں مختلف جگہوں پر دس شو کیے تھے۔ کچھ شوز بچوں کے اسکولوں میں کیے گئے تھے اور کچھ ہسپتالوں میں۔ وہ لوگ جو لمبی بیماریوں کی وجہ سے عرصوں سے ہسپتال کے..... ایک بیڈ پر جڑے ہوئے زندگی کی باتوں سے محروم تھے۔ ان کے لیے بہت سی این جی ایس شوز متفقہ کروائی تھی تاکہ انہیں زندگی کی بات کا احساس ہو..... ان کی اندر بیماری سے لڑنے کی طاقت آئے۔ ان کا قوت بڑھ گیا لیکن برہا میں بہت طاقت آچکی تھی۔ اسے زندگی کی قیمت کا اب احساس آتا تھا۔ جب اس نے چھوٹے چھوٹے بچوں کو شوز خوشی سے تالیاں بجاتے دیکھا تھا اور پوچھنے پر پتا چلا تھا کہ ان میں سے کئی بچے ڈیڑھ ڈیڑھ سال سے وہاں ہی تھے۔ ایک دن بھی اپنے گھر نہیں آئے تھے۔

”ہم خدا کے کس قدر ناشکرے ہیں۔ ہم خدا کی ہر نعمت کو جھٹلاتے ہیں۔ ہر نعمت کو نظر انداز کرتے ہیں اور چھوٹی سے چھوٹی مشکل کو پہاڑ بنا کر اپنے سینے پر ڈال کر لیتے ہیں۔“ وہ سوچ کر رہ گئی تھی۔

ایک شو انہوں نے جیل میں بھی کیا تھا۔ جیل قیدیوں کے لیے..... جہاں جا کر زندگی کی اصل بات کا احساس نہیں ہوتا تھا بلکہ ایک ایک پل کی بات سے کروڑوں ڈالر لگتی تھی۔

ان کے چمک دار رویے کی بدولت این جی او انہیں مستقل طور پر ہاپنر کر لینا چاہا تھا۔ جس کی آمدنی دے دی تھی۔ کام کے پیسے اگرچہ انہیں پھر بھی ٹیم بہت خوش تھی۔ این جی او نے انہیں اپنے کام کی شروعات کی تھی۔ جس پر وہ ان دنوں مانتے چاہتے تھے۔ انہوں نے کہہ دیا تھا کہ

جیسے ہی ان کی این جی او ترقی کرے گی۔ ان کے پیسے بھی بڑھا دیے جائیں گے۔ حمدان کو اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔

”کامیابی کے دو سب سے اہم اصول یہ ہیں۔ خطرہ اور بھر سوسا..... اگر ہم کسی پر بھر سوسا ہی نہیں کریں گے تو ہماری کوششیں پلٹ پلٹ کر ہم تک ہی آجائیں گی۔ ہم ایک کمرے میں بند ہو جائیں گے۔ تاریک کمرے میں.....“ اس نے کہا تھا۔

دس دنوں میں چندہ شو کر کے ساری ٹیم ہی تھک گئی تھی اور اب آرام چاہتی تھی۔ حمدان نے آخری شو کر کے ایک ہفتے کی چھٹی کا اعلان کر دیا تھا اور قافلہ واپس اپنے شہر، اپنے اپنے گھروں کو چلنے کو تیار ہو گیا تھا۔

برہا خوشی خوشی اپنا سامان پیک کرنے لگی تھی کیونکہ بہت دن ہو گئے تھے اسے ریکی اور کیتی سے ملے ہوئے۔ اس نے دونوں کے لیے بہت سی چیزیں بھی اکٹھی کر لی تھیں۔ خیال تو اسے جیڈ کا بھی آیا تھا جسے اس نے ٹال دیا تھا۔ لیکن پھر ایک دکان کے آگے سے گزرتے ہوئے اسے ”پی پی“ والا کھلونا نظر آیا تو وہ اس نے جیڈ کے لیے لے لیا۔

”بجایا کر کیتی کو سٹاے گا۔“ وہ مسکراتے ہوئے سوچنے لگی تھی۔ ”اور پھر ایک دن کیتی غصے سے جیڈ کے سر پر کچھ دے مارے گی۔“ سوچ کر ہی وہ خوشی سے اچھی۔

سامان پیک کرنے ابھی وہ راہداری سے گزر رہی تھی۔ جب کوئی اس سے ٹکرا گیا تھا۔ وہ ملیسا تھی۔ جس کے ہاتھ میں جھوٹا چھوٹا میک اپ کا سامان تھا۔ جو میک اپ کا کام اور کسی سرجری کا سامان زیادہ لگ رہا تھا۔ خیر سے ملیسا میک اپ کرتی بھی اتنا تھی کہ اس کی امی تک اسے پہچاننے سے انکار کر دیں کہ یہ ان کی بیٹی ہے ہی نہیں۔ ٹکرانے سے وہ سارا سامان سرجری ہول کی کارپٹ بچھی راہداری پر گر گیا تھا۔

”سوری ملیسا!“ وہ کہہ کر اس کا سامان اٹھانے کے لیے جھکی تھی۔ لیکن ملیسا نہیں جھکی تھی۔ اس نے

اس اکیلی کو بی اپنا نوکر سمجھتے ہوئے سامان اٹھانے دیا تھا۔

”یہ لو.....“ برہا سامان اسے واپس پکڑا رہی تھی اور ملیسا سامان کے بجائے اسے دیکھ رہی تھی۔

”بہت اسارٹ سمجھتی ہو خود کو.....“ وہ آنکھوں میں طفر سے پردے سونیاں چھونے والے لہجے سے پوچھ رہی تھی۔

”کیا مطلب ملیسا.....؟“ برہا واقعی ہی کچھ نہیں سمجھتی تھی۔

”یاد رکھنا..... جب کوئی اور آجائے گا تب تم بھی میری طرح ایک کونے سے لگ جاؤ گی۔“

سامان پکڑتے ہوئے ملیسا نے بڑی جھکی بات کی تھی۔ برہا نے ایک گہرا سانس لیا تھا۔

”بہنیں ایک ماہ ہو گیا ہے ساتھ کام کرتے ہوئے۔ تم ابھی تک مجھے قبول نہیں کر سکی ہو؟“ ملیسا نے ناں میں گردن ہلاتی تھی۔

”مجھے کروں گی بھی نہیں۔“ اور کہتے ہوئے تن کر چلتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ برہا گہرا سانس بھر کر واپس اپنے کمرے میں آ کر پیٹنگ کرنے لگی۔ ری کی کو اس نے فون کر کے بتا دیا تھا کہ کل وہ واپس آجائے گی۔ کیتھی کو اس نے کال کی تھی لیکن کیتھی نے ریسیو کرتے ہی کہہ دیا تھا کہ ابھی وہ بڑی ہے۔ وہ اس کے ”بڑی“ کا سر پھوڑنے کا انتظام کر کے آرہی تھی۔

ری کی کیتھی کے پاس رہ رہی تھی اور ان دونوں کا سارا سامان بھی کیتھی کے گھر ہی تھا۔ لیکن جوں ہی برہا کو اپنے پہلے دس شوز کے پیسے ملے اس نے ری کی کو پیسے دے کر کہا تھا کہ وہ فلیٹ کے مالک کا کرایہ اس کے منہ پر..... نہیں ہاتھ میں تھمائے کیونکہ انہیں ابھی فی الحال وہاں ہی رہنا تھا۔ ری کی سامان لے کر واپس اپنے فلیٹ میں چلی گئی تھی۔ اب اگلے دن اسے بھی وہاں ہی جانا تھا۔

رات کو وہ سوئے گی تو نجانے کیوں ملیسا کا فقرہ کمرے میں اندھی چکاؤ کی تک چک پھیریاں

لینے لگا تھا۔

”جب کوئی اور آجائے گا تب تم بھی میری طرح ایک کونے سے لگ جاؤ گی۔“

”ایسا بھی نہیں ہو گا ملیسا میڈم!“ اس نے عزم سے سوچا تھا۔ بہت سا وقت اس نے زندگی میں فضول میں گزار دیا تھا۔ اب برہا کی جگہ لینا آسان نہیں تھا۔ ہمت والے کسی بھی انسان کو بے ہمتا کر دینا آسان نہیں ہوتا..... جو بے ہمتا ہو جاتا ہے وہ اصل میں شروعات میں بھی ہمت سے کام نہیں لے رہا ہوتا۔ صرف ہمت کا مظاہرہ کرنے کی اداکاری کر رہا ہوتا ہے۔

اس ایک ماہ میں ان کے گروپ نے چالیس شوز کیے تھے۔ مختلف تھیٹر میں اور ہوٹلوں میں، بڑے اور چھوٹے شو۔ ساری ٹیم پر کھن سوار تھی۔ سوائے برہا کے..... وہ جیسی اپنی زندگی کی ماضی کی قوت میں حال میں لے آئی تھی۔ فارغ وقت میں وہ گزرتے ہوئے جادو گروں کی جادوئی کرتب یوٹیوب پر نکال کر دیکھتی رہتی تھی۔ لائبریری سے ان کی کتابیں لاتی تھی۔ انہیں بخور پڑھتی تھی۔ اب زندگی نے اس کے لیے اگر جادو کی فیلڈ کوچن لیا تھا تو وہ بھی اس میں نا کا نہیں ہونا چاہتی تھی۔ اب وہ اس میں ہی نام بنانا چاہتی تھی۔ پیسہ نہیں.....

☆☆☆

حمدان خود ابھی جدوجہد نامی ایسی شاہراہ سے گزر رہا تھا۔ جہاں تیزی سے بھاگنے والوں کی بھی تھی۔ ایسی بھیڑ جس میں راستہ بھی تلاش کرنا ہوتا ہے اور سب کو پیچھے چھوڑ کر ان سے آگے بھی نکلنا ہوتا ہے۔ وہ خود ابھی کوششیں کر رہا تھا۔ اپنا نام اجاگر کرنے کی، اپنے کام سے شہرت پانے کی۔ وہ اپنے دور میں رہ رہا تھا جہاں ہر کوئی ہی ٹیلنڈ ہے۔ موقع کی تلاش میں ہے۔ ایسے میں کم ٹیلنڈ والے کو کون پوچھتا ہے۔ موقع سے پہلے اسے فوجی کی طرح مشقیں کرنی تھیں اور ہمہ وقت تیار رہنا۔ زندگی کی جنگ کا طبل نہیں بجتا..... وہ جانتا تھا

ابو سحرا میں پھول اُگانے، دریا میں جزیرہ بنانے، پہاڑ پر قطعہ تلاش کرنے، ہوا میں گراہ بننے، پانی کو قالب میں ڈھالنے کا نام ہے۔ یہ بھی معلوم تھا۔

جادو سے اس کا لگاؤ بچپن سے ہی تھا۔ پہلے ماں وہ چھوٹے موٹے کرتب کر کے اپنے کلاس فیلوز کو حیران کیا کرتا تھا۔ وہ ہر روز کچھ نیا کیکھنا چاہتا تھا۔ لڑکپن میں بھی وہ کھلونوں سے کھیلنے کے بجائے ان ہی لڑکپنوں میں مصروف رہتا تھا۔ پھر اسکول میں اس کی ہمت اتنی بڑھ گئی کہ رزلٹ کے موقع پر پرنسپل نے انہیں اسے کہا تھا کہ وہ سب کے سامنے اپنے کرتب دکھائے۔ یہ اس کا پہلا اسٹیج تھا۔ جس کے بعد جادو میں اس کی دلچسپی بڑھتی گئی ہی تھی۔ وہ پیسے جمع کر کے سب سے شوز دیکھنے چلا گیا کرتا تھا۔ تی۔ وی پر ایسا کوئی پروگرام مس نہیں کرتا تھا۔ لائبریری سے وہ جادو کی کتابیں لا کر پڑھتا رہتا تھا۔ ”ہیری ہودی نی“ کو وہ خاص طور پر پسند کرتا تھا۔ اس کے بارے میں بننے والی ساری فلمیں اس نے کی کئی بار دیکھ رکھی تھیں اور اس کے بارے میں شائع ہونے والی تقریباً ہاری ہی کتابیں اس کے پاس موجود تھیں۔ وہ ایشوری طور پر ہیری ہودی نی کا قین ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایسے ہی اپنا استاد سمجھتا تھا اور یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ اس وقت امریکا کا تقریباً ہر جادوگر ہیری ہودی نی کو کاپی کر رہا تھا جبکہ وہ تو صرف اس سے ناظر تھا۔

پھر بہت کوششوں کے بعد اسے ایک چھوٹے جادوگر ٹائیجیل کے ہیلپر کی جاب مل گئی تھی۔ ان دنوں ایسے دور سے گزر رہا تھا جس سے جادوگر خود گزر رہا تھا۔ وہ چھوٹے موٹے شوز کرتا تھا اور شہور ہونے کی کوششوں میں تھا۔ حمدان کا کام تھا کہ وہ اس سے بہت خوش ہوا تھا۔ حمدان حقیقی دنیا میں منتقل تھا بلکہ اس کے لیے منتقلی کا لفظ کم تھا وہ اپنے جنونی بننا چاہتا تھا۔

”کامیابی کے لیے شدت چاہیے، دیوانگی نہیں

کیونکہ دیوانگی اندھیرے کا دوسرا نام ہے اور شدت جوش کا۔ تم جوش میں کام کرو، اندھیرے میں نہیں۔“ ٹائیجیل نے ایک دن اسے خوب صورت نصیحت کی تھی۔ حمدان پر سکون ہو گیا تھا۔ جیسے دکتی چٹان پر کسی نے دریا کا ٹیٹھا پانی بہا دیا ہو۔

”جیسے جیسے ہم محنت کرتے جاتے ہیں۔ ہماری کامیابی کا گراف بڑھتا جاتا ہے۔ قدرت ہمیں کچھ زیادہ دینی کی خواہاں ہوتی ہے۔ یاد رکھنا..... ایسے موقع پر ضد کرو گے تو وہی چھوٹی والی کامیابی مل جائے گی۔ صبر کرو گے، کوشش کرو گے تو بڑی والی کامیابی تک پہنچ جاؤ گے۔ جو راستے کی ساری کھن اتار دے گی۔ میں نے ضد کی تھی۔ تم نہ کرنا۔“ حمدان کے لیے ان کی نصیحتیں زمرہ، یا قوت سے بھی بڑھ کر تھیں۔ مرنے سے پہلے انہوں نے اپنا سب کچھ حمدان کو دے دیا تھا۔ جو کسی اور کے کام کا تھا بھی نہیں۔

یہ انہی کا پھیلا یا ہوا جال تھا جس پر حمدان اب مزید گرہیں ڈالتا چلا جا رہا تھا۔ وہ شہر شہر جا کر مختلف شوز کر رہا تھا۔ کچھ کم پیسوں کے عوض اور کچھ بے حد کم پیسوں کے عوض۔ بہت سی این جی اوز، آرٹ کونسلوں، ہوٹلوں کے ساتھ وہ منسلک تھا۔ لیکن ابھی وہ اتنا مشہور نہیں ہوا تھا شاید اس کے فن میں کیاں تھیں یا اسے ابھی بہت کچھ سیکھنا تھا کہ ایک دم سے وہ راتوں رات کامیاب یا دولت مند نہیں ہو سکتا تھا۔

☆☆☆

شو شروع ہو چکا تھا۔ مدھم میوزک کے ساتھ پردے اٹھ چکے تھے اور شور بلند ہوا تھا۔ یہ بلند شور اس بات کا اشارہ تھا کہ حمدان کی شہرت اب دن بہ دن بڑھتی جا رہی ہے۔ اسٹیج پر پہلے سے موجود ایک صندوق کے دائیں طرف وہ کھڑی تھی اور بائیں طرف حمدان۔

حمدان نے شو کا آغاز کیا تھا۔ اسٹیج پر پڑے صندوق کو چاروں طرف سے عوام کو دکھایا تھا۔

صندوق خالی تھی پھر اس صندوق میں حسب معمول برہانہ گئی تھی اور صندوق کا مقفل کر دیا گیا تھا۔ اندر جاتے ہی اس نے صندوق کی اطراف میں سے لٹری کی چھپی ہوئی پرتیں نکالی تھیں اور اندر بیٹھی سیب کھانے لگی تھی۔ روئین اس قدر مصروف ہو چکی تھی کہ اب اس طرح ہی کھایا پیا جا سکتا تھا۔ دوسرا اب وہ اس صندوق کی کافی حد تک عادی ہو چکی تھی۔ پہلی بار والا ڈرنکل چکا تھا۔ حمدان اپنے کام کا ماہر تھا اور وہ اپنے..... اسے پتا تھا کتنی دیر لگے گی اور اسے سیب کب تک ختم کر لینا ہے۔

وہ تیزی تیزی سے اپنی بھوک مٹا رہی تھی۔ مسلسل شوق تھا جس میں اسے یمن کرتب میں حمدان کا ساتھ دینا تھا۔ اب اس طرح سے ہی کھایا پیا جا سکتا تھا۔ باہر حمدان اپنے کمن کا جادو چکا رہا تھا۔ انہی اس نے سیب کی دوسری بائیمت ہی لی تھی کہ تیز دھار تلوار اس کی گردن کے پیچھے سے گزر گئی تھی۔ اس کی گردن کا ماس چیرنی ہوئی۔ ایک آہ اس کے منہ سے نکلی تھی۔ کیا وہ غلط بیٹھی تھی؟ نہیں وہ تو صحیح طرح سے بیٹھی تھی۔ اطراف کی چھپی ہوئی پرتوں کو بھی اس نے کھول لیا تھا۔ پھر..... پھر یہ کیا ہوا تھا؟

ابھی وہ یہ سب سوچ ہی رہی تھی اور اپنی گردن کا درد لے کر بیٹھی تھی کہ پھر دوسری تلوار اندر کو آئی تھی اور اس کے بازو کا ماس چیرنی ہوئی گزر گئی تھی۔ وہ درد سے بلبل اٹھی تھی۔ یہ اس کے ساتھ ہو کیا رہا تھا۔ وہ تو یہ کرتب تقریباً چالیس بار کر چکی تھی۔ پھر اب کیا ہوا تھا۔ اس نے صندوق کو کٹھن لٹا شروع کیا تھا اور جلد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ کسی نے اندر کی چھپی ہوئی پرتوں میں بھی سوراخ کر دیے ہیں۔ وہ دم سادھ کر بیٹھ گئی۔ اب کیا ہو سکتا تھا۔ وزنی صندوق میں سے اس کی آواز باہر نہیں جاسکتی تھی۔ خود وہ باہر نکل نہیں سکتی تھی کیونکہ صندوق مقفل تھا اور اگر اس کی آواز باہر جانی بھی تو وہ حمدان کا نام پکارنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ اس کا شغراب نہیں کرنا چاہتی تھی۔

پھر تیسری تلوار اندر کو آئی تھی۔ ساری احتیاط

کے باوجود بھی اس کی ٹانگ چھلی گئی تھی۔ پھر چوتھی، اور پھر آخری، پانچویں..... پھر چند لمحوں کے بعد ایک ایک کر کے ساری تلواریں باہر نکالی گئی تھیں۔ ہٹا کھولا گیا تھا اور صندوق کا ڈھکن پرے ہٹا دیا گیا تھا۔ مجمع سادھ اس کی شیخ و سلامت باہر نکل آئے پر پہلے سے ہی حیرانگی سیٹھ ہوئے تھے۔

وہ صندوق سے باہر نکلی تھی۔ چھلے ہوئے بازو، زخمی گردن، خون رسی ٹانگ کے ساتھ۔ ہال میں تالیاں گونجی تھیں اور حمدان اپنی جگہ ساکت رہ گیا تھا۔ وہ وہ دیکھ رہا تھا جو دوری کے باعث ہال میں سے کوئی بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ برہا کا سارا جسم خون آلود ہو جانے کے لیے تیار تھا۔ اس کے باوجود وہ تن کر کھڑی تھی۔ جیسے اسے ہوا ہی نہ ہو۔

☆☆☆

وہ درد سے بلبل رہی تھی۔ آنسو نہ نکل رہے تھے اور نہ ہی واپس جا رہے تھے۔ اولیور نے فوراً سے فرسٹ ایڈ باکس نکالا تھا اور اس کی طرف بڑھا تھا۔ سارا کرد حیران تھا۔ یہ برہانے اپنے ساتھ کیا کر لیا تھا؟ وہ تو یہ ایک کئی مرتبہ کر چکی تھی۔

تھوڑی ہی دیر میں وہاں حمدان بھی آ گیا تھا۔ اس نے پردے گر کر ایک لے لی تھی۔ آتے ہی اس نے برہا کو دیکھا تھا۔ درد کے باعث اس کی آنکھوں میں آنے آنسوؤں کو اور پھر اس کی دہلی ہوئی سسکیوں کو۔ کسی نے جیسے اس کے دل پر مکارا تھا۔ ”کس نے کیا ہے یہ سب..... کس کی کوتاہی ہے یہ؟“ حمدان چلا تھا۔ کوئی کیا جواب دیتا، یہ کسی کی کوتاہی نہیں تھی بلکہ کسی کی سازش تھی اور سازشوں والے کہاں خود سے جرم قبول کرتے ہیں۔

”اولیور.....“ حمدان غصے سے پاگل ہو رہا تھا۔ ”صندوق ہمیشہ تمہارے پاس ہوتا ہے اولیور!“ ”ہاں..... حمدان..... لیکن یہ سب میں نے نہیں کیا ہے؟ میں نہیں جانتا ہوں کہ اندر والے پرتوں پر کس نے سوراخ کیے ہیں۔ یہ کوتاہی ہے یا کسی نے جان بوجھ کر کیا ہے۔“ اولیور نے حمدان کی

طرف دیکھا تھا۔ اس کے دیکھنے اور اس کے لہجے نے ”نہاں کو بتا دیا تھا کہ غلطی اس کی نہیں ہے۔“ ”یہ کسی نے جان بوجھ کر کیا ہے۔“ حمدان پاروں طرف دیکھنے لگا۔ وہ ایک ایک کو شک سے ابھیر رہا تھا۔

”کیا تم سے کسی نے صندوق کی چابی لی تھی اولیور؟“

”نہیں..... مجھ سے کسی نے چابی نہیں لی لیکن بیب بات ہے چابی آج صبح غائب تھی اور جب میں اسے ڈھونڈ ہی رہا تھا کہ وہ ایک کھٹنے بعد پھر سے واپس اپنی جگہ پر موجود تھی۔“ اولیور نے کہا تھا۔

”یعنی مکمل طور پر سازش ہوئی ہے۔“ اس نے پاروں طرف دیکھا تھا۔ سب اس نئے ہوئے واقعے پر حیران تھے۔ صرف ملیسا تھی جو ایک طرف کھڑی تھی۔ چست لباس پہنے، بالوں میں سرخ رنگ کے مصنوعی لہرے لگاتے ہوئے وہ اگلے کرتب کی تیاری کر رہی تھی۔ اسے جیسے کوئی فرق ہی نہیں پڑتا تھا کہ برہا کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ کس نے کیا ہے۔ حمدان نے ملیسا کو دیکھا تھا۔

”عجیب بات ہے ناں ملیسا! میں نے آج ہی تمہیں اولیور کی چیزوں سے چھپڑ چھاڑ کرتے دیکھا ہے۔“ حمدان نے اس کے پاس پہنچ کر اس سے کہا تھا۔ سب نے حمدان کی بات سنی تھی اور پھر ملیسا کی طرف دیکھا تھا۔ ملیسا کو کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ وہ اپنے ہی اپنا ہار سنگھار کرتی رہی تھی۔ بالوں کی کس کر پانی بناتے ہوئے اور پھر اسے جھکا دے کر مڑتے

”اے اس نے حمدان کو دیکھا تھا۔“

”کیا کہنا چاہتے ہو حمدان؟“ ”تم کیا کرنا چاہ رہی ہو ملیسا؟“ ”مجھے شوق تیاری کرنے دو۔ مجھے نہیں پتا کہ کس نے کیا ہے۔ بلکہ شاید برہانے خود ہی یہ ساتھ کیا ہے۔ تمہاری توجہ حاصل کرنے کے لیے۔“ اس نے اس پر طنز کیا تھا۔ برہا کی آنکھوں

لے ہوئے آنسو جاری ہو گئے تھے۔

”تمہیں شاید نہیں پتا ملیسا! اندر والا صندوق چڑکا بنا ہوا تھا اور تم شاید یہ بھی نہیں جانتی کہ چڑکو چیر دو تو اس کی خوشبو پورا دن گزرنے کے باوجود ہاتھوں سے نہیں جاتی۔“ حمدان نے کہا تھا۔ ملیسا چپ ہو گئی تھی۔ پہلی بار وہ گھبراہٹ ہوئی دھبی تھی۔

”ہاتھ دکھاؤ اپنے ملیسا!“ حمدان نے کہا تھا۔

”تم میرے سالوں کے غلوں اور دوستی کا یہ صلہ دے رہے ہو کہ مجھ پر شک کر رہے ہو؟“

”اپنے ہاتھ آگے کرو ملیسا!“

”مجھے یقین نہیں آ رہا حمدان! ایک ادنیٰ سی لڑکی جسے آئے ابھی چھ ماہ بھی نہیں ہوئے تم اس کے لیے مجھ پر غصہ ہو رہے ہو۔“

”نہ وہ ادنیٰ ہے نہ تم..... ہم سب برابر ہیں۔ اپنے ہاتھ آگے کرو ملیسا!“

”اوہ..... ہم برابر ہیں۔ میرے تین سال کی محنت اور اس لڑکی کے چھ ماہ کے ساتھ کو تم نے برابر کر دیا ہے۔“

”ہاتھ آگے کرو ملیسا!“ حمدان نے چلاتے ہوئے کہا تھا۔ ملیسا اس کی شکل دیکھنے لگی تھی اور اس نے اپنے ہاتھ پیچھے کر لیے تھے۔ پھر ناں میں سر ہلایا تھا کہ ایسا تو وہ اپنی جان جانے کے بعد بھی نہیں کرے گی۔ حمدان نے اسے دبوچ کر اس کے ہاتھ تھام لیے تھے، پھر ان پر سے گلوں اتارے تھے اور اپنی ناک کے قریب کر کے سونگھا تھا۔ پھر ایسی نظروں سے ملیسا کی طرف دیکھا تھا کہ جیسے اسے ملیسا سے یہ امید نہ ہو اور جیسے اس کا اعتماد ٹوٹ گیا ہو۔

”ہاں..... ہاں..... میں نے کیا ہے یہ سب کیونکہ نفرت ہے مجھے اس لڑکی سے۔ پہلے دن سے، میں اسے تمہارے ساتھ، میں اسے ہماری ٹیم میں برداشت کر ہی نہیں سکتی۔“ ملیسا چلائی تھی۔ ساری ٹیم حیران رہ گئی تھی۔ اگرچہ شک ملیسا پر جا رہا تھا لیکن پھر بھی جیسے انہیں توقع نہیں تھی کہ ملیسا یہ سب کام کر سکتی ہے۔

”اب تمہیں اسے ہماری ٹیم میں برداشت

کرنے کی کوئی ضرورت بھی نہیں ملیسا! کیونکہ آج سے تم ہماری ٹیم میں نہیں ہو۔ تم میری بہت اچھی دوست رہ چکی ہو اس لیے میں پوکس کو نہیں بلاؤں گا۔ تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ تم خاموشی سے ہمیں چھوڑ کر چلی جاؤ۔“

”کیا واقعی.....؟“ ملیسا کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔ ”صرف اس لڑکی کے لیے.....“ ”اصولوں کے لیے.....“ حمدان نے سختی سے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا تھا۔ ”اب تم جاسکتی ہو۔“

”حمدان.....“ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن حمدان نے ہاتھ کے اشارے سے اسے کچھ بھی کہنے سے منع کر دیا تھا۔ ملیسا سمجھ گئی تھی کہ اس کا کھیل ختم ہو چکا ہے۔ غضب ناک نظروں سے اسے اور برہا کو دیکھتے ہوئے وہ باہر جانے لگی تھی۔ اس کی نظریں کہہ رہی تھی کہ کچھ بھی ہو جائے وہ اس بات کا بدلہ لے کر رہے گی۔ ٹیم اپنی جگہ پر ساکت کی ساکت تھی۔

”نہ تو اندرونی پر تیس چڑی لکڑی کی ہیں اور نہ ہی چڑی خوشبو سارا دن ہاتھوں میں بسی رہتی ہے۔ لیکن آپ نے دیکھ لیا کہ چور کیسے اپنا آپ خود بے نقاب کر دیتا ہے۔“ ملیسا کے جانے کے بعد حمدان نے کہا تھا۔ سب حمدان کی عقل پر دنگ رہ گئے تھے۔ ”سب اگلے شو کی تیاری کریں۔“ حمدان نے حکم دیا اور بھڑوں کے چھتے کو جیسے کسی نے آگ لگا دی تھی۔ سب پھر سے اپنے اپنے کاموں میں مشغول ہو گئے۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

برہا ایک طرف سہمی اور ڈری ہوئی بیٹھی تھی۔ درد لگھ لگھ بڑھتا جا رہا تھا۔ خون جو جلد کے اندر تھا اب باہر نکل آیا تھا۔ وہ دہی دہی سسک رہی تھی۔ حمدان آہستہ سے چلتے ہوئے اس کے پاس آیا تھا۔ ”مجھے نہیں پتا حمدان! وہ کب مجھ سے اتنی نفرت.....“ اس نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے تھے لیکن حمدان نے اس کے لبوں پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ ”شش..... کوئی بھی وضاحت دینے کی

ضرورت نہیں ہے۔“ اس نے کہا تھا اور پھر اس کے ہاتھ سے مرہم لے لیا تھا۔ جسے وہ ہمت کے باوجود بھی خود پر لگا نہیں سکتی تھی۔ وہ اس کی طرف دیکھتی رہی تھی اور کچھ نہیں کہہ سکتی تھی۔ اس کی ٹھون کی خوشبو نے اسے ساکت کر دیا تھا۔ حمدان نے روٹی پکڑ کر اسے بوتل کے منہ پر رکھ کر گیلیا کیا تھا اور پھر اس نم روٹی کو وہ برہا کے زخموں پر لگانے لگا تھا۔ برہا اس کے بارے میں بھاری وجود تلے کسی چھوٹے بچے کی طرح بیٹھی تھی۔ دور کہیں محبت نے اسے مردنگ نکال لی تھی اور اب اس پر بے ترتیب دھڑکنوں نے اپنا اپنا کھیل کھیلنا شروع کیا تھا۔ وہ نمک کے کھلونے کی طرح اس نم روٹی کے باعث ٹوٹ کر گری تھی۔ ڈھے ہی تو گئی تھی۔ مردنگ کے بیٹھے سرائے تھے اور سارے عرض و سماں میں پھیل گئے تھے۔ برہا کی آنکھیں پھٹی تھیں۔ اپنے اوپر جھکا وجود اسے کسی دیوتا کا لگا تھا۔ اور وہ اپنی جگہ پر ساکت اس دیوتا کے چروں میں بیٹھ کر تیس نو اس کر رہی تھی۔

وہ اس کے زخموں پر مرہم لگا تا رہا تھا اور برہا نے ایک آنکھ نہیں کی تھی۔ اس کے سارے زخم بھر چکے تھے۔

☆☆☆

شفاف رات میں یا قوت کے سے ستارے آسمان سے اتر کر زمین پر چلے آ رہے تھے۔ زمین بہت بڑے خزانے کی مالک بننے والی تھی۔ ہوا ملک بنی چکی تھی اور اب اپنے زرنگار لباس کی جھکارت عالم کو مدھوش کر رہی تھی۔

برہا نے اپنے زخموں پر ہاتھ پھیرا تھا۔ ہلکے..... دھیرے سے..... جیسے وہاں کچھ تلاش کر رہی ہو اور ہاتھ لگانے سے اس کے کھوجانے بھی ڈر ہو۔ وہ مسکرائی تھی اور پھر سے یادوں کی میں جا پہنچی تھی۔ آج کے دن کی یاد کی تھیں..... تہ کی سطح پر ٹھہراتا ہوا ایک لمبے بڑی مشکل سے اس قید میں آیا تھا۔ حمدان کے ہاتھ کا لمس۔ ”برہا تم ابھی تک سوئی نہیں۔“ ری

کر دھت بدلتے ہوئے اسے دیکھا تھا۔ وہ صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی اور سامنے بند آواز میں نی وی چل رہا تھا۔ لیکن نی وی پر اسپورس چلن کھلا تھا۔ ری کی جانتی تھی کہ برہا کو اسپورس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

”ہاں.....“ برہا چوکی تھی۔

”کوئی بات ہوئی ہے کیا؟“ ری کی فکر مندی سے پوچھنے لگی تھی۔

”کوئی بات؟“ اس نے خود سے پوچھا تھا اور کب سے ہی تو پوچھ رہی تھی۔ کیا بات ہوئی تھی؟ کس بات نے اس کی نیند اڑا دی تھی۔ زخموں پر مرہم لگ گیا تھا لیکن اس کا لمس کیوں نہیں جا رہا تھا۔ اسے یاد صبا چلتی کیوں محسوس ہو رہی تھی جبکہ ابھی تو رات تھی۔ دن کے نکلنے میں وقت تھا۔ یہ سب کیا تھا؟ مفکر اسے جیت کی خوشی کہتے ہیں اور شاعر اسے کیا کہتے ہیں۔ وہ جانتی تھی۔

”ہاں..... مجھے محبت ہو گئی ہے۔“ برہا نے کہا اور ری نے ”ہائے اللہ“ کہہ کر منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔

☆☆☆

جس این جی او کے ساتھ وہ کام کر رہے تھے۔ ای این جی او کے ساتھ ایک شو انہوں نے معذور بچوں کے اسکول میں کرنا تھا۔ جہاں وہ اس وقت سب موجود تھے اور شو کی تیاری کر رہے تھے۔ ایسی پہنوتی جگہوں پر تیاری مزید تھکا دیتی تھی کیونکہ وہ اپنے مطلب کی سہولیات ڈھونڈنے میں کافی وقت لگ جاتا تھا۔ ساری ٹیم اسی بھاگ دوڑ میں لگی ہوئی تھی۔ سوائے حمدان کے جو صحافی کو انٹرویو دے رہا تھا۔

این جی او اپنا ایک میگزین نکال رہی تھی اور اس پہلے شمارے میں انہوں نے حمدان کو خاص جگہ دی۔ میگزین چھوٹی نوعیت کا تھا اور حمدان سے ہوتا تھا۔ ابھی چھوٹی ہی نوعیت کا تھا۔ سب شو کے لیے اپنی تیاری کر رہے تھے کسی کو اس انٹرویو سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

”آپ اپنی اب تک کی کامیابی کو کس پر منحصر

کرتے ہیں؟“ جب صحافی نے یہ سوال پوچھا تھا۔ عین اسی وقت برہا شو کی تیاری کرنی وہاں پر آئی تھی۔ ”محنت پر.....“ میں نے اس مقام تک پہنچنے کے لیے بہت محنت کی ہے اور کر رہا ہوں۔“ حمدان نے انتہائی سادگی سے جواب دیا تھا اور افراتفری کا شکار برہا ایک دم سے رک گئی۔ ”محنت.....“ میں نے یہ دو الفاظ اسے ساکت کرنے کے لیے کافی تھے۔ اس کے دل کی کھال سکڑی تھی۔ حمدان کو صرف ”محنت“ اور ”میں“ کا نام نہیں لینا چاہیے تھا۔ وہ سوچ کر رہ گئی تھی۔ اسے کیا کہنا چاہیے تھا۔ اسے برہا کا نام لینا چاہیے تھا؟ ہاں اسے برہا کا نام لینا چاہیے تھا بلکہ اسے برہا سمیت سب کا نام لینا چاہیے تھا۔ اس کا جادو صرف اس کی مرہون منت نہیں تھا اس میں اس کی ساری ٹیم کا ہاتھ تھا۔ لفظ ”میں“ کافی نہیں تھا۔ ”ہم“ کہنا چاہیے تھا۔ جو بات وہ سوچ رہی تھی وہ یہ بات اس نے بڑے اچھے طریقے سے حمدان کو سمجھا دی تھی۔ شو کے دوران برہا نے عجیب حرکت کی تھی۔

وہ صندوق میں بندھی، بارہا دفعہ کیا ہوا ایک کر رہی تھی۔ حمدان نے تلواریں صندوق کے اندر گھسائی تھی۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد باہر نکلی تھیں۔ برہا کو تب باہر نکلتا تھا لیکن وہ باہر نہیں نکلی تھی۔ وہ اندر والے پوشیدہ صندوق میں ہی تھی۔ سامنے تماشائے معذور بچے تھے جو برہا کے باہر نکلنے کے منتظر تھے اور برہا ابھی تک چھوٹے صندوق میں تھی۔ حمدان نے پھر ڈبا بند کر کے کھولا تھا۔ برہا اب بھی صندوق سے باہر نہیں نکلی تھی۔ تماشائی پہلے تو اسے کرب ہی کا حصہ سمجھتے تھے لیکن اب ان میں بے چینی بڑھنے لگی تھی۔

برہا تیسری دفعہ بھی باہر نہیں نکلی تھی اور حمدان کے آواز دینے پر اور پکارنے پر بھی اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ وہ اندر بیٹھی مزے سے انگو رکھائی رہی تھی۔ ”برہا! ہاں نکلو۔“ تیسرے بار اپنی جھنجھلاہٹ پر قابو پاتے ہوئے حمدان نے ہولے سے برہا سے کہا تھا۔ لیکن اس نے کوئی اثر نہیں لیا تھا۔ وہ باہر نہیں نکلی تھی۔ سامنے بچوں میں سے کچھ بچے ہنسنے لگے تھے۔

چوتھی دفعہ پر حمدان کا غصہ بھی عروج پر تھا۔ تماشائی اب بچنے لگے تھے۔ یانجویں دفعہ کے صندوق کھولنے پر وہ باہر نکلی تھی۔ انگور کھاتے ہوئے اور تماشائی اسے دیکھ دیکھ کر ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گئے تھے۔ وہ بچوں کی طرح چوس چوس کر انگور کھاتی ہوئی باہر نکلی تھی۔ حمدان نے اپنی خفت پر بشکل ہی قابو پایا تھا۔ اپن جی او کے اونر نے اسے دیکھا تھا اور وہ شرم سے پانی پانی ہو گیا تھا۔

”یہ سب کیا تھا برہا؟“ بیک اسٹیج جا کر وہ برہا پر دھاڑا تھا۔ سب نے حمدان کی یہ غصہ بھری آواز سنی تھی اور وہ اپنی اپنی جگہ پر رک گئے تھے۔ وہ سکون سے لباس تبدیل کر کے، اپنا ہنڈ بیک لے کر باہر جانے کے لیے نکل رہی تھی۔ اس نے جیسے حمدان کی کوئی بات سنی ہی نہیں تھی۔

”میں پوچھ رہا ہوں کیا تھا یہ سب برہا! تم وہاں مجھے شرمندہ کیوں کر رہی تھیں۔ صندوق سے باہر کیوں نہیں نکل رہی تھیں؟“ اس نے اس کا بازو تھاما تھا۔ بات اتنی تھی تو نہیں لیکن اب ساری صورت حال نے بڑھادی تھی۔

”میں تمہیں صرف یہ بتانا چاہتی تھی کہ تمہاری کامیابی کے پیچھے صرف تمہاری محنت کا ہاتھ نہیں ہے بلکہ تمہاری ٹیم کا بھی اتنا ہی ہاتھ ہے۔“ اس نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا اور اپنا بازو چھڑوا کر باہر نکل گئی تھی۔ حمدان جیسے وہاں ہی پھر کا بت بن گیا تھا۔

☆☆☆

زندگی ان رنگوں سے مشابہ تھی جو جب ملتے ہیں تو سب سیاہ کر دیتے ہیں۔ آخری رنگ صرف سیاہی کا ہی پچتا ہے۔ ماتم کارنگ، سوگ کارنگ..... اس نے تو ویسے بھی اتنی سی عمر میں زندگی کے بہت سے رنگ دیکھ لیے تھے۔ پاکستان سے باپ کے مرجانے کے بعد وہ جن رشتے داروں کے بار بار بلانے پر امریکا آئی تھی انہوں نے اسے رشتے دار کم اور نوکرانی زیادہ سمجھ لیا تھا۔ ان کی نوکری کرنے سے

بہتر اس نے ان کا گھر چھوڑ دینے کو سمجھا اور ری کے فلیٹ میں چلی آئی۔ ری کی کہانی بھی اس سے ملتی جلتی تھی۔ اسے اس کا شوہراپنے ساتھ پاکستان سے لایا تھا اور جو کام وہ اس سے یہاں پر چاہتا تھا وہ ری کے مرکر بھی نہیں کر سکتی تھی۔

مگر تو وہ نہیں سکی..... لیکن اس نے طلاق ضرور لے لی تھی۔ دونوں مل کر کسی نہ کسی طرح زندگی کو گھسیٹ رہی تھیں۔ ری کی ٹانگوں کی کمزوری کی وجہ سے زیادہ کام نہیں کر سکتی تھی۔ وہ گھر سنبھال رہی تھی اور برہا سے باہر سنبھال نہیں جا رہا تھا۔ پھر ایک دن سب بدل گیا جب وہ فلیٹ تک آئی تو ری سامان رکھے باہر بیٹھی تھی۔ اس دن کیتھی نے اسے زندگی کا نیا راستہ دکھایا تھا۔

اب یہ اس پر تھا کہ وہ اس راستے کو چن چکی ہے یا مردہ بچے کی طرح ساری زندگی گرداب میں ہی چکر لگاتی رہتی ہے۔ اس نے اس رستے کو چن لیا تھا اور پھر اس پر چلنا شروع نہیں کیا تھا۔ اب اس پر وہ بھاگنے لگی تھی۔ اس نے سخت اور بھرپور محنت لی تھی۔ وہ حمدان کے ساتھ ہر شوش جان لگا دیتی تھی۔ ہر شو کو اس طرح کرتی تھی جس طرح پہلی بار کر رہی ہو..... اگر کامیابی میں صرف اس کا ہاتھ نہیں تھا تو صرف حمدان کا بھی نہیں تھا۔ اس لیے اسے حمدان کی بات پر ڈکھ ہوا تھا۔ اسے ساری ٹیم کا نام لینا چاہتے تھے۔

گھر آ کر اس نے حمدان کو بچ کر دیا تھا کہ وہ کل کے شو نہیں آ سکے گی۔ وہ کسی اور کو اپنی ہیلپر بن لے۔ حمدان کی طرف سے صرف ایک تیج آیا تھا۔ ”اوکے“ اور اس تیج نے اسے مزید تپا دیا تھا۔ اسے اسے آمادہ کرنا چاہیے تھا۔ لیکن وہ جیسے خود اس سے جان چھڑوا گیا تھا۔

☆☆☆

تین دن ایسے ہی گزرے تھے۔ وہ اگلے دن کے شو پر بھی نہیں گئی تھی اور نہ ہی اس سے اگلے دن پر..... حمدان کی طرف سے کوئی تیج نہیں آیا تھا نہ ہی فون۔ اس نے اسے نہیں بلایا تھا اور نہ ہی پوچھا

تھا کہ وہ کیوں نہیں آ رہی۔ برہا کو ہر آن اس کی آمد اور اس کے فون کا انتظار رہا تھا۔ آن آن پر اس کی جان جاتی رہی تھی۔ اس نے غصے میں تیج تو گر دیا تھا لیکن جب وہ شو پر نہیں گئی تو سارا دن بے چین رہی تھی۔ رات میں بھی حمدان کا کوئی تیج نہیں آیا تھا۔ نہ ہی فون کال..... محبت میں ایک یہ ہی تو پریشانی ہے کہ یہ اتنا ختم کرتی ہے اور یہ ہی اتنا کو ختم دیتی ہے۔ یہ ظہور بھی ہے اور اسی میں اختتام کی چاہ بھی نہیں ہے۔ اس کی اتنا بھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ اسی لیے وہ ایک ہفتے سے نہیں جا رہی تھی۔ حمدان کی طرف سے بھی بدستور خاموشی رہی تھی اور یہ خاموشی اس بات کا اشارہ تھی کہ وہ اس کے سنا بھی کام چلا سکتا ہے۔ وہ خود کو کوئی بچنے خان نہ سمجھے..... اس سے پہلے بھی اس کا کام چل رہا تھا۔ اب بھی چل جائے گا۔

”ٹھیک ہے۔“ اسے یہ اشارہ منظور تھا۔ اگر حمدان یہ ہی سوچ رکھتا تھا تو وہ اضطراب میں خود کو مطمئن رکھنے کی ناممکن کوشش کر رہی تھی۔ ری نے اس سے پوچھا تھا کہ وہ شو پر کیوں نہیں جا رہی جبکہ وہ چند دن پہلے ہی تو وہ اسے بتا چکی تھی کہ آنے والے دن اس کے لیے کس قدر اہم ہیں۔ لگا تار شو ہیں۔ کوئی ایک بھی چھٹی نہیں ہے۔ پھر جب وہ بالکل ہی دلی ہو کر گھر بیٹھ گئی تھی تو ری کیسے نہ پوچھتی۔ اسے ڈر بھی تھا کہ یہ پھر سے کام چوری پر نہ اتر آئے اور انہیں پھر سے فاقوں کو نہ گھر پر مہمان خصوصی کے طور پر بلانا پڑے۔

”میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ اس نے بان چھڑاتے ہوئے کہا تھا۔ ”کس کی..... تمہاری یا تمہارے دل کی؟“ ی نے معنی خیزی سے پوچھا اور پھر اس کے تیور کر کے اپنے رورخ موڑ لیا تھا۔

گھر کی میں بیٹھے بیٹھے گرم کانی کو شفا کر کے ڈال دے یہی اس نے مزید تین دن گزار دیے تھے۔ یہ اتوار کا روز تھا۔ چھٹی کا روز..... دوسرے دنوں کی طرح کا اداس سادہ۔ بس ایک

تبدیلی کی بات یہ تھی کہ آج ری کی سالگرہ تھی اور ری کی اپنے گھر والوں کو یاد کرتے ہوئے بہت اداس ہو رہی تھی۔ اگرچہ پیچھے پاکستان میں کسی کو اس کی کمائی کے بعد اس بات کی پروا نہیں تھی کہ ری سانس بھی ٹھیک سے لے رہی ہے کہ نہیں لیکن پھر بھی وہ ڈھیٹا نہیں سمجھی یا دکر لیتی تھی۔ وہ گھرانے جو لڑکیوں کے امریکا جانے کے خیال سے ”توبہ استغفار“ کرتے ہیں۔ جب ان ہی لڑکیوں کی کمائی امریکا سے گھر میں آتی ہیں تو ان کی ساری ”توبہ استغفار“..... ”سبحان اللہ“ میں بدل جاتی ہے اور انہیں ایک دم سے اس بات کا ادراک ہوتا ہے کہ امریکا سے زیادہ نیک ملک تو لڑکیوں کے لیے کوئی اور ہے ہی نہیں۔

حمدان کی بے رخی کو برداشت کرنا اب ناقابل برداشت ہوتا جا رہا تھا۔ شال اوڑھ کر وہ ہوا بلی کے لیے گھر سے نکلتی تھی۔ ساتھ یہ بھی سوچ رہی تھی کہ واپس جاتے ہوئے ری کے لیے ایک اچھا سا ٹیک لیتی جائے گی۔ کیتھی کو بھی اس نے کال کر کے کہہ دیا تھا کہ وہ شام کو آجائے۔

”میں بھی آؤں گا۔“ پیچھے سے جڈ کی آواز بھی اسے سنائی دے گئی تھی۔ یعنی ری کی سالگرہ اس کے لیے ہیملون بننے جا رہی تھی۔

کافی دیر وہ یوں ہی بلا مقصد سڑکوں پر گھومتی رہی تھی۔ موسم دلش ہو رہا تھا۔ لیکن اسے نہ جانے کیوں اداس کر رہا تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے ساری فضا اس کی حق میں اپنا آپ سوئپ چلی ہو..... پھر وہ بیکری گئی۔ اس نے دل کی شکل کا ایک اچھا سا ٹیک خرید..... بیکری سے وہ نکل ہی رہی تھی جب بارش شروع ہو گئی تھی۔ لیکن ابھی مدھم تھی، اتنی تیز نہیں تھی کہ وہ بھیگ جاتی۔ دکانوں کے باہر بنے شیڈوں کے نیچے سے ہوتی وہ آگے بڑھنے لگی تھی جب وہ کسی کونے سے نکل کر اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔ برہا کے قدم ملینکی انداز سے رکے تھے۔

سر پر ٹوپی پہنے، سفید ٹی شرٹ کے اوپر نیلی

کھلے بٹن کی شرٹ پہنے اور ڈھیلی ڈھالی سیاہ جینز کے نیچے براؤن ویلوٹ کے شوز۔

اور سے ہونٹوں کو گول کرتا وہ سیٹی بجا رہا تھا۔ ”مالوہا“ کے گانے ”ہولا“ کی اور خود میں ہی گھونٹتے ہوئے جھوم رہا تھا۔

اللہ..... ایسے مرد سے ناراض رہنے کے لیے پہاڑ جیسی مضبوطی چاہیے۔ اس اچانک آمد سے برہا ایک لمحے کو بولکھائی تھی لیکن پھر وہ فوراً ہی سنبھل بھی گئی تھی اور اسے نظر انداز کر کے آگے بڑھ گئی تھی۔ جیسے اس نے اسے دیکھا ہی تو نہیں۔

”ہائے“ بھی نہیں کہو گی؟“ اس نے سیٹی روک کر پوچھا۔

”تم ہو کون؟“ آگے آگے تیزی سے بڑھتے ہوئے اس نے کہا تھا۔

”اچھا..... اتنی ناراضی؟“ وہ پھر سے اس کے آگے آکھڑا ہوا تھا۔ مدھم بارش میں تیزی آنے لگی تھی۔ ایسے دلکش موسم میں وہ اتنا دلکش لگ رہا تھا کہ اس کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو رہی تھیں۔ وہ دھڑکنوں کو تو سنبھال نہیں سکتی تھی۔ ایک سنبھال سکتی تھی۔ وہ ہی اس نے سینے کے ساتھ لگایا۔

”کیوں.....؟“ ایک ہیلپر (مددگار) کو ناراض ہونے کا حق نہیں ہے کیا؟“ اس نے لفظ ”ہیلپر“ پر زور دیتے ہوئے کہا تھا۔ وہ اس کا طعنے سمجھ گیا تھا۔

”تم ہیلپر نہیں ہو، تم ٹیم کا حصہ ہو۔ ہم سب ایک ٹیم کا حصہ ہیں۔“

”تم ٹیم میں نہیں ہو حمدان! ٹیم میں ہم ہیں۔“

تم سربراہی میں ہو اور خود کو سربراہ ہی سمجھتے ہو۔“ یہ بات اس طرح سے بھی ہو سکتی تھی۔ صندوق سے نہ نکل کر تم نے مجھے بے پناہ شرمندگی کروائی ہے۔“

”اور صرف اپنا نام لے کر تم نے میرا بے انتہا دل توڑا ہے۔“ برہانے بے اختیار ہی کہا تھا۔ حمدان کی آنکھیں تباہ کن حد تک سکڑی تھیں۔ اس نے حیرت سے اسے دیکھا تھا۔ اللہ..... یہ کیا کہہ دیا تھا

اس نے لیکن اب دیر ہو چکی تھی۔ دل کی طرح اس کی زبان بھی بے اختیار ہو چکی تھی اور اسے آج اس کا باختیار ہونا بھایا تھا۔

حمدان بغور اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ برہا کی آنکھوں میں ٹپکی تھی تو حمدان کی آنکھوں میں چمک بڑھ رہی تھی۔ وہ جادو میں ہی مگن رہا اور کسی کی ذات پر اس کا جادو چل گیا۔ اسے اندازہ ہی نہ ہو سکا۔ کوئی لڑکی اسے چپکے چپکے چاہ رہی تھی اور وہ بے خبر تھا۔ یہ بے خبری کا احساس، یہ کسی کو چاہنے کی پچھلی شرارت کا سا احساس اس قدر دلربا تھا کہ وہ مسکرا اٹھا۔ ہوا تو نہیں چلی تھی لیکن برہا کے بال اڑ گئے تھے اور اس کا تمام چہرہ بالوں کی قید سے آزاد ہو کر سورج مٹھی کے پھول کی طرح ٹھہر کر حمدان کی نظروں کے سامنے آیا تھا۔

برہا خود کو چھپاتے ہوئے پھر سے آگے بڑھ گئی تھی۔ حمدان چند لمحے وہاں ہی کھڑا رہا تھا لیکن پھر سے بھاگ کر اس تک آیا تھا۔

”مجھ سے غلطی ہوئی..... سوری۔“

”تم سے غلطی نہیں ہوئی، تم نے حقیقت بیان کی ہے۔ یہ بات تمہارے ذہن میں بھی جس کا تم نے اظہار کیا ہے۔ اب میرے سامنے سوری بول رہے ہو لیکن اندر سے تم اس بات کو کبھی تسلیم نہیں کرو گے۔ تمہارا ذہن ہمیشہ اسی ڈگر پر رہے گا۔ تم ہمیشہ یہ ہی سوچو گے کہ تمہاری کامیابی صرف تمہاری وجہ سے ہے۔“

”ایسی بات نہیں ہے۔ تم میرے ذہن کی ڈاکٹر مت بنو۔“ اس نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

”اور تم میرے گارجین مت بنو، راستہ چھوڑ میرا۔“ اس نے اس طرح تیز اور آواز سے کہا تھا کہ حمدان کی ہنسی ختم ہو گئی تھی اور وہ ساکت ہو گیا تھا۔ برہا آگے بڑھ گئی تھی۔ حمدان وہاں ہی کھڑا رہا تھا اب کہ وہ اس کے پیچھے نہیں آیا تھا۔ برہا چند قدم ڈگئی تھی۔ پھر اس نے پیچھے پلٹ کر دیکھا تھا۔ حمدان وہاں پر نہیں تھا۔

”اتنی جلدی تھک گیا مجھے منانے میں.....“ اس نے غصے اور طنز سے سوچا تھا۔ ہائے شرقی “لی..... وہ اپنے شہر کا روٹھنا اور منانا یاد کر رہی تھی کہ اب تک سبکی مان نہیں جاتی تھی اس کے گھر کے چکر لاتے ہی رہتے تھے۔

بارش ایک دم سے ہی بڑھی تھی اور چاروں طرف چھا گئی تھی۔ کالے بادلوں نے شام کے اندھیرے کو بھی مزید بڑھا دیا تھا۔ اس کا غصہ بوجھل ہوا تو چال بھی سست ہو گئی۔

”مجھے بھی اتنی سرد مہری نہیں دکھانی چاہیے تھی۔“ وہ سوری بول تو رہا تھا۔ اسے احساس ہو رہا تھا۔

بارش سے بچتی بچتی وہ آگے بڑھ رہی تھی جب تیزی سے آئی ایک ہیوی بائیک اس تک قدموں کے پاس آ کر چرچر کر رہی تھی۔ وہ اچانک سے رک گئی ورنہ عین ممکن تھا کہ بائیک والا اس کے قدموں پر بائیک چڑھا دیتا۔

”اندھے ہو کیا.....“ اس نے چلا کر کہا تھا۔ حمدان کا غصہ وہ اس پر نکال رہی تھی۔ لیکن بائیک والے نے کچھ نہیں کہا تھا۔ ہیلمیٹ کے اندر سے وہ اسے گھورنے لگا تھا۔ اس کی سیاہ جیکٹ اور سیاہ گلوں پر احمات کے بہت سے بدن دیکھ کر برہا کو خطرے کی بو آئی تھی۔ جرائم پیشہ افراد اسی طرح کے گلوں پہننے میں اہرت رکھتے تھے۔

اس کے لئے سستی سے قدم چلتے تھے پھر دیر ہی ہوا تھا جیسا برہا کو امید تھی۔ وہ ایک خطرے میں نہیں گئی تھی۔ بائیک والے لڑکے نے اپنی پینٹ کی لف والی جگہ سے پستول نکال لی تھی اور برہا پر پتائی لی تھی۔ برہا کی آنکھیں پھٹکی تھیں اور وہ پیچھے کو بھاگ رہی تھی۔ بائیک والا بڑی جلدی سے پھر اس کے پاس آ کر آکھڑا ہوا تھا۔ اب برہا ایک بند دکان کے شٹر لگی ہوئی تھی اور بائیک والے نے بائیک سے اتر کر پستول برہا کے ماتھے پر رکھ دی تھی۔

”حمدان.....“ وہ چلائی تھی۔ وہ اتنی جلدی دور

نہیں جاسکتا تھا۔ اسے یہی کہیں ہونا چاہیے تھا۔ ”حمدان.....“ وہ اور زور سے چلائی تھی۔ پستول والے لڑکے نے اس کے ماتھے پستول رکھ کر دباؤ ڈالا تھا کہ وہ اپنی زبان بند رکھے۔

”کیا چاہتے ہو؟“ وہ بے حد ڈری ہوئی تھی۔ گھبراہٹ میں اس کے منہ سے الفاظ بھی صحیح طرح سے ادا نہیں ہو رہے تھے۔ اس نے اپنا بیگ لڑکے کی طرف اچھال دیا تھا کہ اس کے پاس جو ہے وہ لے جا سکتا ہے۔ لیکن بائیک والے نے اس کا پرس پرے پھینک دیا تھا اور سر کو ایسے ہلایا تھا کہ اسے یہ نہیں ”پچھا اور“ چاہیے۔

”حمدان..... مجھے بچاؤ.....“ اس کے ارادے جان کر وہ پوری طاقت سے چلائی تھی اور اگلے ہی لمحے پستول کا ٹریگر دب گیا تھا۔ ڈزن کی آواز آئی تھی۔

”امی.....“ موت کے وقت اسے کلمہ پڑھنا تو یاد نہیں رہا البتہ امی ضرور یاد آگئی تھیں اور ان کا نام پکار کر اس نے انہیں یاد کر لیا تھا۔ لیکن پاکستان میں موجود اس کی امی کا نہ تو دل دھڑکا تھا، نہ تو ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر گرا تھا۔ نہ آنکھ پھڑکی تھی، نہ ان کی کھڑکیاں دروازے دھڑدھڑائے تھے اور نہ دیے بجھے تھے۔ لیکن دیے تو خیر ہندوؤں میں ہوتے ہیں۔ تو ایسا کچھ نہیں ہوا تھا کیونکہ پستول سے گولی نہیں نکلی تھی۔ بلکہ ایک پھول نکل آیا تھا۔ سرخ پھول..... جو ہیلمیٹ والے نے اس کے آگے رک دیا تھا۔ وہ مجسمہ بنی سب دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے اپنا ہیلمیٹ اتار دیا تھا اور ایک چاند جیسے گرہن سے آزاد ہو کر پورے آسمان پر چھا گیا تھا۔

”صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ لڑکیوں کو ہمیشہ گارجین کی ضرورت رہتی ہے۔“ کہہ کر وہ مسکرایا تھا۔ برہا کی جان میں جان آئی تھی۔ پھر بھی اس کی سانس نارمل نہیں ہو سکی تھی۔

”اپنی شکل دیکھو ذرا..... بھوت بھگائی ہوئی ہو اور تمہاری آواز۔ کاش میں اسے ریکارڈ کر لیتا

ای! اس نے اس کی نقل اتاری تھی اور پھر دل کھول کر ہنسا شروع ہو گیا تھا۔ بارش سے بے پروا ہو کر، ہاتھ اس نے اپنے گھٹنوں میں دے لیے تھے اور اب دہرا ہوا جا رہا تھا۔ ”حمدان..... مجھے بچاؤ.....“ وہ سارا منظر جیسے پھر سے یاد کر رہا تھا۔

”اگر یہ میرا ہو جائے تو میں دنیا کی اس سلطنت کی مالک بن جاؤں گی جو آج سے پہلے شاید ہی کسی کو نصیب ہوئی ہو۔“ اسے ہنستا ہوا دیکھ کر وہ سوچنے لگی تھی اور مسکرا اٹھی تھی۔

”اب اس طرح بارش میں ہی بھکتی رہو گی یا گارجین کی مدد کو قبول کر دو گی۔“ اس نے ہاتھ آگے کیا تھا۔ برہانے ایک لمحہ سوچے بنا مسکرا کر اپنا ہاتھ آگے کر دیا تھا۔ ”تو کیا خواب کی تعبیر یہ تھی؟“

”اب کیک بھی نیلینا ہوگا جس طرح تم نے اسے بھینچا ہوا ہے اس کے اندر کی تو جین بھی پھس گئی ہوگی۔“ اس کی ہنسی تھمنے میں نہیں آ رہی تھی۔ وہ خاموشی سے اپنی ہی بے وقوفی اور نادانی پر مسکراتی رہی۔ اس نے بائیک اسٹارٹ کی تو وہ اس کی ہیوی بائیک پر بیٹھ گئی۔

”تم نے اتنی جلدی کپڑے کیسے بدل لیے؟“ ”میں جادوگر ہو۔“ حمدان نے کہا۔ ”کچھ بھی کر سکتا ہوں، کسی کا دل بھی چرا سکتا ہوں۔“ وہ منہ پیچھے کیے اس کے کان میں سرگوشی کر رہا تھا۔ بائیک منظر سے دور جانے لگی تھی۔ ان کی باتیں کرنے کی آوازیں مدھم ہونے لگی تھیں۔ بارش تیز تر ہو رہی تھی۔ لیکن ان دو دیوانوں کو جیسے کوئی پروا نہیں تھی۔

☆☆☆

”امریکا گوٹ ٹیلنٹ“ کے آڈیشنرز کا زور عروج پر تھا جس کا حمدان نے دو سال اور برہانے آٹھ ماہ انتظار کیا تھا۔ پورے ملک میں امریکا گوٹ ٹیلنٹ کے آڈیشنرز چل رہے تھے اور جیسا پورا امریکا ہی امریکا گوٹ ٹیلنٹ کے آڈیشن میں اٹھ آیا تھا۔ حمدان اور برہانے بھی اس شو کے آڈیشنرز کے لیے خوب تیاری کر لی تھی۔ جس کی انہیں ضرورت ہی پیش نہیں آئی تھی۔ وہ

کوئی عام جادوگر نہیں تھے بلکہ ملک کے چھوٹے سے شہر ت یافتہ جادوگر تھے جس کا انہیں یہ فائدہ ہوا تھا کہ انہیں آڈیشن نہیں دینا پڑا تھا۔ انہیں ڈائریکٹ اسٹیج پر جانے کی تیاری کرنے کے لیے کہا گیا تھا۔

برہانہ بہت خوش ہوئی تھی۔ کسی پچھلی محنت کا صلہ اس طرح سے بھی ملتا ہے اسے اب اندازہ ہوا تھا۔ وہ لمبی لائنوں میں لگ کر اپنی باری کا انتظار کرنے کی کوفت سے بچ گئے تھے اور اب جم کر پہلے شو کی تیاری کر سکتے تھے۔ اس کی زندگی کے سفر کا یہ پہلا ہدف تھا۔ جس میں وہ ضرورت پورا اترنا چاہتی تھی۔ وہ ہدف، منزل اور زندگی کو مایوس نہیں کرنا چاہتی تھی کیونکہ کہتے ہیں کہ زندگی اپنی ناراضی بڑی لمبی دیر تک نبھاتی ہے۔ حمدان کے بھی خواب پورے ہونے والے تھے۔ وہ دن رات بس یہی کہتا تھا۔

”یہ شو میرا ہی ہے۔ میں ہی اسے جیتوں گا۔“ جس دن شہر شہر آڈیشن ملل ہوئے اور اسٹیج کی تیاریاں ہونے لگیں اس سے ایک دن پہلے حمدان کو شو کے فیئر کیئر کی کال آئی تھی۔

”آپ کل آؤں آجایے گا۔ کچھ ضروری بات کرنی ہے۔“ ”جی، ہم آجائیں گے۔“ حمدان نے کہا تھا۔ ”لگتا ہے آپ نے ٹھیک سے سنا نہیں۔“ میں نے کہا ہے کہ آپ..... یعنی صرف آپ۔ آپ کی پارٹنر برہانہ ہیں۔“ کیئر کیئر بنا تاڑ کے تھا۔ پھر بھی حمدان نے اس پر زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔ اگلے دن حمدان ان کے آؤں چلا گیا تھا۔

”آپ کپل کی صورت میں پر فام کرنا چاہتے ہیں ناں۔ میں نے آپ کو یہ ہی بتانے کے لیے بلایا ہے کہ ہم اس بار جادو میں کپل کو نہیں لے رہے۔ آپ کو اکیلے ہی پر فام کرنا ہوگا۔“

”آپ کے کہنے کا یہ مطلب ہے کہ آپ مجھے چانس دے رہے ہیں لیکن میری پارٹنر برہانہ کو نہیں۔“ ”آپ تو واقعی جادوگر ہیں۔ دلوں کی بات سمجھ جاتے ہیں۔“

”لیکن ایسا کیوں؟“ وہ تانکھی سے بولا۔ ”بتاؤ چکا ہوں کہ ہم اس بار جادو میں کپل کو نہیں لے رہے۔ آپ نے اگر یہ شو کرنا ہے تو آپ کو ہر پر فام ٹیس اکیلے ہی دینی ہوگی۔“ کیئر کیئر نے توقف کیا۔ ”آپ کے پاس سوچنے کے لیے صرف آج رات تک کا وقت ہے۔“

حمدان خاموشی سے اٹھ کر چلا آیا تھا۔ ساری بازی ایک دم سے ہی پلٹ گئی تھی۔ اب وہ کیئر کیئر کو کھل کر جواب دے گا اور برہانہ کو کیا کہے گا۔ وہ بھی ”امریکا گوٹ ٹیلنٹ“ کو جیتنے کے خواب دیکھنے لگی تھی۔ وہ تو خوابوں ہی خوابوں میں ٹرائی بھی جیت چکی تھی۔ اب وہ جا کر اسے کیسے بتاتا کہ فیئر کیئر نے اسے لینے سے انکار کر دیا ہے۔ وہ اس کے فلیٹ تک جاتے ہوئے لفظوں کو ترتیب دے رہا تھا۔

”حمدان تم.....“ وہ اسے اپنے فلیٹ کے دروازے پر کھڑا دیکھ کر خوش ہوئی تھی۔ حمدان خاموشی سے اندر داخل ہو گیا تھا۔ برہانے اس کی خاموشی سے بڑے مطلب اخذ کیے تھے۔

”حمدان سب خیریت تو ہے ناں؟“ برہانے تشویش سے پوچھا۔ حمدان نے اس کی طرف دیکھ کر ناں میں سر ہلایا اور پھر اسے ساری بات بتادی۔ جس کی برہانہ کو ہرگز توقع نہیں تھی۔ لمحے بھر میں اس کے سارے خواب ٹوٹے نہیں تھے تو اس سے کھو ضرور گئے تھے۔ وہ تو حمدان کے ساتھ امریکا گوٹ ٹیلنٹ جیتنے کا تہیہ کر چکی تھی اور دن رات اس پر کام کر رہی تھی۔ وہ بالکل نئے کتب متعارف کروانے کا ارادہ رکھتی تھی۔ ویسے نہیں جیسے سالوں سے چل رہے تھے۔ اپنے کرتبوں کے بارے میں دونوں نے ایک دوسرے سے خوب ڈسکس کیا تھا اور دونوں ہی بہت بے جوش تھے۔ اب برہانے سب سنا تو خاموش ہو گئی اور مشروب سے بھرے گلاس کے کناروں پر اپنی اکایاں چلانے لگی۔

”میں نے انہیں منانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ مان ہی نہیں رہے۔ اس لیے میں سوچ رہا ہوں کہ

تم نہیں تو میں بھی نہیں۔“

”نہیں..... نہیں حمدان! ہرگز نہیں۔ تم ایسا مت سوچو پلیز..... اگر وہ لوگ صرف تمہیں چانس دے رہے ہیں تو تم ضرور جاؤ۔ میں..... میں ایسا کرتی ہوں کہ میں الگ سے آڈیشن دے دیتی ہوں۔“ اسے حمدان کی بات ”تم نہیں تو میں بھی نہیں“ سے خوشی ہوئی تھی۔ اسے لیے وہ قدرے سنبھل گئی تھی اور سوچ سمجھ کر بات کر رہی تھی۔

”میں نے اس حوالے سے بھی بات کی تھی لیکن وہ کہہ رہے ہیں کہ آڈیشنرز بند ہو چکے ہیں اور اس بار وہ دو لڑکیاں سلیکٹ بھی کر چکے ہیں اور ایک لڑکا بھی۔ ایک اور لڑکا وہ سلیکٹ کرنا چاہتے ہیں یعنی مجھے، تمہیں اگلے امریکا گوٹ ٹیلنٹ کا تک کا انتظار کرنا پڑے گا۔“ اداسی سے اس نے باقی صورت حال سے بھی اسے آگاہ کیا تھا۔

”ٹھیک ہے میں کروں گی۔ اللہ کو یہ ہی منظور تھا کہ ہم دونوں ایک ساتھ نہ جیتے بلکہ الگ الگ جیتیں۔“ اس نے بظاہر ہنس کر کہا تھا لیکن اندر سے وہ ڈھکی تھی۔ ”تم میری فکر مت کرو حمدان! تم اپنی تیاری کرو بلکہ اب تو میں بھی مکمل فارغ ہوں۔ ہم دونوں اچھے سے نہماری تیاری کریں گے۔“ حمدان بھی پچھلی سی مسکراہٹ سے مسکرایا تھا۔

☆☆☆

موقع کی نزاکت ہے کہ اس کے بعد پھر وقت برباد مت کیا جائے۔ اس کا مطالبہ ہے کہ اسے نچوڑ لیا جائے۔ اس کا ایمان ہے کہ اس پر بھروسہ کیا جائے۔ اس کی پیش کش ہے کہ اسے فوراً سے قبول کیا جائے۔ اس کی التجا ہے کہ اسے رد نہ کیا جائے اور اس کی دھمکی ہے کہ وہ پھر بھی پلٹ کر نہ آئے گا۔ دونوں نے اس قدر محنت کی تھی کہ اتنی محنت سے ایک پہاڑ بھی ٹوٹ سکتا تھا۔ جس موقع کا انہیں انتظار تھا اور جو زندگی نے ان کو دیا تھا اس سے وہ بھرپور فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ اس طرح موقع بھی خوش ہوتے ہیں اور بار بار پلٹ پلٹ کر ان کے پاس آتے ہیں۔

جوان کی اچھے سے خاطر داری کرتے ہیں۔
 حمدان نے اپنی پہلی پرفارمنس میں ہی ججز کو حیران کر دیا تھا۔ اس کا بنا ہوا تھوڑا سا دس ماہی گیروں کو توڑنے کا کرتب تھا۔ ججز خوش ہوئے تھے اور وہ اگلے مرحلے کے لیے کوالیفائیڈ ہو گیا تھا۔ اگلے مرحلے کی پرفارمنس ایک ہفتے بعد کی تھی۔
 اس ایک ہفتے میں وہ اور پرجوش ہوئے تھے۔ انہوں نے نئے نئے جادو دریافت کیے تھے۔ نئے کرتب کیے تھے۔ بہت سے کرتبوں کو آزما رہا تھا۔ گوٹ ٹیلنٹ کی ٹیم بھی ان کے ساتھ تھی۔ لیکن وہ مطمئن نہیں ہو رہے تھے۔ وہ اس ٹیم کی سوچ سے آگے جا کر کچھ کرنا چاہتے تھے۔ پھر شیشے والے تابوت کا مظاہرہ کرنے پر دونوں ہی راضی ہو گئے تھے۔ تین دن بعد پھر سے حمدان کو پرفارم کرنا تھا اور وہ ان تین دنوں میں کوئی تین سو بار وہ کرتب کر کے اس میں مہارت حاصل کر چکا تھا۔
 ”تمہارا شکریہ برہا! اگر تم نہ ہوتیں تو میرے لیے یہ سب بہت تھکا دینے والا مرحلہ ہوتا لیکن.....
 اب مجھے اس سب میں مزا آ رہا ہے اور مجھے پختہ یقین ہے کہ یہ شویں ہی جیتوں گا۔“ وہ پریقین تھا۔
 یہ امریکا کا گوٹ ٹیلنٹ کا دوسرا مرحلہ تھا جس میں حمدان اپنی پرفارمنس دے رہا تھا۔ وہ ایک شیشے کے تابوت میں لیٹا ہوا تھا جس میں آہستہ آہستہ پانی بھر رہا تھا اور اس کے آس پاس بہت سے سانپ اور بچھو تھے۔ حمدان کے ہاتھ پاؤں اور پورے جسم پر دس تالے لگے ہوئے تھے۔ اسے دو منٹ کے اندر اندر سارے تالے کھولنے تھے۔ ٹھیک دو منٹ بعد تابوت کے اوپر پڑاؤنی پتھر اس پر گر جاتا تھا۔ پانی، سانپ اور بچھوؤں سے لڑتے ہوئے اسے یہ سارا کام ٹھیک دو منٹ میں کرنا تھا۔ ججز سمیت سب کی جان خشک تھی۔ دو منٹ میں سے ایک ایک سنکڑ سب پر بہت بھاری بن کر گزر رہا تھا اور سب کو مفلوج کر رہا تھا۔
 برہا بیک آج کھڑی تھی اور وہیں سے اسے دیکھتے ہوئے خوش ہو رہی تھی۔ وہ بالکل بھی نہیں ڈر

رہی تھی اسے پتا تھا۔ حمدان یہ سب بڑے اچھے سے کر لے گا۔ وہ آج بھی ججز کو حیران کر دے گا اور یقیناً اگلے مرحلے میں جانے کے لیے کوالیفائیڈ ہو جائے گا۔
 ”ہائے.....“ اس نے اپنے قریب ایک بارعب آوازنی تو چونک کر پٹی..... یہ کیرن تھا۔
 ”لگتا ہے کافی محنت کی ہے تم دونوں نے۔ محبت ہو تو تم جیسی..... کاش مجھے بھی کوئی تمہاری طرح کی چاہنے والی مل سکتی۔ تم نے اپنے سارے ٹرک اسے دے دیے تاکہ وہ جیت جائے۔“ کیرن نے کہا تھا اور برہا ہنسی تھی۔
 ”ہم تو دونوں اس پر جا کر آگ لگانا چاہتے تھے لیکن آپ نے ہی پیل کی اجازت نہیں دی۔“ برہا نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔
 ”کیا.....؟“ کیرن نے حیران ہونے کی اداکاری کی تھی۔ ”میں نے اجازت نہیں دی یا اس نے میری بات نہیں مانی۔ کتنی محنت کی میں نے حمدان کی کہ ہمارے پاس آج تک کوئی پیل جادوگر نہیں آیا اور تم جیسا خوب صورت تو ہرگز نہیں۔ تم دونوں آؤ گے تو اس شو کو پکیشی ملے گی۔ لیکن وہ مانا ہی نہیں۔“ کیرن نے بڑے طریقے سے برہا کے قدموں تلے سے اس کی پٹیاں اٹھائیں اور سر پر سے سانبان۔
 ”ایک منٹ..... ایک منٹ رکیے۔ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟“
 ”وہی..... جو تم سن رہی ہو بیٹی! حمدان کا تو بس یہی کہنا تھا کہ وہ پرفارم کرے گا تو اکیلا ہی..... تم دونوں ایک ساتھ پرفارم کرنا نہیں چاہتے اور ایسا تم ہی چاہتی ہو..... ورنہ میں تو تمہیں الگ سے بھی کال کرنے والا تھا کہ پیل کی صورت نہیں کر سکتے۔ اکیلے اکیلے ہی کر لو..... لیکن اس نے اس حوالے سے بھی انکار کر دیا۔“ کیرن بول رہا تھا اور برہا ہر طرح سے وہ جواز ڈھونڈنے لگی تھی جن کی بنا پر کیرن کو جھوٹا سمجھے۔ اس کے ہاتھ ایسے کوئی وجہ نہ تھی جس کی بنا پر وہ کیرن کی بات کا یقین نہ کر سکتی۔
 بھلا وہ کیوں جھوٹ بولے گا؟

”آپ سچ کہہ رہے ہیں؟“
 ”میں جھوٹ بولوں گا لیکن..... لیکن مجھے لگتا ہے کہ مجھے یہ سب نہیں نہیں بتانا چاہیے تھا۔ مجھے تو لگتا تھا کہ حمدان نے تمہیں اعتماد میں لے کر ہی سب کیا ہو گا لیکن..... اودہ..... لگتا ہے مجھ سے غلطی ہو چکی ہے۔ میں دو محبت کرنے والوں کے بیچ میں آ گیا ہوں۔ مجھے معاف کر دو بیٹی! مجھ میں نے کچھ کہا ہی نہیں۔“ کیرن جلدی جلدی سفاکی سے بول رہا تھا۔
 ”نہیں..... آپ نے کچھ غلط نہیں کیا بلکہ مجھے زندگی کی سب سے بڑی غلطی سے بچا لیا ہے۔“ اس نے دانت پیستے ہوئے کہا تھا اور اس پر تابوت کے اندر دم سادھے حمدان کو دیکھا تھا۔ جس کے آس پاس سانپ اور بچھو تھے۔ اسے حمدان اور ان سانپ اور بچھوؤں میں کوئی فرق نہیں نظر آیا تھا۔ اسے تینوں کے چہرے ایک جیسے ہی لگے تھے۔
 ”میں نے جو کہا اسے بھول جانا بیٹی! اچھا اب میں چلتا ہوں۔“ کیرن چلا گیا تھا اور برہا کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔
 دو منٹ گزر چکے تھے۔ حمدان تابوت میں سے صحیح سلامت باہر نکل آیا تھا۔ اس پر حمدان کے لیے تالیاں بجائی جا رہی تھیں۔
 بیک آج اس کی محبت کا وقت بھی پورا ہو چکا تھا۔ اس سے وفا کے تالے نہیں کھلے تھے۔ وہ سانپ اور بچھوؤں کے درمیان ہی رہی تھی اور اب ایک وزنی پتھر اس پر آگرا تھا۔ وہ ٹپ ہی تو آئی تھی۔
 ☆☆☆
 اس نے تین بار تالیاں بجائی تھیں۔ زور زور سے بڑے ہی گونج دار طریقے سے..... حمدان نے اسے جسم خشک کر رہا تھا جب وہ اس کے اس طرح تالی بجانے کے انداز سے مڑا تھا۔
 ”مبارک ہو مسٹر حمدان! فاسل کے لیے اور بے وقوف بنانے کے لیے بھی۔“ اس کی اس بات سے وہ جسم خشک کرتا وہیں جا رہا تھا۔ برہا لہجے میں بہت کچھ تھا۔ وہ مذاق پر گز نہیں تھا۔

”کیا کہہ رہی ہو برہا؟“
 ”کس خوب صورتی سے حیران ہو رہے ہو حمدان! اب تو بس کر دو، مجھے الو ہار ہے ہو۔“ میجر پر جھوٹا الزام لگا رہے ہو کہ وہ پیل کو نہیں لینا چاہتا تھا۔ یوں کیوں نہیں کہتے کہ تم میرے ساتھ یہ شو نہیں کرنا چاہتے تھے۔ تم اس شو کی ساری کامیابی اکیلے سینا چاہتے تھے۔“
 ”یہ سب کس نے کہا تم سے؟“
 ”جس کے نام پر تم نے یہ سب جھوٹ گھڑا ہے۔ کیرن نے۔“
 ”کیرن؟“ بکو اس کر رہا ہے وہ۔ کیرن نے تو خود.....
 ”وہ یا تم؟“ برہا کی آنکھوں میں انگارے دھک رہے تھے۔ حمدان کے لیے ان کی تاب لانا مشکل ہو رہا تھا۔
 ”میں ابھی ساری بات واضح کروا دیتا ہوں۔“ حمدان باہر گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس کے ساتھ کیرن اور ٹیم کے لوگ تھے۔
 ”بتاؤ کیرن! کیا تم نے مجھے نہیں کہا تھا کہ شو میں مجھ اکیلے کو پرفارم کرنا ہوگا۔ اس بار پیل کی اجازت نہیں ہے۔“
 ”میں نے کب کہا؟“ کیرن نے کمال معصومیت سے کہا تھا۔ حمدان کی گویا روح فنا ہوتے ہوئے رہ گئی تھی۔
 ”کیوں جھوٹ بول رہے ہوں غیبت؟“
 حمدان غصے سے پاگل ہونے لگا تھا۔ اس کی آواز اس قدر بلند تھی کہ شو کے لیے اپنی اپنی باری پر تیار کر کے سب وہاں جمع ہو گئے تھے۔ ایریل سلک پر مشق کرتی ایک لڑکی گرتے گرتے جٹی تھی۔ پول ڈانس کرتا گروپ ایک دو سے پردھڑام سے گرا تھا۔ اور بارہ گیندوں کو اچھالتے جو کرکا دھیان بٹا تھا اور اس کی ساری گیندیں گر گئی تھیں۔ کیرن نے چاروں طرف دیکھا تھا۔
 ”زبان سنہال کر بات کرو لڑکے! آج تک

کسی کی ہمت نہیں ہوئی کہ وہ مجھ سے اونچی آواز میں بات کرے۔ جن لوگوں نے تمہیں کسی فاسل تک پہنچایا ہے وہ میرے کہنے پر تمہیں نیچے گرانے میں ایک منٹ بھی نہیں لگاؤ گے اور جو آج تمہارے نام کے تمہاری شکل کے دیوانے ہیں۔ وہ تمہاری شکل بھلائیں گے تو پھر پلٹ کر یہ بھی یاد نہیں کریں گے کہ ایک لڑکا حمدان نام کا بھی ہوا کرتا تھا۔ کیرن نے غصے سے کہا تھا۔

”کیوں کر رہے ہو کیرن ایسا؟“ حمدان ضبط، دکھ، کرب سے بوجھل ہو کر بولا تھا۔ ”تم نے خود مجھے فون کر کے بلایا تھا۔“

”میں یاد کروں یا تم یاد کرو۔۔۔۔۔ مجھے یہ تمہارا کوئی آپسی معاملہ لگتا ہے۔ تم جھوٹ پر جھوٹ بولے جا رہے ہو۔ تم خود آئے تھے میرے آفس کہ تمہیں یہ شواہد کیلے کرنا ہے اور اگر نہیں یاد تو ہمارے آفس کے ایک ایک کمرے میں کیمیرے نصب ہیں۔ اس دن کی فوج تم با آسانی دیکھ سکتے ہو۔ شاید اس سے تمہیں کچھ یاد آجائے۔“ کیرن غصے اور طنز سے بولا تھا۔ حمدان اس کی شکل دیکھنے لگا تھا۔ وہ کس ڈھٹائی سے اسے مجرم ثابت کرنے پر تیار ہوا تھا اور کیوں۔۔۔۔۔؟

”میں وہ ویڈیو دیکھنا چاہوں گی۔“ برہانے کہا تھا۔

چند لمحوں بعد ویڈیو لگا دی گئی تھی جسے لگ بھگ پچاس لوگ ایک ساتھ دیکھ رہے تھے۔ اندر ہال میں بھی چوگولیاں ہو رہی تھیں کہ بیک اسج کوئی جھگڑا ہو گیا ہے۔ اگلا کتب بھی پیش نہیں ہو سکا تھا۔ سی سی وی دی کیمیرے کی ویڈیو اور حمدان کے بولے جانے والے جملوں کو اس طرح سے ایڈٹ کیا گیا تھا کہ کیرن جو کہہ رہا تھا وہ حرف بہ حرف سچ ثابت ہو گیا تھا۔

”حمدان آپ نے مجھے اس لیے کال کی تھی کہ آپ یہ شواہد کیلے کرنا چاہتے ہیں۔“

”جی سر۔۔۔۔۔“

ویڈیو کے پہلے ہی دو جملوں نے سب واضح کر دیا تھا۔ برہان پر بھی کہ وہ ایک دھوکے باز شخص پر اعتبار

کرتی رہی ہے اور حمدان پر بھی کہ وہ سارے پتے ہار گیا ہے۔ اس کے ساتھ بہت بڑا کھیل بہت بڑے طریقے سے کھیلایا گیا تھا۔

”ہاں۔۔۔۔۔ اب کچھ یاد آیا مسٹر حمدان؟“ کیرن چہرے پر مسکراہٹ سجائے پوچھ رہا تھا۔ جمع نے حمدان کو دیکھا تھا۔ وہ سب اس دھوکے باز لڑکے سے نفرت کرنے لگے تھے۔ ان کی آنکھوں میں واضح طور پر دم تھا۔ ”دفع ہو جاؤ یہاں سے۔۔۔۔۔ جس نے ایک معصوم لڑکی کا فائدہ اٹھایا تھا۔“ حمدان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کہاں جائے۔ کیسے اپنے سچائی ثابت کرے۔ کیا کوئی اسے سننے کے لیے تیار تھا؟

”میں اس ویڈیو کو کچھ دیکھوں۔ یہ اصل نہیں ہے۔“

”ویڈیو اصل نہیں ہے یا تم اصل نہیں ہو؟“ برہان آنکھوں میں آنسو بھرے اس سے پوچھ رہی تھی۔ ”برہان۔۔۔۔۔“ وہ خود رو دینے کے قریب تھا۔

”اب کون سا جادو دکھاؤ گے جادوگر! میرے دل کے ساتھ تو دکھایا ہی چکے ہو۔“ وہ رونے لگی تھی۔ کہاں تک ضبط کرتی۔ حمدان نے تڑپ کر اسے دیکھا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اب کیم اس کے ہاتھ سے نکل چکی ہے۔ جھوم دونوں کو دیکھ رہا تھا۔

”دھوکا دینے سے بہتر تھا کہ مجھے صندوق میں بند کر کے مصنوعی تلواروں کے بجائے تم اصلی تلواں استعمال کرتے اور مجھے صندوق میں ہی مار دیتے لیکن یہ سب۔۔۔۔۔“ رونے کے باعث وہ ٹھیک سے نہیں بول پا رہی تھی۔ حمدان سر جھکائے کھڑا تھا۔ ابھی اسے سنا نہیں جاتا تھا۔ وہ جانتا تھا۔ ابھی اسے صرف سننا تھا۔

”تم نے جیت کو اس طرح خود پر حاوی کر لیا کہ انسانوں کو بھول گئے۔ بارہا تم نے کہا یہ شوتہمارا ہے۔ تم ہی اسے جیتو گے۔ تم نے بھی یہ نہیں کہا کہ یہ شوتہمارا ہے۔ ہم ہی اسے جیتیں گے۔ میں نے ہمیشہ اس بات کو نظر انداز کیا لیکن تم نے آج ثابت کر دیا کہ یہ شوتہمارا تھا اور تم اسے جیتنے کے لیے کچھ بھی کر

سکتے تھے۔ کچھ بھی۔۔۔۔۔ اور اب میری دعا ہے کہ یہ شوتہ ہی جیتو۔۔۔۔۔ لیکن جب جیت جاؤ تو پیچھے پلٹ کر ضرور دیکھنا۔۔۔۔۔ شاید تمہیں وہ نظر آجائے جو ہم ہار چکے ہو۔“ برہان نے اپنے آنسو پونچھے تھے اور کہہ کر چلی گئی تھی۔ حمدان اس کے پیچھے نہیں گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

کیرن سٹی بجاتا ہوا جھوم کو چیرتا باہر چلا گیا تھا۔ حمدان کی خوں خوار نظروں کی پروا نہ کرتے ہوئے۔ جھوم نے حمدان پر ایک قہر بھری نظر ڈالی تھی اور پھر سب اپنا اپنا کام کرنے لگے تھے۔ وہاں سے نکل کر کیرن سیدھا اپنے آفس گیا تھا۔ جہاں ملیسا دیوار پر لگی اسکرین پر۔۔۔۔۔ کیرن روم میں ہوتا یہ سارا تماشا دیکھ رہی تھی اور خوش ہو رہی تھی۔ کیرن کے اندر آتے ہی اس نے کیرن کو چومنا تھا۔

”تمہارا شکریہ کیرن! آج تم نے میری بے عزتی کا بدلہ لے لیا۔ جو اس لڑکی کے ہاتھوں ہوئی تھی اور جسے حمدان نے تکمیل تک پہنچایا تھا۔“ غصے سے دانت پیس کر کہتے ہوئے وہ اگلے ہی پل مسکرائی تھی اور کیرن کے گلے سے جھوم گئی تھی۔

نیم سے نکالے جانے والی بے عزتی کا بدلہ اس نے کہیں زیادہ لیا تھا۔ اسے اندازہ ہی نہیں تھا۔

☆☆☆

”برہان! میری بات سنو۔“ شو سے نکل کر وہ اس کے گھر آیا تھا۔ بار بار دستک دینے پر بھی جب دروازہ نہیں کھلا تو اس نے دروازہ پھینکا شروع کر دیا تھا۔

”برہان! ایک بار میری بات سن لو، صرف ایک بار۔۔۔۔۔“ دروازہ کھل گیا تھا۔

”تمہارے پاس ایک منٹ ہے۔ جلدی بولو۔“ ان نے سختی سے کہا تھا۔ حمدان خاموش ہو گیا تھا۔

”کیا کہنا چاہتے ہو، یہ کہنا چاہتے ہو کہ تم بے آناہ ہو۔ اسٹے جیولوں کے بعد بھی تم خود کو بے گناہ ثابت کرنا چاہتے ہو۔ تمہیں شرم نہیں آتی۔ تم کس کو کر رہے ہوئے انسان ہو اور اب چاہتے کیا ہو۔ تم

جیتو یہ شو، اب کس بات کا مسئلہ ہے۔ کیا رکاوٹ ہے۔ سب رکاوٹیں ختم تو ہو گئی ہیں۔“

”برہان! ایسا کچھ نہیں ہے۔“

”یہاں سے چلے جاؤ حمدان! میں تمہاری کسی بھی بات کا کوئی یقین نہیں کروں گی۔“ اس نے کہہ کر دروازہ بند کرنا چاہا تھا۔ لیکن حمدان نے خود کو اس کے اور دروازے کے درمیان میں کر لیا تھا۔

”مجھے تھوڑا وقت دو اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے۔“

”مجھے تمہاری بے گناہی کا کوئی ثبوت نہیں چاہیے اور اگر تم چاہتے ہو کہ میں کھڑکی سے کود کر خود کو ختم نہ کر لوں تو یہاں سے چلے جاؤ۔“ اس نے سختی سے سخت بات کی تھی۔ اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ ایسا کرنے سے پہلے ایک منٹ بھی نہیں سوچے گی۔

حمدان وہاں سے چلا آیا تھا۔ رات میں کسی ایک لمحے اس کی آنکھیں لگی تھی۔ اس رہ رہ کر برہان کا رونا اور دکھ سے چور اس کا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ صبح وہ پھر اس کے فلیٹ کے سامنے تھا۔ دروازہ ریمیں نے کھولا تھا۔

”وہ یہاں سے جا چکی ہے۔“ ریمی نے کہا تھا۔ حمدان کے پیروں تلے سے عمارت نکل گئی تھی۔

”تم جھوٹ بول رہی ہو، اتنی جلدی کوئی کیسے جاسکتی ہے؟“

”جب دل ٹوٹتا ہے نہ تو ایک ایک لمحہ ایک ایک صدی بن جاتا ہے حمدان! اس نے نجانے کتنے سالوں میں اپنا سامان سمیٹا ہے اور نجانے کتنی صدیوں میں وہ یہاں سے گئی ہے۔ آپ کے لیے محض ایک رات گزری ہے لیکن اس کی ساری زندگی بیت گئی ہے۔ وقت کے اس فرق کو سمجھے حمدان! وہ بہت دیر لگا کر گئی ہے یہاں سے۔ جلدی میں نہیں گئی۔“ اداس ریمی نے دکھ سے کہا تھا۔

”لیکن وہ گئی کہاں ہے؟“

”مجھے اندازہ نہیں۔ وہ رات میں ہی کہیں کا فور ہو گئی ہے۔ صبح ابھی تو وہ جا چکی تھی۔ یہ خط پھوڑ

گئی ہے جس پر آپ کا نام ہے۔“ ربی نے خط اس کو دے دیا تھا۔ حمدان نے اسے وہاں ہی کھول لیا تھا۔ ”تمہیں شہرت چاہیے تھی اور مجھے تم..... لیکن اب وقت بدل گیا ہے۔ اب مجھے ثرائی چاہیے۔ اس لیے میرے دل میں تمہاری کوئی جگہ باقی نہیں بچتی۔ مجھے ڈھونڈنے کی کوشش مت کرنا کہ یہ بے کار ہے۔“ خط پڑھ کر وہاں ہی زمین ہرڑھے گیا تھا۔

☆☆☆

”آپ کو ہر حالت میں پر فارم کرنا پڑے گا۔ ہم اس وقت دنیا کا سب سے مقبول رائٹھی شو چلا رہے ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ ہم نے یہاں کوئی جینز بیچنے کی دکان کھول رکھی ہے۔“ ”میرا وہ مطلب نہیں تھا۔ دراصل میری تیاری نہیں ہے۔ میں اگلے راؤنڈ میں پر فارم نہیں کر پاؤں گا۔“

”تیاری آپ کو ٹیم کروا دے گی۔ اس کے باوجود اگر آپ نے پر فارم نہ کیا تو آپ کو جرمانہ ادا کرنا ہوگا۔“ تیزن اب اس کے منہ نہیں لگتا تھا۔ اس نے کسی اور کو اسے پینڈل کرنے کے کام پر لگا دیا تھا۔ ”جرمانہ؟ کس بات کا؟“

”آپ کو کنٹریکٹ سائن کرنے سے پہلے اسے اچھی طرح پڑھ لینا چاہیے تھا۔“ دوسرا منبر کہہ کر چلا گیا تھا۔

اس کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ اگلے راؤنڈ کی تیاری کرے۔ وہ بے دلی سے تیاری کرنے لگا تھا۔ ٹیم اسے تیاری کروا رہی تھی اور برہا کو تلاش کرنے کا کام ملتو ہوتا جا رہا تھا۔ اس کے پاس اتنا وقت ہی نہیں بچتا تھا کہ وہ برہا کو تلاش کر سکے۔ وہ اب دنوں بری طرح سے بے چین تھا۔ بقیہ تیاری اور ربی بھی اسے اپنے اپنے طور پر تلاش کر رہی تھیں۔ لیکن اس کا کہیں پتا نہیں چل رہا تھا۔

اسی دوران سبکی فاضل کا دن آ پہنچا۔ اس نے اپنی پرفارمنس دے دی اور جب ججز نے اگلے راؤنڈ کے کوالیفائیڈ کا اعلان کیا تو..... تو وہ نہ ہی روس کا اور

نہی دھک سے وہیں گر سکا۔ وہ سبکی فاضل میں امریکا گوٹ ٹیلنٹ کی ریس سے باہر ہو گیا تھا۔ اس کا امریکا گوٹ ٹیلنٹ جیتنے کا خواب منوں مٹی تے دب گیا تھا۔ اسے جیسے کسی کی بددعا لے ڈوبی تھی۔

☆☆☆

دن اذیت بن گئے تھے اور راتیں کرب۔ دھڑکنیں نو حركاتں تھیں اور سانسیں ماتم کدہ۔ ایک ماہ ہو گیا تھا۔ برہا کا کہیں اتنا پتا نہیں تھا۔ وہ کہاں چلی گئی تھی، کوئی نہیں جانتا تھا۔ وہ کہاں جا چھپی تھی کسی کے پاس کوئی سراغ نہیں تھا۔ ربی، حمدان، بیٹھی، جیڈ سب نے اسے ڈھونڈا تھا اور پھر سے بے دم ہو کر بیٹھ گئے تھے۔ وہ انویا نہیں ہوئی تھی۔ جہاں بھی گئی تھی اپنی مرضی سے گئی تھی اور اب اپنی مرضی سے ہی واپس آسکتی تھی۔ ایک چھوٹا سا خط جو وہ حمدان کے نام چھوڑ گئی تھی اسے حمدان سمیت ہر کوئی بار بار دفعہ پڑھ چکا تھا۔ اس دن بھی وہ بیڈ پر لیٹا اس کا خط پڑھ رہا تھا۔ اس کی لکھائی میں اس کی خوشبو ڈھونڈ رہا تھا جب ایک دم سے اس کے ذہن میں جھپکا ہوا تھا۔

”تمہیں شہرت چاہیے تھی اور مجھے تم..... لیکن اب وقت بدل گیا ہے۔ اب مجھے ثرائی چاہیے۔ اس لیے میرے دل میں تمہاری کوئی جگہ باقی نہیں بچتی۔ مجھے ڈھونڈنے کی کوشش مت کرنا کہ یہ بے کار ہے۔“ وہ اس خط کے ایک فقرے پر رکھا تھا۔ ”اب مجھے ثرائی چاہیے؟ ثرائی؟ کون سی؟..... اس نے اسی وقت اپنا لپ ٹاپ آن کیا تھا۔ اس کا شک یقین میں بدل گیا جب اس نے ”برطانیہ گوٹ ٹیلنٹ“ کے آڈیشن میں برہا کو دیکھا۔

”تو تم برطانیہ چلی گئی ہو براہ! خود کو جوتانے یا مجھے پھر سے شکست دینے۔“ اس نے دھک سے سوچا تھا۔ واقعی تم یہاں نہیں ہو۔ ورنہ جتنا میں نے تمہیں ڈھونڈا تھا تم مجھے ضرور مل جاتیں۔

☆☆☆

”کیسے ہو حمدان؟“ وہ ایک دن بلا مقصد، بلا

نزل کے راستے سے گزر رہا تھا جب ایک کار اس نے باس آ کر رکی تھی اور اس میں سے ملیسا نکلی تھی۔ ملیسا کی آواز میں نیروں کی کاٹ تھی۔ حمدان اسے دیکھتا رہا۔

”ایک ادنیٰ لڑکی کا سوگ منا رہے ہو؟“ وہ ابھڑ آنے والی نہیں تھی۔ ”جلی جاؤ یہاں سے ملیسا!“ اس نے عاجز آتے ہوئے کہا اور اسے برے کر کے آگے ہوا تھا۔ وہ ملیسا جیسی مخلوق کے منہ لگنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ ملیسا کو اپنی ہنگ کا احساس ہوا تھا۔ ”تم نے مجھے کم جانا..... لیکن دیکھو۔ کیا کرتے کیا میں نے..... تم کس حال میں ہو اور وہ کہاں گم ہے۔ ابھی بھی میرے ٹیلنٹ کی داؤدیں دو گے؟“ حمدان جاتے جاتے پلٹا تھا۔ اس نے ملیسا کو دیکھا تھا۔ جواز ہر کی لپ اسٹک ہونٹوں پر سجائے مسکرا رہی تھی۔

”تو..... یہ سب تم نے کیا ہے؟“ اس نے پوچھا۔ ملیسا نے ایسے کندھے اچکائے کہ ہاں میں نے ہی کیا ہے جو ہوتا ہے کرلو۔ ”تم تو میری سوچ سے بھی زیادہ غلط فکریں ملیسا! تمہیں یہ سب کرتے ہوئے شرم نہیں آتی؟“ ”مجھے سب کے سامنے ذلیل کرتے ہوئے تمہیں بھی تو شرم نہیں آتی تھی۔“

”اس فریبی دنیا کا یہ ہی تو مسئلہ ہے ملیسا کہ یہاں ہر کوئی خود کو جیتتا ہے۔ میری دعا ہے کہ وقت تم پر آشکار نہ کرے کہ تم غلط تھیں کیونکہ جب وقت بدل لیتا ہے تو سارے لحاظ بلائے طاق رکھ دیتا ہے۔“

”تمہاری دعا کا شکر یہ حمدان!“ اس نے آگے بڑھا کر اسے چومنا تھا، پھر کار اسٹارٹ کر کے اس میں بیٹھ کر چلی گئی تھی۔ حمدان وہی کھڑا اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا تھا۔

☆☆☆

یہ ججز کے سامنے اس کا دوسرا شو تھا جس کی اس نے بہت تیاری کی تھی۔ برطانیہ گوٹ ٹیلنٹ کے

آڈیشن میں وہ بہت آرام سے سلیکٹ ہو گئی تھی اور اس کے بعد ججز کے سامنے ایک پرفارمنس بھی دے چکی تھی۔ وہ مختصر تھی، ماہر تھی اسی لیے ٹیم بھی اسے خاص محنت کرواتا تھا۔ وہ بہت پر امید تھی کہ وہ دیکھنے والوں کو حیران کر دے گی لیکن وہ خود حیران رہ گئی تھی۔ جب اس نے ابتدائی نشستوں پر حمدان کو بیٹھے دیکھا تھا۔ ہوا میں ایک دم سے آئینے کے ذرات کاربن میں بدل گئے تھے۔ اس کا سانس کیسے نہ اکھڑتا؟ وہ پورے دو ماہ کے بعد ایسے دیکھ رہی تھی۔ پتا نہیں حمدان کی کیا حالت تھی۔ وہ خاموشی سے اپنی سیٹ پر بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ وہ جیسے پتھر کا بتا ہوا نہیں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اپنی وجہ سے برہا کا کرب خراب نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن کرب خراب ہو چکا تھا۔ اس کی سانسوں کی طرح اس کے ہاتھوں کی ترتیب بھی ادا ہیز بن کا شکار ہو گئی تھی۔ وہ سب رٹا رہا بھول گئی تھی۔ کیا کرنا ہے، کیسے کرنا ہے، وقت کی اہمیت..... اسے جیسے کچھ بھی یاد نہیں رہا تھا۔ وہ بہت حد زور ہو گئی تھی اور لگ بھی رہی تھی اور جب اسے پکا یقین ہو گیا کہ وہ ٹوٹے شیشے اکٹھے کرنے میں ناکام ہو رہی ہے تو اس نے ججز سے سوری کہہ دیا تھا۔ ”کوئی بات نہیں..... اکثر ایسا ہو جاتا ہے۔ ہم آپ کو ایک اور چانس دیتے ہیں۔ ایک گھنٹے بعد آپ پھر سے پرفارم کر سکتی ہیں۔“ وہ آنکھوں کے آنسو صاف کرتی ہوئی واپس گرین روم میں گئی تھی۔

”اب کیوں آ گیا ہے یہ یہاں..... اب کیا چاہیے اسے۔“ وہ ڈیرینک پر بڑی اپنی چیزیں ایک ایک کر کے پھینکنے لگی تھی۔ ایک گھنٹے بعد اسے پھر سے انج پر جانا تھا اور وہ جانتی تھی کہ وہ ایک گھنٹے بعد بھی کچھ نہیں کر سکے گی۔

”ڈیٹیل..... کیا تم ناظرین میں سے کسی ایک کو باہر نکال سکتے ہوں؟“ اس نے میجر ڈیٹیل سے کہا تھا۔ ”لوگ یہاں پر ٹکٹ خرید کر آئے ہیں مائی

ڈیر! میں کیسے کسی کو نکال سکتا ہوں۔“

”کسی بھی طرح..... پلیز میرے کہنے پر..... میری خاطر..... اگر وہ وہاں پر ہوا تو میں کچھ بھی نہیں کر سکوں گی۔“ اس نے منت بھرنے نیچے سے کہا تھا۔

”وہاں سے نکلوانے سے بہتر ہے کہ تم اسے پہلے دل سے نکالو۔“ ڈینیل ایک لمحے میں ساری بات سمجھ گیا تھا۔ وہ اس کی شکل دیکھتی رہ گئی تھی۔

”اچھا بتاؤ ان میں سے کون ہے وہ..... کوشش کرتا ہوں۔“ ڈینیل اسکرین پر لوگوں کے جھوم کے فوج اسے دکھانے لگا تھا۔

”وہ تیسری رو میں بیٹھا ہے۔ حجر کے دائیں طرف۔“ اس نے یاد کرتے ہوئے کہا تھا۔

”لو دیکھو..... بولو کون ہے وہ.....“ ڈینیل اسے وہاں کی ہی فوج دکھا رہا تھا جہاں اس کا اس نے بتایا تھا۔ وہ وہاں حمدان کو تلاش کرنے لگی تھی لیکن اسے حمدان وہاں کہیں بھی بیٹھا نظر نہیں آیا تھا۔ حمدان تو وہاں تھا ہی نہیں۔

”بولو بھی..... کہاں ہے وہ؟“

”لگتا ہے وہ چلا گیا ہے۔“

”سیٹس تو ساری بک ہیں۔ وہ چلا گیا ہوتا تو اس کی سیٹ خالی ہوتی۔“ ڈینیل ٹھیک کہہ رہا تھا تو کیا وہ واقعی یہاں نہیں آیا تھا۔ یہ اس کا خیال تھا؟ لیکن کیوں تھا؟ وہ تو اس سے شدید نفرت کرنے لگی تھی اور دشمن اس طرح خیلوں میں نہیں آتے جیسے وہ آیا تھا۔

”تم تیاری کرو..... مایوس مت کرنا۔“ ڈینیل اسے تھکی دیتا ہوا چلا گیا تھا۔

ایک گھنٹے بعد وہ پھر سے اسٹیج پر گئی تھی۔ حمدان وہاں نہیں تھا۔ اس کے باوجود وہ بمشکل ہی شو پیش کر سکی تھی۔ اور بمشکل ہی اگلے مرحلے کے لیے کوالیفائیڈ ہوئی تھی۔

تھک کر وہ ہوٹل واپس آئی تو اس کے کمرے کے دروازے پر ایک کارڈ لگا ہوا تھا۔

”اگلے راونڈ کی مبارک باد..... تمہاری

کامیابی کے لیے دعا گو۔“ کارڈ سے ”ڈارک نائٹ“ کی خوشبو اٹھ رہی تھی۔

تو وہ وہاں آیا تھا۔ اس کے دل کی کھال سکنے لگی تھی۔

”کیسی تم یہاں.....؟“ وہ کبھی کو وہاں دیکھ کر حیران ہوئی تھی۔ ہوٹل کے کمرے میں دستک ہوئی تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ کھانا آ گیا ہے جس کا اس نے آڈر دیا تھا لیکن یہ تو کبھی تھی۔

”کیسی نے برہا کی حیرت کی کوئی پروا نہیں کی تھی۔ وہ میز پر نظروں سے برہا کو دیکھتے ہوئے اندر چلی گئی تھی۔

”مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی برہا!“ اندر پہنچ کر اس نے کہا تھا۔ ”اس طرح چھوڑ کر آگئی ہو مجھے۔ بنا بیٹائے.....“ کبھی نے شکوہ کیا تھا۔ برہا کے پاس کبھی کی بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔

”میں نے تو سنا تھا کہ مشرقی لوگ، دوستی اور تعلق داری نبھانے میں بہت مشہور ہیں۔ کچھ ان کی لاج ہی رکھ لیتی تھی۔“

”مشرقی لوگ نازک دل کے ہوتے ہیں۔ وہ حساس ہوتے ہیں۔ کیا یہ نہیں سنا تم نے؟“ اس نے اسے لا جواب کیا تھا۔

”جو بھی لڑائی تھی وہ حمدان سے تھی۔ مجھ سے اور ریکی سے تو نہیں..... تم اتنی دور چلی آئیں۔ میرے گھر رہنا شروع کر دیتیں۔“

”مجھے ڈرتا تھا کہ اگر میں نے اپنے بارے میں تمہیں کچھ بتایا تو تم حمدان کو بھی بتا دو گی اور اسی لیے تمہارے گھر رہنے کا تو سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔“

”ایسی بات نہیں ہے۔“ کبھی نے تھوک نکلنے ہوئے کہا تھا کیونکہ وہ جھوٹ بول رہی تھی۔ ایسی ہی بات تھی۔ اگر برہا اس کی طرف رہتی یا اسے اپنے بارے میں کچھ بتاتی تو کبھی نے اب تک حمدان کو بتا دیا ہوتا۔

”ویل..... میری پاس تمہارے لیے ایک

ماس نیوز ہے۔ اس دن جو حمدان نے.....“

”کیسی.....“ برہا نے اسے درمیان میں ہی نہ دیا تھا۔

”کیا ہے؟“ اس کی آنکھوں کی سختی دیکھ کر کبھی ناؤش ہوئی تھی۔

”کیرن کے بارے میں کچھ مت کہو۔ تم کچھ ہی نہیں جانتیں۔“

”اور اگر میں بھی یہ ہی کہوں کہ تم کچھ نہیں جانتی.....“

”دراصل اس دن.....“

”کبھی انہیں میری دوستی کی قسم۔ ایک لفظ ہی مت کہنا۔ میں کچھ سننا نہیں چاہتی۔“

”لیکن برہا!“ کبھی افسردگی سے بولی تھی۔ وہ تو غلط فہمی دور کرنے آئی تھی اور برہا کچھ سننے کے لیے تیار ہی نہیں تھی۔

”اگر تم اب آگے سے ایک بھی لفظ بولی تو میں بھی اس بات پر یقین کر لوں گی کہ آسمان کے لوگ بے مہر ہوتے ہیں۔“ اس نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ ”حمدان کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں۔“ برہا نے سختی سے کہا تھا۔ کبھی کے پاس خاموش ہو جانے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا۔

☆ ☆ ☆

اگلا شو پانچ دن کے بعد تھا اور وہ پہلے کی طرح بنز کو مایوس نہیں کرنا چاہتی تھی۔ صبح اٹھ کر وہ جلدی سے پریکٹس روم میں آ جاتی تھی اور پاگلوں کی طرح پریکٹس شروع کرتی تھی۔ لیکن اس سے نارمل لوگوں کی طرح بھی پریکٹس نہیں کی جاتی تھی۔

”تم مشکل ایکٹ نہ لو..... بلکہ کوئی عام سا ایکٹ لے لو۔“ ڈینیل نے اسے ہلکان ہوتا دیکھا تو اس سے کہا تھا۔

”عام ایکٹ تو سب کرتے ہیں۔ میں کچھ خاص کرنا چاہتی ہوں۔“

”خاص کے چکر میں کام خراب کرنے سے

بڑے ہے تم عام کر لو لیکن ٹھیک سے کر لو۔“ ڈینیل

تنبیہ کر رہا تھا۔ وہ غصہ دہائی ہوئی جھجک روم میں

آئی تھی، اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ پانی کی بوتل کو اس نے اپنے ہونٹوں سے لگایا تھا۔ لیکن پانی ہونٹوں سے بہہ کر نیچے گر رہا تھا۔ منہ میں نہیں جا رہا تھا۔ نجانے اسے کس کس بات کا غصہ تھا۔

”میں پریکٹس کروا دوں۔“ ایک نرم آواز کمرے میں گونجی تھی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تھا اور اس کا شک یقین میں بدل گیا تھا۔ وہ اس کے سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ کمرے میں ڈارک نائٹ کی خوشبو پھیل گئی تھی۔ جو اسے پاگل کر دیتی تھی۔ برہا کو کبھی

میں نہ آئی کہ وہ اپنا پہلا رول کیا غما کرے۔

”آؤ میں تمہیں پریکٹس کروا دوں؟“ اس نے اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے پیار سے کہا تھا۔ (تو کیا یہ تھی اس کے خواب کی تعبیر.....؟)

”ایک بار ہوا شخص مجھے کیا پریکٹس کروائے گا۔“ اس نے اس پر طنز کیا تھا۔

”مجھے اپنی ہمار منظور ہے۔ تم کیوں جیت.....“

”کیا کرنے آئے ہو یہاں؟“ اس نے اسے درمیان میں ہی ٹوکا تھا۔ ایک دم سے جیسے اسے اس بات کا احساس ہوا تھا کہ یہ یہاں آیا کیوں ہے؟

”تمہیں جوتانے۔“ اس نے مسکرا کر بڑے پیار سے کہا تھا۔ اپنے غصے کو قائم رکھنا برہا کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔

”لیکن مجھے تمہاری مدد کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ کہہ کر اٹھی تھی اور باہر جانے لگی تھی۔

”برہا.....“ اس نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

”چھوڑو میرا ہاتھ مسٹر حمدان!“ وہ نفرت سے چلائی تھی۔ آواز گردش کرتی ہوئی چاروں طرف پھیلی تھی جو جہاں جہاں چل رہا تھا وہاں ہی رک گیا تھا۔

”تم سمجھتے کیا ہو خود کو..... کتنے روپ دھارو گے خود پر..... میں نے مان لیا کہ تم بہت بڑے جادو گر ہو..... بہت بڑے۔ عوام کے ساتھ کھیلنا مجھی جانتے ہو اور دلوں کے ساتھ بھی..... لیکن مجھ پر اب تمہارا کوئی زور نہیں چل سکتا..... سمجھے تم۔“ وہ اتنی تیزی سے چلائی تھی کہ سب اپنے اپنے کام بھول کر

ان دونوں کے پاس آکھڑے ہوئے تھے۔ حمدان اس کی شکل دیکھتا رہ گیا تھا۔

”اتنی نفرت؟“ وہ بس اتنا ہی کہہ سکا تھا۔
”اگر تم میری نفرت کو ناپ سکتے تو تمہیں انداز ہوتا کہ دنیا کا بلند پہاڑ بھی اس کے آگے کچھ نہیں ہے۔ گہرے سمندر کی گہرائی بھی اس نفرت کے آگے کم ہے۔ تم نے دھوکے سے بھی بڑھ کر ڈھ دیا ہے مجھے۔“

”اس سب کی ہی توضاحت کرنے آیا ہوں۔“
”مجھے کوئی وضاحت نہیں چاہیے، سنا تم نے۔ کچھ نہیں جانتا مجھے۔“ وہ چلائی تھی اور اس نے باس بڑا گلہ ان زمین پر دے مارا تھا۔ شور کا جتنا کا ہوا تھا۔ ڈنیل بھی کمرے میں آیا تھا اور ٹوٹے ہوئے گلہ ان کو دیکھنے لگا تھا۔

”آخری موقع بھی نہیں دو گی؟“
”دوں گی۔ اپنی آخری سانس کے وقت..... اگر تم چاہتے ہو کہ میں خود کو ختم نہ کروں تو یہاں سے چلے جاؤ اور پھر بھی یہاں مٹ آنا۔“ وہ اتنی شدت سے اس سے نفرت کرنے لگی تھی حمدان کو اندازہ بھی نہیں تھا۔ وہ یک ٹک اس کی شکل دیکھتا رہا تھا۔

”جارہا ہوں اور اب ایسے جاؤں گا کہ تم بھی مجھے ڈھونڈنا چاہو گی تو میں تمہیں نہیں ملوں گا۔“
حمدان نے جاتے وقت کہا تھا۔ نجانے کیوں برہا کا روم روم اس آواز اور اس دھمکی پر کانٹ کر رہ گیا تھا۔ لیکن وہ پھر بھی حمدان کو نہیں روک سکی تھی۔ حمدان چلا گیا تھا۔ سب اس کو دیکھنے لگے تھے۔ جو غصے کے باعث کانٹ رہی تھی اور جس کی سانس نارمل حالت میں واپس نہیں آ رہی تھی۔

”اگر تم برطانیہ کوٹ ٹیلنٹ جیت گئیں تو امید ہے کہ مجھے اس گلہ ان کے پیسے دے دو گی جو تم نے ابھی ابھی توڑا ہے۔“ ڈنیل نے حمدان کے جانے کے بعد کہا تھا۔ برہانے اسی وقت اپنا ہینڈ بیک پکڑا تھا اور بنا گئے بہت سے پیسے نکال کر ڈنیل کے ہاتھ میں دے مارے تھے۔ ”میرا یہ مطلب نہیں تھا۔“

ڈنیل پتا نہیں شرمندگی سے کہہ رہا تھا کہ نہیں۔
”لیکن میرا مقصد یہ ہی ہے کہ اسے تمہارے منہ پر دے ماروں۔“ اس نے غصے سے کہا تھا۔ خود کو نارمل کرتی ہوئی وہ پھر سے پریکٹس روم میں گئی تھی۔ ”تم سے آج مشق نہیں ہو سکے گی، بہتر ہے کہ تم گھر چلی جاؤ۔“ پریکٹس کروانے والے نے اس سے کہا تھا۔

☆☆☆

یہ سی فائل کا شو تھا۔ جس میں اسے پر فارم کرنا تھا۔ اگر وہ اس میں باس ہوئی تھی تو آگے فائل تک جاتی تھی۔ اس سی فائل کے لیے اس نے اتنی ہی محنت کی تھی جتنی وہ اپنی طور پر کر سکتی تھی اور جتنی اس سے ان دنوں ہو سکتی تھی۔ وہ ذہنی طور پر نارمل نہیں تھی۔ اس سے کام پر فوکس نہیں ہوا جا رہا تھا۔ جتنا وہ سوچتی تھی کہ اب اس کا حمدان سے کوئی تعلق نہیں۔ ذہن اتنا ہی اس کے خلاف جا کر نجانے کون کون سے تعلق ڈھونڈ لاتا تھا۔ دوستی کا تعلق، استاد کا تعلق، باس کا تعلق، مددگار کا تعلق اور..... اور..... محبت کا تعلق۔

اس نے جیسا تیسرا پر فارم کر دیا تھا۔ ججز آپس میں مشورہ کرنے لگے تھے۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ اس کی پرفمنس اچھی نہیں تھی۔ ورنہ انہیں اس پر سوچ بچار نہ کرنی پڑتی۔
”آپ اگلے راؤنڈ کے لیے کوالیفائیڈ نہیں ہوتی۔ آپ کا سفر یہاں ہی ختم ہوتا ہے۔“ اس سے کہا گیا تھا اور آٹسو خود کا طریقے سے اس کی آنکھوں سے نکلے تھے۔ ”ہمیں افسوس ہے۔ لیکن آپ اگلے راؤنڈ کے لیے نہیں جا سکتیں۔“ ججز اس کا دل رکھ رہے تھے اور اس کا دل کر رہا تھا کہ وہ دھاڑے مار مار کر روئے۔

اگلے سے بیک آج آنے کا سفر جیسے صدیوں میں ہوا تھا۔ سب اپنے اپنے شو کی تیاری کر رہے تھے۔ کسی کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ کوئی اس کی دادرسی کرتا..... ایک ڈنیل ہی تھا جو اس کے پاس آیا تھا۔

”تم اس لیے نہیں ہاری! کہ تم میں ٹیلنٹ کی کمی ہے بلکہ تم اس لیے ہاری ہو کہ تم منتشر ہو۔“ ڈنیل نے کہا تھا۔ لیکن اس نے جیسے سنا ہی نہیں تھا۔

”ہوئے شخص سے جو بھی کہہ دیا جائے۔ اس کا دلہا ہی لم نہیں کر سکتا اور جیتے ہوئے شخص کو کچھ بھی برا نہیں کیا جائے۔ اس کی خوشی کوئی بات کم نہیں کر سکتی۔ ہول کے کمرے میں واپس آ کر وہ دھم سے اپنے پر گری تھی اور رونا شروع ہو گئی تھی۔ اس نے اپنے جلانے کی زحمت بھی نہیں کی تھی اور اندھیرے کمرے میں اب اس کے رونے کی آواز ایسے گونج رہی تھی جیسے کمرے میں ایک ساتھ بہت سی چڑیلیں اٹی ہوئی ہوں۔ وہ اپنی اس ہار کا ذمہ دار بھی حمدان کو ہی مان رہی تھی۔

”تم آئے ہی کیوں میری زندگی میں حمدان!“
وہ روتے ہوئے شکوہ کر رہی تھی۔ اس سے جو حاضر نہیں تھا۔

نجانے اسے اسی طرح روتے روتے کتنی دیر ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھ لگ گئی تھی یا اس پر غنودگی طاری تھی کہ تھوڑی دیر کے بعد جھٹکے سے اس کی آنکھ کھلی تھی۔ اندھیرے کمرے میں ٹی وی کی اسکرین روشن ہوئی تھی اور وہاں پر ملیسا کی شکل نظر آئی تھی۔

”ہاں..... میں نے ہی حمدان اور برہا میں پھوٹ ڈلوائی ہے۔ اپنی بے عزتی کا بدلہ لیا ہے۔ لیکن نے اور میں نے مل کر دونوں کے ساتھ گیم کھیلی تھی۔ حمدان خود سے نہیں آیا تھا کیون کے پاس..... بلکہ کیون نے ہی اسے فورس کیا تھا کہ وہ شو ایلے کرے۔“ ملیسا چلاتے ہوئے ٹی وی اسکرین پر کہہ رہی تھی اور بری طرح سے رو رہی تھی۔

☆☆☆

ملیسارات گئے اپنے گھر آ رہی تھی جب ایک رفقار کار اس کے پاس چرچراتے ہوئے رکی۔ ایک سینیڈ بھی نہیں لگا تھا اور کار کے اندر سے ایسی نے جھٹکے سے ملیسا کو اندر کھینچ لیا تھا۔ وہ چلا بھی نہیں سکی تھی۔ اس کے منہ پر نرم رومال رکھا گیا تھا اور پورہ نہیں جانتی کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ آنکھ کھلی تو وہ ایک اندھیرے کمرے میں تھی اور اس کے ہاتھ پاؤں بندھ کر اسے ایک کرسی پر بیٹھا دیا گیا تھا۔

”کون ہے.....؟ مجھے چھوڑو..... مجھے آزاد کرو..... کیا چاہتے ہو تم.....؟ کون ہے؟ کس نے مجھے اغوا کیا ہے؟“ بند اور اندھیرے کمرے میں وہ گھنٹوں چلائی رہی تھی اور کسی نے اس کے سوالوں کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ یہ سارا عمل اسے ذہنی طور پر تھکانے کے لیے تھا اور اس کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا تھا۔ محض دو ہی گھنٹوں میں ملیسا چلاتے چلاتے بے دم ہو گئی تھی۔ اسے شاید پیاس بھی لگ رہی تھی اور بھوک بھی اور اس کے ہاتھ پاؤں بھی سختی سے بندھے ہوئے تھے۔ وہ کلبا رہی تھی۔

”مجھے آزاد کرو، کوئی ہے؟“ وہ اب آہستہ آواز سے چلا رہی تھی۔

”مہاشکتی..... مہادپوی.....“ ایک جلائی آواز کمرے میں گونجی تھی اور ملیسا کی روح پرواز کرتے کرتے رہ گئی تھی۔

”ک.....ک.....کون.....؟“

”تمہارے گناہوں کے بدلہ ان کے طور پر تمہیں اس قبر میں لایا گیا ہے۔ مہاشکتی خود تمہارے منہ سے تمہارے گناہ سننا چاہتی ہے۔ پھر ہی تم اس قبر سے نکل سکتی ہو.....“ آواز نے کہا تھا۔

☆☆☆

”ہاں..... میں نے ہی حمدان اور برہا میں پھوٹ ڈلوائی ہے۔ اپنی بے عزتی کا بدلہ لیا ہے۔ لیکن نے اور میں نے مل کر دونوں کے ساتھ گیم کھیلی تھی۔ حمدان خود سے نہیں آیا تھا کیون کے پاس..... بلکہ کیون نے ہی اسے فورس کیا تھا کہ وہ شو ایلے کرے۔“ برہا چلاتے ہوئے ٹی وی اسکرین پر کہہ رہی تھی اور بری طرح سے رو رہی تھی۔

”مجھے وہ لڑکی شروع سے ہی پسند نہیں تھی۔ میں چاہتی تھی کہ میں اسے مار دوں..... پھر میں نے اسے ماریا، اس کی محبت کو مار کر.....“ ملیسا روتے ہوئے چلا رہی تھی۔

برہا حیرت سے سب دیکھ رہی تھی۔ پھر اچانک سے ٹی وی بند ہو گیا اور کمرے میں روشنی ہو گئی۔ برہا

کی اندھیرے کی عادی آنکھیں لمحے بھر کو چندھیان کی تھیں۔ کیتھی نے خیال کیا کہ اس سے نکل کر اس کے سامنے آکر کھڑی ہوئی تھی۔

”من لیا تم نے.....“ کیتھی نے کہا تھا۔
”یہ سب کیا تھا کیتھی؟“ وہ ابھی بھی شاکد تھی۔
”میں نے اپنے گناہ کا اعتراف کر لیا ہے۔“
”لیکن کیسے؟“

”ابھی ابھی نہیں سمجھیں، ابھی میں نے کروایا ہے اس سے گناہ کا اعتراف..... مہاشتی نے.....“ کیتھی نے خود کو فخر سے بلند کر کے کہا تھا۔ ”اور جس کے تم اتنے خلاف ہو..... اس نے ملیسا کو اغوا کیا تھا۔ اپنی جان خطرے میں ڈال کر چلنے۔ اس دن میں تمہیں یہ بتانا چاہتی تھی کہ اس سب کے پیچھے ملیسا کا ہاتھ ہے۔ لیکن تم میرے آباؤ اجداد تک پہنچ گئی کہ اگر میں ایک بھی لفظ بولی تو تم سمجھو گی کہ ہم لوگ واقعی میں بے مہر ہوتے ہیں۔ پھر سوچا تمہیں خط لکھوں اور اس میں یہ ساری تفصیل لکھوں۔ لیکن پھر وہ چینی قول یاد آیا کہ ایک تصویر ایک ہزار لفظوں سے بہتر ہوتی ہے اور دیکھو..... ملیسا کی ایک منٹ کی ویڈیو نے میرے ہزاروں لفظوں کو بچا لیا ہے۔“ کیتھی نے ساری تفصیل بتائی تھی۔ برہانے دم کی ہو کر رہ گئی تھی۔

”اوہ میرے خدا! اس نے ملیسا کی ایسی ناقابل یقین حرکت پر انفس کرتے ہوئے کہا تھا۔ کیتھی اس کے پاس آئی تھی۔ اس نے پیار سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔

”نہ تم اتنے دعوؤں کے بعد برطانیہ گوٹ ٹیلنٹ جیت سکی ہو اور نہ ہی وہ امریکا گوٹ ٹیلنٹ..... پتا ہے کیوں؟ کیوں کہ خدا تمہیں بتانا چاہتا ہے کہ تم الگ الگ کچھ بھی نہیں ہو۔ جو وہ وہ ایک ساتھ ہو۔“ کیتھی نے بے حد گہری بات کہی تھی۔ اس نے کیتھی کی طرف دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

”ہاں میری جان! یہ سچ ہے۔ تمہاری محنت پر

مجھے کوئی شک نہیں..... لیکن جڑ کے ہٹا پودا بھی پانی حاصل نہیں کر سکتا اور تنے کے ہٹاتے بھی نہیں آگے آگے۔ اسے تمہاری جیسی ہیلر نہ لی اور تمہیں اس جیسا استاد۔“ کیتھی جو کہہ رہی تھی سچ کہہ رہی تھی۔ برطانیہ گوٹ ٹیلنٹ کی پوری ٹیم جو اسے تیاری کروا رہی تھی ان سب پر ایک حمدان والی میں بھاری تھا۔ وہ بھی دل کے ساتھ سب سن رہی تھی۔

”اپنی ہار کو اپنی جیت بنالو، میری پیاری.....“ ”کیسے؟“ وہ رندمی آواز سے پوچھنے لگی۔
”اس ہارے ہوئے شخص کو کبھی اپنے ساتھ ملاؤ۔ دو ہارے ہوئے لوگ پھر سے سخت کر دواؤ دیکھو کہ سہاٹی کیسے تمہارے قدم چومتی ہے۔“

”لیکن میں اسے اپنی زندگی سے نکال چکی ہوں اور وہ بھی کہہ چکا ہے کہ وہ اب بھی مجھے نہیں ملے گا۔“ برہانے کہا تھا۔ لیکن کیتھی جیسے سن نہیں رہی تھی۔ اس نے بنا برہانہ کی اجازت کے حمدان کو کال ملا دی تھی۔

”کسے کال کر رہی ہو؟“ اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکن بڑھنے لگی تھی۔

”حمدان کو..... لیکن اس کا نمبر بند جا رہا ہے۔ لگتا ہے اب نیویارک جا کر ہی اس سے ملنا ہوگا۔“

☆☆☆

حمدان کہاں تھا اس کا کسی کو نہیں پتا تھا۔ اس کے گھر سے پوچھنے پر پتا چلا تھا کہ وہ دو ہفتوں سے غائب ہے یعنی جب برہانے چیلنجنگ روم میں اس کے بے عزتی کی تھی تب سے..... اس کے دوستوں نے بھی اس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔

”ہمیں تو خود نہیں پتا کہ وہ کہاں گیا۔ اچانک سے ہی غائب ہو گیا ہے۔“ سب کا یہی کہنا تھا۔ جہاں جہاں جاسکتی تھی وہ جہاں جہاں اسے شک تھا کہ وہ ہوگا اس نے اس کا پتا کیا تھا لیکن کہیں نہیں تھا۔

”جارہا ہوں اور اب ایسے جاؤں گا کہ تم مجھے ڈھونڈنا چاہو گی تو میں تمہیں نہیں ملوں گا۔“

ان نے جاتے وقت کہا تھا۔
اسے اس کی بات یاد آئی تھی اور اس کی روح اٹھ اٹھ ہو گئی تھی۔ ”تو اس نے وہ کر دکھایا تھا اس کا دعویٰ کیا تھا۔“

حمدان کی امی الگ رو رہی تھیں۔ ان کے ان بیٹے کا کہیں پتا نہیں تھا۔ جیڈ الگ اسے تلاش کرتے ہوئے بلکان ہو رہا تھا۔ کیتھی الگ مہاشتی، مہادپوی کی مدد لے رہی تھی اور فلیٹ میں ری می اس کا ہڈ بانی سہارا بنی ہوئی تھی۔ جس طرح انہوں نے ایک وقت میں برہانہ کو تلاش کیا تھا اب وہ سب اسی طرح حمدان کو تلاش کر رہے تھے اور حمدان خود چھپ کر جیسے اپنی تلاش کا برہانے بدل لے رہا تھا۔

”اگر یہ میرا ہو جائے تو میں دنیا کی اس مہلت کی مالک بن جاؤں گی جو آج سے پہلے شاید کسی کو نصیب ہوئی ہو۔“ ایک بار اسے ہنسا ہوا دیکھ کر اس نے سوچا تھا۔ یہ بات یاد آتی ہی اسے وہ اور اس کی ہنسی بھی یاد آگئی جو اس وقت اس کے بس سے باہر ہو رہی تھی اور تھکنے میں نہیں آ رہی تھی۔

”اپنی شکل دیکھو ذرا..... بھوت بنگلانی ہوئی او اور تمہاری آواز..... کاش میں اسے ریکارڈ کر لیتا۔ امی.....!“ اس نے اس کی نقل اتاری تھی اور پھر دل کھول کر ہنسا شروع ہو گیا تھا۔

”حمدان..... مجھے بچاؤ.....“ ہاتھ اس نے اپنے منڈوں میں دے لیے تھے اور اب دیر ہوا جا رہا تھا۔ سب یاد کر کے وہ خود بھی مسکرا اٹھی تھی۔ ”شکر ہے ان پندرہ دنوں میں تم بھی لڑائیں۔“ ری می نے کہا تھا۔ وہ پھر سے سنجیدہ ہو گئی تھی۔ جیسے اس کی مسکراہٹ کوئی گناہ ہو۔

”کیتھی مجھے تمہیں ہنسنے ہوئے نہیں ٹوکنا چاہیے۔“ ری می افسردگی سے کہہ کر ایک طرف بیٹھ گئی تھی۔ بہار آچکی تھی۔ ہر طرف پھول کھلے ہوئے تھے ان اس کی آنکھوں کو نجانے کیوں کانٹے ہی نظر آ رہے تھے۔ عجیب کھیل کھیل رہی تھی اس کی تقدیر آہ اس کے ساتھ..... پہلے حمدان اس کے پاس آ رہا

تھا اور وہ نہیں مان رہی تھی۔ اب وہ اسے ڈھونڈ رہی تھی اور حمدان اسے نہیں مل رہا تھا۔ کیا محبت جدائی کا خراج ضرور لیتی ہے۔ کیا اسے ناراضی، غصے، انا سے اتنی ہی محبت ہے جتنی انسانوں کو نفرت ہے۔

”مجھے اب پاکستان واپس چلے جانا چاہیے۔“ ایک دن اس نے ری می سے کہا تھا۔ ری می نے ڈھک سے اس کی طرف دیکھا تھا۔ اگلے دن سے اس نے اپنا سامان پیک کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس کا دہاں پر کوئی نہیں تھا تو یہاں پر بھی وہ سب کچھ کھو چکی تھی۔

☆☆☆

”کیتھی یہ تم مجھے کہاں لے آئی ہو۔“ وہ لڑکھرائی ہوئی چل رہی تھی۔ کیتھی نے اس کے پیچھے ہارچ پکڑی ہوئی تھی جس جگہ وہ دونوں آئی تھیں اس جگہ دنیا بنے سے بھی پہلے والا اندھیرا جھپا ہوا تھا۔ جگہ بہت دیرانہ اور ادراچی پٹی تھی۔ وہ یقیناً کوئی کھنڈر تھا۔ جہاں بہت سے درخت بھی تھے۔ کوئی تباہ شدہ ہوٹل تھا یا بلڈنگ تھی یا شاید کیتھی اسے مرخ کر لے آئی تھی۔

”کیتھی..... یہ کون سی جگہ ہے۔“ ”جاو بستی.....“ کیتھی نے اس کے کان کے پاس منہ لاکر نفسو خیزی سے کہا تھا۔

”یہاں چوہوں کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا اور تم کہہ رہی ہو کہ یہاں حمدان ہے۔“ اس نے کہا تھا لیکن اسے اپنی بات کا کوئی جواب نہیں ملا تھا۔ اس نے پیچھے پلٹ کر دیکھا تھا اور جیسے ملک الموت کو دیکھ لیا تھا۔ کیتھی وہاں نہیں تھی۔

”کیتھی.....“ اس نے ہلکی آواز سے پکارا تھا۔ ”کیتھی..... کہاں ہو تم..... کیتھی! پلیز مذاق مت کرو۔ سامنے آ جاؤ..... میں اس طرح سے ڈرنے والی نہیں۔“ وہ کئی ڈرنے والی تھی۔ یہ اس کی لڑکھرائی ہوئی آواز بتا رہی تھی۔

”کیتھی.....! کہاں ہو تم.....؟“ وہ چلانے کے سے انداز میں بولی تھی۔ لیکن جواب نہیں آیا تھا۔ ”کیتھی.....“ اور اب کی بار وہ چلا آئی تھی کیونکہ اندھیرے میں جی جی آوازوں نے جنم لے لیا

عمر بے ساختہ کی جگہ

تشریفہ ریاض

ساتویں قسط

نارنگی



اگلی دفعہ پر..... ”میں نے تمہاری سانسوں کی خوشبو کو اپنے جیسا پایا۔“
اگلی دفعہ پر..... ”پھولوں کی خوب صورتی مجھے تمہارے آگے کم لگی۔“
اگلی دفعہ پر..... ”مجھے لگتا ہے تم اور میں ایک ہی مٹی سے بنے ہیں۔“
اگلی دفعہ پر..... ”تو آؤ..... پھر ایک ہو جاتے ہیں۔“ روشنی بند ہو کر پھر سے روشن ہوئی تھی اور براہ دھک سے رہ گئی۔

”مجھ سے شادی کرو گی؟“ ساری تتلیاں اور پھول پھر سے نکل آئے تھے۔ بورڈ اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ سر جھکائے اس عبارت کا عمل بنا بیٹھا تھا۔ ایک ہاتھ اس کی طرف بڑھائے۔ (تو کیا یہ بھی خواب کی تعبیر.....؟)

”جاؤ..... یہ ہی تو ہے تمہارے خواب کی تعبیر.....“ کبھی نجانے کہاں سے نکلی تھی اور اب سرگوشی میں اس کے کان میں کہہ رہی تھی۔ مکالمہ کیجی..... اس کے ایک خواب کی کوئی چوٹی مختلف تعبیر اسے بتا رہی تھی۔

نحمان کا ہاتھ مستقل اس کے ہاتھ کا منتظر تھا کون سی تعبیر اصل تھی وہ نہیں جانتی تھی لیکن اس سے بڑھ کر کوئی اور عجیبہ وہ چاہتی بھی نہیں تھی۔ ہاں..... ہی تو تھی اس کے خواب کی حقیقی تعبیر..... اس نے نہیں کی تھی اور آگے بڑھ کر نحمان کا ہاتھ تمام لیا تھا۔ آسمان پر جلتی رنگ ن رہے تھے۔ اس نے آنکھیں آسمان سے اتر لی ان آوازوں پر بھی توجہ نہ دی تھی۔ اب جب دی گئی تو جھوم اٹھی تھی۔

☆

تھا۔ جو جانی پہچانی نہیں تھیں اور جان نکال دینے والی تھیں۔

”امی.....“ اس نے نعرے لگانے کے سے انداز میں کہا تھا اور وہاں سے بھاگی تھی اور تب ہی ویرانے میں ایک قہقہہ بلند ہوا تھا۔ جس نے اس کے قدم روک دیا تھا۔ دور کہیں ایک روشنی ہوئی تھی اور اس نے دیکھا تھا کہ وہاں کوئی کھڑا تھا۔ کون.....؟ آنکھوں کو پہچان ملی تو دل کو دھڑکن بھی مل گئی اور زندگی کو سانس لیں.....

وہ نحمان تھا۔ قدرے دور اور اونچائی پر..... سیاہ پیٹ کوٹ میں۔ سر پر ہیٹ ڈالے..... پھر اس نے اسی ہیٹ کو اتار کر سر کو تعظیم کے انداز سے نیچے جھکا دیا تھا۔

”مس برہا.....! اپنی زندگی کا سب سے بڑا جادو..... آپ کے لیے.....“ اس نے اسی کے انداز میں کہا تھا اور اپنے ہاتھ کو اپنے ہونٹوں کے پاس لاکر بڑے پیار سے اور مدھرتا سے ایک پھونک ماری تھی۔ سنہری برادے، افشاں کی ایک لہر اس کے ہاتھ کی انگلیوں کی پوروں سے اس کی پھونک کے زور اثر آگئی تھی اور توں بنائی، اڑتی ہوئی براہ تک گئی تھی۔ براہ کی ساری نظریں اس ایک کرتب نے اپنے پاس تمام عمر کے لیے رہن رکھ لی تھیں۔

پھر ایک دم سے لائب بند ہوئی تھی اور اگلے ہی پل روشن ہوئی تھی۔ اب وہ تتلیوں کے جھرمٹ میں تھا۔ اس کے آس پاس بہت سی رنگ پرنگی تتلیاں تھیں۔ روشنی بند ہو کر پھر سے جلی گئی۔

اب اس کے آس پاس پھول ہی پھول تھے۔ پھر یہ کھیل شروع ہو گیا۔ روشنی بند ہو کر جلنے کا۔ اب اس کے ہاتھ میں ایک سفید بورڈ تھا۔ جس پر کچھ بھی نہیں لکھا ہوا تھا۔ اگلی باری پر اس پر ایک عبارت لکھی ہوئی تھی۔ ”تم نے پہلی نظر میں مجھے اپنا گرویدہ کر لیا۔“ اس سے اگلی باری پر..... ”میری زندگی سے ادھر اور یہ..... مجھ سے کہیں بہت دور چلا گیا۔“

ساتھیو! میرے بیٹے کے لیے وہ وقت بہت مشکل تھا لیکن آپ سب کو اس کے حوصلے کی داد دینی چاہیے کہ وہ بہت ہمت کے ساتھ یہ سب برداشت کر رہا تھا۔ آپ کو اب احساس ضرور ہوا ہوگا کہ وہ منہ پھٹ اور خود پسند تو تھا لیکن خود غرض نہیں تھا۔ اس نے ہماری خاطر زمین کی بات ماننے سے انکار کر دیا تھا لیکن اس نے اس مسئلے کا جو حل نکالا تھا وہ ہمارے گمان میں بھی تھا اور محراب عرف سونیا پر قدم پر اس کے ساتھ تھی۔ اس کے باوجود ہماری زوجہ محترمہ کی خواہش کے پورے ہونے کا دور دور تک کوئی نام و نشان نہ ملتا تھا۔ میں آپ کو سب کچھ بتاتا ہوں۔

☆☆☆

”مجھے کچھ بھی سمجھ نہیں آرہا کہ یہ ہو کیا رہا ہے۔“ عطیہ بیگم نے ماسٹر جی کے سامنے اپنی پریشانی کا اظہار کیا تھا۔ وہ کچھ دیر پہلے ہی دکان سے واپس آئے تھے اور عادت کے مطابق انہوں نے آتے ہی انش کے متعلق سوال کیا تھا۔

”آپ کے تحت جگر کے مزاج کو سمجھنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے ماسٹر جی۔“ عطیہ بیگم نے بے تاثر سے لہجے میں کہا تھا۔ ”پہلے ہر وقت کمرے میں بند رہتا تھا کچھ کچھ بھل سا گیا اور ہنسنے بولنے لگا۔ کھانا بھی وقت پر اور گھر میں کھانے لگا تھا۔ اب پھر کچھ دن سے پھر ہر وقت جلا بخٹنا نظر آرہا ہے۔ صبح کا گیارہ گھنٹے کو واپس آتا ہے اور بات کرو تو کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔ کھانے کا جب بھی پوچھا تو فرما دیتے تھے کہ کھا کر آیا ہوں یا بھوک نہیں ہے۔ میں نے بھی ناراض ہو کر پوچھنا ہی چھوڑ دیا تو سونیا سے کہتا ہے کہ تم نے میری ای کو نا صرف کاہل بلکہ خود غرض بھی بنا دیا ہے۔ انہیں فکری نہیں ہوتی کہ اکلوتے بیٹے کو کھانے کا بھی پوچھنا ہے۔ بتاؤ کل کی بچی سے ماں کی شکایتیں کر رہے ہیں حضرت۔“ عطیہ بیگم شکوہ کر رہی تھیں۔ ماسٹر جی بیٹے کی حمایت میں کچھ بولنے سے پہلے ذرا سا مسکرائے۔ عطیہ بیگم نے سر جھکا جیسے انہیں یہ مسکراہٹ ایک آنکھ نہ بھائی ہو۔

”جی جی مجھے پتا ہے۔ اب آپ کہیں گے۔ اس کا مزاج ہی ایسا ہے۔ وہ بدستور نہیں ہے بس کچھ لا پرواہی اور محنت تو بہت کرتا ہے مجھ سے وغیرہ وغیرہ۔ دراصل آپ کی ان ہی باتوں نے اس کا مزاج سوائیز کر دیا ہے پھر پتہ چلا کہ ماسٹر جی۔ بچپن سے آپ نے اسے کچھ نہیں ٹوکا۔ ہمیشہ اس کی حمایت کرتے رہے۔ اس کی ہر بات مانی ہے تب ہی یہ دن دیکھتے رہے ہیں ہمیں۔ بہت بد مزاج اور خریلا سا ہوتا جا رہا ہے۔ مجھے تو اس بات کی فکر ہے کہ بچپن کی سبیلی کے سامنے ناک کٹ جائے گی میری۔ کیسے گزارا کرے گی سونیا اس کے ساتھ۔“ وہ پریشانی کا اظہار کر رہے تھیں۔

ماسٹر جی چونکے اور کچھ کہنا چاہا۔ اپنی اہلیہ کو کروانا چاہا کہ یہ قصہ تو ختم ہو چکا تھا لیکن پھر کچھ سو کر خاموش رہے کہ وہ اس بحث سے اکتا چکے تھے اب اور یہ بات بخوبی سمجھ چکے تھے کہ ہر تیسرے روز اہلیہ کو دیندو نصراخ کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ آج تو ان مزاج کچھ اچھا تھا اور بیگم سے الجھ کر وہ اسے خراب نہیں کرنا چاہتے تھے جبکہ وہ عادت کے مطابق انش کی شکایتیں کرنے میں مگن تھیں۔

”میری بات کہیں لکھ کر رکھیں ماسٹر جی۔ آپ کا ہونہار بیٹا ہمیں خاندان میں خوب شرم کروانے والا ہے۔ بے چاری بچی کو بہت مشکل ہو اس کے ساتھ رہنے میں۔ گوئے دیا کرے گی مجھے۔ ممانی نے خاک تربیت نہیں کی اپنی اکلوتے بیٹے کو۔“ وہ جسے جلی بھٹی بیٹھی تھیں۔ انش چند دن سے الجھنا الجھنا سا نظر آتا تھا جس وجہ سے وہ کچھ پریشان سی تھیں لیکن ان کا خیال رکھنے کا انداز ایسا ہی تھا۔ ماسٹر جی سے اس کی شکایتیں کرنے لگی تھیں۔ ماسٹر جی نے لفظ ”ممانی جان“ پر گہری سانس لی تھی۔ اب تو بالکل واضح ہو گیا تھا کہ وہ سونیا کی بات کر رہی تھیں۔

”آپ یہ کس سمت چل پڑیں۔ آپ کو کیوں نہیں آرہا کہ اس اسٹیشن پر کھڑے رہنے کا

وہ نہیں ہے۔ آپ کے بیٹے کی ٹرین اس اسٹیشن کو پہنچنے میں گزرنے والی۔ اس لیے آگے بڑھیں۔“ ماسٹر جی بچی بار اس موضوع پر بات کرتے ہوئے انداز میں بات کر رہے تھے۔ بیگم جھنجھلا گئیں۔ انہوں نے زندگی میں کسی بھی بار ماسٹر جی کا اعتراض یا مزاحمت برداشت نہیں کی تھی لیکن اس موضوع پر وہ ہمیشہ ہی ان کی مخالفت کرتے تھے جو انہیں بالکل اچھی نہیں لگتی تھی۔

”ماسٹر جی! آپ اب بھی نہیں سمجھتے تو خدا کی قسم سمجھیں گے۔ آپ نے انش کی ماں کر لیا ہے نا۔ کچھ نہیں ہاتھ آیا آپ کے۔ اب آپ کو سننی پڑے گی اور میرا فیصلہ یہی ہے۔ سونیا ہی بی بی ہو بنے گی۔ اتنی اچھی لڑکی ہاتھ سے جانے والی پاگل سمجھ رکھا ہے مجھے۔“ انہوں نے قطعیت سے لہجے میں کہا تھا۔ ماسٹر جی اس سمت میں بیٹھے تھے کہ باہر آنگن تک میں لگا ہڈی تھی۔ انہوں نے ہاتھ دیر پہلے وہاں کر سی رکھے سونیا کو بیٹھے دیکھا تھا۔ وہ اگرچہ اب وہاں موجود نہیں تھی لیکن وہ وہیں کہیں ان میں موجود تھی۔ اس نے یقیناً وہ سب سنا تھا جو بیگم کہہ رہی تھیں۔ ماسٹر جی کو اچھا نہیں لگا تھا۔ وہ انی چاہتے تھے کہ یہ باتیں بار بار سونیا تک پہنچیں لیکن بیگم اس معاملے میں لا پرواہی جاری تھیں۔

☆☆☆

”کیا سوچا ہے تم نے۔ اب کیا کرو گے؟“ بیگم نے اس کے سامنے کھانے کی ٹرے رکھتے ہوئے سوال کیا تھا۔

عطیہ بیگم پڑوس میں کسی کی بیمار پرسی کرنے گئی تھیں۔ انش آفس سے جلدی آ گیا تھا۔ اس کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ اسی لیے سونیا اس کے لیے دوا دے رہی تھی۔

کافی دن بعد کی بات تھی۔ اس رات کے بعد بیگم کے درمیان اس موضوع پر کوئی بات نہ ہوئی تھی۔ سونیا چاہنے کے باوجود اسے کرید کر لیا۔ کیونکہ وہ بلاوجہ کی جرح سے بہت جلدی

چڑھایا کرتا تھا اور بدتمیزی پر اتر آتا تھا۔ اسی لیے اس رات کے بعد سے اس معاملے میں سناٹا ہی چھایا ہوا تھا۔ لیکن پھر اس کی مسلسل خاموشی سے اکتا کر سونیا کو ہی یہ موضوع چھیڑنا پڑا تھا۔ وہ اس موقع کو ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی۔

اس کے والدین کینیڈا سے آنے والے تھے۔ وہ جانتی تھی کہ امی کی واپسی کے ساتھ ہی پھر وہی پرانا موضوع چھوڑ جائے گا۔ وہ ان کی واپسی سے پہلے سب چیزیں ٹھیک کرنا چاہتی تھی۔ اسی لیے اس نے خود ہی بات کا آغاز کیا تھا۔ انش نے سنی ان سنی کرتے ہوئے پہلے تو شور بے والے سالن کو دیکھ کر منہ بنایا پھر اکتا کر پلیٹ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے استغماہمہ انداز میں پوچھنے لگا۔

”کھانا تم نے بنایا ہے؟“ سونیا نے اس کے چہرے کے تاثرات کی جانب دیکھا پھر ذرا سا آگے ہو کر اس کی پلیٹ کی جانب دیکھا۔

”ہاں۔ لیکن تمہیں کیسے پتا چلا۔“ اس نے کچھ حیران ہو کر پوچھا تھا کیونکہ اس نے تو ابھی ایک لقمہ بھی نہ لیا تھا۔ انش کے چہرے کے تاثرات مزید خراب ہوئے۔

”اتنا وسیع و عریض شور بے والا سالن میری امی نہیں بنا سکتیں۔ انہیں پتا ہے میں ایک بونی کی خاطر شور بے کے اس تالاب میں سوئمنگ کرنے کے سخت خلاف ہوں۔“ روٹی کے ٹکڑے کو توڑ کر پلیٹ میں گھماتے ہوئے اس نے ناپسندیدگی سے کہا تھا۔ سونیا کو اس کا یہ جملہ سخت برا لگا۔

”یہ ذرا سا شور ہاتھیں تالاب لگ رہا ہے؟“ وہ بھی ناک چڑھا کر پوچھ رہی تھی۔ عطیہ بیگم کی طبیعت کچھ تھکسا ماسٹر جی سانس نے سالن بنالیا تھا۔ انش نے سر جھٹک کر ٹرے بالکل اپنے سامنے کی پھر ایک نظر سالن والی پلیٹ اور دوسری اس کے چہرے پر ڈھل کر بولا۔

”چار فٹ دس انچ کے حساب سے دیکھا جائے تو یہ واقعی تالاب نہیں بلکہ سمندر ہے۔“ وہ اسے

چڑانے سے باز نہیں آتا تھا۔ سونیا کو مزید نرا لگا۔
 ”تو پھر لگا دو غوطہ اس سمندر میں۔ ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔ کہیں تو فائدہ ہو تمہیں بھی، تمہارے اس چھٹ فٹ قد کا وزن اب تک تو ہم نے گھانا ہی ہوتے دیکھا ہے۔“ اس کا لہجہ کاٹ دار تھا۔ آتش کھوکھلی سی ایسی ہنس دیا جیسے کسی بچے کے احمقانہ طرز عمل پر ہنسا جاتا ہے۔ سونیا کو شرمندگی سی ہوئی وہ اسے طعنہ نہیں دینا چاہتی تھی لیکن وہ اسے مجبور کر دیتا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ معذرت کرتی وہ بولا تھا۔
 ”اب نہیں ہو سکتا کسی کو بھی فائدہ۔ سیانے کہتے ہیں جب پھل پیری کا سایہ کسی مرد آہن بڑ جائے تو مقدر میں بس گھانا ہی آتا ہے۔“ سونیا کو دو ٹیکنڈز لگے تھے اس کی بات سمجھنے میں پھر جب سمجھ گئی تو نہایت بری شکل بنا کر بولی۔

”میں تو پھل پیری نہیں ہوں۔“
 ”ہاں تو میں نے بھی کب خود کو مرد آہن کہا ہے۔ وہ تو شور باد کی طرح مجھے احتشام غریب کی یاد آگئی تھی۔“ سونیا اس ذکر پر مزید جھنجھلا سی گئی۔ اسے آتش کے منہ سے اس لڑکے کا ذکر کبھی اچھا نہیں لگا تھا اور اس بات پر وہ خود بھی حیران ہوئی تھی کیونکہ دیکھنے میں وہ بہت مہذب تیز دار اور وجہ لڑکا تھا پھر وہ سونیا کی طرف مائل بھی تھا لیکن پھر بھی اسے اچھا نا لگتا تھا۔

”تمہارے سیانوں کی ایسی کی تمہیں۔ مجھے پرانے زمانے کی دانشوری والی باتیں سنا سنا کر مرعوب مت کرو۔ میں خود بہت بڑی دانشور ہوں۔“ وہ جھنجھلا سی گئی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ آتش اس سے زمین کی بات کرے لیکن مجھ میں بھی نہیں آ رہا تھا کہ براہ راست کیسے پوچھتے۔

”ارے بھائی ہم نے لوگوں کو مرعوب کرنا چھوڑ دیا ہے۔ ہمیں ہماری اوقات پتا چل گئی ہے۔ ہاں ہاں ہم وہی ہیں آتش..... آتش غلام حسین۔ خاندان غلاماں والے۔ اس لیے خاموشی سے ہمیں یہ شور باز ہر مار کرنے دیا جائے۔“ وہ دو دیشانہ انداز

میں بول رہا تھا۔ سونیا نے اس کے بدلے ہوئے پر غور کیا تھا۔ وہ ابھی بھی سنجیدہ نہیں تھا اور بظاہر ہر گھٹانے میں گمن تھا لیکن چہرے کے تاثرات نہایت بدل سے گئے تھے۔ سونیا نے چند لمحے کچھ نہیں کیا اسے سمجھ ہی نہیں آ رہا تھی کہ کیا کہے، اسے کیسے دے پھر اس نے تسلی دینے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے پوچھ ہی لیا تھا۔

”زمین سے بات ہوئی تمہاری؟“ آتش اس سوال پر مزید برا منہ بنا کر نوالہ منہ میں رکھا تھا۔
 ”کون زمین؟ میں کسی زمین کو نہیں جانتا۔ وہ ناک چڑھا کر بولا تھا۔ سونیا نے گہری سانس بھری۔ وہ اس موضوع پر بات کرنا چاہتی تھی۔ آتش کے خیرے ہی ختم نہیں ہو رہے تھے۔ وہ کوئی باز لڑکی نہیں تھی لیکن سستی کا بلی سے چڑھتی اسے جب کسی کام کو کرنے کا ٹھکانا ملتی تھی تو اسے پایہ تک پہنچا کر ہی دم لیتی تھی۔ اس نے دل ہی دل میں آتش کی مدد کرنے کا عزم کر لیا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اس کے اس عزم کی خبر اس کے بسوا صرف ایک شخص تھی۔

”تمہیں اس سے بات کرنی چاہیے آتش ایسے تو نہیں چھوڑا جا سکتا اس بات کو۔ تم مجھے اس فون نمبر دو۔ میں اس سے بات کرتی ہوں۔“
 ”مل کر بیٹھتے ہیں۔ بات کرتے ہیں۔ مل جل کر کوئی درمیانی راستہ نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔“

منہ تک نوالہ لے جاتے آتش کے ہاتھ لہجہ بھر کے تھے۔

”اس وادی پر خار میں کوئی درمیانی راستہ نہیں ہے مائی ڈیئر چارٹ دس انچ۔ تمہیں کیا خبر کہ تم زندگی سوئی میں دھاگے پروتے ہوئے گزار رہے ہو۔ محبت شطرنج نہیں ہے۔ یہ سانس سیرھی کا کھیل کرتی ہے یا تو آپ ہیں یا پھر نہیں ہیں۔ اس میں یہاں وہاں، ادھر ادھر والی جالوں کی گھنٹائیں کم ہوتی ہے۔“ وہ ابھی بھی سنجیدہ نہیں تھا لیکن چہرے کے تاثرات میں نرمی بھی نہیں رہی تھی۔ اس

لوگوں میں ٹھکرانے جانے کا غم جھلکنے لگا تھا۔
 ”غلط کہہ رہے ہو تم۔ محبت بھی ختم نہیں ہوتی۔ والی ہو تو.....“ وہ زنج ہو کر بولی تھی۔ ایک تو اپنے لڑکپن سے محبت جیسے معاملات پر بات کرنا بھی انسانی ہوتی تھی کہ جس کے ساتھ آپ کے اپنے رشتے اہمات بزرگوں کے درمیان راکھ میں کہیں دبی ہوئی کاری کی طرح بڑی سلگ رہی ہو۔

”یہ کس بکثت نے کہا کہ محبت ختم ہوگئی ہے۔ کیا ان ہے۔ جی نہیں۔ محبت واقعی ختم نہیں ہوتی لیکن تم ہو جایا کرتا ہے اور وہی ہو گیا ہے۔ ختم ٹھنڈ۔“
 ”کل بدھ۔“ وہ جیسے خود سے باتیں کر رہا تھا۔

”اسی کو بچانے کی بات کر رہی ہوں۔ اے ال مند آدی۔ اس سے بات کرو۔ کوئی حل نکالو۔“

وہ اپنے سر جھٹک کر مشورہ دیا تھا۔
 ”محبت اب نہیں ہوگی اور محبت کی بات تو بالکل ایسی ہوگی۔ یہ میں نے نہیں کہا۔ یہ ایک عظیم شاعر نے خیالات ہیں آگے جا کر وہ مزید تفصیل سے مانتے ہیں کہ محبت اب نہیں ہوگی۔ یہ کچھ دن بعد ان ہوگی۔ گزر جائیں گے جب یہ دن۔ یہ ان کی یاد ان ہوگی یعنی تھک ہار کر تشریف لے جاتی ہے کہ بکثت نے سکون نہیں لینے دینا زندگی میں۔“ وہ اب زہری نوالے بنا رہا تھا۔ منہ نوالے سے بھرا ہوا تھا، اس پر سنجیدگی کا نام و نشان نہیں تھا لیکن آنکھیں میں کہ بے روٹی چھپائی نہیں پاری تھیں۔

سونیا کا دل چاہا اپنے سامنے بیٹھے اس شخص کو ہاتھ چھت قسم کی باتیں سنائے اور یہاں سے اٹھ جائے۔ اس کے صبر کا پیمانہ باتوں کے معاملے میں اچھل دی ختم ہو جایا کرتا تھا۔ وہ کبھی کسی تقریروں سے اٹھ کر عمل پر یقین رکھتی تھی لیکن آتش اس کے بالکل ٹھنڈا تھا۔ وہ شاید ابھی اس غم سے نکلنے کا خواہش مند تھا۔ اس کی باتیں طویل اور بے سرو پا تھیں۔ اس نے گہری سانس بھری پھر اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولی۔
 ”تم اس موضوع پر بات کرنا ہی نہیں چاہتے۔“

لیکن اگر تم بات نہیں کرو گے تو تکلیف میں رہو گے۔“ آتش کا کھانا ختم ہو چکا تھا۔ اس نے سبک میں ہاتھ دھوئے پھر بنا اس کی جانب دیکھے بولا۔
 ”پہلی بات تو تکلیف ہوگی کیونکہ میں رخصتوں کو چھیل چھیل کر تازہ کرنے کا قائل نہیں ہوں۔ دوسری بات مجھے جب تک تکلیف ہوگی۔ میں اپنے باپ کا چہرہ دیکھ لیا کروں گا۔ ان کی خاطر سب چھوڑ سکتا ہوں۔ سب کچھ..... تیسری بات میں ابھی خود سوچ رہا ہوں کہ مجھے کرنا کیا ہے۔ جب سوچ لوں گا تو تمہیں بتاؤں گا ضرور۔“ اس کے لہجے میں قطعیت تھی۔ سونیا بس اس کی جانب دیکھتی رہ گئی۔ وہ کتنا بدلا بدلا سا لگنے لگا تھا۔

☆☆☆

”آپ کو چاہیے کیا میڈم؟“ آتش نے اسے ایک دکان سے نکل کر دوسری دکان اور دوسری سے تیسری میں خوار ہوتے دیکھا تو اتنا کرسوال کر بیٹھا۔ اسے کچھ ضروری سامان چاہیے تھا تو وہ ماسٹر جی کے ساتھ ان کی دکان پر آگئی تھی۔ اس نے ان سے ذکر کیا تھا کہ وہ اپنے کام کو بڑھانے کا ارادہ رکھتی ہے اور اسے کچھ پروفیشنل قسم کی مشینری درکار ہے اسی لیے ماسٹر جی نے اسے پیشکش کی تھی کہ وہ چاہے تو ان کے سب شاگردوں کے ساتھ مل کر اپنے بزنس کے سلسلے میں مشورے لے سکتی ہے لیکن وہ بالائی جاری تھی پھر اب جانے کیا دل میں سمائی کہ ان کے ساتھ چلی آئی۔ فیشن ٹریڈر، رنگ اور رجحانات پر سب سے ہی باتیں کرتی رہی پھر وہی پر اسے یاد آیا کہ اسے تو اپنے موتی دھاگے جیسی اشیاء کی خریداری بھی کرنی تھی۔ ساہیوال سے جو سامان ساتھ لائی تھی وہ ختم ہو چکا تھا۔ ماسٹر جی نے آتش کو فون کر کے بلوایا تھا کہ وہ اسے خریداری کروا کر گھر واپس لے جائے لیکن وہ اس کی مطلوبہ دکانوں کے متعلق زیادہ نہیں جانتا تھا اسی لیے خواری بھی زیادہ اٹھانی پڑ رہی تھی۔ آتش اس بے وجہ کی مصروفیت سے بھنجھلا نے لگا تھا۔
 ”میں جن تلاش کر رہی ہوں۔ ذرا بڑے ڈایا

میٹر کے۔ رنگ بھی کچھ گہرے ہونے چاہئیں۔“
اس نے اسے جواب دیا پھر دکان دار کو اشارے سے
ایک جانب نمایاں کر کے رکھے گئے شبن دکھانے کا
اشارہ کیا تھا۔

”تم ان کا کروگی کیا؟“ اس نے سوال برائے
سوال پوچھا تھا سونیا نے بظہر غایت اسے دیکھا پھر
بولی۔

”میں ایک نیا پردجیکٹ کرنے والی ہوں جو
میں نے پہلے نہیں کیا۔ میری ایک کلائنٹ ہے۔ اسے
میرا کام بہت پسند ہے تو اس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا
میں ڈریسز میں بھی ڈیل کر سکتی ہوں۔ میں نے ہاں
بول دیا۔ اب اس نے مجھے آرڈر دیا ہے۔ اسے کچھ
ٹریڈی قسم کے جیکٹس چاہئیں۔ جو وہ گرمیوں کے
موسم میں بھی استعمال کر سکے۔ وہ ذرا مختلف قسم کی چیز
چاہتی ہے یعنی فیشن کے مطابق بھی ہو اور گرمیوں
جی۔ ساری گفتگو کا کل خلاصہ یہ کہ میں اس قسم کی
جیکٹ بنانا چاہ رہی ہوں جو ٹریڈی اور اسٹائلش
ہونے کے ساتھ ساتھ پروڈاکر بھی لگیں۔“ اس نے
ایک اور شبن دیکھتے ہوئے بتایا تھا۔

اتش اس دوران دکان کے اندر کی جانب ہو کر
خود سے مختلف چیزیں اٹھا اٹھا کر دیکھنے لگا تھا۔ وہ
کشیدہ کاری سے متعلق سامان سے بھری ہوئی دکان
تھی اور وہاں بڑی مختلف چیزیں اس کی توجہ اپنی
جانب کھینچ رہی تھیں لیکن سونیا کی بات کا جواب دینا
بھی فرض تھا اس پر سو چند منٹ کے وقفے کے بعد
طریقہ انداز میں بولا تھا۔

”اچھا یعنی تم اتنی دیر سے ایسے شبن ڈھونڈ رہی
ہو جو قطر بنے گیف بھی ہوں لیکن ضرورت پڑنے پر ہیما
مانی بھی بن سکیں؟“ اتش نے پیچھے دیکھے بنامہ بنا کر
کہا تھا۔ سونیا کو تو اس کی بات پر ہنسی نہیں آئی لیکن
دکان دار کے ہنسنے کی آواز سنائی دی تھی۔ اب کی بار
اتش نے مزہ کر دیکھا۔ سونیا اسے نظر نہیں آئی تھی لیکن
دکان دار کے چہرے پر مسکراہٹ چمک رہی تھی۔
”آپ کو بہت ہنسی آرہی ہے بھائی صاحب۔“

”میڈم چلی گئی ہیں سر! آپ خود سے ہی بات
کرنے میں مگن ہیں۔“ اس نے وضاحت کی۔ اتش
نے حیرانی سے دکان کی ایگزٹ کی جانب دیکھا تھا
سونیا واقعی جا چکی تھی۔ اتش دکان دار کی جانب دیکھے
بغیر خود بھی باہر نکل گیا۔ سونیا چند قدم کے فاصلے
چلتی نظر آئی تھی۔ اس نے تیز قدم اٹھائے اور ایک
لمحے میں اس کے قریب پہنچ گیا۔

”انتہائی بدترین ہوتم۔ میں وہاں کھڑا ہوا تھا اور
منہ اٹھا کر باہر نکل آئیں۔“ اس نے طعنہ دے
والے انداز میں کہا تھا۔

”تم کیا چاہتے تھے۔ میں منہ وہیں چھوڑ
آ جاتی؟ پھر خوش ہو جاتے تم؟“ سونیا کے انداز میں
شرارت تھی اور چہرے پر ہنسی کی جھلک تھی۔ اتش نے
اسے گھور کر دیکھا پھر گہری سانس بھر کر اس کے ساتھ
چلتا ہوا بولا۔

”ایک تو میں تمہارے اس گھسے بے سینے
آف ہیومر سے بہت تنگ ہوں۔ اتنی تھکی ہوئی بات
کرتی ہو اور پھر اتنی ایسے ہو جیسے بہت ہی کوئی
لطیفہ سنایا ہو۔ میری بات سنو۔ محراب عرف سونیا
بی۔ یہ کراچی ہے۔ ایسے بوسیدہ لطیفے یہاں بچوں
کتابوں میں بھی نہیں پچھتے۔“ اس کے کہنے کا اثر
ایسا تھا کہ سونیا ایک بار ہنس دی۔

”ہاں بھئی سچ کہہ رہے ہو تم اور چھپیں بھی
ایسے لطیفے۔ جب چلتے پھرتے لوگ ہی ہنسانے کو
ہوں تو کتابوں سے لطیفے کیوں پڑھے گا کوئی۔
اس کو سنار ہی تھی۔“

”وہ جو ستائشی جملہ میں نے لمحہ بھر پہلے
کے سینس آف ہیومر کے لیے بولا تھا نا۔ اس
کے جواب میں اسے ہی مکر سمجھ لیا جائے۔“ وہ نہا
سجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ سونیا مسلسل مسکرانے
مصرف تھی۔ اسی دوران وہ اس جیسے کی جانب
تھے جہاں چند ایک بوٹیکس بنی ہوئی تھیں۔
”دو منٹ کے لیے یہاں چلیں؟ میں
آئیڈیا لینا چاہتی ہوں کہ آج کل کیسے رنگ

مجھے جیکٹس بنانے کے لیے ایسے رنگ چننے
ہوں ہر رنگ کے ساتھ چل سکیں۔ لیکن کسی دہی چیز
میں۔“ سونیا نے اصرار کرتے ہوئے ہنسنے
پاؤں اٹاف بھی بیان کیا تھا۔ اتش نے اثبات میں سر
ہلایا۔ وہ اسی طرح باتیں کرتے ہوئے ششے کا
ہاں دروازہ کھولتے ہوئے اندر داخل ہو گئے تھے۔
وہاں لواندازہ تھا کہ اتش بجلت میں بے سووہ فوراً ہی
اپنے کیے گئے بلوسات کی جانب چلی گئی تھی۔

”آج کل گہرے رنگ چل رہے ہیں۔
ایاں بھی آنے والی ہیں تو مزید کچھ مہینے گہرے
ایاں چلیں گے۔ یعنی مجھے جیکٹس کے لیے ہلکے
ان چننے چاہئیں۔ تب ہی تناسب درست ہوگا
۔“ سونیا کو جیسے یقین تھا کہ اتش اس کی بات
در ہی سن رہا ہوگا۔

”یہ دیکھو اتش! یہ کتنی اچھی چیز ہے۔ حالانکہ
یہ رنگ پسند نہیں ہے لیکن یہ اچھا لگ رہا ہے۔“
اس نے اسے مخاطب کرتے ہوئے اب کی بار غور کر
لھا تھا۔ وہ نظر نہیں آیا۔ سونیا کے چہرے پر
لراہٹ پھیل گئی۔

”بہت چالاک ہو۔ بدلہ لے رہے ہو نا مجھ
۔“ اس نے اب کی بار ذرا اونچی آواز میں کہا تھا
۔ وہ سن سکے لیکن وہ کچھ نہیں بولا تھا۔ سونیا دوبارہ
ٹن کاؤنٹر والے حصے کی جانب گئی تھی۔ اتش وہیں
رہا تھا۔

”یہاں کھڑے ہو تم۔ میں تمہیں مشورہ دینے
لیے لاتی تھی اپنے ساتھ دیکھو تو ذرا اس رنگ
بناؤں ایک؟“ اس نے بنا یہ دیکھے کہ
کے چہرے کے تاثرات کچھ بگڑے ہوئے سے
اس نے پوچھا۔

”اچھا آ۔۔۔۔۔ تو یہ بھی ساتھ ہے تمہارے۔
اما مجھے زمین نے کہ تمہاری یہ کزن گاؤں سے
آئی ہے۔ اس کا باپ بھی درزی ہے کیا؟“
۔ ساتھ کھڑی خاتون نے طنز سے انداز میں
ما۔ سونیا نے چونک کر انہیں دیکھا۔ اس جملے پر

وہ کچھ حیران ہوئی تھی۔ ایک ٹائیے میں بی ان خاتون
کے نفوش واضح ہو گئے تھے۔ اسے یاد آ گیا تھا کہ وہ
کون ہیں۔

”ویسے ماسٹر غلام حسین کے ہاتھ میں تو بہت
صفائی ہے۔ میری توانائی بھی انہی کے ہاتھ کے سٹل
کپڑے پہنتی رہی ہیں۔ بہت اچھے درزی ہیں۔“ وہ
لمحہ بھر کورکیں۔ لہجے میں جان بوجھ کر ایسا جس پیدا
کیا جیسے کسی گیم شو میں بیٹھی ہوئی میزبان ہوں جو آخر
میں سوال کے درست ہو جانے پر کروڑ روپے کے
انعام کا اعلان کرنے والی ہو۔

”لیکن اچھے درزی ہونے کا مطلب یہ نہیں
ہوتا کہ اپنی لاکھوں کروڑوں کی بیٹی ان کے گھر دے
دی جائے۔ نا بھئی درزیوں میں بیٹی نہیں دے سکتے
ہم۔“ وہ بہت کڑوے انداز میں بات کر رہی تھیں۔
ان کی آنکھوں میں نہیں لہجے میں بھی کاٹ دار طنز
چھلک رہا تھا۔ سونیا کو اپنی پیشانی پر ہنسی محسوس
ہوئی۔ وہ دو قدم بھر کر اتش کے برابر آئی تھی۔ اس
کے چہرے کے تاثرات بھی انتہائی سخ ہو رہے تھے۔
سونیا کو ڈر سا لگنے لگا تھا۔ یہ گھر نہیں تھا، پبلک پلین
تھی۔ یہاں ذاتی گفتگو اور اس طرح کے طنز
برداشت نہیں کیے جاسکتے تھے۔ اتش ان کے سامنے
ہوا تھا۔

”درزیوں کو سازدے سکتی ہیں آپ۔ بیٹی نہیں
دے سکتیں۔ بہت خوب۔“ وہ تنک کر بولا تھا۔ سونیا
کے پورے وجود میں لرزش ہی ہونے لگی تھی۔
”چلیں اتش! ہو گیا ہے میرا کام۔“ سونیا نے
انہیں نظر انداز کرتے ہوئے اتش کو مخاطب کرتے
ہوئے کہا۔

”چلی جانا بی بی! میرا کام بھی ہو لینے دو۔ مجھے
اس پیارے انفعل سے بات تو کر لینے دو۔ ہاں تو میں
نہ کہہ رہی تھی کہ دوبارہ میری بیٹی سے ملنے کی کوشش نا
کرنا۔ وہ آج کل کی لڑکی ہے۔ اسے خوب سمجھ ہے تم
جیسے تھرڈ کلاس لوگوں کی کہ کیسے اپنا اسٹیٹس بدلنے کی
خاطر تم جیسے چھوٹے لوگ بڑے گھروں کی لڑکیوں کو

اپنی میٹھی میٹھی باتوں میں پھنساتے ہو۔ اسے تمہاری حقیقت بہت اچھی طرح پتا چل گئی ہے۔ وہ تمہاری طرف تھوکنے کو بھی تیار نہیں ہے اب۔ اس لیے بہتر ہے اپنی اس کزن پر محنت کرو۔ میڈم تھینک کا لہجہ تو سن تھا ہی مگر الفاظ نے تو اتنا تش کوئی نہیں سونیا کو بھی ہلا کر رکھ دیا تھا۔

”یہ آپ کا گھر نہیں ہے کہ میں لحاظ کروں۔ یہاں کوئی مجھی مجھے کچھ بھی بولنے سے روک بھی نہیں سکتا۔ میں آپ کے اس بڑے پن کے جواب میں ایسا چھوٹا پن دکھا سکتا ہوں کہ آپ کانوں میں انگلیاں ڈال کر یہاں سے نو دو گیارہ ہو جائیں گی۔ لیکن میرے درزی باپ نے ایسی تربیت نہیں کی میری۔ ہم اگر اسٹیشن میں آپ کی برابری نہیں کر سکتے تو تسلی رکھیے بدتمیزی میں بھی نہیں کریں گے۔ اس لیے بہتر ہے میں یہاں سے چلا جاؤں۔“

اتش نے اپنے لہجے کی کو چھپانے بنا کہا تھا۔ ”اوپنہ..... لڑکا درزی کا اور انداز مرضی کا۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ اپنے سے بڑے لوگوں سے جھک کر ملنا سیکھو قائدے میں رہو گے۔ اب چلو شہاباش۔ نکلو یہاں سے۔“ وہ اسی انداز میں بولی تھیں جو ان کا خاصہ تھا۔ دو سیلز مین بھی آواز سن کر ان کے قریب آ کھڑے ہوئے تھے۔ ان کی نگاہوں میں جھجھک تھی۔

”اپنی پرائلم میڈم؟“ ان میں سے ایک نے میڈم تھینک سے سوال کیا تھا۔ ”نہیں بھئی۔ مجھے کوئی پرائلم نہیں ہے۔ یہ درزی کی اولاد کو نکلو لگا یہاں سے۔ سچ کو لوگوں کو دیکھ کر میرا دم سا گھٹنے لگتا ہے۔“ وہ باز نہیں آئی تھیں۔ اتش کا چہرہ برداشت کرتے کرتے مزید سرخ ہو چکا تھا۔ سونیا نے بہت ہمت کر کے اسے بیرونی دروازے کی جانب دھکیلا اور باہر نکل آئی تھی۔

☆☆☆

”مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ان کے دل میں تمہارے لیے اتنا بغض ہے۔“ سونیا نے کافی دیر بعد تاسف بھرے لہجے میں کہا تھا۔

”بدتمیزی..... بلکہ انتہائی بدتمیزی کو سانس میں ”بغض“ کہتے ہیں؟“ اتش نے اس کی جانب دیکھے بنا نظر یہ انداز میں کہا۔

”میں نہیں اس بات کا بہت اچھا جواب دے سکتی ہوں۔ لیکن تم ابھی ابھی اپنی بھی نا ہونے سانس سے اچھی خاصی درگت بنا کر آئے ہو۔“

لے ترس آگیا ہے تم پر۔“ سونیا نے سادہ سے لہجے میں کہا تھا۔ اتش نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ وہ ابھی کافی ناراض نظر آتا تھا۔ اس کے چہرے پر تاثرات ابھی بھی تارل نہیں تھے۔ وہاں غصہ تو تھا لیکن بے پناہ تش بھی جو اس کی سرخ آنکھوں سے لپک لپک کر باہر آرہی تھی۔ یہ وہ تش تھی احساس تو بین سے پیدا ہوئی ہے اور چہرے کو کھانسیر کر دیتی ہے۔ سونیا اس تش کو استعمال چاہتی تھی۔ اسی لیے اس نے گفتگو کا آغاز کیا۔ اتش اگر آج بھی اس تو بین کو تو بین نا سمجھتے ہوئے انداز کر دیتا تو پھر وہ سب کیسے ہوتا جس کی خاطر ساہووال سے کراچی آئی تھی۔ اس نے ذرا سا موڑ کر اس کی جانب دیکھا۔ وہ جب یونیک سے تھے تو ایسا لگتا تھا کہ اتش سب کو کچا کھا جائے گا۔ اب اس کے چہرے کے تاثرات ذرا قابل برداشت ہو گئے تھے۔ چہرے پر خشکی تو تھی مگر زمانے بھر بے زاری نہیں تھی۔

”میرا مشورہ ہے اتش تم ایک بار زر مین بات ضرور کرو، ایسے یہ معاملہ ہینڈل نہیں کیا جا سکا۔ وہ چونکہ بالکل خاموش تھا تو سونیا کو بھی پھر سے رخ اس جانب موڑنا پڑا تھا۔ اب کی بار اتش نے کراسے دیکھا۔ سونیا باجھیں چکر کر مصنوعی انداز میں مسکرائی تھی جس سے وہ مزید جل جھن گیا تھا۔

”تمہارا کیا مسئلہ ہے۔ ایک تو تم سے مانگ کر میں نے اپنی زندگی کا سب غلط فیصلہ کیا۔ حالانکہ مجھے سمجھنا چاہیے تھا کہ شریکے (رشتہ دار) بس شریکے ہی ہوتے ہیں۔ آپ کو دکھ میں نہ شکھ ملتا ہے انہیں۔ خدا جانے تم کیوں اتنی دبی

ملی اس معاملے میں۔ آخر تمہارا کنسرن کیا ہے اس اے معاملے سے؟“ وہ سخت ناراض ہوا تھا۔ ہونا چاہیے تھا کہ سونیا اس کے برہم انداز پر براہمان ہاتی لیکن ایسا نہیں ہوا تھا۔ اس نے گہری سانس لی اور اپنا رخ مکمل طور پر اس کی جانب موڑ لیا۔ ”میرا کنسرن؟“ استفہامیہ انداز میں اسے دیکھا پھر اطمینان سے بولی۔

”تو پھر سنو۔ آج بتا ہی دیتی ہوں تمہیں کہ میرا کنسرن یہ ہے کہ کوئی بھی اس اذیت میں نا جٹے جس میں جٹی ہوں۔ میرے لیے یہ صورت حال بالکل بھی نئی نہیں ہے۔ میں نے پہلے بھی ایسا زعم کسی کے ہاں پر دیکھا تھا جیسا آج مسز تھینک کے چہرے پر تھا۔ ایسی ہی درگت کسی نے میری بھی بنائی تھی جب میرے رشتے کی بات کی گئی تھی۔ تمہیں تو یاد ہونا چاہیے تھا اتش۔ وہ فخر جو دولت کی وجہ سے مسز تھینک کے چہرے پر چمک رہا تھا، وہی فخر میں نے بھی کسی کے چہرے پر اس کے چھٹ فتد کی وجہ سے دیکھا تھا۔“ وہ کہی پھر دوبارہ بولی۔

”یہ ہی زمانے کا چلن ہے اتش! کہیں کوئی درزی کی اولاد کہہ کر دھتکار دیا جاتا ہے اور کہیں کوئی پارفٹ دس انچ کہہ کر۔ بات تو ایک ہی ہے۔“

وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بول رہی تھی لیکن چہرے کے تاثرات بہت ملائم سے تھے۔ وہ اللہ دے رہی تھی نا جتا رہی بس یاد کر دار ہی تھی۔ اتش کے چہرے کا رنگ لہجہ بھر کو بدلا۔ اسے واقعی کچھ یاد آیا تھا۔ اپنا لہجہ۔ اپنا انداز۔ اپنا فخر وغرور۔ اس نے ہلکے کہنا چاہا پھر کہہ مارا۔

الفاظ کی شرمندگی کسی درندگی سے کم تو نہیں تھی۔ اس نے بھی درندگی کا ہی مظاہرہ کیا تھا تو اب اسے تکلیف نہیں ہونی چاہیے تھی لیکن ہو رہی تھی۔

”آئی ایم سوری۔“ اس نے کہہ دیا تھا پھر فوراً بے بیش تر بولا۔

”لو ہو گیا ہوں میں شرمندہ۔ ناگ لی ہے تم، معافی۔ کہو تو اسٹیرنگ چھوڑ کر کان بھی پکڑو۔“

لوں؟“ وہ زیادہ دیر شرمندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ سونیا مسکرائی۔

”ہونا تو بھی چاہیے کہ تم کان پکڑ کر معافی مانگو۔“ اس نے سونیا کی بات کا لی۔

”یہ لو پھر۔“ اس نے اسٹیرنگ چھوڑ کر اپنے دونوں کان پکڑ لیے۔ ”خوش ہو چار فٹ دس انچ؟ یا مار دوں کہیں گاڑی؟ یا بولو کیسے معاف کرو گی تم اس درزی کے بیٹے کو؟“ خدا جانے وہ مذاق کر رہا تھا یا سنجیدہ تھا۔ سونیا کو گمان گزرا کہ شاید وہ اپنے حواس کھو چکا ہے۔

”اوہو..... تم خود کشی کر سکتے ہو۔ تمہارا تو تیانیا دل ٹوٹا ہے لیکن میری ایسی کوئی خواہش نہیں ہے اور نا ہی میں اتنی احمق ہوں کہ دل ٹوٹنے کے اس قیمتی عمل کو ضائع جانے دوں۔ ہوش کرو اور گاڑی چلاؤ۔“ وہ تنک کر کہہ رہی تھی۔ سڑک پر چند ایک ہی گاڑیاں تھیں اور اتش کی اس حرکت کی وجہ سے گاڑی کا توازن خراب ہو رہا تھا۔

”ماشاء اللہ۔ یعنی اب دل ٹوٹا بھی قیمتی ٹھہرا آپ کے لیے۔“ اس نے دوبارہ سے اسٹیرنگ تھام لیا تھا۔ سونیا مسکرائی۔

”اے بڑھے لکھے انسان میرے لیے نہیں۔ سائنس کے لیے بھی یہ عمل قیمتی ہی ہوتا ہے۔ سائنس فرماتی ہے کہ جب کوئی مادہ دو حالت ہوتا ہے تو توانائی خارج ہوتی ہے۔ توانائی جو کائنات کے سارے نظام کو نکلوا چھپا کی جھرات آئی ہے (پنجاب میں کھیلنا جانے والا بچوں کا ایک کھیل) کی طرح نچانی ہے۔ حرکت میں رہتی ہے۔ یہ توانائی وہ محرک ہے جو کائنات کو چلانے کا باعث بنتی ہے۔ اب جو عمل توانائی پیدا کرنے کا باعث بنے گا جیتی ہی کھلائے گا۔ کچھ آئی سمجھ میں یا نہیں۔۔۔ سو دل ٹوٹتا ہے، نکلے نکلے ہوتا ہے کہ چچی ہوتا ہے تو بھی توانائی ہی خارج ہوتی ہے۔ قیمتی توانائی۔ اب یہ انسان پر منحصر ہے کہ اس توانائی کو کبھی طریقے سے استعمال کر لے یا مٹنی طریقے سے۔“ اتش کے

چہرے پر تمسخرانہ سے تاثرات چمکنے لگے تھے لیکن سونیا خاموش نہیں ہوئی تھی۔

”میں چپ دس سال کی تھی نا تو اپنے قد کی وجہ سے چھ سال کی لگتی تھی۔ میرے بچے زچھے کی گیم میں شریک نہیں ہونے دیتے تھے کہ یہ تو چھوٹی ہے۔ کوئی اسکول کا بلے یا بیٹلو یا پھر تقریری مقابلے میں مجھے حصہ نہیں لینے دیا جاتا تھا۔ یہ چھوٹی ہے۔ اس کا قد چھوٹا ہے۔ یہ چھوٹی لگتی ہے۔ رومزم کے پیچھے سے نظر ہی نہیں آتی۔ یہ گر جائے گی۔ اسے چوٹ لگ جائے گی۔ ہر بار ایک ہی طرح کے جملہ بول کر میرا دل توڑ دیا جاتا تھا۔ وہی کام جو میرے ہم عمر اور ہم جماعت آرام سے کر سکتے تھے۔ مجھے کرنے ہی نہیں دے جاتے تھے اور وجہ بس یہی تھی جسے تم چار فٹ دس انچ کہتے ہو اور جب میں نے سوچا کہ بس اب میں کسی کی نہیں سنوں گی۔ میں ثابت کر کے دکھاؤں گی کہ میں کسی سے کم نہیں ہوں۔ میں وہ سب کر سکتی ہوں جو میرے ہم عمر کرتے ہیں۔“

اس کے بعد آتش میں نے کبھی مزہ نہیں دیکھا۔ ہر اس چیز میں حصہ لیا۔ ہر وہ کام کیا۔ ہر اس کھیل کا حصہ بنی جو میرے لیے صرف میرے قد کی وجہ سے ممنوع قرار دے دیا جاتا تھا۔ یقین کرو جب چپ بھی کسی نے میرا دل توڑا۔ میں نے اس عمل کو قیمتی جانا۔ اسکول میں۔ کالج میں یا عملی زندگی میں۔ ہمیشہ میں نے دل کے ٹوٹ جانے پر کبھی غم نہیں منایا۔ انسان ہونے کے ناطے روٹی ضرور ہوں لیکن کبھی اس توانائی کو ضائع نہیں ہونے دیا۔

تم سا ہیوال سے آتے ہوئے میرا دل توڑ کر آئے تھے۔ یہ سوچے سمجھے بنا کہ میں تم میں ذرا بھی انٹرنل نہیں ہوں۔ تم نے میرے چھوٹے قد کی بنا پر میری تنقید کی تھی۔ میرا بھی دل ٹوٹا تھا لیکن دیکھ لو میں آج تمہارے سامنے ہوں۔ اتنا سامنے کہ تم مجھ سے مشورہ کرنے پر مجبور ہو کیونکہ میں نے اپنی توانائی کو کبھی ضائع نہیں ہونے دیا اور تمہیں بھی یہی مشورہ دوں گی کہ سوچو۔ کیسے خود کو ثابت کر سکتے ہو۔ یہ

نکل سکتے ہو اس صورت حال سے۔ کیسے پہنچ سکتے ہو اس مقام پر جہاں مسرتہ نہیں اپنا داماد بناتے ہوئے فخر محسوس کریں اور تم ان کے سامنے سر اٹھا کر کہہ سکو کہ لڑکا درزی کا تو انداز واقعی مرضی کا۔“ وہ اسے سمجھا رہی تھی۔

آتش کو اس لڑکی پر، اس کی دوستی پر پہلی بار بے پناہ فخر محسوس ہوا تھا۔ وہ غلو تو نہیں کہہ رہی تھی۔ دل ٹوٹ گیا تھا لیکن عزم سلامت تھا۔

”واہ واہ..... بڑی ولی اللہ ہیں بھائی آپ تو۔ مجھے یقین ہے آخر میں تم نے زبردستی مجھ سے اپنے ہاتھ پر بیعت لے لینی ہے۔“ اس نے مصنوعی انداز میں ناراضی میں چڑتے ہوئے کہا تھا۔

سونیا کچھ نہیں بولی کیونکہ وہ جانتی تھی اسے لوگوں کو اپنا مزید بنانا آتا تھا۔ اسے وہ منہ آتا تھا جو لوگوں کے دلوں کو اس کے حق میں رام کر دیا کرتا تھا۔

☆☆☆

”تم گئے نہیں؟“ سونیا نے اسے حیران ہو کر دیکھا۔ وہ مغرب کی نماز پڑھ کر کمرے سے نکلی اور آتش عطیہ بیگم کے کمرے میں بیٹھائی وی دیکھنے میں لگن تھا۔

”نہیں۔“ آتش نے اطمینان سے جواب دیا تھا۔ اسے حیرت ہی نہیں ہوئی بلکہ انتہائی غصہ بھی آیا تھا۔ ”لیکن کیوں؟“ وہ چوس گئی۔ آتش اطمینان سے ٹی وی اسکرین کی جانب دیکھ رہا تھا۔

”تمہیں احساس بھی ہے میں نے کتنی مشکل سے ان سے تمہارے لیے بات کی تھی۔ وہ اتنی بڑی اسٹاکسٹ ہیں۔ بڑے بڑے ماڈلز کو انہوں نے چانس دے کر اس مقام تک پہنچایا ہے۔ تم جیسے آموز کو تو وہ دروازے سے ہی باہر بیچ دیتی ہیں لیکن میری ریکویسٹ پر انہوں نے تمہیں اوکے دیا تھا آتش۔ آخر تم کرنا کیا چاہتے ہو؟“ وہ ناراض ہو رہی تھی۔ وہ اس کے لیے ہر روز ایک موقع تلاش کرتی تھی اور وہ ہر روز اسے رد کر دیتا تھا۔ سونیا کے بنائے کچھ چیز ایک ڈریس ڈیزائن

ائے تھے۔ انہوں نے فیس بک پر اس سے رابطہ لیا۔ سونیا نے ان کی فرمائش پر پھر اور سلنگ بیگز بنائے۔ لیکن اپنا ٹیگ بھی لگایا تھا۔ اس کا فیڈ بیک کافی اچھا تھا۔ وہ ڈیزائنر اچھی خاتون تھیں اور اپنا کمزور قدر کی نگاہ سے دیکھتی تھیں۔ اسی لیے اس کے لیے اس نے ان سے بات کی تھی کہ وہ اپنے دل شو میں اسے ریمپ پر آئینے دیں۔ اسے ایک سال مل جائے گا اور بعد میں وہ باقاعدہ ماڈلنگ کی لائسنس لے سکتا ہے۔ کسی پروفیشنل سے اپنا پورٹ فولیو بنوا سکتا ہے۔ انہوں نے سونیا کی خاطر یہ بات مان لی تھی جبکہ آتش نے اس پر خوب واویلا مچایا تھا۔

”میں نہیں کر سکتا یہ فضول کام۔ آج کل ماڈلنگ مردوں کے کرنے والا کام ہی نہیں ہے۔ جس انٹر کال دال چاہتا ہے دو پینڈ اوڑھا کر اچھے بھلے گھروں کو ریمپ پر دھکیل دیتے ہیں۔ ابھی تو تم جیسے انٹر بھی مارکیٹ میں آنے باقی ہیں۔ ڈر لگتا ہے اس وقت سے جب جھکے پرانے بھی مردوں کو ہی بنادیا کرو گے تم لوگ۔“ وہ ناک چڑھا کر بولا تھا۔

ریمپ پر آنے سے اس نے قطعاً انکار کر دیا تھا۔ وہ اس قسم کی ماڈلنگ میں بالکل بھی دلچسپی نہیں لیتا تھا۔ اس کے بعد سونیا نے اسے ایک اسٹاکسٹ ملاقات کے لیے ٹائم دے کر دیا تھا۔

”تم اپنی نوکری سے کبھی زمین کی اماں کے پاس کو نہیں چھو سکتے۔ تمہیں ایک بڑا بریک ٹھہرو پانی ہے۔ جو الیکٹرونک میڈیا کے ذریعے ہی مل سکتا ہے۔ اس کام میں روپے بھی ہیں اور شہرت بھی۔

”تمہاری کوشش کرو۔ تمہارا چھ فٹ سے نکلنے ہوئے قد کوئی فائدہ تو ہو۔“ سونیا اسے بہت مشکل سے اندک تھا تھا اور سمجھا بھی تھا کہ اگر تم اسٹاکسٹ کی اماں کر چلو گے تو تمہیں ضرور چانس مل جائے گا۔

وہ سنیں جانے والا تھا لیکن اس کی گھر میں موجودگی راز رہی تھی کہ اسے یہ بھی منظور نہیں تھا۔

”تمہارا مسئلہ کیا ہے آتش۔ تم میری کوئی بات مانتے اور پھر خواہش تمہاری یہ ہے کہ اپنی

ہونے والی ساس کے اسٹیٹس کا مقابلہ کرو گے۔ ایسے تو کبھی نہیں کر سکو گے۔“ وہ اس کی خاموشی سے زچ ہو گئی تھی۔

”مجھے مقابلہ کرنا ہی نہیں ہے۔ میں بنا جنگ جیتے ہی فاتح ہوں میری پیاری پھوپھی کی بیٹی۔“ وہ ناک چڑھا کر بولا۔ سونیا نے گہری سانس بھری۔ اسے آتش کی کاہلی سے بہت الجھن ہوئی تھی۔ آتش نے اس کے اکٹائے ہوئے چہرے کی جانب دیکھا پھر ذرا سا شرمندہ ہو کر بولا۔

”یار۔ تم سمجھنے کی کوشش کرو تا میں ڈیپلے میٹر مل نہیں ہوں۔ میں باقاعدگی سے جم جانے والی۔ لڑکیوں کی طرح وکس کروانے والی۔ ڈائمنڈ کرنے والی۔ پروٹین ٹیک پینے والی مخلوق نہیں بن سکتا۔ میرا اسٹیٹما ہی نہیں ہے ان سب چیزوں کا اور پھر جن عجیب و غریب خاتون کے پاس تم نے مجھے بھیجا تھا نا انہوں نے کہا کہ اپنی زندگی سے چاکلیٹ اور چیز نکال سکتے ہو۔ میں نے کہا۔ نہیں۔ تو وہ کہنے لگیں۔ پھر ماڈل بننے کا خواب بھی دل سے نکال دو۔ سو میں نے نکال دیا۔ لوگ مجھ سے شریٹیں رکھ کر ملنے کے خواہاں کیوں ہیں۔ زمین چاہتی تھی میں اپنی زندگی سے اپنے اما کو نکال دوں۔ یہ مختصر مہ فرماتی ہیں میں چاکلیٹ کو زندگی سے نکال دوں۔ مجھ سے نہیں ہو گا یہ سب۔“

وہ خود بھی کچھ الجھا ہوا سا نظر آنے لگا تھا لیکن باتیں ابھی غیر سنجیدہ انداز میں کر رہا تھا۔ سونیا چند لمحے اس کی شکل دیکھتی رہی۔

”تم آخر کرنا کیا چاہتے ہو؟“ وہ الجھے ہوئے انداز میں اس سے پوچھ رہی تھی۔ آتش نے ہاتھ میں پکڑا ریموٹ بیڈ پر پھینکا پھر اپنی جگہ سے اٹھ کر عطیہ بیگم کی الماری میں سے کچھ کالنے لگا تھا۔ سونیا اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔

”ایک درزی کا بیٹا۔ یہی کر سکتا ہے بس۔“ اس نے ایک کرافٹ بک نکالی تھی اور سونیا کے سامنے رکھ دی تھی۔ سونیا نے ذرا سا جھک کر کرافٹ بک قریب

کی اور اسے کھول کر دیکھنے لگی۔ وہ چند لمحوں میں ہی کی جانب متوجہ رہی۔

”یہ سب تم نے بنائے ہیں؟“ وہ ایک ایک صفحہ پلٹتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔ اس کی نگاہوں میں سناٹا تھا۔

”ہاں اور میں یہی بناؤں گا۔ میں نے اسی دن یہ سوچ لیا تھا جس روز میڈم تھینہ نے میرے باپ کو میرے سامنے ذلیل کیا تھا۔ تم دیکھنا میں ان پر ثبات کروں گا کہ درزی ہونا کس قدر قابلِ فخر ہو سکتا ہے۔ میرا عزم ان کے اسٹیش کا مقابلہ کرنا نہیں ہے۔ دولت روپیہ پیسہ اہم نہیں ہے میرے لیے۔ بلکہ میرا عزم ان کو دکھانا ہے کہ میرے باپ کا اسٹیش کس قدر عظیم ہے میرے لیے۔“ وہ نہایت اعتماد بھرے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ سونیا نے ایسا اعتماد پہلی بار اس کے چہرے پر دیکھا تھا۔

”تم درزی بنو گے؟“ وہ پوچھ رہی تھی۔ آتش کے چہرے پر فحاشانہ مفروضی مسکراہٹ چمکی۔

”نہیں۔ میں ڈریس ڈیزائنرز بنوں گا۔ دنیا کو اگر کان مشرق کے بجائے مغرب سے پکڑنا اچھا لگتا ہے۔ دنیا اگر سادگی کی زبان بولنے والوں سے خار کھاتی ہے۔ دنیا کو اگر درزی کو درزی کہتے شرم آتی ہے لیکن ڈریس ڈیزائنرز کہنے سے شملہ اونچا جھوس ہوتا ہے تو ایسے ہی سہی۔ ہم بھی دنیا کو دنیا کی طرح ہی بن کر دکھائیں گے۔ ہم بھی کان کو مغرب سے ہی پکڑ کر دکھائیں گے اب۔“ وہ عزم لہجے میں کہہ رہا تھا اور یہ عزم بھی اس کے چہرے پر سونیا کو پہلی بار نظر آیا تھا۔

دل ٹوٹ گیا تھا لیکن توانائی ضائع نہیں ہوئی تھی۔ دل کا ٹوٹنا کام آگیا تھا۔

☆☆☆

”زرین۔ طوٹی نے کتنی پیاری شرٹ پہنی ہوئی تھی نا؟“ میڈم تھینہ نے بیٹی کو مخاطب کر کے پوچھا تھا۔ اس نے موبائل سے نظریں ہٹا کر ان کی جانب دیکھا۔

”جی اچھی تھی۔“ اس نے سرسری سے انداز میں کہا تھا۔ میڈم تھینہ کو اس کا انداز اچھا نا لگا۔ وہ اچھا کپڑا پہننے کی بے حد شوقین تھیں۔ ہر طرح کا فیشن اپنی عمر اور جسامت کا لحاظ رکھے بنا کر لیتی تھیں اور ان متعلق گفتگو میں بھی نہایت دلچسپی رکھتی تھیں۔ زرین نے ان سے یہ عادت ورثے میں لی تھی۔

”پرسوں ناز کے بیٹے کی سالگرہ میں بھی بہت پیاری میکی پہنی ہوئی تھی اس نے۔ میں نے پوچھا تھا۔ کہاں سے لی؟ لیکن بتایا نہیں اس نے۔ ایک تو چھپا چھپا کے رکھنے کی عادت بالکل اپنی ماں سے لی ہے ان لڑکیوں نے۔ مجال ہے بھی کوئی چیز بتادے کہ کہاں سے یا کتنے میں خریدی۔“ وہ مزہ اسامہ بنا کر بولیں۔ زرین صوفے پر ذرا ٹھیک ہو کر بیٹھتے ہوئے ان کی جانب دیکھنے لگی۔

”زرین کے بریک اپ کو ڈیڑھ سال ہونے کو آیا تھا اور اب تو وہ کافی سنبھل چکی تھی۔ ایک دفعہ خود کشی کی ناکام کوشش۔ چھ مہینے ماموں کے یہاں لندن میں قیام اور تین مہینے امینی ڈیپریسینٹ کے مستقل استیصال نے بھی اس کے دل سے آتش کی باج کو کھریج کر نہیں پھینکا تھا۔ وہ اپنی ماما کے سامنے ذرا نہیں کرتی تھی لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ آتش کو کھول نہیں پاتی تھی اور نا ہی اس امر کو کہ وہ ان کے خاندان درزی ماسٹر غلام حسین کا بیٹا تھا۔ آتش کو نہیں بھولی لیکن اس سے شادی کے خیال کو بھلا چکی تھی وہ۔

”آپ مجھے پہلے بتائیں۔ مجھے پوچھنے کا ہنر آتا ہے۔ میں آپ کو پوچھ کر بتا دیتی۔“ اس نے ناک چڑھا کر کہا تھا۔ اب کی بار میڈم تھینہ نے فخر سے ان کی جانب دیکھا۔ یہ بات تو وہ جانتی تھیں کہ ان بیٹی ان سے زیادہ ہی ہوشیار تھی۔

”ہاں تو پوچھ لیتی نا۔ میں بھی جاری ہوں ہفتے پاکستان۔ آتے وقت لے آؤں گی۔ آٹے رمضان آجانا ہے۔ اتنی افطار پارٹیاں آنی ہیں ہمارے پاس اسٹاک ہونا چاہیے۔“ وہ اسے سمجھا رہی تھیں۔ دینی میں ان کے خاندان کے بہت سے

نئے اور مقابلہ بازی خوب عروج پر رہتی تھی۔

”بات تو آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ روزوں میں تو واقعی بہت زیادہ ایسٹرن کپڑوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ پھر عید کے تین دن بھی تو ایسے ہی کپڑے پہنیے ہوتے ہیں۔ میں تو تھک گئی ہوں جینز کے ماتھے شرٹس پہن پہن کر۔ پوچھتی ہوں طوٹی آپ سے۔“

ان کو ہی نہیں زرین کو بھی اچھا پسندے اوڑھنے کا بے حد شوق تھا۔ اس نے اسی وقت طوٹی کو وائس ایپ بھیج کیا تھا اور پہلے تو اس کے ذوق کی، اس کی نزاکت و خوب صورتی کی اور پھر اس کے لباس کی بے پناہ تعریف کی تھی اور اس کے بعد اس سے دریافت کیا تھا کہ اس نے اپنی شرٹس کہاں سے خریدی ہیں۔

”یہ نیا ڈیزائنر ہے۔ بہت اچھا اسٹاک ہے ان کے پاس۔ اچھی نئے لوگ ہیں لیکن آرڈر پر کام کرتے ہیں اور کام بہت زبردست ہے۔ کراچی بیڈ ہیں۔ فلوٹی شپنگ کرتے ہیں۔ تم آؤ گی تو کانٹیکٹ نمبر دوں گی نہیں۔“ اس نے بھی فوراً جواب دے دیا تھا۔

”کوئی آن لائن لنک نہیں ہے آپ کے پاس؟“ اس نے دوسرا میسج بھیجا تھا۔ اس میسج کا جواب طوٹی نے کچھ توقف کے بعد دیا تھا۔

”نہیں۔ میرے پاس سیل نمبر ہی ہے۔ ان کا فیس بک پیج بھی بنا ہوا ہے لیکن وائس ایپ گروپ بھی ہے۔ تمہیں نمبر دوں گی نا۔ تم خود دیکھ لینا۔ تمہیں اگلے گھنٹے ڈیزائن۔“

طوٹی نے ابھی بھی نمبر نہیں دیا تھا حالانکہ ایک ہی کلک سے اگر میسج جاسکتا تھا تو نمبر بھی جاسکتا تھا۔ ان زرین سمجھ گئی تھی کہ وہ اتنی آسانی سے نمبر نہیں دے گی۔ ان سب کزنز کا ایک مسئلہ تھا۔ کوئی بھی مالی سے اپنی چیزیں شیئر کرنے پر تیار نہیں ہوتا تھا بلکہ مخصوص کپڑوں جو قوت کے معاملے میں تو وہ بی بی بلا کی محتاط تھیں۔ ایک دوسرے کو بتاتی بھی نہیں تھیں اور پھر اپنی چیزیں دکھا دکھا کر جلاتی بھی

”میں نے کہا تھا نا کہ نہیں بتائے گی۔“ میڈم تھینہ نے کہا تھا۔ زرین نے ناک سے کبھی اڑانے والے انداز میں انہیں دیکھا۔

”نہیں تو نا سہی۔ اتنے ڈیزائنرز آگئے ہیں مارکیٹ میں۔ ان کو مل گیا ہے کوئی تو ہمیں نا ملے گا کیا۔ آپ سرچ کر لیں۔ لاتعداد لوگ مل جائیں گے۔“ وہ لاپرواہی سے بولی تھی۔

”رمضان سے پہلے کوئی انتظام ہو جاتا تو اچھا تھا۔ یہاں تو انڈین مال بھرا پڑا ہے اور پھر مہنگا بھی بہت ہے۔ وقت کے وقت خریدیں گے تو مزید مہنگا پڑے گا۔“ میڈم تھینہ نے اپنے مخصوص انداز میں کہا تھا۔ زرین نے سر ہلایا تھا۔ خاندان بھر میں اس قسم کی باتوں پر سخت گفتگوں رہتی تھی۔

اس کے بعد کافی دن گزر گئے۔ ایک دن وہ ٹی وی پر رات کے وقت بھی کوئی پرانی مووی دیکھ رہی تھی۔ میڈم تھینہ بھی ساتھ ہی بیٹھی ہوئی تھیں۔ جب طوٹی نے میسج کیا۔

”زری۔ مارننگ شو لگا کر دیکھو۔ وہ جس ڈیزائنر کی بات میں کر رہی تھی نا۔ ”الجر اب“ وہ ٹی وی پر آیا ہوا ہے۔ اپنا نیا اسٹاک اور عید الفی کی کوئیکشن شو کیس کر رہا ہے۔ ڈریسز تو بعد میں دیکھنا۔ پہلے بندہ دیکھو۔ کیا زبردست پرسنالٹی ہے۔ بڑا ڈشنگ ہے اور دینی میں بھی ایگری میشن کرنے والے ہیں اگلے مہینے۔“ اس کے میسج کو دیکھنے کے بعد زرین نے میڈم تھینہ کی جانب دیکھا تھا۔

”ماما۔ طوٹی بتا رہی ہے کہ وہ ڈیزائنرز جس کا ایڈریس اس نے ہمیں نہیں دیا تھا۔ وہ ٹی وی پر آرہا ہے۔ اپنی نئی کوئیکشن دکھا رہا ہے۔

زرین نے اس کا بتایا ہوا چینل لگایا تھا۔ اسی وقت مختلف ماڈلز بہت پیارے کپڑے پہنے ایک کے بعد ایک تیز میوزک کی تان پر سامنے آ جا رہی تھیں۔ وہ دونوں ماں بیٹی اس میں گن ہو گئی تھیں۔ اسکرین پر فیس بک پیج۔ فون نمبر اور دوسری تفصیلات بھی آرہی تھیں۔ زرین نے سب کچھ اپنے فون میں محفوظ کر لیا

تھا۔ اسی دوران میوزک دھیمیا ہوا تھا اور میزبان نے ڈیزائنر سے بات شروع کی تھی۔ میڈم تہینہ ٹونی وی اسکرین کی جانب ہی متوجہ تھیں لیکن زمین موبائل میں بھی ساتھ ساتھ گن گئی۔

”ڈیزائنر آپ کتنا سوہنا ہے۔“ میڈم تہینہ نے اسکرین کی جانب دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

زمین کو کسی کی وجاہت سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اس نے سرسری سے انداز میں سر اٹھا کر ٹونی وی کی جانب دیکھا تھا۔ اسے جھک لگا تھا۔ اس نے اپنی ماما کی جانب دیکھا۔ وہ ٹونی وی اسکرین میں کھوئی ہوئی تھیں۔ انہوں نے انٹرنیشنل پیمانہ تھا لیکن وہ تو اس چہرے کو لاکھوں چہروں میں بھی پہچان سکتی تھی۔ وہ نہایت اعتماد کے ساتھ اپنے بنائے ہوئے ملبوسات کی تعریف کر رہا تھا۔ وہ ان شارٹ کورسز کے بارے میں بات کر رہا تھا جو اس نے گزشتہ ایک سال میں کیے تھے۔ وہ اپنی اس بوتیک کے بارے میں بتا رہا تھا جو اس نے کراچی کے بڑے اور مہنگے ترین مال میں بنائی تھی۔ وہ اپنے والد کے بارے میں بات کر رہا تھا جو اس کی انساپرائزیشن تھے۔ جنہوں نے اسے یہ سب سکھایا تھا۔ اس کے انداز میں مہارت بھی فخر تھا، غرور تھا اور اعتماد بھی۔ وہ جو بھی کر رہا تھا اسے اس پر فخر تھا اور یہ فخر اس کے ہر عضو سے چھلکتا پڑ رہا تھا۔ وہ واقعی بدل تو گیا تھا۔ ایک بے پروا کھلنڈرا سا لڑکا اٹھارہ مہینوں میں ایک کامیاب ترین بزنس مین کے سے انداز میں ڈھل چکا تھا لیکن اس نے ثابت کر دیا تھا۔

وہ بے مثال تھا۔ وہ بے مثال ہے۔

زمین نے ایک بار پھر ماما کا چہرہ دیکھا۔ وہ تو واری صدقے جانے والی نگاہوں سے ٹونی وی کی جانب دیکھ رہی تھیں۔

”دیکھ زمین۔“ ہے کتنا اچھا اور ذہین بھی۔ بہت قابل ڈریس ڈیزائنر ہے۔ ماشاء اللہ۔ چھ مہینے کا کورس کر کے آیا ہے لندن سے۔ تو اس کا نمبر لکھ لے۔ تیری بشارت پر اس سے کام کر وائیں گے۔“ زمین کے منہ سے آواز ناگن رہی تھی۔ اسے بس

ایک بات یاد تھی۔

وہ آتش تھا۔ وہ آتش جسے سب جتنا تھا۔ سب کچھ۔

☆☆☆

”اگر اب۔“ سونیا نے فخر و انبساط کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ اپنی بوتیک پر نگے اس بورڈ کی جانب دیکھا۔ ڈیڑھ سال کے عرصے میں کراچی جیسے بڑے شہر کے ایک مشہور مال میں اپنی بوتیک بنالینا آسان نہیں تھا۔ سرمایہ تو اس کے ماں باپ بھی دے سکتے تھے۔ آتش کی فرمائش پر ماسٹر جی بھی فراہم کر سکتے تھے۔ اصل بات سرمایہ کی فراہمی نہیں تھی بلکہ اس بوتیک کو چلانا، اپنے آپ کو ایک ڈیزائنر کے طور پر منوانا سب سے مشکل کام تھا اور اس نے اور آتش نے مل کر یہ کر دیا تھا۔ یہ ایک بہت بڑی کامیابی تھی جس پر وہ جتنا فخر کرتی کم تھا۔

یہ اس کا اور آتش کا جوائنٹ وینچر تھا۔ ان دونوں نے اس کے لیے دن رات محنت کی تھی۔ اس کا ہنر اور آتش کے ٹونے دل سے حاصل ہونے والی توانائی نے یہ سب کر دکھایا تھا۔ یہ آئیڈیا آتش نے ہی دیا تھا۔ سونیا نے اسے حقیقت کا روپ دیا تھا۔ وہ مل کر ڈیزائن بناتے تھے، ماسٹر جی کے کاریگر سونیا کی معاونت سے انہیں لباس کے روپ میں بدل دیتے تھے اور ایک ایسی چیز تیار ہو جاتی تھی جسے دیکھنے والا سراپے بنارہ نہیں پاتا تھا۔

کام وہی تھا جو ماسٹر جی کرتے آئے تھے لیکن آتش اور سونیا نے اسے زمانے کے رجحان کے مطابق جدید رنگ دے دیا تھا۔ وہ دونوں پڑھے لکھے تھے انفرادیت کے قائل تھے اور ٹیکنالوجی کا بھرپور استعمال کرنا جانتے تھے۔ ماسٹر جی کے تجربے اور ان دونوں کی جدت پسندی نے انہیں بہت جلد کامیاب کر دیا تھا۔ وہ دونوں ابتدا میں روپے کماتے تھے زیادہ اپنے برانڈ کی پروموشن میں دلچسپی رکھتے تھے اس لیے انہوں نے ابتدائی اشاک کو تحفہ بھی دیا تھا۔ اپنے فیس بک پر مختلف مقابلے کروا کر انعام

مل رہی دیا تھا۔ پہلے ہی سال میں چار بار پچاس لاکھ کٹائی پر بھی بیچا تھا۔ اس لیے وہ مقبول بھی جلدی لگے تھے۔ سونیا نے اپنی ایک کلائنٹ سے درخواست کر کے ایک مارننگ شو کے لیے اپنے لباس پہنائے تھے جو بہت پسند کیے گئے تھے بعد میں انہوں نے فرمائش کر کے مزید لباس منگوائے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی مارننگ شو تک رسائی بہت جلد ممکن ہو گئی تھی۔

”اگر اب۔“ سونیا نے یہ نام خود اپنی بوتیک کے لیے منتخب کیا تھا حالانکہ پہلے وہ صرف محراب کے نام سے اپنی چیزیں مارکیٹ میں متعارف کروانا چاہتی تھی لیکن جب آتش نے اس کام کو اپنے پیشے کے طور پر اپنانے کی بات کی تو اس نے بخوشی اس کا ہاتھ دیا تھا۔ اس کی معاونت کی تھی اور تب ہی اس نے اپنے برانڈ کے نام کو ”محراب“ سے ”اگر اب“ لے لیا تھا۔

وہ دونوں اب ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم تھے، آتش نے ”اگر اب“ کے لیے اپنی انا پرمان کی تھی تو سونیا نے بھی اپنے شہر کو چھوڑنے جیسے امر کی قربانی دی تھی۔ اپنے والدین کی کینڈا سے انہی کے بعد اسی نے اصرار کر کے انہیں کراچی منت ہونے پر مجبور کیا تھا۔

وہ دونوں ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے تھے، ایک دوسرے کے کام میں خوب کڑے نکالتے تھے۔ ایک دوسرے کی آراء سے کبھی اتفاق نہیں آتا تھا لیکن پھر بھی ایک دوسرے کی اہمیت کو تسلیم کرتے تھے۔ اتنے عرصے میں اگرچہ بہت کچھ لڑا تھا لیکن ایک دوسرے کے لیے وہ ابھی بھی لڑتے ہی تھے۔ آتش سونیا کے لیے راجا آتش تھا تو سونیا اس کے لیے چارفت دس انچ تھی اور اسی بزرگوں کی خواہش تھی اسی طرح قائم و دائم تھی۔

☆☆☆

”یہ کس نے بنایا ہے؟“ سونیا نے ایک نامکمل ٹیٹ کو دیکھ کر ناک چڑھائی تھی۔ وہ دودھی سی

رنگ کی آدھی استیوں والی جیکٹ تھی جس پر جا بجا سرخ اور گلابی رنگ کے دائرے چپکائے ہوئے تھے۔ اس نے مزید قریب ہو کر دیکھا۔

”لیپلک ہے یہ؟“ اس نے شوبی سے پوچھا تھا۔ وہ موبائل ہاتھ میں لیے بیٹھا تھا۔ سونیا کے انداز کو دیکھ کر اس نے موبائل جیب میں رکھا اور اثبات میں سر ہلایا۔ سونیا نے ناک چڑھائی۔ وہ عموماً بوتیک پر کم ہی جایا کرتی تھی لیکن درکشاپ پر صبح ہی پہنچ جاتی تھی اور سارا دن وہیں گزارتی تھی۔ انہوں نے ماسٹر جی کی زمزمہ والی دکان کو بھی عارضی طور پر درکشاپ بنالیا تھا۔ اس دکان کے اوپر والے حصے میں ایک بڑا مال تھا جس کو ماسٹر جی نے ایک بڑے شوروم کی شکل میں ڈھال دیا تھا۔ وہاں پر ہی وہ اپنا کام کر لیتے تھے کیونکہ اب وہاں پر سلائی ہی نہیں ہوتی تھی بلکہ مختلف کڑھائی اور کوٹا کناری کرنے والے کاریگر بھی ملازم رکھ لیے تھے۔ سونیا کو ہر کام کو نہایت مہارت و محنت سے کرنے کی عادت تھی۔ وہ اسی لیے آتش کے کام میں سین میک بھی خوب لگا لیتی تھی جس سے وہ چڑتا تھا۔

”میں نے کروایا ہے اسے شوبی سے۔ اچھا لگ رہا ہے نا۔ یہ جو دائرے دیکھ رہی ہونا۔ اس تھیم کو میں مزید رنگوں کے ساتھ کرنا چاہ رہا ہوں۔ یہ پلین شرٹ کے ساتھ چلائیں گے۔ بہت اچھا لگے گا۔“ اسی لمحے آتش میز صاف چڑھ کر اوپر آیا تھا۔ سونیا کی پیشانی پر پتیریاں بڑھ گئی تھیں۔

”تم بھی دماغ بھی استعمال کر لیا کرو۔ اسپرنگ میں پلین (سادہ) کون اڑائے گا۔ فلورل ڈیزائنز کی بھرمار ہوگی اس بار۔ اس پر یہ گول گول دائروں والی لیپلک کی جینٹلس کو کوئی پوچھے گا بھی نہیں۔ کوئی ضرورت نہیں ہے اس پر محنت کرنے کی۔“ اس نے سخت سے سنجے میں شوبی کی جانب دیکھ کر کہا تھا، آتش کو بہت برا لگا۔ اس نے نیچے چوتھوں سے سونیا کو گھورا پھر قریب کھڑے شوبی کو دیکھا۔ وہاں موجود سب ملازم جانتے تھے کہ کام کے

معاملے میں ان کے مالکان بچوں کی طرح لڑنے کے عادی تھے۔ شوبی کے چہرے پر مسکراہٹ بکھری تھی لیکن ڈانٹ کے ڈر سے وہ وہاں کھڑے رہنے کے بجائے سڑھیاں اتر کر نیچے چلا گیا تھا۔ انٹرنیشنل سونیائی کی جانب رخ ہوا تھا۔

”مہمیں تو عادت ہی پڑ گئی ہے ہر کام میں جج جج جج کرنے کی۔ پہلے چیز پوری طرح دیکھ لیا کرو پھر یہ زبان کی کانٹ چھانٹ دکھایا کرو۔ جب فلور کی بھر مار ہوگی تو سادہ شرٹس کے ساتھ ایسی ایپلک کی جیکٹس بہت اچھی لگیں گی۔ ابھی کچھ مختلف ہوگا تو کوئی آپ کی جانب اٹریکٹ ہوگا نا۔ اسی لیے میں نے اس کی آستینوں کی لمبائی ایسی رکھی ہے۔ تم دیکھنا۔ آنے والے وقت میں آستین پر اتنی ہی انفرادیت نظر آئے گی جتنی گزشتہ برس ٹراڈرز میں نظر آئی تھی۔“ وہ اپنے موقف پر قائم تھا۔

ماسٹر جی کا بیٹا تھا۔ اسے سلیقہ تو پہلے سے تھا فیشن کا لیکن اس نے آن لائن کورسز بھی کیے تھے جس سے اسے کافی فائدہ ہو رہا تھا۔

”تم پہلے اسے مکمل کرو، مجھے دکھاؤ پھر اس کے بارے میں بات ہوگی۔ ابھی تو ہم برائیدل پر بحث کر رہے ہیں۔ پہلے اسے مکمل کر لیں پھر اسپرنگ کو لکیشن دیکھیں گے۔“ سونیا بھی آرام سے اس کی بات مان لے رہی تھی۔

انتہا اس کی ہدایات کو نظر انداز کرتے ہوئے اطمینان سے ایک سمت میں پڑے جھولے پر دراز ہو گیا تھا۔

”تم بہت چالاک لڑکی ہو۔ مجھے برائیدل پر لگا دو گی اور خود اسپرنگ کو لکیشن شروع کر دو گی تاکہ بعد میں ثابت کر سکو کہ تم مجھ سے زیادہ محنت کرتی ہو۔“

”مجھے ثابت کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ سب ہی جانتے ہیں کہ میں ہی زیادہ محنت کرتی ہوں۔ میرے ڈیزائنز ہی زیادہ پسند کیے جاتے ہیں اور میرے ڈیزائنز ہی سب سے پہلے نکل جاتے ہیں۔ تمہارا کام تو لگا رہ جاتا ہے ڈیزائنز پر اور پھر بعد

میں ہمیں ستر فیصد آف پر نہیں کر کر کے بیچنا پڑا ہے۔“ وہ ایک کونے میں پڑے مینکین کو گھسیٹ کر ہال کے درمیان میں لے آئی تھی۔ وہ کسی کلائنٹ کے برائیدل آرڈر تیار کر رہی تھی۔ وہ ایک کاسٹی اور سرورنگ کے امتزاج کا لباس فراہم کر رہا تھا جس پر اس نے اپنے کاریگر سے جالی پر سنہری دھاگوں سے بہت خوب صورت کڑھائی کروائی تھی اور درمیان میں اسٹونز کا بے دریغ استعمال کیا گیا تھا۔ اس لباس کے لیے اس نے بہت محنت کی تھی۔ وہ مکمل ہو جانے کے بعد بہت خوب صورت چیز لگنے لگی تھی۔ سونیا نے اس کے لیے بہت زیادہ چارج بھی کیا تھا لیکن کام ایسا تھا کہ سب کاریگرز بھی سر راہ رہے تھے اور ماسٹر جی نے بھی تعریف کی تھی۔

”تمہاری احسان فراموشی پر فی الوقت میں صرف صدقے واری چا سکتا ہوں۔ خاندان بھر میں تمہارے جیسا کوئی نہیں لڑا اور جس حساب سے سارا خاندان نمازی پر بیڑی ہوا جا رہا ہے۔ لگتا بھی نہیں ہے کہ ایسا کوئی مزید ساخرو نما ہو سکتا ہے اب صرف میرے جیسی نیک اولادیں ہی پیدا ہوا کریں۔ خاندان میں۔ ویسے تو اس بات پر بھی شکر واجب ہے ہم سب پر۔“ وہ اطمینان سے جھولا جھلار رہا تھا۔ سونیا کچھ نہیں بولی۔ اس نے اب اپنا سارا دھیان ان لباس کی جانب کر لیا تھا۔ یہ لباس آج ہی سیلائی ہوا اور اب وہ اس کا آخری جائزہ لینا چاہ رہی تھی۔ اسے یہ کام وقت سے پہلے مکمل کرنا تھا۔ انتہا نے اسے اسٹہاک کو دیکھا، اسے چڑا نا چاہا لیکن پھر چپ ہو گیا اس سے چند لمحے بھی صبر نہ ہوا تھا۔

”یہ تمہیں کچھ زیادہ لمبا نہیں لگ رہا؟“ وہ نے اس کے اعتراض پر پنا فائدہ لگا ہوں سے لباس کو دیکھا پھر ناک سے کھٹی اڑانے والے اس میں بولی۔

”برائیدل ہے یہ۔ لڑکی چھانچ کی ہیل پر ساتھ۔ تب بھی یہ فرش پر لہراتا ہوا نظر آنا چاہیے ہی برائیدل لڑ چل رہے ہیں آج کل۔“

”یہ بات بھی ٹھیک ہے۔“ مینکین میں تو واقعی انہی ہونے لگے سوال یہ ہے کہ اگر دلہن چارنٹ دس انچ ہوئی تو کتنے انچ کی ہیل میں یہ نیک کام سر انجام پانچائے گا۔“ وہ اسے چڑا رہا تھا۔ سونیا نے کھا جانے والی لٹکوں سے اسے دیکھا۔

”یہ جس کے لیے بنا رہی ہوں نا۔ وہ بھی پانچ فٹ سے کم ہی ہے۔“ اس نے انتہا کو کہا تھا کہ انتہا نے اس کی بات کاٹ دی۔

”اودہ رہنے دو بی بی! اگر نفسی سے کام لے رہی ہو تو معاف کر دیتا ہوں لیکن فانیو فانیو سے کم کا نہیں لگ رہا ہے۔ فانیو فور ہائیٹ کی لڑکی کے لیے مناسب ہے یہ۔“ وہ اپنے موقف پر ڈٹ سا گیا تھا۔

”لگاتے ہو شرط۔“ ابھی پہن کر دکھاؤں۔ لیکن وعدہ کرو اگر ہار گئے تو مجھے بھی چارنٹ دیں انچ نہیں کہو گے؟“ سونیا کو بھی جیسے ضد سی ہوئی تھی۔ انتہا نے طنز پر انداز میں ہنستے ہوئے سر جھکا۔

”انتہا آج تک ہارا نہیں ہے۔ شکست بختی نہیں ہے مجھ پر۔ لیکن اگر تم پھر بھی ہارنا چاہتی ہو تو لگا لیتے ہیں شرط۔“

بات مذاق مذاق میں شروع ہوئی تھی لیکن ہمیشہ کی طرح وہ دونوں ہنستے ہنستے ضد میں آ گئے تھے۔ بیس منٹ گزرے تھے۔ سونیا وہ فراک زیب تن کر کے آ گئی تھی۔ وہ بے حد خوب صورت لباس تھا۔ کوئی عام سے نقوش والی لڑکی بھی پہنتی تو دیکھنے والے کی آنکھیں چند دھماکی جاتیں لیکن یہ تو سونیا تھی۔ بھرے اٹھے اٹھے بالوں کے صحن سے بنائے گئے بوڑے اور ہٹا میک اپ والے چہرے کے ساتھ بھی وہ لباس جیسے اس کے وجود پر روشنی بن کر بکھر گیا تھا۔ لیکن اس کے انداز میں وہ اعتماد تھا جو کسی کو بھی چٹ لے سکتا تھا۔ انتہا نے اس کی جانب دیکھا تھا اور بہت سارہ دیکھا تھا۔ یہ واقعی لباس ہی کی خوب دوری تھی لیکن حیران ساراری ہو گیا تھا۔

سونیا نے دیوار گیر آئینے میں اسے آپ کو دیکھا، پھر اسی آئینے میں نظر آتے انتہا کے عکس کو دیکھا

تھا۔ اس کی نگاہوں میں پسندیدگی تھی، ستائش تھی۔۔۔ سونیا کو یہ ستائش اچھی لگی۔ اس نے گھوم کر انتہا کو موع دیا تھا کہ وہ بھی کر اس لباس کو اور اسے دیکھ لے۔ یہ پہلی بار ہوا تھا کہ اس کا دل چاہا تھا کہ انتہا دل کھول کر اسے سراہے۔ اسے خود اپنی کیفیت پر حیرت ہوئی اور اسے اس بات پر بھی حیرت ہوئی کہ اسے یہ کیفیت بری نا لگ رہی تھی۔ اسے انتہا کی نگاہوں میں چھپی ستائش بری نا لگ رہی تھی۔ وہ اس کی جانب مڑی تھی۔

”میں نے کہا تھا نا۔ ہار جاؤ گے۔“ وہ مسکراتے ہوئے جتا رہی تھی۔ انتہا مسکرایا پھر سر ہلایا۔

”اتنی حسین شکست کس کجنت پر نہیں سہجے گی۔ میں تو پھر انتہا ہوں۔“ وہ ہنس رہا تھا۔ اسی دوران دکان کی سڑھیاں چڑھ کر کوئی ہال میں داخل ہوا تھا۔ سونیا کی سمت اسی راستے کی جانب بھی لیکن انتہا چونکہ اس کی جانب دیکھ رہا تھا اس لیے اس نے آنے والے کو دیوار گیر آئینے میں دیکھا تھا۔

”تم۔۔۔ زمین۔۔۔؟“ وہ تنک کر پلٹا تھا۔ اس کی آواز میں حیرت ہی نہیں جوش بھی تھا۔ سونیا اور اس کا طلسم مہر کر کے اڑ چھو ہو گیا تھا۔

☆☆☆

”کیا۔ واقعی؟“ عطیہ بیگم نے حیران ہو کر ماسٹر جی کی جانب دیکھا تھا۔ وہ خاموش ہی رہے مگر چہرے کے تاثرات سے سب واضح ہو رہا تھا۔ یہ ایک ایسا موضوع تھا کہ وہ بول کر بھی پیچھتاتے تھے اور نا بول کر بھی خوار ہوتے تھے۔ عطیہ بیگم کے چہرے کے تاثرات خوف ناک ہو چکے تھے۔

”اس کی ہمت کیسے ہوئی دوبارہ یہ بات کرنے کی اور آپ نے جوتا کیوں نا اتار لیا پاؤں سے۔ دو لگائی تھیں سر پر۔ سارا ہوش ٹھکانے آ جاتا۔ پہلے تھوڑی سی غزنی کروائی تھی ہماری جواب ایک بار پھر تماشا لگوانا چاہتے ہیں موصوف۔“ وہ تھکتے سے ہی اکھڑ گئی تھیں اور ماسٹر جی کو امید بھی یہی تھی۔

انتہا نے جب انہیں یہ بتایا تھا کہ زمین

واپس آگئی ہے اور میڈم تہینہ نے اس بار خود اسے فون کر کے گھر والوں سمیت کھانے پر بلایا ہے جب ہی وہ سمجھ گئے تھے کہ اب اگلا مرحلہ بہت مشکل ہونے والا ہے لیکن وہ بھی کیا کرتے۔ ایک طرف جوان اولاد بھی تو دوسری جانب من چاہا جیون ساھی۔ وہ کسے مایوس کرتے اور کسے سرخرو سمجھاتے۔

”آپ کو کچھ احساس بھی ہے کہ یہ کتنی بڑی بات ہے اور وہ بچی۔ جو آپ کے بیٹے کی خاطر سب کچھ چھوڑ چھاڑ یہاں آگئی ہے۔ اپنے ماں باپ کو ضد کر کے مجبور کیا ہے کہ وہ اس شہر میں پھر سے بسیرا کر لیں۔ اسے بھول گئے ہیں آپ اور پھر بہن کو کیا جواب دیں گے ماسٹر جی۔ آپ اتنے نا سمجھ کیوں ہو جاتے ہیں۔“ وہ دانت چبا چبا کر بول رہی تھیں۔ ماسٹر جی نے اپنے کچھڑی کچھڑی بالوں میں ہاتھ پھیرا پھر گہری سانس بھر کر بولے۔

”میں تو بس آپ دونوں کے درمیان گھن چکر بن کر رہ گیا ہوں بی بی۔ ایک طرف آپ کا لاڈلا بیٹا ہے تو دوسری جانب آپ خود ہیں۔ میں کس کی سنوں اور کس کی نظر انداز کروں؟“ وہ جو کر کہہ رہے تھے۔

”آپ مجھے ہی نظر انداز کریں بس ماسٹر جی۔ میں لگتی کون ہوں آپ کی۔“ انٹش کے آگے آپ کو نظر آیا ہے کبھی کوئی۔“ وہ سخت ناراض تھیں۔ انہیں یہ بات ہنسنے ہی نا ہو رہی تھی کہ انٹش ایک بار پھر اس لڑکی کی باتوں میں آکر میڈم تہینہ جیسی خاتون کے ہاتھوں ہونے والی بے عزتی کو بھول بھال چکا تھا۔

”آپ محل سے میری بات سن لیا کریں تو میرا کتنا وقت بچ جائے۔ لیکن آپ ایک دم جذباتی ہو جاتی ہیں۔“ عطیہ بیگم نے ایک بار پھر ماسٹر جی کی بات کاٹ دی۔

”جذباتی..... میں جذباتی ہو جاتی ہوں؟“ وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر واقعی انتہائی جذباتی ہوتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

”اکھوتا بیٹا ہے میرا انٹش۔ میرے پاس کون سی چار پانچ اولادیں ہیں۔ ایک ہی تو بیٹا دیا ہے اللہ

نے۔ اب اگر اس کے معاملے میں بھی جذباتی نا ہوں تو کس کے معاملے میں ہوں۔ میرے دل میں کتنے ارمان ہیں اس کے لیے۔ یہ نہیں سوچتے آپ دونوں۔ آپ کے لیے بس نیٹھی مرضی اور پسند اہم ہے۔ میں اور میری رائے آپ کے لیے ہمیشہ غیر ضروری رہے گی۔“ وہ روہائی سی ہو گئی تھیں۔ وہ تو سوچتا اور انٹش کو اکٹھے ایک ساتھ کام کرنا دیکھ کر خوش تھیں کہ انٹش کے دل سے اس لڑکی کا خیال نکل چکا ہے لیکن یہ تو ان کی خام خیالی ثابت ہوئی تھی۔ ماسٹر جی کو بہت دکھ سا ہوا لیکن وہ واقعی مجبور تھے۔

انٹش ان کو کہہ گیا تھا کہ میڈم تہینہ ان سب سے ایک بار پھر ملنا چاہتی ہیں اور اب کی بار صورت حال پہلے والی نا ہوگی۔ انٹش کے چہرے پر جو الوہی خوشی انہوں نے دیکھی تھی، وہ انہیں یہ یاد کروانے کو کافی تھی کہ وہ کسی کی نہیں سننے کا تو پھر وہ کس بنیاد پر اسے سمجھاتے۔ وہ اولاد سے بلا وجہ کے بحث و مباحثہ کے شروع سے قائل نا رہے تھے اور یہ ان کی خامی نا تھی تھی بلکہ اکلوتے بیٹے کی محبت میں ایک خود ساختہ قسم کی مجبوری تھی۔

”ایسا کیوں سوچتی ہیں آپ۔ میرے لیے آپ سے بڑھ کر تو کوئی نہیں ہے۔ آپ اگر ایک اکلوتی اولاد کے لیے جذباتی ہو سکتی ہیں تو میں ایک اکلوتی زوجہ کے لیے جذباتی نہیں ہو سکتا۔ مگر میں کیا کروں اس معاملے میں ہمیشہ سے ہی غیر جانب دار رہا ہوں۔ بچے کی خوشی جس میں ہے، میرا وہ اسی طرف کا ہے۔“ وہ نہایت بودے سے انداز میں اپنا موقف بیان کر رہے تھے۔ عطیہ بیگم نے انہیں گھور کر دیکھا۔

”اور اس بچی کی خوشی؟ اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ کیا نہیں کیا اس نے آپ کے بیٹے کے لیے۔ یہ وہی تھی جس نے آپ کے بیٹے کے اسٹینڈس کو اتنا اونچا کر دیا کہ آپ کی میڈم تہینہ سر جھکانے پر مجبور ہو گئی۔ آپ نے اس کے نارے میں سو جا ہے کبھی۔ اس کے دل پر کیا گزرے گی؟“ وہ انہیں گھور رہی تھیں۔ ماسٹر جی نے سر جھٹکا۔

”وہ بہت اچھی بچی ہے۔ بہت سمجھ دار اور ذمہ دار۔ یہ اس کا احسان ہے کہ اس نے ہمارے بیٹے کو ذمہ سے مانتا ب کر دیا ہے۔ اس کے لالہ بانی پن اور انتہائی ذمہ داری میں بدل دیا ہے۔ لیکن یہ صرف احسان ہے..... احسان۔ آپ اسے۔“ سستی محبت والی ٹینک لگا کر کیوں دیکھی رہتی ہیں؟ آپ کیوں نہیں سمجھتی کہ اسے آپ کے بیٹے میں اس سے زیادہ اپنی نہیں ہے۔“ ماسٹر جی کا انداز ابھی بھی نا صحتانہ تھا۔ عطیہ بیگم نے ایک گہری سانس بھری پھر عجیب سی رنجیدگی ان کے لہجے میں جھلکنے لگی تھی۔

”آپ کیوں نہیں سمجھتے ماسٹر جی۔“ وہ ”آپ“ پر زور دیتے ہوئے بولی تھیں۔ ”سوچنا کی آنکھوں میں انٹش کے لیے محبت دیکھی ہے میں نے۔ آپ نے نور نہیں کیا، بچی کچھ دنوں سے سر جھٹائی کر جھٹائی پھر رہی ہے۔ اچھا مان لیتی ہوں یہ احسان ہی کبھی لیکن عورت کو بھی بلا وجہ مرد پر احسان نہیں کرنی ماسٹر جی۔ وہ جب بھی مرد پر احسان کرتی ہے۔ اس کے پیچھے یہ مر جانی کجست محبت ہی ہوا کرتی ہے۔“

ماسٹر جی یہ بات سن کر دم گھٹے گئے تھے۔ ان کا دل چاہا وہ ایک دم اس بات سے انکار کر دیں لیکن وہ کر نہیں پائے تھے کیونکہ یہ بات بحیثیت ایک مرد وہ بھی نہیں سمجھ سکتے تھے۔ عطیہ بیگم غلط تو نہیں کہہ رہی تھیں۔ سوچنا کی جھل جھل کرتی ٹہنی کئی دنوں سے ناکی نہیں دی تھی انہیں۔ وہ تو ہمہ وقت ہنستی مسکراتی رہنے والی لڑکی تھی لیکن آج کل ایسا کیا ہوا تھا کہ وہ کبھی بھی سی رہنے لگی تھی۔

☆☆☆

”مجھے انٹش کہتے ہیں۔ سب جتنا ہے مجھ پر۔“ انیا کی سماعتوں میں کسی نے سرگوشی کی تھی۔ اس نے فوراً ردی طور پر ادھر ادھر دیکھا لیکن وہ وہاں موجود نا تو نظر آتا۔ سوچنا نے سر جھٹکنے ہوئے اپنے ہاتھوں کا جانب دیکھا تھا۔ وہ ہاتھ خالی تھے کیونکہ زمین کا سب کچھ لے جا چکی تھی۔ اس کے دل میں ٹہنیں اٹھائی اور اسے اس تکلیف سے رنج ہی نہیں پہنچا تھا۔

یہ زاری بھی ہوئی تھی۔ اسے سخت الجھن بھی ہوئی تھی۔ انٹش زمین کا ہی تو تھا، اس کا تو کبھی ہوا ہی نا تھا اور یہ بات تو ابتدا سے ہی سب جانتے تھے پھر اب اس کا اس طرح واپس آ جانا یا انٹش کا سب کچھ بھلا کر پھر اس کا دم بھرنے لگ جانا ایسا کوئی عجیب عمل تو نا تھا۔ وہ اس لڑکی سے محبت کرنا تھا اور محبوب کو دیکھ کر تو سب ہی پھل جابا کرتے ہیں۔

انٹش نے اگر اپنی تو بہن بھلا دی تھی تو بھی یہ بات ایسی کوئی حیران کن تو نا تھی لیکن وہ یہ بات خود سے بھی تسلیم نہیں کرنا چاہتی تھی کہ اسے یہ سب بُرا لگ رہا تھا کیونکہ اب اسے انٹش اچھا لگنے لگا تھا۔ ”نہیں..... یہ نہیں ہو سکتا۔“ اس کے بدن میں سخت لرزش پیدا ہوئی۔ اس نے نفی میں سر جھٹکا تھا۔ یہ بات وہ مر کھ بھی کسی کے سامنے تسلیم نہیں کر سکتی تھی۔ ”میں انٹش ہوں۔ محبت جتنی ہے مجھ پر۔“ ایک بار پھر اس کی سماعتوں میں جیسے کوئی چلا یا تھا۔

وہ برملا، برجستہ برٹیکل تذکرہ اور بات بے بات یہ جملہ کثرت سے بولنے کا عادی تھا۔ سوچنا نے جب پہلی بار یہ جملہ سنا تو اسے نہایت برا لگا تھا۔ وہ انٹش کو ہی نہیں اس کی ان تمام خود پسندی والی عادتوں کو بھی سخت نا پسند کرتی تھی۔ لیکن دھیرے دھیرے اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ انٹش کو سوسے سمجھے بنا جس عادتاً ایسا کہنے کی عادت تھی۔ یہ بات بھی سچ تھی کہ وہ خود پسند تھا، اسے اپنی ذات کو سراہتے چلے جانا اچھا لگتا تھا یہی وجہ ہے کہ سوچنا کو وہ شروع سے ہی پسند نا تھا۔ بزرگوں کے درمیان ان کے رشتے کی بات کے تذکرے نے اس نا پسندیدگی کو کم کرنے کے بجائے مزید بڑھا دیا تھا پھر سوچنا پر آشکار ہوا تھا کہ وہ ہی اسے نا پسند نہیں کرتی تھی بلکہ انٹش بھی اس سے خار کاٹا تھا۔ یہاں تک تو سب ٹھیک تھا لیکن پھر جانے کیسے سب کچھ بدلتا چلا گیا۔ وہ ان کے گھر میں آئی پھر جان بوجھ کر اس کے قریب آئی۔ وہ دوست بن گئے اور آہستہ آہستہ بزنس پارٹنر بھی۔ یہ بھی قبول تھا اسے۔ لیکن وہ اسے اچھا لگنے لگ گیا تھا۔ اتنا اچھا کہ وہ اس

کے دور جانے کے خیال سے تکلیف میں مبتلا ہو گئی تھی۔ اتنا اچھا کر زمین کی واپسی نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اتنا اچھا کر اس کے اس عمل نے سونیا کی ہنسی کو کھلا کر رکھ دیا تھا۔

زمین کی واپسی اسے اچھی نا لگ رہی تھی اور یہ سب قبول نہ تھا اسے۔ وہ محبت و جنت کی تو قائل ہی نارہی تھی۔

”میں نے کہا تھا نا محبت جنتی ہے مجھ پر۔“ وہ جیسے دور کہیں کھڑا اب چڑا رہا تھا اسے۔

سونیا نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا لیکن وہ کہیں نہیں تھا اور اس بات کا سونیا کو اتنا دکھ تھا کہ اس سے کوئی کام بھی نہیں ہو پاتا تھا۔ اسے اپنی کیفیت خود بھی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

یہ سب تو ہونا ہی تھا ”سونیا نے ایک بار پھر تاسف سے سوچا۔ زمین کو واپس آئے چند دن ہی تو ہوئے تھے اور سب کچھ پہلے جیسا ہو گیا تھا۔ جکسا پزل کا ہر ٹکڑا جو آتش کے ایک درزی کا بیٹا ہونے کی وجہ سے الٹ پلٹ ہو گیا تھا، اس کے ڈریس ڈیزائنز ہو جانے کے بعد واپس اپنی درست پوزیشن پر آ گیا تھا۔ اب تصویر بالکل واضح تھی، مکمل اور خوب صورت بھی۔ لیکن کوئی چیز اپنی جگہ سے الٹ گئی تھی تو وہ سونیا عرف محراب کا دل تھا۔

آتش آج باقاعدہ ایک بار پھر زمین کے والدین سے ملنے گیا تھا اور اب کی بار وہ صرف زمین کی دعوت پر نہیں گیا تھا بلکہ اسے میڈم تمبینہ نے خود بچ پورے خاندان کے مدعو کیا تھا۔ انہوں نے اس کی، اس کے ڈیزائنز کی پذیرائی کو اتنے کھلے دل سے قبول کیا تھا کہ آتش سب بھول بھال گیا تھا بلکہ وہ بے حد خوش تھا۔ اس کی جیسے دلی مراد برآی تھی اور سونیا اس کو بتاتی تھی نا جتا بانی تھی کہ۔۔۔۔۔

”آتش! تم اپنی تو جن کو اتنی جلدی کیسے بھول سکتے ہو۔ ایسے مت کرو۔ مجھے تمہاری اس حرکت سے تکلیف ہو رہی ہے۔ بے حد تکلیف۔“

یہ بات تو وہ خود کو بھی بتا نہیں پاری تھی تو آتش کو

بتانا تو دور کی بات تھی۔ وہ سب آج میڈم تمبینہ کے یہاں مدعو تھے۔

”یہ اچھا نہیں ہوا۔ یہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔“ وہ خود کو بار بار یہی سمجھاتی رہتی تھی لیکن اس کے ہاتھ سے سب کچھ برف کی طرح پھل کر بہہ گیا تھا مگر دنیا کو اپنے زخم دکھانے سے کیا حاصل ہو جاتا۔ اسے جھوٹی ہمدردیوں سے چوٹی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی تھی۔

”دل ٹوٹ جایا کرتے ہیں۔ لیکن عزم سلامت رہنے چاہئیں۔“ اس نے خود اپنے ہی سامنے اپنی پسندیدہ نصیحت کو دہرایا تھا۔

☆☆☆

”تم خوش ہو آتش!“ زمین نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے سوال کیا تھا۔

”نہیں۔ اس میں خوش ہونے والی بات ہی کیا ہے؟“ اس نے نیم سنجیدہ سے انداز میں کہا تھا۔

زمین نے زیادہ دھیان نہ دیا تھا۔ اس کے لیے اتنا کافی تھا کہ وہ خوش تھی۔ اس کی ہنسی نے اتنا اچھا ڈنڈا دیا تھا آتش کے اعزاز میں اور اس کے تاپا اور پھپھو کی فیملیز بھی مدعو تھیں۔ بظاہر یہ ایک عام سا ڈنڈا تھا جو لوگ تعلقات بڑھانے کے لیے دیا کرتے ہیں لیکن آتش کا تعارف جس خصوصی انداز میں کروایا گیا تھا وہ سارے رشتہ داروں کو باور کروانے کو کافی تھا کہ وال میں کچھ کالا ضرور ہے۔

”تم کچھ بھی کہو۔ لیکن میں بہت خوش ہوں۔ میری سب کزنز تمہیں دیکھ کر حیران ہی ہو گئی ہیں۔ اتنے مشہور ڈیزائنر سے میری وابستگی انہیں ہضم ہی نہیں ہو رہی۔“ وہ پر جوش سے انداز میں کہہ رہی تھی۔ آتش کو اس کے چہرے پر پھر سے رنگ اچھے لگے تھے۔ ایک آسودگی سی اس کے اندر اتر آئی۔ یہ ایک بہت خوب صورت احساس تھا۔ ہم جسے چاہتے ہیں اسے ہمیشہ خوش دیکھنا چاہتے ہیں۔ اسے زمین کے چہرے پر پھیلا اطمینان اور سکون بے حد بھلا لگ رہا تھا اور اس کی اطمینان و سکون میں اسے وہ چہرہ یاد آیا جس کی مسکراہٹ اسے ہمیشہ اپنے لیے کسی کی

چارم سے کم نا لگی تھی۔

”سونیا نہیں آئی؟“ اس نے خود سے سوال کیا تھا کیونکہ اس کی امی، ماسٹر جی اور پھپھو اور پھپھا جی تو موجود تھے۔ زمین نے اس کا چہرہ دیکھا۔ اس نے استفسار نہیں کیا تھا لیکن آتش کے چہرے پر جو ذرا سی الجھن چمکی تھی اس سے ایک بڑا سا سوالیہ نشان خود بخود زمین کے چہرے پر بچ گیا تھا۔

”میں نے سونیا کو نہیں دیکھا۔ وہ نہیں آئی؟“ آتش نے اب با آواز بلند سوال کیا تھا۔ زمین نے سر جھٹکا۔

”نہیں آئی تو نا سہی۔ اس کی مرضی۔“ اس کے لیے یہ اتنا اہم نہیں تھا۔

”ارے خواہ مخواہ نا سہی۔ اسے یہاں آنا چاہیے تھا۔“ ”محراب“ کی اتنی پذیرائی اسی کی بدولت تو ممکن ہوئی ہے۔ ٹھہرو میں اسے کال کرتا ہوں۔“ اس نے کہہ کر انتظار نہیں کیا تھا بلکہ فون ملانے لگا تھا۔ کئی بار کی مسلسل کوشش کے باوجود سونیا نے فون نہیں اٹھا یا تھا اور یہ بات آتش کے لیے بہت حیران کن تھی۔ وہ کبھی فون کالز کو انکوری نہیں کرتی تھی کیونکہ وہ برا بھلا کہتی تھی میرا تو سارا بزنس ہی فون کالز کا محتاج ہے۔

”کیا ہوا؟“ زمین نے پوچھا تھا۔

”وہ فون نہیں اٹھا رہی۔“ آتش کے لہجے میں ابھی بھی بے یقینی تھی۔ زمین کے چہرے پر فاقا نہ سی مسکراہٹ چمک اٹھی تھی۔

”وہ اٹھائے گی بھی نہیں کیونکہ وہ بھی جل بھن گئی ہے۔“ اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ آتش نے اس کی بات کے منہم کو کچھ ہنسا نہ دیدی انداز میں گردن ہلاتی تھی۔

”ارے نہیں بھئی۔ وہ نہیں جل سکتی۔ وہ جلا کر خاک کر دینے والوں میں سے ہے۔ تم نے سمجھا کیا ہے اسے۔ وہ تو ان لوگوں میں سے ہے جو جوتھے چراغوں پر پھونک مار دیں تو وہ بھی زندہ ہوا نہیں۔ وہ اپنی ٹہنی میں روشنی کے کرچا لیتی ہے کہ جہاں تاریکی پائے دیں اُجالا کر دے۔ اس کی مسکراہٹ سے امید پھوٹی ہے اور جو وہ

کہیں ہنس دے تو راستہ بھولنے والے کو راستہ یاد آجائے۔ وہ زندگی میں ہارنے والوں کے ساتھ تب تک کھڑی رہتی ہے جب تک وہ جیتنے نہیں لگ جاتے۔ وہ محراب ہے یعنی سونیا۔ من چاہی۔ وہ نہیں جل سکتی۔ تم نے ہارن کو جلتے دیکھا ہے بھی۔“

آتش کے لہجے میں وہی مان اور بھرپور سا تھا جو ایک اچھے دوست کو دوسرے دوست پر ہوتا ہے۔ اس کے ہر لفظ میں وہ احترام تھا جو کسی بھی معتبر دوست کے لیے کسی دوسرے دوست کے لہجے میں ہو سکتا ہے لیکن زمین پہلی بار خود جل اٹھی تھی۔ چارٹ دس رانچ سے۔

”وہ دیکھو آگئی میری پھل پیری۔“ آتش نے ایک دم ہی اس طرف دیکھا تھا۔ وہ ہنستی مسکراتی ٹھٹھکلائی سی اندر داخل ہو رہی تھی۔ سارے وجود سے وہی پُر اعتمادی روشنی پھوٹ رہی تھی جو سامنے نظر آنے والے ہر شخص کو تازہ دم کر دے۔ وہی انفرادیت، وہی توانائی۔ جسے محراب عرف سونیا قیمتی قرار دیتی تھی، ایک لمحے میں ہر طرف چھانے لگی تھی۔

”دل ٹوٹ جایا کرتے ہیں۔ لیکن اشتہار لگانے کا فائدہ۔ سول تو ٹوٹا تھا لیکن عزم سلامت تھا۔ ایک بار پھر۔۔۔۔۔

☆☆☆

پیارے دوستو! یہاں آکر معاملہ میرے ہاتھ سے بھی جیسے پھسلتا ہوا محسوس ہونے لگا تھا۔ جو ہو رہا تھا، اچھا نہیں ہو رہا تھا۔ یہ سب نہیں ہونا چاہیے تھا۔ میں نے اس سب کی توقع نہیں کی تھی۔ میں اگر اپنے بیٹے کی خوشی میں خوش تھا تو بیٹی جیسی بھانجی بھی مجھے بہت عزیز تھی۔ میں نے یہ نہیں چاہا تھا کہ وہ میرے جیسی لڑکی کی ڈھک سے دوچار ہوئی لیکن ایسا ہو گیا تھا۔ مجھے اعتراف کر لینے دیں کہ اس معاملے میں کچھ قصور وار تو میں بھی تھا لیکن کیسے۔ یہ اب آخری حصے میں ہی بتاؤں گا آپ کو۔

باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ

☆☆☆

آنکھیں

وہ کبھی بھی اپنی اماں کی لاڈلی نہیں رہی تھی، ہوتی بھی کیسے لڑکی جو بھی میٹرک دیتے ہی اماں کو اس کی شادی کی فکر ستانے لگی، جبکہ اس نے آبا کے تجربے سے نصیحت پکڑ لی تھی کہ شادی کر کے زندگی کو سمجھوتے کی چھوہندی تو لگانی ہی ہے تو کیوں نہ پہلے اپنی من مرضی کی صاف ستھری زندگی بسر کر لی جائے پھر چاہے جو ہو سو ہو، مگر اماں اس کی من مرضی کی زندگی گزارنے والی منطق کے تحت خلاف تھیں۔

”اماں مجھے پڑھنے دو آگے، میٹرک کی آج کے دور میں اوقات ہی کیا ہے۔“ وہ ہنسی ہوئی۔

”چل ہٹ، پڑھ کے کیا کرے گی، شادی ہوگی تو ساری ڈگریاں راکھ بن جائیں گی اور جی بڑا ہوگا۔“ اماں کے الفاظ سے زیادہ وہ انداز پر دنگ رہ گئی۔

”تو میری ماں ہو کر ایسی امید لگائے بیٹی ہے پھر کسی اور سے کیا گلہ کرنا۔“ صدے سے کہتی وہ وہاں سے ہٹ گئی۔

پھر نہانے کیا ہوا، کچھ دنوں بعد اماں نے اسے آگے پڑھنے کی اجازت دی، غالب گمان تھا کہ یہ سب آیا کی مہربانی تھی، انہوں نے ہی اماں سے منہ ماری تھی اور بالآخر انہیں قائل کرنے میں کامیاب ہو گئیں۔

☆☆☆

کسی بے وفا کی مانند وقت کی پیاری سے

دو سال نکل کر جو گزرے تو واپس نہ آئے۔ اماں نے اپنا راگ بدلا نہ سُر۔ اُس سے پوچھنے یا بتانے کے جھنجھٹ میں پڑے بغیر رشتہ ڈھونڈو ہم کے لیے کمر کس لی، جس نے واقعتاً اماں کو ناکوں چنے چوائے، مہم کے لیے اماں کی سرگرمیوں سے وہ بھی واقف ہو چکی تھی، مگر لب بستہ کیسے سب دیکھتی رہی، وہ جو ہوش سنبھالتے ہی سنا تھا کہ آج کل اچھے لڑکوں کا کال پڑا ہے، مگر یہ کال پڑتا کیسے ہے، اب اس کی گناہ گار آنکھوں نے مشاہدہ بھی کر لیا۔

اب حال یہ تھا کہ اماں کو پیسے دور رسٹ لو سنٹر یعنی میرج بیورو کا رخ کرنا پڑا، بجٹی سسرال والوں سے بھی بنا کر نہ رہی تھی اور مکے میں کوئی جوڑ کا تھا نہیں کہ وہاں سے کوئی آس رکھتیں، پھر خستہ حال دیواروں اور بوسیدہ دروازے والے گھر میں خوشی سے آتا بھی کون۔ بلا آخر ایک پرانی جاننے اور رشتہ کروانے والی کی وساطت سے اماں میرج بیورو جو پہنچی تو وہاں کی چمک دمک دیکھ کر آنکھیں اور قیمت سن کر منہ ہل گیا۔

”آئے ہائے، یہ بیرو (بیورو) والے ایسے قصائی بنے بیٹھے ہیں، جیسے ابھی بکرا (لڑکا) کھا کر اتار کے ہاتھ میں پکڑا دیں گے، کہ بجٹی یہ تو تمہارے حوالے کیا، اب جیسے چاہے اپنی لڑکی بیاہ دو اس کے ساتھ کوئی پوچھنے والا ہوگا نہ روکنے والا۔“

دورے سے دانتی پر اماں کی یہ رائے تھی، اس کے

کان تو کھڑے ہی تھے، جھٹ بولی۔

”دیکھا اماں اس لیے کہہ رہی ہوں کہ مبر سے انتظار کرو، کیوں پریشانی ہے اپنا وقت اور صحت برباد کر رہی ہو، ہزاروں روپے کمیشن اور شادی کے وقت جہیز پر خرچ کرنے سے بہتر ہے کہ تم میری پڑھائی پر یہ پیسے خرچ کرو، دیکھ لو اماں ایک نہ ایک دن تو شادی

ہوئی جائے گی، ابھی مجھے کچھ کرنے دو اپنے اور تمہارے لیے۔“

اماں کو نرم پڑنا دیکھ کر اس نے دوبارہ اپنی عرضی پیش کی، جسے اماں نے تین دن بعد خالہ سیدہ (رشتے والی) کی تازہ برین واشنگ سے مسز کر دیا۔ جاتے جاتے خالہ بھی اپنا حصہ مانگنا نہ بھولی۔



کہہ رہی تھی۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے
بہنوں کے لیے خوب صورت ناولز



سلاسل

میں

افشال آفریدی

قیمت 400 روپے

فصل خم کا اگلا شمارہ

رضیہ جمیل



قیمت - 300 روپے



گل کھسار

فرح بخاری

قیمت - 400 روپے

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار کراچی۔ فون: 32216361

☆☆☆

مہینوں بعد اماں کو فرصت ملی تھی بیٹی کی خبر خبر لینے کی یہاں آئی تو دل کو کچوکا لگا، ماں کے گھر بھی لون سائیش کر رہی تھی مگر تین وقت کا کھانا اور اچھا پنا داتو مل ہی رہا تھا، پر یہاں تو شاید لگا اٹلی بہتی تھی۔ ساس کو سرد کار نہ تھا کہ بوجھے یا مرے، بس ساری ذمہ داری بیٹے کو بیا بنے تک کی ہی تھی، بسورت دیگر جگ ہنسی کون اور کیوں کر بہتا۔ خیر! اس سے تو اماں کچھ نہ بولی اور نہ نازلی نے ہی اپنا بھرم کھونے دیا مگر پھر جب کچھ عرصے بعد اسے بھی ساس اور شوہر کی مشترکہ رضامندی سے میکے جانے کا مژدہ جاں سنایا گیا تو اس بھرم کے سارے بل کھلتے رہے، اماں شرمندہ شرمندہ ہی نظر آتی۔

”اماں! پچھتاتے سے کچھ نہیں ہونے والا، جب پہلے ہم تجھے کہتے تھے کہ اسے بڑھنے دے تب تو نے ایک نہ کی، اب ہمت پکڑنی ہوئی اسے خود ہی۔“ آپا بھی اگلے دن آ پہنچی۔ ”ظاہر ہے اب اس کے علاوہ کچھ اور کہہ بھی نہیں سکتے کہ اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چک لگیں کھیت۔“ نازلی کے لہجے میں تو جیسے صدیوں کا پچھتاوا اور دکھ گھلا تھا۔

ایسے کیسے، ابھی کھیت میں خوب فصل ہے، بس تو میرے والی غلطیاں مت دہرائے، جو ہوتا ہے اسے کوئی نہیں ٹال سکتا۔ تم نیت صاف رکھو، شوہر کو مجازی خدا بناتے بناتے حقیقی خدا مت سمجھ بیٹھ، ناحق بات ایک حد سے زیادہ برداشت کرنے کی ضرورت نہیں۔ ایک بار مار کھائی تو ساری زندگی اس کے تھروں کے لیے مختص ہو جائے گی۔ سمجھ رہی ہے نازلی، ہمت کر، پیار اور محبت سے رہ اپنے شوہر کے ساتھ اور اسے بھی نکھار، بس اللہ مالک ہے ہمارا تمہارا۔“ آپا کی اولہ انگیز تقریر نے اسے جوش سے سر ہلانے پر اسایا۔

اماں دعائیں دیتی آنکھوں میں آئے آنسو صاف کرنے لگی اور دونوں کو گلے لگا لیا۔

شوہر کو بغیر بایک کے دفتر سے آتے دیکھا تو چونکے بناندرہ کی۔

”کیا؟“ شوہر نامدار نے اس کے تاثرات دیکھ کر انسا سوال کیا۔

”آپ کی موٹر۔“ اس نے دہلی آواز سے پوچھا، مانو وہ بھی قیامت ہو گیا۔

”تو اپنی ماں کے گھر سے لائی تھی کیا، جس کی تھی اسے لوٹا دی۔“

”سلیم۔“ اماں تنبیہ کرتی باہر آئیں۔

”بس اماں مجھ سے یہ ناک نہیں ہوتا اب، تو نے بھی کن بھوکے نکلے لوگوں میں بیاہ دیا، ذرا پیسے خرچ کرتی تو کسی کھاتے بیٹے گھر سے دہن مل ہی جاتی مجھے بھی، وہ سنا نہیں، چچی کیا کہتی ہیں، پیسے دو رشتہ لو۔“

وہ اس کی موجودگی کی پروا کیے بغیر بکنا جھکتا غسل خانے کی جانب چلا گیا۔

اور وہ بڑا سا سوالیہ نشان چہرے پہ لیے جہاں تھی وہیں جم سی گئی۔ گھر داری اور سلیقہ مندی تو اس نے اماں سے سیکھ لی تھی، مگر اس بار غربت بھی صرف ڈاک کی بیٹی کا ہی نرہ بھری تھی۔

☆☆☆

”اے سیدہ! تیری لاٹری لگی ہے کیا۔“ نکڑ والے میاں صاحب اس کے ہر دوسرے دن لمبی لمبی کالیں کرنے پر حیران ہوئے بناندرہ سکے۔

”ارے مت پوچھ، لاٹری سے کچھ کم بھی نہیں، یہ کام ہی ایسا ہے، یہ لگی کھلے پیرو (پیرو) والوں سے بنا کر رکھو تو بڑے پیش ہیں، ایک پارٹی کو راضی کرو اور دوسری کی عقل پر اپنی باندھ دو۔“ تجھے بھی بتائے دے رہی ہوں لگ کے کوئی کام ڈھونڈ یا پھر میرے ساتھ پارٹن (پارٹنر) شپ کر لے۔ میں تجھ

نکلے کو پیلو سے نہیں باندھنے کی۔“ خالہ سیدہ، وارو کے سو والے استعمال شدہ کارڈ کو ڈراتر چھا کر کے بطور ٹوتھ پک استعمال کرتے ہوئے نخوت و بے نیازی

خیر وہ کبھی بنی بیٹھی اپنے نیچے نویلے سر تاج کا انتظار کرتی اماں کی نصیحتوں کو دہرائی رہی۔

کچھ لمحے مزید دستی خاموشی کی نظر ہوئے، پھر یک دم دروازے پر دستک ہوئی تو وہ ہڑ بڑا اٹھی، چند لمحے لگے تھے اسے پھٹنے میں۔

☆☆☆

دلہن کا کمرہ آرائشی پھولوں سے سجا تھا اور مٹی کے تیل کی خوشبو ہناتی تھی کہ دیواروں کو تازہ قلعی کرا کے کمرے کو بیڈروم بنانے کی کمزوری کوشش کی گئی ہے۔ بیڈ کے دائیں جانب رکھے سنگھار میز پر عطر کی شیشی، ہاشمی سرے کی گولڈن ڈبیا، آٹلے کے تیل کی بوتل، سرخ رنگ کا سنگھار اور چوڑیوں والا اسٹینڈل کرا سے حساس دلار ہے تھے کہ یہ سب اس کے لیے ہے۔ آج سے پہلے سنگھار میز کی اتنی تواضع کی گئی تھی اسے اس قابل جانا گیا۔

بائیں جانب چھوٹی سی کھڑکی، میل خور رنگ کے کپڑے جو گلابی پھول پرنٹ شدہ تھا کے پردے کی قید میں تھی، کچا کہ وہ کھڑکی اس کے لیے ہوا کا جھونکا لے کر آئی۔

خیر وہ کبھی بنی بیٹھی اپنے نیچے نویلے سر تاج کا انتظار کرتی اماں کی نصیحتوں کو دہرائی رہی۔

کچھ لمحے مزید دستی خاموشی کی نظر ہوئے، پھر یک دم دروازے پر دستک ہوئی تو وہ ہڑ بڑا اٹھی، چند لمحے لگے تھے اسے پھٹنے میں۔

☆☆☆

شام کا پنجھی اپنے پر پھیلائے لگا اور گل داؤدی نے سہم کر لب سی لیے۔ آج خلاف معمول وہ موقع

بے کرا

صبح کے پنکھ پیازی رنگ کے تھے..... جن پر سنہری سفوف چھڑکا جا رہا تھا۔ اجالا پھیلے کافی وقت بیت چکا تھا۔

ایسے میں ایک فٹ ہاتھ پر چودہ سالہ لڑکی اور اسی کا ہم عمر لڑکا چلتا دکھائی دے رہے تھے..... جن کی چال میں ہی نہیں، انداز میں بھی غلت تھی۔ سفید یونیفارم پہنے، کشمیری بچیوں کے اسٹائل میں سر پر اسکارف لپیٹے۔ ہاتھ میں میتھ کی ہیلپنگ بک پکڑے وہ پورے زور و شور اور سنجیدگی سے میتھ کے سوال ذہن نشین کر لینے کے بڑے جتن کرتی دکھائی دیے رہی تھی۔ شفاف چہرے پر پاکیزہ معصومیت تھی۔ اور گل گلابی گلابی پڑ رہے تھے..... اسے اپنے ٹیٹ کی فکر ستائے جا رہی تھی۔

اس کے برعکس لڑکا ہلکے ہلکے جوش میں مسکراتا..... زیر لب دھیرے دھیرے کوئی دھن بکھیرتا۔ ایک ہاتھ سے بار بار بال سنوار رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس سے بڑھ کر کوئی اور اہم کام اس کے پاس نہیں..... آہستگی سے گنگنا تے ہوئے وہ ہنسا..... پھر بول اٹھا۔

”سنو“ لڑکی رک گئی۔

”جلدی کہو“

”تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو.....“ لڑکا ہچکچا کے بولا..... لڑکی ٹھنک گئی یوں جیسے سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ اس بے ٹکی بات کا کیا جواب دے ”تو میں کیا کرو؟“ سر پر لیپے اسکارف سے ماتھے کے بل چھپ گئے..... لہجہ ناگواری لیے ہوئے تھا۔

”میں تم سے..... محبت کرتا ہوں۔“ وہ بے حد محبت سے بولا تھا۔ لڑکی ہکا بکا رہ گئی۔ بلکہ ششدر ہو چکا۔

”تمہارا دماغ ٹھکانے پر ہے۔“ اگلے لمحے میں وہ غصے سے کہہ رہی تھی..... گلابی گال مارے صدمے کے قندھاری اتار ہو گئے۔

”کیا ہوا..... میں نے کچھ غلط تو نہیں کیا۔ ہر کوئی محبت کرتا ہے۔ میں بھی کرنے لگا ہوں۔“ چودہ سال کا لڑکا فکر مندی سے ہاتھ تھام کر بولا۔ لڑکی نے فوراً سے بیشتر ہاتھ کھینچ کر اسے دے مارا۔

”تم نہایت فضول لڑکے ہو..... میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ابھی سے تم ایسی واہیات باتوں کے پیچھے پڑو گے۔ وہ بھی مجھے کہہ دو گے؟ مجھے.....؟ جتنی توجہ ان باتوں پر دیتے ہو پڑھائی پر دو تو فائدہ بھی اٹھاؤ..... بڑے کندے دوست ہیں تمہارے انہوں نے ہی تمہیں سکھایا تاں یہ سب..... ورنہ میں تمہیں اچھا سمجھتی تھی۔

سرخ گالوں والی لڑکی میتھ کے سوال بھول کر اس کو چھاڑ پٹاری ماری تھی۔ وہ چند ماہ بڑی ہوگی اس سے اور ان باتوں کو بہت برے انداز میں لیتی تھی..... زہر لگتے تھے اے لڑکے..... وہ بھی لگ رہا تھا۔

اور زہر لگتا لڑکا ذرا خفا ہوا..... اس میں کدو برائی۔ اودھ سمجھا..... لڑکیاں کون سا جلدی مانتی ہیں اور بہت جگہ سے سنا ہے کہ محبت اپنا آپ منوایں ہے۔ یہ مان جائے گی۔ ایک منٹ مجھے کچھ کر چاہیے..... پس..... اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا

دو دن پہلے کا لکھا خط محفوظ تھا..... اثر نہ لینے والی مسکراہٹ کے ساتھ اس نے ہاتھ آگے کر دیا..... لڑکی اس ڈھٹائی پر بے بس سی ہوئی۔

”یہ پڑھنا تم..... پھر بتانا۔“ لڑکی نے خط لیا۔ ٹیٹ سے دل اٹھ چکا تھا۔ بھاڑ میں جائے..... لڑکا چپ پر بے حد خوش ہوا۔

اسکول سے واپسی پر لڑکے کو باپ نے طلب کیا۔ کچھ بولتے بولتے وہ رکا۔ گھر کے سب ہی افراد

جمع تھے۔ کشمیری لڑکیوں کے سرخ گالوں جیسی لڑکی بھی۔ اس کا دل دھڑکا کہ کانپا، سمجھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ باپ کے ہاتھ میں سفید پرچا تھا۔ چہرے تاثرات کرجت، لڑکا زمین میں دھس گئی۔ وہ جو سمجھا تھا۔ غلط سمجھا تھا۔ اس سے بہت بڑی غلطی ہوگئی۔ اور اس شام سب کے سامنے..... اف، قیامت وہ سر جھکائے شرمندہ تھا۔ حد سے بڑھ کر شرمسار، سب سمجھا کر (اس کے نزدیک پتھر برسا کر) جا چکے۔



تب وہ لڑکی آئی۔
 ”امید ہے سمجھ گئے ہوں گے..... تمہاری عمر نہیں
 ایسی حرکتوں کی۔ دوبارہ کسی لڑکی کے ساتھ ایسا کچھ
 کرنے سے پہلے آج کی شام سوچ لینا۔“ سنجیدگی
 سے کہہ کر اس نے دھکی دینا ضروری سمجھا۔ وہ چپ
 رہا۔ اس لیے کہ اس نے الٹا اثر لیا تھا۔ یہ شرمندہ
 اسے عمر بھر کی ذلت محسوس ہو رہی تھی۔ اور پاس سے
 گزرتی لڑکی۔ زہر سے بڑھ کر کڑوی.....
 ☆☆☆

”یونیورسٹی آف لاہور.....“

سرخ بلند و بالا عمارت سنہری دھوپ میں چمک
 رہی تھی آسمان صاف تھا لیکن اقل کناروں پر نہیں
 کہیں سفید سفید بادل سر اٹھا رہے تھے۔ ان دنوں
 ان کا لاسٹ سمسٹر چل رہا تھا اور وہ کمپائن اسٹڈیز
 کے لیے اکثر گروپ کی صورت پائے جاتے۔
 حالانکہ یہ گروپ شروع سے تھا..... ہر جگہ ساتھ
 ساتھ پایا جانے والا وہ بھی نمایاں حیثیت کے ساتھ
 پھر بھی یہ شوکرنا ضروری سمجھا جاتا۔ ”اسٹڈیز ڈسکشن
 کے لیے تشکیل دیا گروپ“ اور اس ڈسکشن میں دنیا
 جہاں کے موضوع شامل۔ یہ کل تین لڑکوں اور چار
 لڑکیوں پر مشتمل تھا۔ اور یونیورسٹی میں ”باتونی
 گروپ“ کے نام سے مشہور تھا۔ بہت سے لوگ کے
 نزدیک ”بھوکوں کا گروپ“ اور خود ان کے نزدیک
 معصوم لوگوں کا گروپ“ باقی سب حاسد، جلن کے
 مارے۔

تو اس وقت معصوم لوگوں کا گروپ خلاف توقع
 کینیٹین کی کرسیوں پر براجمان تھا۔ دھوپ کے
 باعث گراؤنڈ خالی خالی سے تھے۔ لیکن کینیٹین میں
 اسٹوڈنٹس کی آمدورفت جاری تھی۔ وہ اس وقت بے
 زار کن تاثرات کے ساتھ چہرے ہتیلیوں پر جمائے
 کھاتے پیتے اسٹوڈنٹس کو حسرت بھری نظریں
 لگا رہے تھے..... ایک دو لوگ بھی نہیں سارے کے
 سارے۔

”اف کہاں رہ گئے یہ دونوں؟“ نایاب نے

سب سے پہلے کوفت کا اظہار کیا..... باقی سب کا
 حال بھی اس سے مختلف نہیں تھا۔
 ”جب سے دونوں نے اظہار محبت کیا ہے اور
 کسی کا تو ہوش ہی نہیں..... اب کون جائے دونوں
 مشدہ لوگوں کو ڈھونڈنے.....“
 ”قسم سے زویا..... بھوک سے چکر آنے لگے
 ہیں..... میں ناشتا کر کے نہیں نکلی تھی۔“ نیا (نایاب)
 نے دہائی دی۔ زویا کا پہلے ہی موڈ آف تھا۔
 ”مجھے کیوں قسم دے رہی ہو۔ کیا میرا ناشتا
 کرنا ہے؟“ وہ بھنا کر بولی۔ سوئی جاگے مناہل جو کہنی
 میز پر لٹکائے پڑی تھی سیدھی ہوتے ہوئے یوں
 لڑکھرائی جیسے نیند سے جگا کر کسی نے دھکا دے دیا
 ہو..... سب ہی نے تعجب سے گھورا۔

”اف۔ بھئی شہریار پر بھروسا کرنا ہی نہیں
 چاہیے تھا۔ ویسے وہ ہم سب کو کس خوشی میں ٹریٹ
 دے کر مہربانی کرنے پر تیار ہے؟“ منال نے لفظوں
 کو برگر سمجھتے ہوئے چپا چپا کر کہا۔ مصنوعی جمائی لینے
 کی کوشش کی، جمائی نہ نظر آئی تو شرافت سے شرمندہ
 نظر آنے لگی۔ دوسری طرف موجود موہنا لٹلر سے کہتے
 لڑکوں میں سے غیور سمان نے جواب دیا۔
 ”آج زریں کا جنم دین ہے.....“

”اووو.....“ بہت سی معنی خیز آوازیں ایک
 ساتھ نکلی تھیں..... نیند..... کوفت..... بھوک یک
 لخت غائب ہوئی۔

”ہمیں تو خبر نہیں تھی..... تب ہی تو.....“
 دانستہ ہنسنے بولتے ہوئے وہ ہلکھلا پڑی۔ زویا نے چند
 لمحے قبل لڑکھرائی منال کو دیکھا۔

”تب ہی تو خود نکلے ہوئے ہیں..... اور ادھر
 ہم..... ہا..... اب کون جائے یونیورسٹی کھنگالنے؟“
 ”وہ تب بھی نہیں ملیں گے..... یقیناً کہیں
 بیٹھے گزرے دنوں کی یادیں تازہ کر رہے ہوں
 گئے؟“ منال کی بات پر نیا کی گردن پیچھے کو مڑ
 گئی..... کینیٹین میں کیسے تازہ تازہ چکر شوارما، برگر،
 خوشبودار میکرونی اور راکس رکھے تھے۔ ہائے اف

نندی آہ!

”ویسے ان کا حق تو بنتا ہے..... یاد ہے ناں
 ایسی نیکی کیجھی ملاقات ہوئی تھی دونوں کی۔“ نیا
 مزے لے کر پوچھنے لگی۔

”بالکل تب ہی تو شہریار نیازی کا ہمارے
 گروپ میں اضافہ ہوا۔“ شاعر نے پہلی بار گفتگو میں
 حصہ لیا۔ محفل جاگ اٹھی تھی۔

”بعد میں یہ نیکی نیکی ملاقات..... میٹھی میٹھی
 ثابت ہوئی۔“ غیور سمان نے موہنا لٹلر آف
 لیا..... سب اپنی اپنی جگہ اس ملاقات کو یاد کرتے
 ہوئے خالوں میں کھو گئے۔ نیا البتہ کھانے کی اشیاء
 کے گرد ہی محوم پھر رہی تھی۔

اس دن یونیورسٹی آف لاہور دھند میں لپٹی
 تھی۔

دھند زیادہ گہری تھی ناہنگی۔ مگر مرکزی گیٹ
 پار کر کے ٹھٹ ٹھٹ کی راہ اداری پر چلو تو دور سے
 نمارت کے نقش درنگ بالکل غیر واضح دکھائی دیتے
 تھے۔ ایسے میں نقاب چہرے سے ہٹا کر سنجیدگی سے
 ”گیٹ پار کرنی لڑکی اپنی چال ڈھال سے زریں
 کمال لگتی تھی۔ سارے ماحول پر ایک طائرانہ نظر
 ڈالی۔ سفیدی کی تیکائی کی مانند ہر چیز سے چپکی پڑی
 تھی۔ گہرے سانس لے کر ناک رگڑتی وہ کچھ ہی
 آگے چلی کہ کسی احساس کے تحت چوکی۔ اس کے
 آگے کچھ فاصلے پر دو لڑکے کسی بات پر جھگڑ رہے
 تھے۔ اور ایک نے دوسرے کا گریبان تھام رکھا
 تھا۔ اس کی آنکھوں میں الجھن الجھری اور نگاہیں اس
 سے ہوتی ہوئیں قریب کھڑی لڑکی پر جمائیں۔
 ”دھند میں وہ خوف سے سنبھلی بھی کھڑی تھی۔ زریں کی
 آنکھوں میں الجھن تیرنے لگی۔ اس سے پہلے کہ وہ
 بٹھ پانی لڑکے نے دوسرے کو پیٹھ پر مار دیا۔ اچھلنے
 لے ساتھ ساتھ ٹپس کی ایک لمبر برق رفتاری سے اس
 لے پورے وجود میں سرایت کر گئی۔
 ”رکو..... چھوڑو اسے.....“ نیکی سر آواز پر
 اہاں موجود میٹوں نفوس چونکے۔ تھپ تھپ کھڑک لڑکا اب

خون آشام لگا ہوں سے مخالف کو گھور رہا تھا۔ زریں
 کسی حد تک معاملہ سمجھتے ہوئے تیزی سے آگے آئی
 تھی۔

”کیا بد تیزی ہے؟“ نیکی چپوٹوں سے گھورتے
 ہوئے وہ پہلے لڑکے سے مخاطب تھی۔ لڑکے نے
 کمال مہارت سے اسے نظر انداز کر دیا۔ اس کے
 سوالیہ سمیت۔

”نکلو اب یہاں سے..... شکر مناؤ چھوڑ رہا
 ہوں۔“ انگلی اٹھا کر اس نے وارننگ دی۔ سامنے
 کھڑا لڑکا بار بار گال چھو رہا تھا۔

”میں دیکھ لوں گا تمہیں..... زیادہ ہیر و سمجھ
 رہے ہو خود کو.....“

”چلو ابھی دیکھ.....“ پہلا لڑکا خاصا لڑکا
 مزاج کا لگتا تھا..... دوسرا لڑکا شٹائیا۔ زریں تن گئی۔
 ”پلیز رک جائیں..... اگر وہ لڑکیں رہا تو
 ناجائز فائدہ مت اٹھائیں.....“ زریں نے اسے بار
 رکھنا چاہا۔ ”وہ باز آ بھی گیا۔“
 ”کون سی شرافت؟“

”کیسا فائدہ؟“ لمحے میں حیرانی چمکی۔
 ”شرافت کا۔“ وہ سختی سے بولی۔

”کون سی شرافت؟“ حیرت کا بیاناہ لبریز ہوا۔
 زریں کو اس کی حیرت (ڈھٹائی) پر حیرت ہوئی۔

”یہی جو وہ دکھا رہے ہیں۔ کیوں ہاتھ اٹھایا
 آپ نے اس بے چارے پر..... (بے چارہ
 شرافت سے معصوم بن گیا) اگر آپ اونچی نیکی سے
 تعلق رکھتے ہیں تو ہر کسی کو اپنی جاگیر سمجھتے پھریں
 گئے؟ میں اچھی جانتی ہوں آپ جیسے لڑکوں کو.....
 میں آپ کی شکایت کروں گی۔“ زریں کی بات پر
 لڑکے کی ہنسی اکٹھی ہوئیں۔ ماتھے پر ٹپ ٹپ نمایاں
 ہوئے۔ وہ مکمل طور پر اس کی جانب متوجہ ہو چکا تھا۔
 ”میڈم کیا مسئلہ ہے آپ کے ساتھ؟“ اس کی
 سنجیدگی طعنے میں شمار کیے جانے کے قابل تھی۔ زریں
 کو غصہ آ گیا۔
 ”میرے ساتھ کوئی مسئلہ نہیں۔“ اس کے تیز

لے کر لڑکے کو ناگوار دی محسوس ہوئی۔

”تو پھر اس تقریر کا مقصد؟“

”مقصد سامنے ہے اگر آپ انجان نہ بنیں تو۔“

میں سمجھ گئی ہوں کہ آپ کو غصہ کس بات پر آ رہا ہے۔ اس لڑکی کو چھیڑ رہے تھے آپ اور ان بھائی صاحب کی مداخلت پر غنڈہ گردی دکھا رہے ہیں۔ اپنا نہیں تو اپنی فیملی کا خیال کر لیں۔ کیا آپ کے گھر میں بہن نہیں ہے؟ لڑکے نے ایک پل کو اسے گھورا۔ پھر سکون سے بازو سینے پر لپیٹ لیے۔

”یہ لڑکی آپ کی بہن ہے۔؟“

”بہن نہیں ہے۔“ زریں نے کہنا چاہا۔

”میری بھی بہن نہیں ہے۔ پھر چھیڑ لوں؟“

زریں ہکا بکا ہوتے رہ گئی۔

”عجیب انسان ہیں آپ۔۔۔۔۔ بلکہ ڈھٹائی کی حد ہے۔“ وہ مٹھیاں بچھ کر ٹمٹماتی تھی۔

”آپ نے درست اندازہ لگایا۔ میں مشکور ہوں۔“ اسے اثر نہ لیتا دیکھ زریں کو کبھی کا احساس ہوا۔

”لیکن میں آپ کو ایسا کرنے نہیں دوں گی۔ یہ فیملی ادارہ ہے اور یہاں ایسی کھلے عام بد معاشی کم از کم میں نہیں دیکھ سکتی پتا آپ جیسے لڑکوں کا مسئلہ کیا ہے۔؟ کسی ایک لڑکی نے آپ کی کسی بھی چیز سے متاثر ہو کر آپ کو لفٹ کروا بھی دی تو آپ ہر لڑکی کو ایسا سمجھنے لگتے ہیں۔۔۔۔۔ ناصرف سمجھتے ہیں بلکہ اپنا حق جتانے سے بھی نہیں ہچکچاتے۔ یہیں اگر کسی لڑکی نے آپ کو سخت جواب دیتے ہوئے اپنی حد دکھا لیں تو آپ اسے انا کا مسئلہ بنا لیتے ہیں۔ اگر بنا بھی لیتے ہیں تو اسے اپنا مسئلہ رکھیے۔۔۔۔۔ ناکہ دوسرے کے لیے مسائل کھڑے کیجیے۔ کیا آپ دیکھ سکتے ہیں کہ وہ لڑکی کتنی ہراساں لگ رہی ہے۔ مگر آپ کیوں دیکھیں گے کہ آپ کی تو بہن ہی نہیں ہے نا؟ جذبات میں آ کر وہ جانے کیا کیا بول جاتی کہ ایک لخت زبان کو بریک لگاتی پڑی۔

”انف۔۔۔۔۔ شٹ اپ ناؤ۔۔۔۔۔“ انگلی اٹھا کر جیسے غرایا تھا۔ دھند کے حصار میں کھڑی زریں اب کی بار بھی اثر نہیں لیا تھا۔

”سچائی کا ش آپ سن سکیں۔۔۔۔۔ تاکہ کچھ میں آئے۔“ وہ نخوت سے بولی تھی۔ پہلو میں کھڑی لڑکی کا ج میں غصہ تھا۔ اور مارے گھبراہٹ کے کہنے کے لیے منہ کھولتی۔ پھر پکلا جاتی۔

”سچائی پر بڑا یقین رکھتی ہیں آپ؟“

چبا کر بولا۔

”ایمان بھی رکھتی ہوں۔“ وہ بھی اسی انداز میں بولی۔

”اچھا۔۔۔۔۔ آپ مجھ پر اپنی اچھائی ظاہر کرنا چاہتی ہیں؟“

”میں ایسا کیوں چاہوں گی؟“ وہ پل میں حیران رہ گئی۔

”کیونکہ آپ میری انیشن پانا چاہتی ہیں۔“

”اوشٹ اپ مسٹر۔۔۔۔۔“

”صرف سچائی پر ایمان رکھتی ہیں مگر بچپان نہیں۔ شہر یار نیازی نام ہے میرا۔۔۔۔۔ ایک ناقابل فراموش شخصیت۔۔۔۔۔ کی نہیں ہے مجھے لڑکیوں کی میری فیملی پر کوئی سوال اٹھائے میں برداشت نہیں کرتا اور آپ کو بھی چھیڑوں گا۔ اب یقیناً آپ کا دل تھپڑ مارنے کو چاہے گا؟“ وہ تائید کے لیے رک زریں نے مضبوطی سے جواب دیا۔

”صرف چاہے گا نہیں۔۔۔۔۔ میں مار بھی سکتا ہوں۔“

”ہوں گڈ۔۔۔۔۔ تو مارے۔ دکھائیے مارے؟“ اس نے لگا ہیں گھا کر کہا جیسے پیچھے کو اشارہ کیا ہو۔

زریں کو اپنا آپ بڑا ہونق سا لگا تھا۔

”پلیز۔ آپ لوگ آپس میں جھگڑنا کریں۔۔۔۔۔ اسے سزا مل چکی ہے۔“ اب کی بار لڑکی مری مری آواز میں بولی تھی۔ زریں اسے دیکھنے لگی۔

”کے۔۔۔۔۔ کے سزا مل چکی ہے؟“ وہ نے میں پھنسی تھی۔

بارش اور شہری دھوپ کی مہک، طمانیت، آسودگی اور سرشاری بن کر اس کے چہرے پر پھیل رہی تھی خوشی وہاں رقصاں تھی۔ آڈیو ریم ہال کی سیڑھیوں پر وہ کب سے بیٹھے تھے۔۔۔۔۔ ہر منظر مکمل اور حسین تھا۔

”تم ایک اہم موقع ضائع کر رہی ہو۔ حالانکہ میں نے خوب صورت سر پرانہ پلان کیا ہوا تھا۔“ اپنی آواز اور لہجے سے جو شہر یار نیازی لگتا تھا۔ افسوس سے کہہ رہا تھا۔ زریں متاثر ہوئے بغیر بے چارگی سے مسکراتی رہی۔

”یقیناً ایسا ہوگا مگر میں ایسا نہیں چاہتی۔“ اس نے نرمی سے جواب دیا۔ شہر یار کی فہمائی نگاہیں اٹھیں۔

”کیا؟“

”کانج سے باہر جا کر تم سے ملنا۔ میں مانتی ہوں تم میری بے حد عزت کرتے ہو مگر میں جس کلاس سے تعلق رکھتی ہو۔ وہاں کی کچھ حدود ہیں جن کو میں خود پر لاگو کرتی ہوں۔ تمہیں میری بات کا احترام کرنا چاہیے۔

”اور میں کرتا ہوں۔“ میں نے تمہیں فورس تو نہیں کیا ناں! بس اپنی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ وہ یقین دلاتے ہوئے بولا تھا۔

”شہر یار میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ میں اور میری ماں، بابا کی وفات کے بعد ماموں کے گھر میں رہ رہے ہیں۔ بابا کے بعد مجھے ماموں سے بے حد محبت ہے اور میں نہیں چاہتی کہ ہمیں کہیں دیکھ کر ان کا اعتبار ٹوٹے۔ اور ویسے بھی تھوڑے عرصے کی ہی بات ہے ناں۔ وہ مدہم ہی آواز میں جیسے معصوم بچے کو سمجھاتے ہوئے گویا تھی۔ شہر یار نے روشن آنکھوں سے اسے دیکھا۔

”میں سمجھ سکتا ہوں زریں۔ تم صفائی مت دو۔“ زریں مسکرا دی۔ چند پل خاموشی کی نذر ہوئے۔ شہر یار اسے دیکھ رہا تھا۔ جس کے شفاف چہرے پر سکون تھا۔ وہ بہت زیادہ خوب صورت ہرگز نہیں تھی مگر دیکھنے میں اچھی لگتی تھی۔ پر کشش سی سے اسے دیکھا۔

”اسے۔۔۔۔۔ اس نے بد تمیزی کی مجھ سے۔۔۔۔۔ شہر یار نیازی آپ کا شکریہ۔۔۔۔۔“ لڑکی تشکر آمیز جذبات سے شکر یہ جتا رہی تھی۔۔۔۔۔ اور زریں پھینکی گات کے ساتھ سرخ چہرے والے لڑکے کو دیکھنے لگی۔ اپنی طبیعت کے ہاتھوں وہ بری طرح پھنسی گئی۔

”اب آپ شکایت درج کروا کر شکریہ کا وقع دیں گی۔ یا یہ زحمت مجھے اٹھانی پڑے گی؟“ زریں کا دل چاہا زمین بھنے اور اس میں سا جائے۔ زریں نے سخت زدہ چہرے کے ساتھ ہنسا چاہا۔ شرمندی کا احساس زائل کرنے کی شعوری کوشش۔۔۔۔۔ مگر ناکام رہی۔ وہ اس وقت ترس کھانے لے لائق ہو رہی تھی۔ پھنسی پھنسی آواز میں اس نے ہنسا چاہا۔

”وہ۔۔۔۔۔ آہم۔۔۔۔۔ ایم سوری۔۔۔۔۔“ شہر یار نے ہاتھ اٹھا دیا۔

”اس کی فرصت نہیں مجھے۔۔۔۔۔“ اس کے لہجے میں واضح ناراضی تھی۔ زریں اپنی جگہ چوری بن گئی۔ بلکہ جرم اور وہ تھی بھی اس نے اعتراف کر لیا۔ وہ بے حد شرمندہ ہوتی رہی، شہر یار بے حد خفا، زریں نظریں جھکا کر انجان بن کر اس کے پاس گزرتی تھی۔ وہ طنز کرنے سے باز نہیں آتا تھا۔ زریں کو ماننا پڑا کہ وہ اس لیے ناقابل فراموش شخصیت تھا کیونکہ خود کو فراموش نہیں ہونے دیتا تھا۔ پھر وہ تو تھی بھی اس کی معذرت کی طلب گار اور اس سے پرے ایک حقیقت یہ تھی کہ دونوں کے درمیان غیر شناسائی کی دیوار گرتی جا رہی تھی۔ پھر یہ نئی اور شرمندگی دونوں کو پاس لانے کا سبب بنی، لہذا غلط نہیں تھا۔

☆☆☆

آڈیو ریم ہال کی سیڑھیاں سنسان پڑی تھیں۔ اطراف کی کیارپوں میں بے تحاشا پھول پتے تھے۔ ان سے مسکور کن انوکھی سی خوشبو سارے چہان چھائی سانسوں کو بو بھل کر رہی تھی۔ گزشتہ شب

خاموشی محسوس کرتے ہوئے زریں کی آنکھیں چمکیں ایک خیال ذہن میں کوندے کی طرح لپکا تھا۔
”سنو..... مجھے کچھ بتانا تھا۔“ شہر یار نے اس کی سنجیدگی پر دھیان دیے بغیر کہا۔
”بتاؤ۔“

”مجھے ایک فیملی نے پسند کر لیا ہے۔“ آہستگی سے بولی۔ شہر یار چونکا۔
”مطلب؟“ بھنویں کھڑی ہوئیں۔ پیشانی سمٹ گئی۔

”مطلب انہیں میں پسند آئی۔ اور انہوں نے رشتے کی بات کی ہے۔ مجھے لگتا ہے ای بھی مطمئن ہیں۔ اس نے بڑے آرام سے کاغذ کو شعلہ دکھایا۔ شہر یار کی سماعتوں پر جیسے بم گرا تھا۔ وہ اچھل کر کھڑا ہوا۔

”واٹ.....؟ کس نے..... کیسے؟ کب کی بات ہے اور تم مجھے اب بتا رہی ہو..... وہ بھی اتنے سکون سے..... تمہیں صدمہ لگا ہے ناں تب ہی اتنے آرام سے بتا رہی ہو.....؟“ آدمی کا ڈ..... چلوتے بے یقینی سے پھٹتی آواز سے آڈیو ریکم ہال کی سیڑھیوں پر براجمان ساری خاموشی دھوپ میں جھسک گئی..... چلاتے لہجے میں بولتے ہوئے ایک دم اس نے زریں کی کلائی تھامی۔ زریں بریں طرح بوکھلا گئی۔
”کہاں..... کہاں چلنا ہے؟“ سیڑھیاں اترے ہوئے وہ گرتے گرتے پچی تھی۔ شہر یار کا ہاتھ پکڑ کر بمشکل روکا۔

”تم ابھی گھر جا رہی ہو..... بلکہ میں بھی۔ تمہیں اپنی ای کو سب کچھ بتانا ہوگا۔ میری طرف کوئی مسئلہ نہیں، وہ ہاں کر دیں میں برداشت نہیں کروں گا سمجھیں؟“

”شہری رکو..... دیٹ..... ایسا نہیں ہے۔“ مذاق پھندا بن گیا تھا۔ گہرائی آواز کے ساتھ اس کے چہرے پر سکون رخصت ہوتا نظر آتا تھا۔
”کیسا نہیں ہے.....؟“ وہ رک گیا۔ اس نے شکر کیا۔ انکی ہوئی سانس بے اختیار بحال ہوئی تھی۔

”میرے اللہ..... کیسے جلد باز ہو تم۔ میں نے مذاق کیا تھا۔ تم کیسے اتنی جلدی اور وہ بھی شدید ری ایکٹ کرنے لگتے ہو۔ ایسا کوئی نہیں کرتا ہوگا۔“ وہ اپنی کلائی مسلتے ہوئے خشکی سے کہہ رہی تھی۔ مقابل کی آنکھوں میں اس سے بڑھ کر ناراضی درآئی۔

”واٹ..... کیا تم پاگل ہو؟ مجھے بتاؤ تمہارے پاس ایسے جھوٹے قسم کے مذاق ہی کیوں ہوتے ہیں؟ اور ہاں میں ایسا ہی ہوں تمہارے معاملے میں جنونی، کچھ الٹا سیدھا کن کر تصدیق کرانے نہیں بیٹھ سکتا۔“
”اچھا..... اور اگر تمہیں پتا چلے میری شادی ہو گئی ہے..... مان لو مگے.....؟“

”ہاں..... مان لوں گا۔“ اس نے آسانی سے اعتراف کر لیا۔ غیر متوقع جواب نے زریں کو بھونچکا کر دیا تھا۔ وہ بول نہ سکی۔
”یہ تو اچھی بات نہ ہوئی۔“ اس کا لہجہ شکوہ کنناں ہوا۔ شہر یار کے چہرے پر ہلکی شرمندگی کے آثار نمودار ہوئے۔

”یار ایسی بھی بات نہیں..... میں واقعی کچھ جلد باز اور شروع سے ہی جذباتی قسم کا ہوں..... الٹا سیدھا مجھ سے سنا ہی نہیں جاتا۔ اور سن بھی لوں تو وہ غصہ، اشتعال میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیت چھین لیتا ہے۔ تم مجھے عجیب ترین کہہ سکتی ہوں۔ مگر میں اپنی اس خالی برقا بواپالوں کا۔ تم ہونا..... سب ممکن ہے۔“ اس کی آزدگی محسوس کر کے شہر یار نے محبت پاش لہجے میں بھرپور یقین دلایا تھا۔ زریں کمال جھینپ گئی، وہ دونوں اب ساتھ ساتھ چلتے لگے تھے۔

”روٹی آیا کی شادی طے یا گئی۔ ماموں ہمارے ایگز ام تک اس شادی کو ملتوی کرنے کا ارادہ رکھتے تھے مگر ان کے سرال والوں کا اصرار بڑھ رہا ہے۔ تو ان کی رخصتی کے بعد میں امی سے بات کر لوں گی۔“ کینٹین کی جانب بڑھتے ہوئے زریں نے دھیمے لہجے میں اسے اپنے ارادے سے آگاہ کیا۔ روٹی اس کے بڑے ماموں کی بیٹی اور غیور

ان کی بہن تھی۔ شہر یار سے غائبانہ تعارف تھا۔
”نے مجھے ہونے سر ہلادیا۔“

☆☆☆
سورج ایک شعلہ تھا۔ جس کے زیر سایہ سنہری

دھوپ کی حدت سے بو جھل ہوئیں۔ صحرا کی ایک رواں کی مانند۔ ملتان کی تنگی سڑکوں پر سر پہنچی، یہی تھیں۔ فخر دہر میں ڈھلی، سورج سوانیزے آیا۔ گرمیوں کے موسم میں ملتان کے باسیوں پر لڑی ٹوٹی بھی بہت تھی۔

واش روم کا دروازہ کھول کر ”لقمان حیدر“ لمرے میں واپس آیا تو دھوپ کی تمازت سے نہ بھائے چہرے پر تازگی لوٹ رہی تھی۔ یہ اس کا بیڈ، ام تھا اور اس نے جنت کا گوشہ معلوم ہو رہا تھا۔ اس کی بدولت پچھلی خشکی مخصوص مہک نے ماحول لو پرسوں بنا ڈالا تھا۔ ایسے خواب ناک ماحول کو پلٹتے ہوئے دماغ کی ساری کشاف ت دھل جائے۔
”بھئی پرسکون ہو گیا تھا۔“

ست انداز میں چلتے ہوئے وہ بال بنانے کے لیے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے آیا۔ قد آدم آئینے میں اس کی پشت کا منظر عکس کی صورت نظر آ رہا تھا۔ جس میں بے آواز سے انداز میں دروازہ کھلیا گیا۔ کمرے میں روشنی نے مزید پر پھیلائے۔ پلٹھٹ میں کرن البتادہ تھی اور آئینے میں جھلملاتے اپنے خوبرو بھائی کے عکس کو دیکھ رہی تھی۔

دراز قد، مضبوط کانٹھ، بے حد شفاف رنگت پر کبری آنکھیں، براؤن سی، شہد رنگ، جیسے شہد میں لٹھا ذرا سا پانی، چمکتی پیشانی کمان ابرو اور ناک بالائی۔ نوکیلی معلوم نہیں کیسی..... ہونٹوں کے اوپر بالائی سیاہ موچھیں گویا چار چاند لگائی تھیں۔ پچھلا ”نٹ اوپر والے کے برعکس بھڑاسا تھا اور نیم گلابی سا ہوتا تھا۔ وہ شیو کرتا تھا مگر کرن کے نزدیک وہ ہلکی ازہمی میں زیادہ پیارا لگتا تھا اور اس کا بھیر اسٹائل اتار تھا۔ چال میں شاہانہ پن تھا۔ وہ مخروہ نہیں تھا۔

یہ اس کی شخصیت کا خاصہ تھا۔ وہ کچھ شرم تھا۔ بہنوں کا چہیتا، راج دلار، اس کے انداز میں شوخی تھی۔ اور گہری آنکھوں میں بھیر اسکون و بھیراؤ، دیکھنے والے کا دل کھینچ لیتا۔ دل موہ لیتا۔

باپ کی وفات کے بعد وہ ذمہ دار ہو گیا تھا۔ انداز میں سنجیدگی کچھ اپنائیت گویا ایک اضافی خوبی تھی۔ سب ہی اس کی شخصیت کو دل سے سراہتے تھے۔ اللہ نے اس کی ظاہری خوب صورتی کے ساتھ دل بھی بہت خوب صورت بنایا تھا۔ وہ اسے ٹوٹ کر چاہتی تھی حد سے بڑھ کر۔ اور بے تحاشا، آئینے میں نظر آتے اس کے سراپے کو ساکت دیکھ کر اس کی بھنویں کھڑی ہوئیں۔ کرن اس کے چونکنے پر مسکرائی۔ دل کھول کر مسکرائی پھر کمرے میں داخل ہو گئی۔

”فریش ہو گئے بھائی؟“
”خیریت؟ کہیں جانا ہے؟“
”کنیز آ پائی ہیں نیچے۔“

اووہ..... یقیناً بلار ہی ہوں گی؟“ لقمان کا لہجہ استفہامیہ تھا۔ آنکھیں پچھلی تھیں۔ کرن مسکراتا چاہتی تھی تو نہیں تھی مگر۔

”جی.....“ اس کا ”جی“ بھرپور معنی خیزیت کا اظہار کر رہا تھا۔ لقمان نے گھورا وہ ہنسی چلی گئی۔ ایک سخت دن میں کام کے بعد وہ سن دماغ کے ساتھ جانا تو نہیں چاہتا تھا۔ مخروہ بڑی، بہن تھیں اور پر چلی آئیں تو کس نے روکنا تھا؟ دوسرا وہ جس کام کے لیے آئی تھیں۔ طے بغیر ہرگز نہیں جانے والی تھیں۔

حسب توقع سیڑھیاں اتر کر وہ ماں کے کمرے میں پہنچا۔ کنیز آ پانے سارا لحاظ بالائے طارق رکھ کر تصویریں نکال کر آگے پھینکنے والے انداز میں رہی تھیں۔ لقمان انداز پر بری طرح شیشایا۔ وہ بنا تمہید باندھے کڑے تیوروں سے دیکھ رہی تھیں۔

”کیا کروں.....؟“ وہ جان بوجھ کر انجان بنا۔ امی کے ساتھ بیٹھی کرن نے آرام دہ انداز میں پہلو بلا لقمان خوب واقف تھا۔

”ایک منتخب کرو۔“ انہوں نے حکم دیا۔ لی چپ تھیں مگر وہ سب بہن بھائی آپا سے زیادہ ڈرتے تھے۔ لقمان غیر آرام دہ سا ہوا تھا۔

”ہم..... مگر آپا۔“
”باس.....“ ان کے اٹھے ہاتھ سے وہ دب گیا۔ کرن کی کھنٹی ہنسی کمرے کا سنجیدہ ماحول توڑ دیتی۔ اگر وہ پہلی سے لب پوری قوت سے نہ دباتی۔ دوسرے کو نے میں بیٹھی نازک سے لڑکی کچھ گھبرائی لگ رہی تھی۔ چہرے پر ماسک لگا رکھا تھا اور ہنسی آنے سے درازیں پڑنے کا خدشہ تھا۔ سودا انگلیاں کانوں پر تھیں۔

”بہت ڈھیل دے دی ہے تمہیں لقمان حیدر، اب میں بھی کینز حیدر ہوں۔ یہ ساری تصویریں رشتے والی مشکلوں سے جمع کر کے لائی ہے اور کچھ لڑکیاں تو بہت ہی بھائی ہیں دل کو..... جلدی سے پسند کر لو میں زیادتی نہیں کرنا چاہتی۔“

وہ ہنوز بے نیازی کا خول چڑھائے کھ رہی تھیں۔ لقمان عجیب مشکل میں پھنسا تھا۔ تم یہ تھا کہ ای بھی چپ تھیں۔

”آپا آپ کیوں ہلکان کر رہی ہیں خود کو..... پلیز یہ دکھا دکھا کچھ گناہ گار مت کریں۔ مجھے ایسے کوئی پسند نہیں آسکتا۔“ رونی صورت بنا کر وہ بے حد بے چارگی سے گویا ہوا تھا۔ امی کچھ بے چین ہوئیں۔ کچھ آپا پر بھی اثر پڑا تھا۔ وہ بھانپ گیا۔ آپ خود کو کھڑا کر رہی ہیں اور.....

”تمہیں معلوم ہے اپنے سسرال میں مجھے کیسے کیسے سوالوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے؟“ وہ جتنی سے بادر کروانے میں کامیاب ہوئیں۔ کہ وہ لفٹ نہیں دینا چاہیں گی۔ لقمان کو ان کی آخری بات کو فٹ میں جتلا کر گئی۔

”آپا آپ کے سسرال والوں کے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟ انہیں میرے انتہائی ذاتی معاملے میں دخل نہیں دینا چاہیے۔“
”تو میرے بھائی مان کیوں نہیں جاتے.....“

ہم یہ ترس نہیں آتا تمہیں، اگلوتے بھائی کے بہنوں کے دل کتنے ارمانوں سے بھرے ہیں۔ خدا کرے تم سمجھ پاؤ۔ ورنہ مجھے اور کیا ہے؟“ آپا نے تصاویر پر اس میں ڈال کر آرزو کی کہا۔ لمحہ میں وہ ابیدہ ہوئی تھیں۔ لقمان بری طرح شیشیا۔

”اوہو پلیز میری اچھی آپا..... ایسے کریں۔ اچھا چلیں اگر آپ کو میری آزادی اتنی کھلتی ہے تو پورے کر لیں اپنے ارمان..... امی آپ جو کچی پسند کریں گی مجھے منظور ہوگا۔ بس آپ کے انٹرویو کے جوابات بالترتیب مجھ تک پہنچ جائیں۔ وہ ذہانت کتنی رکھتی ہے..... اسے ٹالنا پسند ہے یا عقل احمد روٹی..... کھیلوں میں کس حد تک دلچسپی رکھتی ہے۔ کرکٹ میں قومی ٹیم نے بھارت کتنے رنز سے شکست دی اور کتنی وکٹوں سے باہر..... ریزنر راج کی خدمات؟ عمر اگلے نے انٹرنیشنل میں کتنی وکٹیں حاصل کیں۔ اسے بہری پور ٹورنچ لگی ہے یا ٹیننگ پسند ہے..... سائیکل چیکس یا.....“ شاید آفریدی نے شادی کب کی.....

کب ہوئے..... انگلینڈ کا دورہ کب کب کر رہے ہیں..... سردیوں سے لگاؤ کیا کھڑی کر رہے ہیں گریج کا مزہ دیتی ہے..... کتا پیچھے لگ جائے تو چھوڑ دیتی ہیں یا بھاگنے کو ترجیح دیں گی..... خطرہ دیکھ کر سامنا کرے گی یا واک آؤٹ کر جائیں گی۔

”ہا ہا ہا.....“ ان کی طنزیہ باتوں پر لقمان ہنسی سے پورا کمرہ گونج اٹھا تھا۔ ماسک سے اسے چہرے والی آنکھوں پر رکھے کھیرے کے گول ٹکڑے لرزتے ہوئے آنکھوں سے پھسل گئے۔ کینز آپا حیدر راضی سے امی کو دیکھ رہی تھیں۔

”رہنے دو کینز، کوئی فائدہ نہیں.....“ امی چپ تھیں کہ یہ سب آپا کو مزہ کرنے کے لیے تھا۔ کیا واک آؤٹ کریں۔

”کھانا لگوادیں۔“ لقمان نے پیچھے سے ان کے تعاقب میں دوڑائی۔ امی نے اسے مخاطب

”پھر نا تم نکالا تم نے..... کل روانہ ہونا ہے۔“
”بات پر بھی وہ ناک چڑھا گیا۔“
”آپ نے لازمی لاہور بھیج کر ہی دم لینا ہے؟“

”ظاہر ہے..... رشتے داری چھوڑی تو نہیں ہاتھی ناں۔“ وہ اتنا ہی کہہ پائیں۔ کئی دنوں کی بات کا نتیجہ بھی یہ نیم رضامندی۔
”شادی میں کتنا دن رہتا ہے؟“ یعنی وہ مان لیا تھا۔

”جتنے دن تمہاری دادی چاہیں.....“ انہوں نے کندھے اچکا کر لاعلمی کا اظہار کیا اس نے منہ لپایا۔

”چلو اگر نہیں شرکت کر سکتے ہو تو..... میں بارہ نہیں کہوں گی۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولیں۔
”نہیں آپ کا حکم ہے۔ جانا تو پڑے گا۔“

”امی نے سن کر بے اختیار سکون کا سانس لیا۔ ہر سورج اب بھی ایک شعلہ تھا۔

☆☆☆

آسوی بیلوں سے ڈھکے اس گیٹ والے گھر کے بارزندی بھر پور انداز میں متحرک تھی۔ نیلے رنگوں میں ڈوبایہ پرانی طرز کا خوب صورت گھر اپنی پشیمانی پر ”محبت کدہ“ لکھوائے اسے میکینوں کی محبت لیتے کا صاف پتا دیتا تھا۔ پہلی نظر ڈالنے پر اس ”نچے سے مکان کو تین پورشنز میں شمار کرنے کو دل پاتا تھا..... اور بظاہر نظر آتے یہ تین پورشنز آپس میں اس قدر جڑے تھے کہ کوئی حصہ الگ نظر آتا تھا مان الگ ہو کر اچھا دکھ سکتا تھا۔ تینوں حصے ایک سرے کے لیے لازم و ملزوم ستون کی مانند تھے۔ ان کی ساخت اس پرندے کی مانند تھی جو اڑتے اڑتے دونوں پر پھیلا دے۔ اور یوں ساکت رہا۔

مکان جو بے جان اینٹوں سے بنتا ہے۔ اس بلکین ہی ان اینٹوں میں جان ڈال کر اسے گھر

بناتے ہیں۔ اس گھر کی جوانی کے پیچھے بھی یہی وجہ رہی ہوگی جو وہ نصف صدی سے زیادہ عرصہ گزار کر بھی عمر سیدہ نہیں لگتا تھا۔ اس علاقے کے تمام گھروں کی نسبت یہ گھر ہر ایک سے بڑھ کر اپنی شان میں اونچا لگتا تھا۔

یہ سورج کے ٹھنڈا ہونے کا وقت تھا۔ اور پوری کائنات پر آؤی ترچھی، ایک دوسرے سے گلے ملتی شعاعیں۔ اسے سنبھالنے جارہی تھیں۔ ممکن تھا کچھ سے پور شام کی آمد کے آثار نمایاں ہوں..... مگر فی الحال شام کو راج دہانی پر قبضہ کرنے کا حکم نہیں ملا تھا۔ قبضہ جو بے حد مختصر..... لیکن دن کے لیے شکست کا باعث تھا۔

اندر شادی کی تیاریاں آخری مراحل میں تھیں..... اس لیے زور و شور سے جاری تھیں۔ چاروں اور لائٹنگ لگانے کا کام مکمل ہوا چاہتا تھا عمارت کے ماتھے پر دل کی شہپ میں ”ونیکم“ لکھا یقیناً روشنیوں میں اضافے کا سبب بننے میں اہم کردار ادا کرنے والا تھا۔ اندر سے بھانت بھانت آوازیں آرہی تھیں۔ بکھرا پھیلاوا آسانی سے سمجھتا دکھائی نہیں دیتا تھا۔ گیٹ سے باہر کھانے کے معاملات سمان ماموں طے کرتے نظر آ رہے تھے۔ اندر سعدیہ دونوں بھابیوں کے ساتھ مشغول تھیں۔
”لیں آپا..... زریں کا ڈریس بھی آگیا۔ اسے چیک کروالیں بعد میں کہیں مسئلہ نہ کرے۔“ صوفے چاروں سامان سے اٹے ہوئے تھے..... میز پر چوہری باکس کھلے تھے۔ وہ ابھی مارکیٹ سے لوٹی تھیں اور بڑی بھابی نے ایک ڈبا ان کی سمت بڑھا دیا۔

”ماشاء اللہ۔“ سعدیہ کے صبیح چہرے پر نرم مسکان پھیل گئی۔ کل رات کے فتنش پر پہننے والے ڈریس پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے انہوں نے بے ساختہ تعریف کی۔ بڑی بھابی بیگم بنا کوئی جواب دے لٹ پر کچھ کھوجتی رہیں۔ یہ اس گھر کی پہلی شادی تھی اور وہ خاصی حواس باختہ تھیں۔ ایک کام ختم

”بھئی کوئی پانی ہی پوچھ لے۔ یہ لڑکیاں لگی ہوں گی فصول کاموں میں۔ خود اٹھنا پڑ گیا۔“ عافیہ جو سعدیہ کی چھوٹی بھابھی کے درجے پر فائز تھیں۔ کوفت بھرے انداز میں کہہ کر اٹھیں۔ سامنے سے اماں (ساس) آ رہی تھیں۔

”ہاں بھئی خواتین..... رفیعہ کی طرف پیغام بھجو دیا تھا ناں..... کیا جواب آیا۔“ کئی بار پوچھا گیا سوال ایک مرتبہ پھر دہرایا گیا۔ عافیہ نے بڑے صبر کا مظاہرہ کیا۔ انہیں اپنی بہن کی آمد کی بڑی فکر تھی۔

”اماں بی کہہ بھی دیا تھا۔ اور وہ کل ابھی رہی ہیں..... اب اڑ کر آئیں کیا۔“ عافیہ نے ساس کو مطمئن کیا۔

”بھئی یہ اچھا کیا تم نے..... اب ملنا ملنا تو محدود ہو کر رہ گیا ہے..... خوشی میں تو بندہ شریک ہو۔ میں ذرا لڑکیوں کو دیکھ لوں، کچھ تیاری کر لوں۔“ وہ منہ ہی منہ میں ہنسی واپس مڑ گئیں۔ تینوں کے یوں پر ہنسی اٹھ اٹھی۔ وہ کس تیاری کی طرف اشارہ کر رہی تھیں..... انہیں سب معلوم تھا۔

لڑکیوں کے کمرے الگ ابتری کا شکار تھے۔ یوں جیسے مینا بازار میں بڑے زور کی آندھی آئی ہو..... بڑے ماموں سلمان احمد کے..... غیور سلمان، روشنائی اور علیزے، بچے تھے۔ ان کے بعد سعدیہ تھیں جن کو قدرت نے صرف ایک ہی بیٹی سے نوازا تھا اور شوہر کی وفات کے بعد سے وہ بھائیوں کے ہاں مقیم تھیں..... ان کی بیٹی زریں کمال تھی اور سب سے چھوٹے ارسلان احمد اور آئینہ اور قیوم ان کی اولاد دیں تھیں۔

ابھی سے کیوں محنت کر رہی ہو..... کل ساری کوشش ضائع جانی ہے..... علیز نے شونہ میں ڈال ڈال کر چپک کرتے ہوئے چھیڑا تھا۔ آئینہ کے اطمینان میں ذرا جو فرق آیا ہو۔

”کل کی کل دیکھنا۔ میں ایک مقصد سے محنت کر رہی ہوں۔“ اس کے سکون پر دادی ماں کان کھڑے ہو گئے۔

”تمہارا کیا مقصد ہے آئینہ بچی.....“ ماں کے استفسار پر سب ان کی طرف متوجہ ہوئیں۔

”چھوڑیں ناں..... اس نے پہلے بھی مندی کا ثبوت دیا۔“ زریں نے لاپرواہی سے جواب دیا۔ آئینہ تپ کر مڑی۔

”چلو سب کی سب..... وہ کیا ہے ناں کہ دارا، فیشل کے بعد چہرے پر سرخی آ جاتی ہے۔ میں اس لیے ابھی سے کر رہی ہوں کہ کل تک رو بھی آ جائے اور سرخی بھی جاتی رہے۔“ سب نے داری والا کام؟“ دادی ماں نے سمجھ کر سر ہلایا تو پرسکون ہوئی۔

”بس چپ بے ادب.....! خفت چھپانے اور..... کیا تھا۔ اس سے پہلے کوئی گفتگو کو آگے.....“ قیوم نے آ کر ارادہ نا کام بنادیا۔

”زری آئی..... آپ کا موبائل بیج کرفوت والا ہے۔ مرنے سے پہلے آخری خواہش.....“ قیوم نے کسی شہر یا صاحب کا فون ہے۔“ قیوم کے ہاتھ اندازہ بر زریں کے چہرے کا رنگ فق..... اور کاسٹس اوپر، نیچے کا نیچہ رہ گیا تھا۔

”بار..... کے نام کے ساتھ ہی یک دم کمرے میں آئی خاموشی، زریں کو دل شکن محسوس ہوئی۔ وہ چاہے آگے نہ بڑھ پائی تھی۔

”نے.....“ نیا ہے نامری ایک دوست اس کی.....“ فون ہوگا۔ ایڈریس سمجھنا تھا اسے.....!

ارے کی چوکت پار کرتے غیور نے خاموشی..... اس سے زریں کا جواب سنا..... زریں نے اس..... پر دل ہی دل میں خود کو شرمندہ ہوتے پایا۔ مگر..... لیا اوتار میں لینے سے پہلے وہ یہ بات کسی پر آشکار..... ہونے دینا چاہتی تھی۔ ماسوائے ایک کے جو..... ہاں نہیں تھا۔ غیور سلمان کے.....!

☆☆☆

پر کھول کر ساخت ہوئے پرندے کی ساخت.....! گھر بچہ نور بنا ہوا تھا.....! آئیوں بیلوں سے لپٹی منھی منھی لائٹس، روشن..... اور اس قدر روشن تھیں کہ سبز پتے سرخ ہو کر..... ہوئے نظر آئے تھے.....! چاروں اور لکھتیں..... کی لڑکیاں رنگ برنگی نور برسا رہی تھیں..... نام کے جلانے گئے اتار سامان سا باندھتے تھے۔ بے..... شنیوں کے حصار میں گھر اشادی والا گھر رات..... پہلے پہر بہت حسین دیکھا تھا۔

فنکشن میں شرکت کرنے والے مہمانوں سے..... اندر باہر سے بھرا تھا۔ سب کی سجاوٹ اور..... انوں کے بیٹھنے کا انتظام ناہر لان میں کیا گیا تھا۔ انوں کی آمد جاری تھی۔ عروہ، علیزے ہاتھوں..... لہجے کی ٹوکریاں پکڑے، آنے والوں کو خوش.....

آمدید کرتے ہوئے ”گھر“ پیش کر رہی تھیں۔ آئینہ، نیا اور روشنائی (دہن) کی باقی دوستیں اس کی کے روم میں جمع تھیں۔ زریں کی تیاریاں مکمل تھیں مگر وہ کہیں نظر نہیں آتی تھی۔

سلمان ماموں نے اپنی بساط سے بڑھ کر شادی کا اہتمام کر دیا تھا۔ دیکھنے والوں کو آنکھوں میں ستائش اترتی تھی۔ ملتان سے آنے والے مہمان کچھ سے قبل پہنچے تھے۔ دادی اماں ان ہی کے پاس ہو گئی تھیں۔

”بڑی جلدی آئی ہو رفیہ.....! اپنی ہو کر بے گانوں جیسا برتاؤ..... وہ مصنوعی خشکی سے شکوہ کرتے ہوئے بولیں۔ سعدیہ کے ساتھ ساتھ لقمان حیدر کے لیوں پر بھی مسکراہٹ اٹھائی۔

آپا کا رپر آئی ہوں۔ ہوا پر سوار ہو کر نہیں۔ دوسرا لقمان کو بھی کہاں اتنی فرصت ہوتی ہے.....! چھوٹی دادی نے ہنسی دبا کر انانیت سے جواب دیا۔ جواباً ذکیہ دادی یوں منہ بنا نکلیں گویا بد مزہا ہوئی ہوں۔

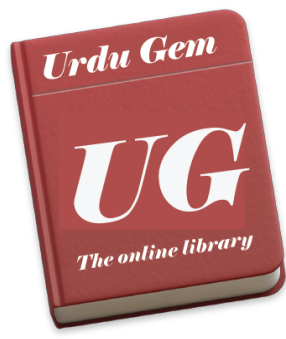
”آپا آپا بہت کرتی ہو، کوئی اتنی بھی بڑی نہیں ہوں تم سے.....!“

”حد کرتی ہیں آپ.....!“ چھوٹی دادی چھینپ گئیں۔ یہ تھا کہ وہ اپنی عمر سے کافی چھوٹی لگتی تھیں..... اور بڑھاپا ان کا زیادہ کچھ نہیں بگاڑ پایا تھا۔ لیکن ذکیہ بانو جو کچھ سال بڑی تھیں۔ ہمیشہ خود کو چھوٹا ثابت کرنے پر تکی رہتی تھیں۔ ان کی اس عادت سے سب ہی واقف تھے۔ اور ایک سچائی یہ بھی تھی کہ ایسا وہ صرف چھوٹی بہن کی محبت اور لاڈ میں کرتی تھیں۔

”حد تو تم کرتی ہو، سوسال کی نہیں ہوئی میں۔ بڑی آئی تم ریمیاں کی ہم جولی.....“

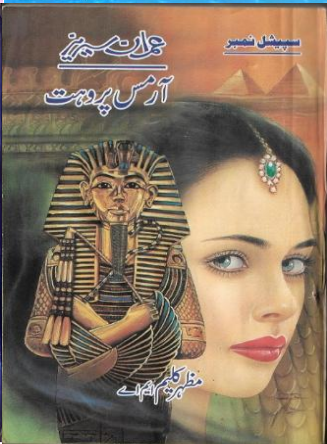
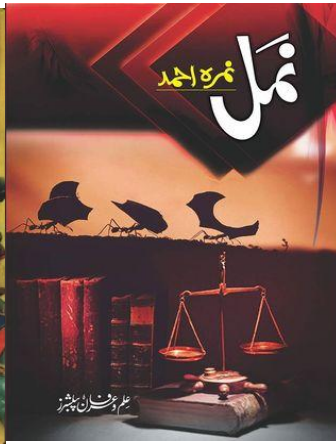
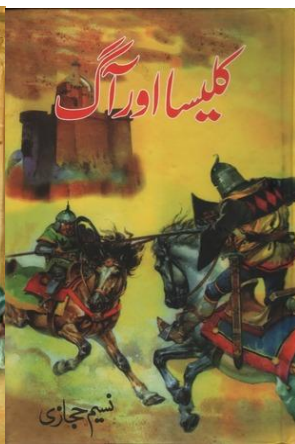
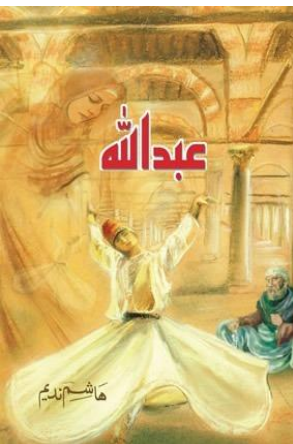
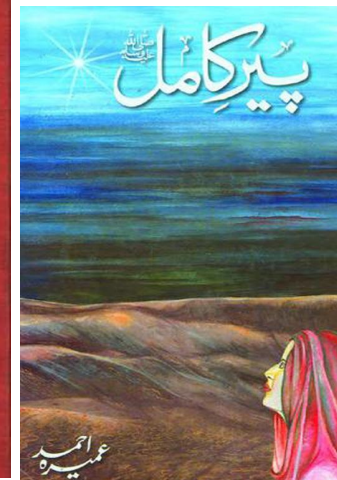
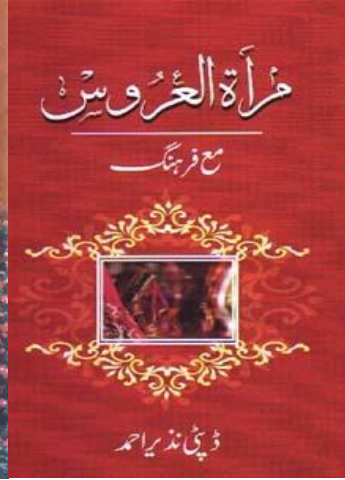
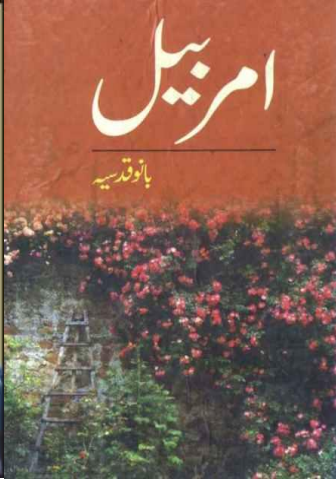
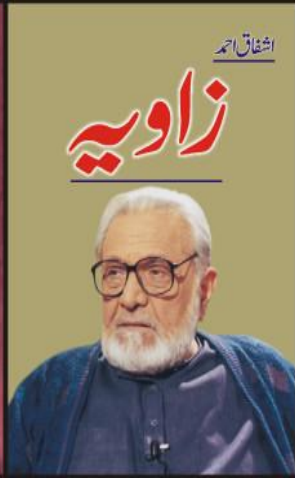
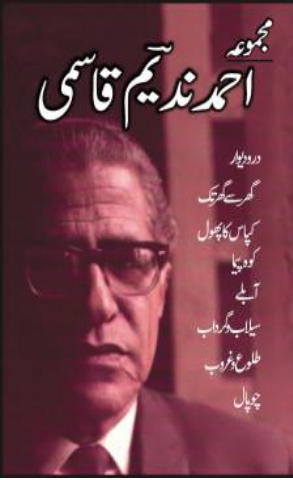
”آپا کیا فرق پڑتا ہے، ذرا سادل بڑا کر لیں تو.....“

”آئے ہائے دل بڑا ہوتا تو بیماری کی علامت ہے۔“ تمہاری نظر میری صحت پر ہے۔“



UrduGem.com

URDU KA KHAZAANA



”نہیں نہیں..... محاورہ نا کہہ رہی ہوں۔“ بڑی دادی کی بے بسی پر ہلکا کر وضاحت دی گئی تھی۔ کئی لمبوں پر دینی دینی ہنسی چل گئی۔ یہ نوک جھوک بڑی دیر تک جاتی تھی۔

ان سے ہٹ کر دوسرے پورشن پر، جہاں نیچے کا شور آسانی سے پہنچ رہا تھا۔ زریں فون کان سے لگائے خاصی خوش نظر آتی تھی۔ اس کی تیا ریاں مکمل ہو چکی تھیں اور اس یک میں وہ پہلی نظر ڈالنے پر ہی بے حد اچھی لگ رہی تھی۔

”تم یہ زیادتی کر رہی ہو زری، اگر چاہو تو بن بلائے مہمان کی طرح شرکت کرنے میں مجھے کوئی شرم محسوس نہیں ہوگی۔“

”بس کر دوشیری.....“ وہ ہنسی روکنے میں ناکام ہو رہی تھی۔ ”میرے پاس تمہاری شوخیوں کے لیے وقت نہیں، اور وہ وقت بھی دور نہیں جب تم اس میلی کا حصہ ہو گے۔ بھئی ابھی اور شادیاں بھی تو آئیں گی۔ کچھ صبر پیدا کرو طبیعت میں۔“

”اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں، وہ آدہ بھر کر بولا۔“ بھاگ لودور..... زریں کمال..... تمہارے راستے تو مجھ تک آتے ہیں.....“ وہ جیسے گنگنا کر بولا تھا۔ زریں ہنس کر گئی۔ اتنے نیم اندھیرے میں بھی اس کے چہرے کی سرنی دو نظروں سے چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔

”شٹ اپ..... میں فون بند کر رہی ہوں۔ پھر بات ہوگی۔“ غیور کو آتا دیکھ کر اس نے دوپٹا ٹھیک کیا اور سنبھل کر کھڑی ہو گئی.....!“

”زریں! انیا پوچھ رہی ہے یار..... نیچے جاؤ، بارات آچکی ہے۔“ سنجیدہ لہجے میں کہتے ہوئے وہ یقیناً اسے ڈھونڈتا ہوا آیا تھا۔ اس نے تیزی سے سر ہلایا تھا۔

”فون تھا..... چلو چلیں۔“
”شہر یار کا!“ اس نے پوچھا۔
”آف کورس.....“ وہ چلتے ہوئے اتنا کہہ پائی۔

”زریں گھر والے نہ مانے تو.....؟“ وہ جا بے کیا سوچ کر گر گیا۔ زریں بھی ہنسی..... رکی
”میں منالوں گی۔“ سرگوشی کی اس نے
”تمہیں اپنی محبت سے ڈر نہیں لگتا۔ اگر تمہاری راہیں کوئی اور موڑ لے گئیں؟“

”میری محبت طاقت دیتی ہے۔ اور میری راہوں میں کوئی موڑ نہیں غیور.....! میری خوش فہمی ہے کہ محبت میرا امتحان لیتی نظر نہیں آتی۔“ سکون سے کہہ کر وہ سڑھیاں اترنے لگی۔ خوشبو کے جھوٹے دور جانے لگے۔ غیور نے لا پرواہی سے شانے اچکائے اور قدموں کو حرکت دی۔ سارے پورشن پر آوازیں گونجتی رہ گئیں۔

بسا اوقات انسان پورے دھوکے سے کتنا غلام بول جاتا ہے۔ یوں جیسے تقدیر کو آنکھوں سے پڑھ چکا ہو۔ اتنی خوش بھی رکھنے کے بجائے اگر ہم آئے والے وقت میں خود کو ہر حالات کے لیے پہلے سے تیار رکھیں تو شاید کبھی اتنی اذیتیں سہنی نہ پڑیں.....! خیر..... رنگینوں سے بوجھل رات پر شور مچا سوار تھا۔ کی جلی خوشبوؤں سے مہکتی فضا میں رات کی رائی کی خوشبو بزم ہو رہی تھی.....!!

دہن کو اسٹیج پر بٹھایا جا رہا تھا۔ نیا غالباً کوئی شرابی بات کر رہی تھی، تمام لڑکیاں کھل کر ہنس رہی تھیں۔ غیور سہان کیمرہ سنبھالے فوٹو بنا رہا تھا۔ ویڈیو میکر اپنے کام میں مشغول تھا وہ چھوٹے ماموں اور عروہ کے ساتھ کچھ فاصلے پر کھڑا ان کے شکوے شکایات کو ہنس کر ٹال رہا تھا۔ تب ہی.....

کچھ لمحے خاص ہوتے ہیں۔ جن کے دامن میں ڈھیروں مسرتیں ہلکورے لے رہی ہوتی ہیں۔ کبھی یہ لمحے انسان تلاش کرتے ہیں۔ کبھی یہ انسانوں کو کھوج لیتے ہیں۔ کچھ ایسے ہی لمحے تھے..... انسانوں کو کھوجنے والی قسم سے تعلق رکھنے والے۔ تب ہی تو ایک بالکل سرسری سی نظر غیر ارادی طور پر اوپر اٹھی۔ تو لا شعوری طور پر اسی ہی رہی۔ جیسے ٹھہر ہو جاؤ ہو کر! سن ہوئی ہو..... ایک لفظ پر جا

اٹ سکتی ہو۔ پر سنیے پروت لیتی ہو.....! مود اور گرین کا کبھی نیش کے شرارہ سوٹ میں وہ لوٹی اجنبی روپ میں لگ رہی تھی۔ نفاست سے اب سہری میک اپ سے چہرہ سجا تھا۔ یوں جیسے ہنٹ کر دیا گیا ہو۔ سلیقے سے کئی چہرے کے گرد لپٹیں اور سیاہ کھلے بال پشت پر آبشار کی مانند پڑے تھے۔ آئی لائزر سے گہری کی ہوئی آنکھیں، بالوں میں پڑے نچلی کیوں کے جیسے سفید ٹاپس، اپ اسٹک سے تراشیدہ ہونٹ اور سوٹ کا ہم رنگ اپنا شانے پر پھیلائے وہ کمال لگ رہی تھی۔ لیکن زریں کمال نہیں لگ رہی تھی۔

اسے پہلی بار اس قدر سجاد کیا گیا تھا۔ اور اس لیے..... جب وہ اپنی ڈریسنگ کو لے کر منہ سو رہی تھی۔ پینٹ شدہ ٹانگ سکڑ گئی تھی.....!

”اتنا بھاری سوٹ..... یار میری ماں کا بس چلے تو شادی سے پہلے ہی مجھے دہن بنادیں۔ آج اس چل ہی گیا۔“ وہ جھنجھلائی لگ رہی تھی۔ نیا اس کے انداز پر ہنس کر بولی۔

”قیامت لگ رہی ہو۔“ پھر گھورنے کی پروانہ کرتے ہوئے قل قل ہنستی لگی۔

لقمان حیدر کی سپاٹ نگاہوں میں جانے کیسے اشتیاق ابھرا..... وہ ناچا ہتے ہوئے بھی لمحوں کے رعب میں الجھا..... بے بس ہوا تھا۔

تقدیر کے کھیلوں کو کون سمجھے..... لیکن دل یونہی اپنا تک جڑتے ہیں..... ایک کھلے میں۔ بغیر کسی پروا..... ہمیشہ دشوار راہوں پر.....! اسے بھی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا ہوا۔ دھندلی آنکھوں کے پار کا منظر..... زریں اسے ہاتھ کے اشارے سے بلارہی تھی۔ اپنے پاس شاید آج پروہ حیران ہوا۔ اور اپنی حیرانی پر خوش..... بہت وقت گزرا تو دل کے احساسات پر بے تحاشا خوش۔

آج پروہ بڑی ہونے کے سبب ٹائم نہ پاسکے پر مارت کر رہی تھی۔ اور وہاں آنے پر خوشی کا اظہار، کی خوشی جو قریبی رشتے دار کے آنے پر ہوتی ہے۔

باتوں کے درمیان شور کے باعث وہ ہلکا سا جھک کر بیٹھتے ہوئے کچھ بتاتی تھی۔ اور لقمان کی آنکھوں میں کیسی خوش گوار بیت تھی۔ دونوں کی کرسیاں ساتھ تھیں ایسے میں کئی مسکراتے پوزیشن لائٹ کی زد میں آئے تھے۔ لقمان جولا ہو آئے پر کشش کا شکار تھا۔ بے خبر تھا کہ تلاش یہاں آخر ختم ہوتی تھی۔ اچانک ہی دل کو اچھا لگنے والا معاملہ..... اور لمحوں نے لقمان حیدر کو کھوج لیا تھا.....!

وہ جو زریں کمال تھی..... اب واقعی کمال تھی۔ روشنائی کی رخصتی کے ساتھ..... اس نے زریں کا ہاتھ تھام کر پھولوں پر چلنے کے کی مناظر دیکھ لیے تھے۔ زریں جو انجان تھی، لقمان کے جذبول سے، ارادوں سے..... تقدیر سے..... اپنی قسمت سے۔

☆☆☆

کھنکٹی ہنسی، شریر لہجہ، پانی کے جیسی شفاف مسکراہٹ، انداز میں سادگی، اور باتوں سے جھلکتی اپنائیت وہ بے ضرر ہی لڑکی اگر اس کی پسند تھی تو واقعی اس کی پسند ایسی ہونی چاہیے تھی۔ اس کی یعنی لقمان جیسے بندے کی۔

کوئی پسند آ جانا اگر اتنی بڑی کوئی دیر نہیں تو اس گھر میں خوشی کے ٹھکانے کی بڑی وجہ یہی تھی۔

ایک چیز ہوتی ہے جو پہلے پہل مسکان کو لبوں سے جدا نہیں ہونے دیتی۔ ہنسی میں طمانیت نظر آتی ہے۔ وہ چیز ”محبت“ ہے!

کثیر آپا کا زور نہیں چل سکا ورنہ فون میں گھس کر اس کی پیشانی پر بوسہ لیتیں۔ دادی خود بہت پرسکون نظر آتی تھیں۔

”اللہ کے ہاتے خوب صورت جوڑ..... پہلے بتادیتے لقمان.....! اپنی بچی ہے وہ تو۔“ دادی کہیں تو وہ مسکرا دیتا۔ کسی کو کیا خبر..... کون کب منظور نظر ٹھہرے.....! وہ تانہ پاتا۔

”میں آپ کو لڑکی پسند آ جانا کی خوشی میں، نوافل ادا کر رہی تھی۔“ اریشا آتے جاتے چھیڑتی۔

”کرن کہاں ہے؟“ اس نے پوچھا۔
”شکرانے کے فعل ادا کر رہی ہے۔“

جواب آیا۔

”اچھا وہ کرن کی دوست ہے ناں.....“ اس نے کوئی اطلاع دینی چاہی۔
”کیا وہ بھی پسند آگئی؟“ ایک چیخ نما آواز کے ساتھ بچن میں پیٹ ٹوٹی تھی۔
”لا حول.....“ وہ بری طرح شیشیا تھا۔ ہنسی کے جلتے لگے۔

”ہم شیطان نہیں جو لا حول سے غائب ہو جائیں گے۔ ہمیں لگا ہماری دعاؤں کی تاثیر اس قدر کی گہری ہوگئی کہ کہاں ایک نہیں..... اور اب دو دو“ وہ بغیر کچھ کے مسکراتے ہوئے گھورتا رہا۔ اسی شام لیپ ٹاپ کی اسکرین پر پورے گھر کی عوام سامی، لاہور والوں سے جو گفتگو تھی۔ اسی شام باقاعدہ بڑوں میں پرپوزل پر بات ہوئی۔

☆☆☆

ایک پودا ہوتا ہے آک..... جس کے پھیلیاں پھیلائے سبز نرم و ملائم پتے اور ٹہنیاں اس قدر نازک ہوتی ہیں کہ آسانی سے ٹوٹ جائیں، اس پودے پر بظاہر کوئی کانٹے نہیں آتے۔ اور ٹہنیوں کے انک میں ننھے سفید سے پھول بھی کھلتے ہیں جو اندر سے گہرا نیلا رنگ لیے ہوتے ہیں..... لیکن اسی پودے کے سبز دبیز پتوں کی رگوں میں دوڑتا سفید دودھ اس قدر زہریلا ہوتا ہے کہ کہ جو کسی آنکھوں میں گرے تو اندھا کر دے۔ انسان تو خیر نہیں، جانور بھی اسے کھانا پسند نہیں کرتے.....!!

کچھ انسان بھی ایسے ہوتے ہیں..... بظاہر آک کے پتوں کے جیسے نرم و ملائم..... نازک..... اور کانٹوں سے عاری..... پھولوں سے بھرپور.....! لیکن نفرت کا زہر ان کی رگوں میں اک زہر بلا دودھ بن کر دوڑتا ہے۔ یہ زہر کسی قسم کا بھی ہو..... نفرت..... عداوت..... انتقام..... یا کسی چھوٹی سی وجہ کا آک کے زہر لیے مادے کی طرح آپ کو اندھا

کر سکتا ہے۔ وقت تلخ سے تلخ زہر بھی بے کر سکتا ہے..... سوائے ایک زہر کے.....!

☆☆☆

”یونیورسٹی آف لاہور.....“
نائب ہلاک کی چھٹی سائڈ پراسپورٹس گراؤ تھا..... جو سبزہ زار سے ڈھکا ہوا تھا۔ وہ ان یونیورسٹی میں آخری دن تھا اور خاصا سخت دن تھا۔ سرمئی بادلوں سے ڈھکے اس کیمپس کے اندرون احاطے میں شہوت کے سایہ دار درختوں کے نیچے وہ سب لٹش گرین گھاس پر بیٹھی تھیں..... ارد گرد شہوت اور نیم کے سبز و پیلے خشک پتے بکھرے ہوئے تھے۔

آج ماسٹر والوں کو الوداعی پارٹی دی جا رہی تھی اور پوری یونی میں رنگ برنگ لباس میں ملبوس لڑکیاں چہل قدمی کرتی پھر رہی تھیں کچھ لڑکے کیمسٹری لیب کے سامنے کھڑے گوں میں مصروف تھے۔ ان چاروں کے آگے رضیہ بیٹ کا ناول ”بانو درمیان سے کھلا تھا اور اس پر کچھ تصاویر کھلی پڑی تھیں.....!

روشی آپا کی شادی میں صرف نیانے شرکت کی اور اب وہی پکڑ زانٹا اٹھا کر سب کو بتا رہی تھی۔
”کوئی شک نہیں..... زریں واقعی بہت پیاری لگ رہی ہے۔“

”ارے ابھی کیوں پیچھے پڑی ہو۔ تصاویر کچھ اچھی آگئی ہیں تو دیوانی کیوں ہو رہی ہوں سب۔ میں ابھی زریں ہوں۔“ وہ ہنستے ہوئے وضاحت دے کر ان کی تائش کم کرنے کی غرض سے بولی تھی۔
وہ سب ابھی تصاویر پر تبصرہ کر رہی تھیں کہ موبائل پر بیل ہوئی۔ یہاں کیونکہ لڑکیوں نے اب شور کرنا تھا..... اس لیے اس نے جگہ چھوڑی..... اور کیمپس ٹریب کی گیلری پر آئی..... یہاں قدرے سنا اور کئی تاریکی تھی۔
”السلام علیکم.....!“
”علیکم السلام۔“ کسی ہوزریں! بندہ حال چال

یہاں چہ لیتا ہے۔ وقت نے فاصلوں کا گہرا فائدہ اٹھایا ہے شاید.....“

”ایسی بات نہیں۔“ وہ بری طرح شرمندہ لٹی۔ ”میرے پاس آپ کی بات کا جواب نہیں۔ آپ شخص ایسے مصروفیت ہی سمجھ لیں بھول جانا امان کہاں ہوتا ہے۔ آپ شرمندہ نہ کریں۔“
”زریں بات سنو.....“ آواز پر چونک کر لٹی۔ شہریار اس کے پیچھے کھڑا تھا۔ سنجیدہ تاثرات لے ساتھ زریں نے انگشت کی آخری پور کے ”ایمان“ میں انگوٹھے کا نیل دیا۔ یہ ”ایک منٹ“ کا اشارہ تھا۔ پھر رخ پھیر کر بولی۔
”یو ڈونٹ مائنڈ لقمان..... ہم بعد میں بات کر سکتے ہیں؟“

”نہیں اچھوٹکی میں اس وقت یونی میں ہوں۔“ لٹی ہو کر آپ کو کال بیک کروں گی۔“ اس کی بات پر جواب میں دوسری طرف کچھ کہا گیا اور رابطہ ”تعلق“ ہو گیا۔ لٹی کی مسکان کے ساتھ میل کان سے ناکر وہ مڑی تو راہداری دور تک خالی تھی۔ چند لمحوں پہلے کھڑا شہریار کسی بھوت کی طرح غائب ہو چکا تھا۔
”ای ہی دل میں حیران ہوئی وہ واپس گروپ میں آئی۔“

”شیری کہاں ہے؟“ اس نے سب سے ”مڑ کر سوال کیا۔ جس زیدہ، زرد فضا میں ہوا دیر سے بھرے بلکورے لینے لگی تھی۔
”معلوم نہیں..... باہر دیکھا میں نے.....“
”الم چباتے غور نے لا پرواہی سے بتایا تھا۔ زریں نے ہنستے ہوئے کیمپس سے باہر آئی..... حاشہ کچھ لڑکوں کے ساتھ کھڑا تھا مگر شیری وہاں بھی نہیں تھا۔ منہ تے ڈھونڈتے وہ تھک گئی تو شہریار کے منہ تے اسے مطلع کیا تھا۔

”شیری یونی میں نہیں ہے۔“ انتہائی بڑے آواز کے ساتھ میں نے اسے گیٹ سے نکلے دیکھا۔ ”وہ سن کر کچھ بولنے کے لائق نہیں رہی۔ یوں“
”اماغ کے فیوز اگڑے گئے ہیں۔ شہریار کا عجیب

وغریب رویہ اس کی سمجھ سے باہر تھا۔
اس دن جب یونی بادلوں سے ڈھکی تھی..... زرد فضا میں شہن کا احساس بڑھ رہا تھا..... زریں اور شہریار کے تعلقات کے آگے ایک بڑا سافل اسٹاپ لگ گیا..... ایسا فل اسٹاپ، جو کسی چیز کے ”ایند“ ہونے پر لگایا جاتا ہے۔

☆☆☆

آئینوی بیلوں کے پتوں سے پانی کی بوندیں ٹپک رہی تھیں۔ خوش گوار موسم کا اثر تھا کہ بیلوں کی سبز رگوں سے ننھے ننھے پھول جھانکنے لگے تھے۔ کچھ دیر فل چھابوں جھانج بارش برسی تھی۔ جس کی ٹھنڈک سے سورج کی آگ سرد پڑ گئی تھی۔

بارش رکے وقت نہیں جتا تھا اور پودوں سے ٹپکتے پانی کے ساتھ سوندھی سوندھی مہک بھی اڑی اڑی پھر رہی تھی۔ اس کے باوجود موسم اپنی تمام تر رنگینوں کے ساتھ ان کے توجہ کھینچنے میں مکمل طور پر ناکام ہو رہا تھا۔ سامنے بڑے خوشبودار پیکوڑے گرامش کے ساتھ اپنی لذت بھی کھو چکے تھے۔

میرون، جنیز پر ٹنڈ سوٹ پہنے، بے ترتیبی سے کیمپس میں جکڑے بال، پیشانی پر سوچ ٹکٹوں کا جال، لمبائی رنگت، پھیلے بڑتے ہونٹ اور آنکھوں میں سرخی لیے، وہ لان کی مینگی کریسوں میں سے ایک پر بیٹھی خشاش کی ٹرے میں انگلی سے لکیریں بناتی جا رہی تھی۔ نظریں زمین پر کچھ کھوجتے سفید موروں پر پھسلتی میز پر رکھا موبائل بے جان ہو چکا تھا۔ ذرا سی دیر پہلے نایاب کی کال سن کر اسے میز پر رکھا گیا تھا۔

”زریں میں نے شہریار کے دوستوں سے پتا کرنے کی کوشش کی مگر کچھ حاصل نہیں ہوا۔ تم غیور سے کہو ناں!“ موبائل اسکرین کے پار سے ابھرتی مایوس آواز نے اس کی آنکھوں میں جعلی امید کی جوت کو مزید بجھا دیا تھا۔ اذیت کی ایک اور لہر اس کے پورے وجود میں اترتی گئی تھی۔
”کہہ چکی تھی..... شہریار کا کسی سے رابطہ نہیں

ہے یا پھر کوئی بتانا نہیں چاہتا۔ وہ اتنا لاپرواہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تین دن اپنا موبائل بند رکھے اور اپنی خیریت کی اطلاع نہ دے۔ میں کیا کروں نیا؟“

بھیلی آواز میں جواب دیتے ہوئے ہچکیوں سے رونے لگی تھی۔ آج سے قبل ایسا بھی نہیں ہوا تھا۔ اور یہ کس قدر مشکل تھا۔ درد بلکہ اذیت ناک.....“

”پلیز خاموش ہو جاؤ زریں! مجھے تو فکر لاحق ہونے لگی ہے کہیں کوئی حادثہ۔“

”ایسا مت کہو۔“ اس نے ٹپ کر نیا کو روکا تھا۔ صرف اس نقطے کو وہ ذہن میں بھی نہیں لانا چاہتی تھی۔ دل شدت سے چاہا تھا کہ بادل از سر نو بریں اور اس کی آنکھیں، یہ بارش اسے خود پر قائم کناں محسوس ہوئی.....!

”بی بریو یارا“ نیا اپنائیت سے اسے تسلیاں دیتی رہی۔ یہ تسلیاں بھی اس کی ضرورت تھیں۔ دلا سے، ڈوبتا دل ابھارتے تھے۔ نیا سے بات کرنے سے لے کر اب تک کھوئی کھوئی کیفیت سے پچھا چھڑاتے ہوئے وہ فیصلہ کر چکی تھی کہ وہ شہریار کے گھر جائے گی۔ ہاں اس کے سوائے کوئی راستہ نہیں تھا۔ ایک بار تو معلوم کرے، کیا خبر واقعی کچھ! نہیں ہوگا تو وہ ٹھیک ہی، شاید شرارت شرارت میں اس کا ضبط آزما رہا ہے۔ وہ اپنی محبت..... پس یہ ممکن ہے.....!! عین ممکن ہے۔

یہ ہی سوچتے ہوئے وہ ابھی خشخاش صاف بھی نہیں کر پائی تھی کہ سعد یہ اس کے مقابل آکر بیٹھ گئیں۔ بادل پھر سے جمع ہونے لگے تھے راج ہنسل کے جیسے..... اور ہوا میں غمی تھی۔

”یہ مجھ زری.....“ نظریں جھکائے جھکائے وہ وہاں سے اٹھنے لگی کہ ماں کی آواز پر رک گئی۔ دل زور سے دھڑکا تھا۔ وہ چور بن گئی۔

ہوں۔“ اپنے مخصوص نرم لب ولہجے میں زریں آگاہ کرتی وہ چند تاپے خاموش ہوئی تھیں۔ زریں اس تمہید نے ابھن کا شکار کر دیا۔ وہ جھکے سر کے ساتھ سنے گئی.....!

”لقمان کے لیے تمہارا ہاتھ مانگا گیا ہے۔ امی نے اطمینان سے بتایا تو اس کا سر جھٹکے سے اوپر اٹھا۔ یہ کس کا نام لیا گیا تھا وہ فوری طور پر فیصلہ نہ پائی اور۔

”لقمان حیدر.....“ دوسرے پل وہ بری طرح شاکر رہ گئی تھی۔

وہ حواس باختہ ہوئی..... منجھ..... سناکت..... یا بے یقینی کی انتہا کو چھو کر گنگ ہوئی تھی۔ ماذن ہوتے ذہن کے ساتھ باشکل وہ منتشر حواسوں کا قابو کرتے ہوئے وہ ماں کو دیکھنے میں کامیاب ہوئی۔ ایک دھچکا..... دوسرا دھچکا..... پھولوں کی پتیوں ہوا میں گھرنے لگی تھیں۔

سعد یہ جو دکھ رہی تھیں۔ بیٹی کو غور سے سمجھتی آ نکھیں..... شل چہرہ..... اڑی رنگت..... جان پڑتا وجود..... سعد یہ سوچ نہیں سکتی تھیں جو ایسی فرماں بردار بیٹی اور دھچکا سہہ سنبھلنے پر..... ”ای نہیں.....“ ایک دم اٹھنے پر ہاتھ میز سے لگا اور خشخاش کی ٹرے انٹ گئی۔ اس قدر شدت سے بولے گئے ان دو لفظوں نے اب کی بار سعد یہ ششدر کر دیا تھا..... یہ دو لفظ کیسے تھے؟ یہ دو لفظ..... جو قطعی تھی..... کسی بھی چمک عاری تھے۔

☆☆☆

گزشتہ بارش سے موسم کی رت ہی گئی تھی سفید شکل کے بادل آج سے قبل بھی اتنے مہربان ہوئے ہوں گے۔ چھ دنوں سے متواتر پھوار بڑی تھی اور خوش گوار ہوا میں بدلتے موسم کی نوید تھیں ایسے میں مارننگ گلوڑی کے تیل پر شکر پی پھولوں پر تیات اتری آئی تھی۔ جو آنکھوں کو تراوٹ تھی۔

لقمان حیدر کے گھر کا سرسبز لان گھر انکھ اسما صورت تاثر دے رہا تھا۔ سفید رنگ کی بنا بازو اپنی شرٹ اور گرے ٹراؤزر کے آرام دہ حلیے میں نیکی باؤں لٹش گرین گھاس پر داک کر رہا تھا۔ فلک لاتی کناروں پر شام کی لالی تھی پھیلی ہوئی تھی۔

”السلام علیکم..... زریں بول رہی ہوں۔“

”آپ کے مخاطب کو لقمان کہتے ہیں۔“

ہماری سی آواز کے جواب میں مسکرایا تھا۔ زریں کا

کا: بیٹا لگتا تھا۔ آواز زکام زدہ تھی!

”یقیناً..... میں کچھ بات کرنا چاہتی ہوں۔“

”اے پر آتے ہوئی بولی۔ اس کی حد درجہ سنجیدگی

لقمان کو چونکا یا تھا۔

”بولو..... میں سن رہا ہوں.....“

”آپ جانتے ہوں گے۔ میرے لیے آپ کا

ہزل دیا گیا ہے۔“ وہ چاہ بھی نہیں سکی کہ آپ کے

ماتے تم کہہ سکے۔ ایسی بے تکلفی کی فضا بھی قائم

نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ مارننگ گلوڑی تیل کی شاخ کو

ہمو لا جھلانے لگا۔

”جانتا ہوں۔“

”آپ کا ہر پوزل ہر لحاظ سے میری فیملی کے

ایہ مناسب اور بہترین ہوگا، آپ یہ بھی جانتے

اں گے۔ مگر میرے انکار کو کسی طور اہمیت نہیں دی

ہانے گی۔ یہ میرے لیے ناقابل یقین اور باعث

ایف ہے۔ اس بات کا احساس کسی کو نہیں ہوگا۔

وہ یقیناً آنسو اندر دھکیلتے ہوئے بہ دقت بول

ہی تھی۔ دوسری سمت سنا سنا سا چھا گیا تھا۔ ایک

..... پھر کئی تاپے۔

”تم نے انکار کر دیا.....؟“ پھر ایک بے

آواز ابھری تو زریں لا جواب سی ہو گئی تھی۔

علم نہیں تھا کہ لقمان سمیت اس کے گھر والوں کو

بیر رکھا گیا ہوگا۔ اس نے خود کو نہایت بے بس

ابایا۔

”اصولاً تو آپ کو کرنا چاہیے تھا۔ میرے گمان

نہیں تھا کہ کوئی آج کے زمانے میں بغیر کسی کو

پرکھے، سمجھے کسی نئے تعلق پر کیسے آمادہ ہو سکتا ہے۔ آپ تو پھر لڑکے ہیں۔ آپ کو انہیں اپنی مرضی سے آگاہ کرنا چاہیے تھا۔ لیکن اب بھی پلیز، پلیز اپنے گھر والوں سے کہیں وہ یہ رشتہ واپس لے لیں۔ میں ایک اجنبی زندگی نہیں جی سکتی۔“

آنسو پلکوں کی باز توڑتے، گالوں پر سلسلہ وار بہنا شروع ہو گئے تھے۔

حیران حیران سے لقمان نے اس کی یہ جذباتی گفتگو بڑی حیرانی سے ملاحظہ کی۔ زریں کی باتیں وہ سمجھنے سے قاصر تھا۔ یا مقصد نہیں جان رہا تھا۔

”اے لیکن مجھے مجبور تو نہیں کیا گیا۔ میں نے

خود شریک سفر کے لیے آپ کا انتخاب کیا زریں!“

آسمان پر دھیرے دھیرے اتنی شام کی بے رنگ

تاریکی، لقمان کی گفتگو میں شریک ہو گئی۔ وہ زریں

کی غلط فہمی دور کرنے کو بولا تھا۔

”آپ نے.....“ تھیرے آنکھیں پھیلیں لفظ

اپنی موت آپ مرے تھے۔ وہ مزید کچھ بول نہیں سکی

تھی۔

”ہاں میں نے..... تم میری پسند ہو زریں،

میں تمہیں بتا دیتا مگر حج وقت آنے کا انتظار کرنے

لگا۔ میں تمہیں کہنا چاہتا ہوں زریں کہ میرے دل کو

تمہاری تلاش تھی۔ بھی کسی جگہ کوئی چیز دیکھ کر آپ

لحلوں کی زد میں آکر اسے سند کر لیں تو وہ صرف لمحائی

کیفیت ہوتی ہے مگر کسی چیز پر دل ٹھہر جائے تو آپ

چاہ کر بھی ان لحلوں سے خود کو آزاد نہیں کر پاتے۔

میرے ساتھ بھی دوسرے والا معاملہ سمجھو زریں۔

میں کوئی رومانوی جملے نہیں بولوں گا مگر میرے

اضطراب کی ایک ایک چیز گواہ ہے کہ کوئی لڑکی

میرے حواسوں پر چھائی ہے۔ لیکن تم مجھے پریشان

لگتی ہو زریں..... تم ایسی کیوں لگتی ہو؟“

وہ جو بت بن گئی تھی۔ لحلوں کی قیدی.....

لفظوں سے پزل سی۔ قیامت تک کے لیے ساکت

ہوئی لگتی تھی۔ یمن دبا کر متحرک گڑیا ساکت کر دی گئی

ہو۔ وہ اپنے جذبے آشکار کر کے تشویش کا شکار ہو رہا

تھا۔ فکر مندی سے پوچھ رہا تھا۔ اپنائیت سے استفسار کر رہا تھا۔ شکر فی پھول گر کر قدموں میں ڈھیر ہونے لگے۔ زریں کمال اس ڈھیر کے سامنے بھر پوری چٹان ہونے لگی۔

”نہ۔ نہیں میں..... ہاں ٹھیک ہوں۔“
 ”ہاں کہ نہیں؟“ بہم سے جواب پر سوال سوار ہوا۔ وہ نظر انداز کر گئی۔ وہ جو انکار کرنے کی جسارت کرنے چلی تھی..... ایسا کہ نہ پائی۔ دل میں بھانپ کر چلنے لگے..... آسو جمنے لگے۔

”تم نے انکار کیوں کیا زریں؟“
 ”ہم بعد میں بات کریں گے لقمان! مجھے کچھ وقت دو پلیز۔ فی الحال کسی نئے بندھن میں بندھنے کے لیے خود کو ذہنی طور پر تیار نہیں کر پاؤں گی۔ وہ جھوٹ بول کر جانے کیا ثابت کرنا چاہ رہی تھی۔ ثابت ہوا کہ وہ منتشر لچلی کا شکار تھی۔ وقت کی ستم ظریفی نے اسے ناقابل فہم مشکلات میں جکڑ لیا تھا۔ وہ عجیب سے احساسات کا شکار تھی۔ فضا میں بھری ہوئی۔ مغلق سی!

”میں سمجھ سکتا ہوں زریں! تم جتنا چاہو وقت لے لو میں انتظار کی لذت چکھنے کو تیار ہوں۔ یہ میرے حصے میں آئی چاہیے۔ محبت کسی جگہ تو آزمائے پہلی آزمائش ہی سہی گھر والوں کی فکر تم مت کرو۔“
 اس نے ہنس کر زریں کے دباؤ کو ہلکا کرنا چاہا اور جھک کر قدموں سے ایک پھول اٹھایا..... شاید انتظار کا..... آزمائش کا..... محبت کا!!!!

”شوق سے..... مگر یاد رکھو! محبت غیر محرم سے ہوتو عذاب بن جاتی ہے۔“ اس کے لہجے میں طنز کی چھین اتری۔ تنبی سے کہہ کر وہ کال منقطع کر چکی تھی اور لان کی نرم گھاس پر ایک جگہ کھڑا لقمان اس کے لفظوں کے مفہوم میں کھویا رہ گیا۔

ادھر زریں مایوسی کے اندھیرے میں، امید کی کرن ڈھونڈ رہی تھی۔

شہر یار سے ملنا نہایت ضروری ہو گیا تھا۔ اسے حالات کی گتینی سے آگاہ کرنا اشد ضروری ہو گیا تھا۔

بے رنگ سی تاریکی، سیاہی میں نہا کر دھڑکی چھا گئی۔

☆☆☆

نیم گرم، دھوپ میں راکل بلیو پاٹھامہ اور لاٹکا شرٹ پر لمبی سیاہ چادر میں لپٹی، زریں کمال ”نیازی ماؤس“ کے بڑے سے براؤن آئینی گیار کے سامنے کھڑی، سانسوں درست کر رہی تھی۔ ایکڑ پر پھلا پھلا بنگلا جس کی بیرونی دیوار پر سفید پھولوں کی تیل لپٹی تھی۔ بلاشبہ مہارت سے تراشا ایک شاہکار تھا۔ کئی لمحے وہ نگاہ کش کا شکار ہوئی ہونٹ چپکتی رہی تھی۔

تیل کا بٹن دبانے کی صورت میں اندر جلتے رنگ سے بچے..... پھر سکوت چھا گیا۔ دوپہر کے سسے اس بنگلے سمیت، پورے صاف شفاف علاقے میں..... ویرانیوں کی حد تک سنائے پھیلائے ہوئے تھے۔ چند لمحوں بعد اس نے دوبارہ ہاتھ کھڑا کیا۔ ہاتھ فضا میں معلق رہا..... گیٹ میں حرکت ہوئی..... سامنے ایک نفیس سی خاتون سادہ سے حلیے میں کھڑی تھیں..... چہرے پر اپنائیت اور شخصیت میں ایک تمکنت اور وقار۔ زریں مرعوب سی ہو گئی تھی۔ ایک دم اعتماد سے خالی ہوئی۔

سارے ترتیب دیے جملے بھک کر کے اڑ گئے تھے۔ کچھ ٹائیے بعد وہ خوب صورت سے ڈرائنگ روم میں بیٹھی دیوار پر آؤ براؤں، سمندر میں ڈوبتی کا منظر دیکھ رہی تھی۔ جو کوشش کے باوجود ڈوب جا رہی تھی۔ اس کے دل کی طرح..... پیچھے..... اور نیچے چپکے لے کھائی!

”کیا ایس گی بیٹا!“ نرم سی مسکراہٹ کے ساتھ انہوں نے حوصلہ افزائی کی۔ زریں کے چہرے سفید مسکراہٹ جھلک دکھا کر معدوم ہوئی۔

”بہت شکریہ آئی! کچھ بھی نہیں۔ آپ شہر کی والدہ ہیں؟“

”بالکل۔“ وہ محبت سے بولیں۔ ”تم شہر سے ملنے آئی ہو؟“

”جی دراصل..... مجھے شہر یار سے کوئی کام تھا اور.....“ اتنا کہہ کر وہ لب کاٹنے لگی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آنے کا مقصد کسے بیان کرے؟“

”پر سکون ہو کر بیٹھو بیٹی..... اسے اپنا ہی گھر سمجھو۔ میں تمہاری بھی والدہ جیسی ہوں۔ شہری سے تمہاری ملاقات نہیں کروا سکتی..... اس کے لیے مجھے افسوس ہے۔“ وہ واقعی افسوس ناک تاثرات سے بولی تھیں۔ زریں کا دل دھڑکنے لگا۔

”شہر یار سے ملاقات کیوں نہیں ہو سکتی آئی۔ کافی دن ہوئے اس سے کوئی بات چیت نہیں ہوئی۔ سیل فون بھی آف ہے۔ سب خیریت سے ہے ناں؟“
 دل سے دوسو سے جھٹک کر وہ استغناء بھرا نگاہوں سے انہیں دیکھنے لگی۔ وہ ہنوز مطمئن بیٹھی تھیں۔

”سب ٹھیک ہے بیٹا۔ شہری کو اصل میں، میں نے یورپ بھجوا دیا ہے۔ ایک خاص مقصد کے لیے۔“
 ”خاص مقصد؟“

”ہاں..... وہاں شہری کی خالہ مقیم ہیں۔ اور میں چاہتی ہوں کہ شہری کی بات میری بھانجی سے ملے پاجائے۔ اسی سلسلے میں شہری کے ڈیڈی اور میں نے فیصلہ کیا کہ شہری کچھ عرصہ وہاں رہ کر ایک دوسرے کو کچھ جان لے اور امتحان کے بعد آؤ جنگ بھی ہو جائے گی۔ اپنے خلوص میں بتاتے ہوئے انہوں نے زریں کے سر پر دھماکا ہی کر دیا تھا۔ صدے میں گر کر وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان کو دیکھ جا رہی تھی۔ ایسا کچھ تو اس کے گمان کی آخری حدوں میں نہیں تھا۔

”آئی..... شہر پارمان گیا۔ آئی مین.....“
 ”بھئی مانتا کیسے نہیں۔“ وہ خود بھی اس ماحول سے کچھ وقت کے لیے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا اور وہ زریں کے لہجے پر غور کیے بنا اس کے دل پر بجلیاں گرائے جا رہی تھیں۔

وہ خاصی باتونی خاتون تھیں۔ ہنس کھا، رگھنے ملنے والی اور یہ ساری خوبیاں اس وقت زریں پر بہت بھاری گزر رہی تھیں۔ اس لگنے لگا کہ یہاں

آکر وہ غلطی کر چکی ہے۔

”شہر یار نے ہمیں بتایا ہی نہیں..... پسند تو وہ کسی اور کو کرتا تھا۔“ گلے میں ایکٹی کسی چیز کو ملحق سے اتار کر وہ بہ دقت بول پارہی تھی..... دل زنجی ہو رہا تھا۔ آنکھیں دھواں دھواں..... وہ ایسا تو کبھی نہیں رہا تھا۔

”کرتا تھا۔“ شہر یار کی والدہ اسی انداز میں گویا ہوئیں۔ میں نے ایک دوبارہ ذکر سنا تھا۔ مگر بیٹا اس عمر میں تو لڑکے ایسے ہی ہوتے ہیں..... میں نے خود اس کی پسند پوچھی اور دیکھ لو کہ اس نے اب کی بار نام ہی نہیں لیا۔ بلکہ الٹا ناراض ہو گیا۔ آج کے بچے ہیں اپنی منوائے ہیں۔ میں نے پھر اپنی خواہش ظاہر کر دی تو خاموش ہو گیا۔ ہونا ہی تھا۔ شاید وہ لڑکی ٹھیک نہیں تھی۔“ ان کے لہجے میں نہ تنفر تھا نا خوشی۔ بس سادگی تھی۔

اتنے بڑے گھر کا سارا سناٹا تیزی سے زریں کے اندر اترنے لگا۔ زریں کے اندر کا شور باہر پھیلنے لگا۔ لڑکی ٹھیک نہیں تھی..... لڑکی ٹھیک نہیں تھی..... لڑکی ٹھیک نہیں تھی..... پورا بنگلا لرزنے لگا۔ دوسرے کھائے دبیز قالین پر نظر پڑی جمائے بیٹھی تھی۔ جمائے بیٹھی رہی آواز ساتوں تک پہنچ رہی تھی۔

”شہری میرا اکلوتا بیٹا ہے۔ بے حد لاڈلا..... شروع سے ہی بہت جذباتی رہا ہے بات بات پر روٹھتا، معمولی سی بات پر بری طرح ری ایکٹ کرنا اس کے مزاج کا حصہ ہے۔ اپنے پیار میں شاید مجھ سے ہی کوئی کسرہ رہ گئی کہ جوان ہونے کے باوجود بھی وہ سدا کا جلد باز ہے۔ بات کو غلط رنگ دے کر بنا کوئی تصدیق کرائے اپنا ہی نقصان کر بیٹھتا تھا۔ اب بھی ویسا ہی ہے مگر اس کی تربیت بہت اچھی ہے۔ دوسروں کو عزت دینا جانتا ہے بہت فرماں بردار ہے میرا بیٹا.....“

ٹھٹھے کچھ میں بولنے ان کے چہرے پر ممتا کے سبب ہی رنگ بکھرے ہوئے تھے۔ زریں کے اندر کھن بڑھ رہی تھی۔

پلیس چھپ کر..... نمی دھکیلتی..... اس نے چہرہ اٹھایا۔ انہیں دیکھا..... بہت ہمت کے بعد بول سکی۔
”میں چلوں آئی۔ شیری سے پھر بھی ملاقات ہو جائے گی۔“ حالانکہ وہ اب مرکز بھی اس انسان کی شکل نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ مگر اس قدر کہنا اس نے ضروری سمجھا تھا۔ ساتھ ہی وہ کھڑی ہو گئی تھی۔
”سنو..... تم کہیں وہی لڑکی تو نہیں.....“ وہ جانے کیسے خشک میں پڑیں۔

”جی نہیں..... میں وہ نہیں ہوں۔ شہر یار کی کلاس فیلو ہوں۔“ اتنا وہ جانتی تھی کہ شیری نے فی الحال گھر میں کچھ نہیں بتا رکھا تھا۔ کہہ کر وہ بغیر ان پر نظر ڈالے۔ سرعت سے باہر نکل گئی۔ بھلے ان کو تا گوار گزرے، گزرتا رہے۔ وہ کچھ دیر مزید رکتی تو مرنے جاتی۔ کچلے آسمان تلے، پہنچنے تک وہ پسینہ پسینہ ہو کر ہانپ رہی تھی یوں جیسے میلوں سحر میں بھاگتی رہی ہو۔

المانت سے پیشانی جل رہی تھی..... وہ دھوکا کھا چکی تھی..... کسی کے ہاتھوں بے وقوف بنی رہی تھی..... محبت، محبت کے فریب میں ڈوبی رہی تھی..... کیا وہ ایسی بے مول تھی کہ یوں ٹھکرانی جانی.....؟ کیا وہ اسی کی حق داری تھی.....؟

محبت سے بڑا فریب کوئی نہیں..... یہ حقیقت اور جھوٹ ایک ساتھ ہے..... مگر کسی کو تو دو کوڑی کا کر دیتی ہے..... خوار کر دیتی ہے!

زریں کمال اندر سے خالی ہو گئی تھی۔ دنیا کی بڑی حقیقت سے بے زار ہو چکی تھی۔

”نیازی ہاؤس“ کی دہلیز پار کرتے ہوئے زریں کمال، شہر یار نیازی کی مردہ محبت کو بے گانگی کا کفن پہنائے ہمیشہ کے لیے وہیں چھوڑ آئی تھی۔ سوچھ سے آزاد خالی دل کے کواڑ شہر یار نیازی پر بند کرنا وہ بھی بھول نہیں سکتی تھی..... بھولی بھی نہیں۔

اسی گہری تاریکی میں لان کے سامنے کور پٹور کے ساتھ والی سیڑھیوں پر ایک بھولا سا بیٹھا گویا دھیرے دھیرے لرز رہا تھا۔ لان میں ہلکی ہلکی سی پھوار برس رہی تھی۔ اور اس کے سر پر شیڈ کی تکی چھت

اسے اس نمی سے بھاری تھی۔ وہ رو رہی تھی۔
”کیا تمہیں اس کے چھوڑ دینے کا اس قدر دکھ ہے زریں؟“ غیور سنان اس کے برابر بیٹھا سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔ وہ اس کے رونے پر کئی دفعہ اسے تسلی دے چکا تھا۔
وہ دونوں بھی ایک دوسرے کے قریب نہیں رہے تھے مگر اس راز سے صرف غیور سنان واقف تھا۔ اس لیے وہ صرف اسی کے سامنے کوئی بہانہ نہیں بنا سکتی تھی۔

”کیا نہیں ہونا چاہیے؟ میں نے اس سے بھلے کوئی طوفانی محبت، دھواں دھار عشق نہیں کیا۔ مگر اتنے عرصے میں جو دلی وابستگی ہو چکی تھی۔ میں نے ساتھ جینے مرنے کی قسمیں نہیں کھائیں۔ مگر ساتھ رہنے کے خواب تو دیکھے ہوں گے ناں.....؟ وہ خواب ایک دم جل جائیں تو آنکھوں میں راکھ سما جاتی ہے..... یہ آنسو بہا کر میں وہ راکھ بہا دینے کی کوشش کرتی ہوں۔“

ایک زکام زدہ سی سانس کھینچ کر وہ ہلکے سے بولی تھی..... لیوں سے ادا ہوتے کمزور الفاظ، حلق کے خشک ہو جانے کی علامت تھے۔

”یہ بار بار کے آنسو راکھ جمائیں سکتے زریں! کیا فائدہ، سنہالو خود کو۔“

”خاموشی سے ٹھکر کر چلے جانے کا دکھ بڑا کڑا ہوتا ہے غیور۔“ اپنی کم مائیگی کا احساس دلاتا ہے۔

”ہاں۔“ کاش میں تمہیں خوشیاں دے سکتا زریں! میں مجبور ہوں۔“

”مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں میرے بھائی۔“ وہ آنسو صاف کرتے ہوئے صاف لہجے میں بولی۔ پھوار ہنوز جاری تھی۔

”لقمان اچھا لڑکا ہے۔“ غیور نے اسے نئے راستے پر ڈالا۔ زریں نے منزل دیکھ سکتی تھی۔

”وہ واقعی بہت اچھا ہے۔ مجھ سے بڑھ کر اچھی لڑکی ڈیزور کرتا ہے۔ میں بہت ڈسٹرب ہوں۔ اور.....“

”اور تمہاری ڈسٹربنس شاید تمہارا فیصلہ دور۔“
لر دے۔ بہر حال جیسا تم چاہو۔ میں نے تمہیں پہلے ہی سمجھایا تھا۔ اب دل ٹوٹے تو اتنی تکلیف تو ہوتی ہی ہے..... تم ہانتی نہیں تھیں تب.....“
”غیور پلیز!“ اس کی آواز نظریں چراتی تھی۔
”ایسا مت کہو۔ میں خود کو سنبھال لوں گی۔ میں یہ کر سکتی ہوں۔“ خائف سے ہو کر وہ کیا کہہ رہی ہے۔ وہ خود بھی نہیں جان پائی۔

بادل کی گرج، بارش کی برس، ہوا سے کھڑکھڑا تے پتے، سائیں سائیں کرتیں ہوائیں، سرمئی بادلوں سے ڈھکا آسمان میں پر چھایا سکوت، یہ سب مل کر جب ماحول پر ہیبت طاری کر رہے تھے۔ سعدیہ کے پورٹن میں زریں کے کمرے کی کھڑکی میں لپٹ کی مدہم زرد روشنی پورے شیشے پر پھیلی نظر آتی تھی..... اندر زریں ڈائری پر لکھ رہی تھی.....!

”انسان زندگی میں ایسی ایسی جگہوں سے مات کھا جاتا ہے ڈائری! جہاں سے ایسا کچھ ہونے کی امید کیا امکان بھی نہیں ہوتا۔ پھر شاید اسے ہی تقدیر کہتے ہیں۔ جو تیر یوں کو بھی خاطر میں نہیں لاتی۔ میں نے شہر یار سے محبت کی اور مطمئن ہو گئی۔ غلطی جانے کس کی ہے۔ میری شہر یار نیازی کی، یا کسی تیسرے کی۔ پھر بھی ہم دریا کے دوا لگ الگ کناروں پر جا کھڑے۔ جتنا سوچتی ہوں اتنا ابھرتی ہوں کہ شہر یار نے آخر کس بات کا بدلہ لیا مجھ سے..... انتقام کی وجہ ہی بتا جاتا۔ یوں نہ کرتا۔ لیکن.....“
وہ آنکھیں پوچھنے کور کی۔

”لیکن اب اس سب کا کوئی فائدہ بھی نہیں..... کیا میں کبھی اس انتقام کی بنیاد جان سکوں گی۔ یا ساری زندگی یونہی کبھی کبھار یاد آنے پر اس بے تصور غلطی کی سزا پریش رہوں گی۔ میں نہیں ہانتی، مگر اب میں اس سے پیچھا چھڑا رہی ہوں۔ است! تمہاری ایک صفحے پر میرے ہاتھوں لکھا ایک بلہ پڑھ کر میں حیران ہوں کہ اسے میں نے لکھا ہے۔ لکھا کچھ یوں ہے.....“

”جو لوگ ہماری چاہت و توجہ کے منتظر ہوں..... انہیں انتظار کی اذیت میں مبتلا نہیں رکھنا چاہیے۔ ہمیں چاہیے کہ فوراً ہاتھ بڑھا کر انہیں تمام لیں کہ ایسا نہ کرنے کا ہمارے پاس کوئی حق نہیں.....“
مجھے میری ہی تحریر نے راہ دکھادی اور میں سنبھل گئی ہوں۔ دیکھو میں خود کو سنبھال رہی ہوں۔ آگے بڑھ رہی ہوں۔ ڈائری ڈائری! میں شادی کر رہی ہوں۔ پس آئی ایم گینگ میریڈ.....“

☆☆☆

زریں کے ہائی بھر لینے کے بعد دو ماہ بعد وہ مایوں میں بٹھائی گئی تھی..... اس سے قبل وہ دونوں ایک ساتھ مقبرہ جہانگیر آئے تھے۔
”لاہور میں بہت سی جگہیں قابل دید ہیں۔ مجھے تم سے شکوہ رہے گا کہ تم مجھے سیر کرانے کی ایک دفعہ بھی آفر نہیں کی۔“

صدر دروازے کو پار کرتے ہوئے لقمان نے ہلکا سا شکوہ کیا تھا۔

زریں محسوس کر سکتی تھی کہ کئی گھنٹوں کے سفر کے بعد وہ بھی ہشاش بشاش لگ رہا تھا۔ وہ خوش تھا۔ اور یہ صاف دکھتا تھا۔ زریں نے اس شاندار مرد کو نظر بھر کر دیکھا۔

”آخر تو تم نے ملتان دکھانے کی بھی نہیں کی۔ میں وہاں کبھی نہیں گئی۔“ مقبرے کے وسیع احاطے میں چہل قدمی کرتے لوگوں پر ایک طائرانہ نظر ڈال کر زریں نے جواب دیا تھا۔ دونوں اندر داخل ہو گئے تھے۔

”میں تمہارے پاس ہوں..... یہ کافی نہیں۔ ملتان میں تمہیں کیا نظر آ رہا ہے؟“

”یہی بات میں.....“ وہ تیزی سے مڑ کر برجستگی میں جواب دیتی رہی..... ٹھٹکی..... اپنے حاضر جوابی کے مظاہرے پر رخصت زدہ ہو گئی تھی۔ لقمان حیدر اس کی بات سمجھ کر بدقت نہی لیوں میں دبایا تھا۔ اس ضبط پر زریں اسے بنا دیکھے اس کے چہرے پر پھیلی سحر کی کتا سکتی تھی۔

احاطہ پارکر کے دونوں سنگ مرمر کے تختوں کے نیچے ابدی نیند سونے نور الدین جہانگیر کے لیے دیر تک دعا کرتے رہے۔ واپس احاطے میں آنے تک زریں نے لقمان کو مکمل طور پر سنجیدہ پایا تھا۔ ”تمہیں کسی نے اس پر پوزل پر پیرا اڑ تو نہیں کیا زریں؟“ دونوں ڈھلتے دن کی روشنی میں سفید گلابوں کی کھاری کے پاس بیٹھ گئے تھے۔ زریں کو ایک دم لقمان کی اچانک لاہور آمد کی وجہ سمجھ میں آ گئی تھی۔

”نہیں لقمان..... یہ سراسر میرا ذاتی فیصلہ ہے.....“ وہ اسے بغور دیکھ رہا تھا۔ اسے انھن سی محسوس ہوئی۔

”تمہارے رویے سے لگتا تو نہیں تھا.....“ اس نے بات کو مزاح کا رنگ دینے کے لیے مسکرا کر دکھایا۔

”رویے بدلنے کے لیے ہی ہوتے ہیں لقمان اور انسان درست وقت پر درست فیصلہ کر لے، یہ بڑی بات ہوتی ہے۔“ وہ پھول توڑنے لگی۔ دھوپ کی ہلکی ہلکی پیش سے وہ مرجھائے سے تھے۔

”ہوں..... میں کہوں کہ میری محبت نے تمہارا دل بدل دیا؟“ وہ سوچ سوچ کر بول رہا تھا۔ گویا زریں سے کچھ اگلوانا مقصود تھا۔ زریں نے پھول کی پہلی پتی نوچی۔

”پاپر لقمان..... ہماری گفتگو میں اس لفظ کو شامل مت کیا کرو۔“ اس نے فوراً ٹوک دیا تھا۔ یوں جیسے چائے میں ایال سا آ گیا ہو۔ پھول کی پتیاں تیزی سے بکھرنے لگیں۔

”کیوں..... تم اس لفظ کی سچائی سے انکار نہیں کر سکتیں۔“ اس نے تنبیہ کی۔

”مجھے اس جذبے کی حقیقت پر ذرا بھی یقین نہیں۔“ وہ غصے کا شکار ہو، لہجے میں حلق کڑوا کر بولی تھی۔

”تم اس قدر تلخ کیوں ہو زریں! بتادو۔“ وہ ٹھنڈے ٹھارے لہجے میں گویا ہوا۔ ہلکی ہلکی ہوا

پودوں کو جھولا جھلانے لگی۔

”انسان مٹھاس اور کڑواہٹ کا مجموعہ ہے۔ ہر وقت کی مٹھاس بھی زہر لگنے لگتی ہے۔ تمہارا سوال بے معنی ہے۔“ اب وہ سپاٹ لگنے لگی تھی۔ لقمان حیدر گہری سانس بھر کر رہ گیا۔ اس لڑکی کو کھولنا بے حد کھن تھا۔

”تم انکار کر دو زری..... جہاں محبت نہ ہو وہاں خوشی نہیں آتی۔“

”میں بے حد خوش ہوں.....“ وہ یوں مسکرائی جیسے کہتی ہو۔ ”یہ دیکھو“ لقمان ناچا جتے ہوئے بھی ہنس دیا۔

”بہر حال میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا..... تم نے انتظار کرنے کو کہا..... میں کر سکتا تھا۔ دو ماہ نہیں، دو سال..... تمہارا جو فیصلہ ہوتا۔ چاہے میرے مخالف..... میں تمہارے ساتھ کھڑا رہتا۔“ وہ یقین کے ساتھ بول رہا تھا۔ زریں کو وہ اچھا لگا۔ لقمان حیدر بے حد اچھا..... بال روڈ کے جھوم میں گھومتے، زریں کو نظروں سے اوجھل ہوتے فتنے پر شہریار کا گمان کڑوا اب پہنچ کر قدم بڑھاتے ہوئے اس نے پیچھے مڑ کر دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی!

اور پھر زریں کو مایوں بٹھا دیا گیا۔ وہ ہر چیز سے غافل ہو گئی۔ لقمان سے بات کرنا بھی اس لیے بند ہو گیا تھا کہ اس کے بعد اس کا موبائل کہاں بڑا رہ گیا۔ اس نے خود بھی یاد رکھنے کی کوشش نہیں کی تھی!

☆☆☆

زرد سورج کی البیلی کرئیں ”میٹرو شاپنگ مال“ کی گلاس وال سے منعکس ہو کر آنکھوں کو حیرہ کرتی چمک پیدا کر رہی تھیں۔ شاہ خاور کی باسی کزنوں میں میٹرو کی عمارت پوری محنت سے کھڑی دیکھنے والوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کر داری تھی۔ اندر نیچے سے اوپر منزل تک معمول کا ریش نظر آرہا تھا۔ دن کی روشنی میں اندر چلتے برقی نقشے سپیدی پھیلانے میں کامیاب نظر آتے تھے۔ ایسے میں وہ ہاتھوں میں چند شاپنگ بیگز لیے اوپر سے چلتی ہوئی

اڑی تھی۔ وہ اپنی شاپنگ مکمل کر چکی تھی ادب اپنی وندو شاپنگ کرتے ہوئے اس کا رخ نیچے کی جانب تھا۔ شاپنگ ہمیشہ اس کا بہت وقت لیتی تھی۔ گہری سانس لے کر وہ رکی۔ سامنے برقی سیڑھیاں تھیں جو بھتی ہوئی نیچے کو جاتی تھیں۔ وہ قدم بڑھا کر آخری سیڑھی پر کھڑی ہو گئی اور نیچے پہنچنے کا انتظار کرنے لگی۔ ارد گرد کا جائزہ لیتے ہوئے وہ دیکھ سکتی تھی کہ میٹرو میں گہما گہما بڑھ رہی ہے۔

پہلی سیڑھی پر پہنچ کر وہ اتر کر دو قدم ہی مزید ہلکی کراہٹ پر نظر بھر گئی۔

”ہائے نیا۔“ کسی مانوس آواز پر وہ چونک کر مڑی۔ آواز کے تعاقب میں نظر دوڑانے پر وہ اپنے مخاطب پر پہلی نظر ڈالتے ہی اسے اپنی نظروں کا فریب بھی۔ وہ فریب دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا اس کے قریب آتا گیا۔

”کیسی ہو نیا.....؟“ وہ دھیما سا مسکرا کر بولا۔

نیا کسی خواب سے جاگ گئی۔ ”شہر..... یار تم..... مانی گاڈ..... یہ تم ہو؟“ وہ بے یقینی سے اسی قدر کہہ سکی۔ شہریار نیازی ہنوز مسکرا رہا تھا۔ اگلے دو منٹ بعد وہ میٹرو میں ”سوفٹ ڈرنک کارنز“ کے اندر آئے سامنے بیٹھے تھے۔ اور بے یقین نیا اسی حیرت کا اظہار کر رہی تھی! ”تمہاری اچانک غائب ہونے کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی تھی شہریار..... میرے گمان میں کہیں نہیں تھا کہ ہمارا اب بھی ٹکراؤ بھی ہوگا۔ تم اس سارے عرصے میں کہاں تھے؟“ وہ اس تصادم پر حیرت دہانی۔ جس سے پوچھ رہی تھی۔ وہ سننے پر اکتفا کر رہا تھا۔

”اسی زمین پر تھا نیا۔“ وہ ٹالنے کی غرض سے بولا۔ ”اسے چھوڑو۔ تم کہو، آج کل کیا کر رہی ہو۔ شاپنگ ہو رہی تھی؟“ گفتگو کا رخ بدلنے پر وہ اس ٹھنڈی سانس بھری۔ یہ شہریار نیازی بہت اچھی مالک رہا تھا۔

”میں فارغ ہوں آج کل..... اور ہاں زریار کی غرض سے آئی تھی۔ زریں کی شادی کے

لیے گفت بھی خریدنا تھا..... اس امید پر خریدا ہے کہ اسے پسند آئے گا۔ نادانگی میں زریں کا ذکر کرتے آخر میں وہ کچھ جتنی نظروں سے دیکھ کر چپ ہوئی تھی۔ شہریار کے چہرے پر استہرا ایسے مسکراہٹ پھیلی۔

”وہ شادی کر رہی ہے.....؟“ ”تمہیں اس خبر سے خوش ہونا چاہیے۔ کہ وہ اپنی زندگی میں چھپلی باتیں بھلا دینے کی ہمت رکھتی ہے، تم نے بہت غلط کیا اس کے ساتھ۔“ اس کے طنز پر وہ ناگواری کا احساس بمشکل دبا کر بولی تھی۔ شہریار نیازی کی بھنوسیں تن لگیں۔

”ہم سمجھتے تھے تم دونوں شادی کرو گے ایک دوسرے سے، مگر مجھے اس دھوکے کی امید نہیں تھی۔“ اب کے اس کے لہجے میں غم و غصہ تھا۔

”نیا دھوکا میں نے دیا نہیں..... کھایا ہے زریں ایک جھوٹی اور مکار لڑکی ہے۔“

”شٹ اپ شہریار..... میں فضول بکواس نہیں سنوں گی۔ زبان پر کنٹرول رکھو۔“ ضبط کو کہہ کر سرخ ہوتے ہوئے سختی سے بولی تھی۔ شہریار کہنیوں کے بل میز پر آگے کو جھکا۔

”تمہیں سننا ہوگا نیا! تم وہی بات جانتی ہو جو تمہیں زریں کے آنسوؤں نے سنائی ہوئی بلکہ نہیں وہ کیوں رونے لگی۔ شاید آنسوؤں یا غصے سے۔ اصل دھوکا تو میں نے کھایا، زریں نکاح شدہ ہو کر مجھ سے محبت کا کھیل کھیلتی رہی۔ کس لیے؟ صرف دولت، پیسوں کے لیے، یونی میں دکھانے کے لیے شہریار نیازی صرف اسے چاہتا ہے۔ کیا اسے میرے جذبات کی پروا نہیں تھی۔ کیوں کرتی رہی وہ ایسا۔ اب بتاؤ مجھے؟“

جذبات میں بولتے شہریار نیازی نے اس کی سماعتوں میں پھلکا سیسہ انڈیل دیا..... وہ جھونکی سی رہ گئی تھی۔

”یہ..... یہ جھوٹ ہے..... الزام ہے شہری!“ وہ حقیقتاً سنائے میں رہ گئی تھی۔ شہریار کی آنکھوں میں ایسی نفرت، سمجھ سے بالاتر تھی۔ ”یہ حقیقت ہے

نیا..... تمہیں شک و دیکھ کر لگتا ہے تم بھی انجان ہو اس بات سے۔“ وہ نظریں جھکا کر نرمی سے گویا ہوا۔
 ”نہیں نہیں شہر یار!“ وہ چکر اسی گئی۔ ”میں اسے اچھی طرح جانتی ہوں۔ کئی بار اس کے گھر بھی جا چکی ہوں۔ تم اس کے کردار پر انکی اٹھا کر گناہ مت کرو۔ وہ ایسی ہرگز نہیں ہے۔ تمہارے دماغ میں یہ خناس کس نے بھرا۔ اود اللہ! شیری اس کا کوئی نکاح نہیں ہوا۔ اس کا جہاں رشتہ ہوا وہ ملتان کے رہنے والے ہیں اور نکاح بارات والے دن ہی ہوگا۔
 زریں مایوں میں بیٹھی ہے اور کل مہندی ہے۔ باخدا اس نے بہت کوشش کی تم سے رابطہ کرنے۔ تمہارے گھر تک گئی۔ تمہاری ماں سے ملی۔ میں اس کے دکھ کی گواہ ہوں..... تمہیں ایسا کہہ کر اس کی تو جین نہیں کرنی چاہیے۔ تم سے مایوس ہو کر ہی اس نے اس رشتے کے لیے ہائی بھری۔ اور تم..... اف اللہ!“
 نیا نے چکراتے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ شہر یار! مجھن بھری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔
 ”یہ کیسی پیچیدہ کہانی سنارہی ہو نیا..... مجھے یہ باتیں ایسے شخص سے پتا چلی ہیں جس پر اعتبار نہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تمہیں بھی غلطی نہیں ہوئی ہے۔ زریں نے اپنی سن پسند کہانی سنائی ہے تمہیں۔“

”فارگا ڈیک شہر یار! غلط فہمی تمہیں ہوئی ہے، مجھے بتاؤ کس نے یہ غلط بیانی کی تم سے۔ نام بتاؤ اس شخص کا۔“

”میں بتاتا ہوں نیا! شاید پھر تمہاری آنکھوں سے پردہ ہٹ جائے۔“ وہ لمبے بھر کو چپ ہوا۔ ”مجھے یہ سب غیور نے بتایا۔ غیور سداں نے..... کہو کیا کہتی ہو؟“ میرٹو مال اپنے تین منزلہ قد سمیت نایاب کے سر پر جا کر اٹھا۔ اس کے بلے میں دب کر وہ کچھ بولنے کے قابل نہیں رہی تھی۔

☆☆☆

یونیورسٹی سرنگی بالوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ وہ وہاں الوداعی پارٹی اٹینڈ کرنے جمع ہوئے تھے.....

یہ یونی کلاسیٹ ڈے تھا اور وہ دونوں لیاقت ہال کی راہداری میں کھڑے کوک کی رہے تھے.....
 اس دن صبح سے ہی خمر ڈار کی کسی لڑکی کی کہانی زبان زو عام تھی۔ وہ لڑکی یونی کے ہی کے کسی لڑکے سے چاہت میں مبتلا رہی تھی اور اب اپنی محبت پر کسی ایسے کبیر شخص کو فوجیت دے کر اس سے شادی کر رہی تھی۔ ایک عرصہ اس لڑکی کی محبت کا دم بھرتی وہ لڑکی اب اس کی بات بھی نہیں سن رہی تھی۔ غیور سداں نے سارا قصہ دہراتے ہوئے کہا تھا۔

”کچھ لڑکیاں ہوتی ہیں ایسی..... جو محبت نہیں جسٹ ٹائم پاس چاہتی ہیں۔ نہ ہر لگتی ہیں مجھے ایسی لڑکیاں جو خود سے بھی تخلص نہ ہوں.....“ اپنے سیاہ بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ ناگواری سے بولا تھا۔ شہر یار متفق ہوا۔

”تم صحیح کہہ رہے ہو.....“
 ”نبی بات لڑکا ہو یا لڑکی مجھے سخت ناگوار گزرتی ہے۔ جو جذبات سے یوں کھیلے ہیں جیسے دلچسپ گیم سے کھیل رہے ہوں۔ کسی پزل باکس سے..... میں زری کو بھی..... تیز تیز بولتے زبان سے نکلے غیر ارادی جملے پر اس نے زبان فوراً دانتوں میں دبائی۔ ”زریں کا کیا ذکر.....“ وہ بری طرح چونکا۔

”نہیں کچھ نہیں..... سوری۔“ غیور کے نظریں چرانے پر شہر یار کے کسی جذبے کو ہوا ملی تھی۔
 ”تم کیا چھپا رہے ہو؟“

”چھوڑو یار! یونی زبان سے پھسلا۔“
 ”غیور مجھے بتاؤ۔ تم ایسے کیوں رہی ایکٹ کر رہے ہو؟“ وہ تنبیہ کی سے کچھ ڈپٹ کر بولا تھا۔
 ”غیور کے چہرے پر بے چارگی ابھرائی۔
 ”کیونکہ زری بھی ایسی ہے..... وہ آل ریڈی نکاح شدہ ہے۔“

”واٹ؟“ شہر یار کے گرد سے دیواریں سرک گئیں..... کوک ہاتھ سے چھوٹ کر کرچیوں میں بٹ گئی تھی۔

”ایم سوری شیری! میں تمہیں بتانے کی کبھی شل نہ کرتا مگر شاید یہی بہتر ہے۔“ زریں کا نکاح مارے دور کے کزن لقمان سے بہت پہلے کا ہو چکا ہے۔ وہ تمہارے ساتھ سیر نہیں، بس تمہارا مذاق اڑانا پسند کرتی ہے۔ تم دولت مند ہو پینڈ ہو، سب بڑھ کر اس کے ساتھ کے خواہاں ہو، تو وہ اس نام کو برا نہیں سمجھتی..... اور۔“

”شٹ اپ غیور! اپنا بے ہودہ مذاق مجھ پر مت آزماؤ، تمہارا سر بھاڑ دوں گا۔“ وہ غصے سے ہایا۔ دیواریں خاموش تھیں۔ آواز گونجتی رہ گئی۔
 اور کے چہرے پر گہرے تاسف کے سائے تھے۔
 ”اوکے۔“ تو بتاؤ وہ تمہارے ساتھ نہیں آتی ہائی کیوں نہیں..... کبھی تمہارے گھر بھی نہیں گئی تھی۔
 ”یوں تمہارا ذکر گھر میں نہیں کرتی، تمہیں گھر کا ایڈریس مجھ سے نہیں معلوم، تمہیں شادی میں انوائٹ نہیں کیا۔ کیوں؟ کیونکہ وہ تم سے گریز کرتی ہے۔ اس گریز کی وجہ اس کا نکاح ہے جو اسے دل ہی دل میں ایسا کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ ویٹ!“

صدے میں شہر یار کو ڈال کر وہ ہاتھ میں پکڑے ”بائل پر انکی چلا رہا تھا۔ شہر یار کا چہرہ شل تھا۔
 ”یہ دیکھو..... دیکھو دونوں کی قدر خوش ہیں۔ نکاح کی تصاویر، نکاح کے بعد کی گئیں۔“ موبائل شہر یار کے سامنے تھا۔ شرارہ سوٹ میں دلہن بنی ہیں۔ اور ساتھ میں بیٹھا وہ (کرب سے چہرہ بکرا) دونوں مسکرا رہے تھے اور بھی کئی پوز فلیش اس کی زد میں آئے ہوں گے۔ دونوں کی ٹراہٹ سے موبائل کی اسکرین روشن تھی اور شہر یار دنیا تار یک ہو گئی تھی۔ غم و غصہ، شدید صدمہ، زور دار دھچکا، زمین پر زلزلہ، جیسی ملی جلی کیفیتوں کا شکار تھا شہر یار نیازی!

”تم نے پوچھا کیوں نہیں کہ وہ کیوں رہا ہے تمہیں۔ آخر کس مہر دوزی سے؟“ بت بتی نیا۔ خود کو جرکت دے کر زندہ ہونے کا احساس آیا تھا۔ زندگی میں پہلی بار وہ کسی سنگین انکشاف کا

شکار ہو رہی تھی۔

”اس نے کہا اسے لقمان بہت عزیز ہے۔“ وہ نہیں چاہتا، اس کی امانت میں کوئی خیانت ہو۔ مجھے اس کی زندگی سے نکل جانا چاہیے۔“ شہر یار شکست خوردہ سا بول رہا تھا۔ سنا ہوا چہرہ بچہ سناوے کا نماز تھا۔ نیا کو اس پر بے تحاشا ترس آیا۔

”تمہیں زریں سے باز پرس کرنی چاہیے تھی۔“
 ”اسی نے مجھے روکا۔ وہ زریں کا تماشا نہیں بنانے دینا چاہتا تھا اور..... اور میں اس کے پاس گیا بھی، وہ واقعی لقمان نامی شخص سے محو گفتگو تھی۔ بس میں بری طرح سے ٹوٹا تھا اور بری طرح بددل ہوا، مجھے میری جلد بازی نے بہت تکلیف پہنچائی نیا۔ تمہیں اندازہ بھی نہیں۔“ نیا اس کے چہرے پر نرم ازیت دیکھ سکتی تھی، لیکن اس کے بس میں کچھ بھی نہیں تھا۔ کسی کے بھی بس میں کچھ نہیں ہوتا اس نے تھک کر سوچا۔

”پلیز نیا۔ مجھے زریں سے ملو۔ وہ میں سب کچھ ٹھیک کر لوں گا۔ پلیز میپ می۔ وہ مان جائے گی۔“ وہ منت سے بولا۔

”یہ ممکن نہیں، شہر یار کی رخصتی قریب ہے اور اب قیامت تک ایسا نہیں ہو سکے گا کہ تم اسے پاسکو۔ اس کی نئی زندگی میں بدل مت پیدا کرو شیری! تمہارا کوئی بھی حد سے بڑھا قدم اسے عین وقت پر سب کی نظروں میں گرانے کا سبب بن سکتا ہے۔ سو جو چل رہا ہے چلے دو۔ اسے آگے بڑھنے دو۔“ وہ اپنی بات کہہ کر اٹھنے کے پر توڑ رہی تھی۔

”پلیز نیا نہیں۔ تمہیں زریں کی قسم..... بس ایک بار مجھے اس سے بات کرنے دو۔ پھر خواہ مجھے ٹھکرائی دے..... اس کی عزت کا مجھے خیال ہے۔“
 ”نمبر لکھ لو شہر یار! اس سے بڑھ کر میں کچھ نہیں کر پاؤں گی۔ ایم ریٹی سوری۔“ شہر یار نے نیا کو قطعیت سے کہتے سنا اور بے بس نظروں سے اسے دیکھ گیا۔ وہ جو ایک جذباتی شخص تھا۔
 اور جذبات بھی..... اگر صبح دھارے پر نہیں تو عین خوبی..... اور اگر غلط رخ چلیں تو ایک خطرناک

خامی کا روپ لے لیتے ہیں۔ اعتبار کے کچے شخص کی مثال اس پرندے کے جیسی ہے۔ جیسے عمر بھر نہ سایہ دار اشجار کی ٹھنڈک میسر آتی ہے..... نہ زمین کا سکون..... مقدر بخیر تہا ہے تو بس اہل چلی زمین پر بنوں کا ٹھکانہ..... اور دور درواز تک ویرانہ.....!!!

”اچھا کرنا ہوگی۔“ زریں نے دھیر سے کہا۔
 ”اچھا جیسے میں جانتی نہیں، کرنا کی آڑ میں کون ہوگی۔“ وہ دہی بی بی سے بولیں۔ زریں جھینپ سی گئی۔

وہ دم سادھے ٹوٹا پھوٹا پڑھ رہی تھی۔ ہاتھ لرز رہے تھے۔ نیلی روشنی اس کا چہرہ سن کر رہی تھی۔ انگلیوں میں نمکین ہانسیوں نے جمع ہونا شروع کر دیا تھا۔ موبائل چھوٹ گیا تھا۔ جب اس نے سنا..... ابلجھا..... وہی نمبر دوبارہ جھنگا رہا تھا۔ وہ چلا کر کہنا پاتا تھی۔ بکو اس بند کر دو۔ مجھ سے دور ہو جاؤ، اس نے اتنا تھوڑا سا فون اٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ ورنہ دیوار پر مار کر چور چور کر دے..... اب آسمان حیدر چمکنے لگا تھا..... اس کلبے جان جسم ڈھیر کرنے پر بھی آمادہ نہیں تھا۔

غیرور اس سے اس کے کمرے میں ہوتا ہے۔ وہ اندر داخل ہوگئی۔ ٹھک سے لی وی آف کر دیا۔ قیوم کمرے سے باہر جاؤ۔“

دہشتیوں سے پیش لپک رہی تھی۔

”میرے پاس وجہ نہیں۔“

”کوئی کام بے وجہ نہیں کیا جاتا۔“

”ٹھیک کہہ رہی ہو۔“ وہ اچانک کرختگی سے بولا تھا۔ ”میں نے کیا ہے سب کچھ۔ بتاؤ کیا کرو گی تم۔ یہ سب تمہارا اپنا کیا دھرا ہے۔“ وہ آواز نیچے رکھتے ہوئے غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ زریں کے صبر کا گراف آہستہ سے گھٹنے لگا۔

”مجھ پر الگ بگدیں اٹھانا۔۔۔۔۔۔ پہلے تمہارا چہرہ تو پہچان لوں میں۔۔۔۔۔۔ کس منفی جذبے نے تمہیں ایسا کرنے پر اکسایا۔ غیور ایسا تھے کس مہربانی سے دیا تم نے۔۔۔۔۔۔ اس کی آواز بھٹ گئی۔ وہ متاثر ہوئے بغیر گھورنے پر اکتفا کر رہا تھا۔۔۔۔۔۔!

”کچک سے زری! جیجن سے۔ تم نے میری محبت جھین لی تھی۔ میں تمہاری محبت کیسے چپ چاپ پھولتے دکھ سکتا تھا۔ جو تم نے کیا تھا یاں زری اس کے مقابلے میں تو یہ نہایت تھیں ہی کوشش ہے۔ جو ایک جھٹکے میں کامیاب ہو گئی۔“ اسے بازوؤں سے پکڑ کر جھوڑتے ہوئے اس کا چہرہ ہزار زادیوں سے بگڑ رہا تھا۔ زریں کو تکلیف ہوئی۔۔۔۔۔۔ بہت ہوئی۔ وہ ایسے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ ذرا نہیں لگ رہا تھا۔

”کون سی محبت۔۔۔۔۔۔ کس کی بات کر رہے ہو؟“ وہ صرف غیور کو جاننا چاہ رہی تھی۔ اس لڑکے کو جسے بڑے چاؤ سے بھائی مانتی تھی۔۔۔۔۔۔ باقی باتیں بھاڑ میں جائیں۔۔۔۔۔۔ وہ اس نفرت کا سبب تو جانے۔۔۔۔۔۔ دکھ شہر یار نیازی کا نہیں تھا۔ فطری نہیں تھا۔ وہ اپنا مقام کھو چکا تھا۔

”واؤ۔۔۔۔۔۔ انسان کی سب سے بری عادت یہی ہے زری کہ وہ کچھ کر کے ایسے بھلا کر آگے بڑھ جاتا ہے جیسے پاکیزہ باتوں سے خود کو دھوا ہوا ہو۔ اب کچھ اس کی طرف پلٹ کر نہیں آئے گا۔ مگر مخالف نہیں بھولتا زری۔۔۔۔۔۔ کبھی چچی نہیں بھولتا۔۔۔۔۔۔ تمہیں دکھ ہے؟ یقین کرو مجھے بھی بہت ہے۔۔۔۔۔۔ جو محبت تم کرتی ہو ناں، وہی میں نے کی تھی۔۔۔۔۔۔ دس سال یا

اتنے ہی عمر کے کم و بیش پہلے۔۔۔۔۔۔ میں نے تم سے کون بدتمیزی نہیں کی تھی۔ تم نے کیا کیا۔۔۔۔۔۔ پورے گھر میں میرا تماشا بنادیا۔۔۔۔۔۔ اس شام میری عزت کتنی کتنی مجروح ہوئی تھی۔ تمہیں اس کا اندازہ بھی نہیں ہو سکتا۔ جو عمر اس وقت میری تھی۔ اس عمر میں کوئی معمولی سی بات بھی کتنی انسٹلٹ فیل کر دیتی ہے۔ کاش تمہیں علم ہوتا۔ اس شام تمہاری واہ واہ ہوئی اور مجھے کتنی لعنت ملا مت کی گئی۔ مجھے وہ لہجہ ابھی تک نہیں بھولتے۔۔۔۔۔۔ تو میں نے بھی تم سے تمہاری محبت جھین لی۔۔۔۔۔۔ تمہیں شہر یار کے کھونے کا اس قدر دکھ ہے۔ میرا دکھ تم سے بڑا تھا زریں کہ اس شام کے بعد بھی بار بار مجھے اس واقعے کی یاد دلا کر چھیڑا جاتا رہا تھا۔ کیوں زریں کیا میں اسی سزا کا حق دار تھا۔ ہاں تو تمہارے ساتھ بھی ٹھیک ہوا ہے۔“ وہ لہجے میں پھنکارسا کر اسے جیجن کی کوئی بھولی ہنسی یاد دلا رہا تھا۔ لیکن کمرے میں جیسے صور اسرافیل پھونک دیا گیا تھا۔ زریں ساکت تھی۔۔۔۔۔۔ قیامت تھی۔۔۔۔۔۔ گنگ تھی۔۔۔۔۔۔ کیا اتنی سی وجہ۔۔۔۔۔۔ کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ اس کے ارد گرد دھوئیں کے گبولے اٹھ رہے تھے۔

”غیور۔۔۔۔۔۔ یہ بات۔۔۔۔۔۔ کیا اتنی سی؟“

”شہر یار کی بات بھی اتنی سی ہے۔۔۔۔۔۔“

”بھاڑ میں گیا شہر یار۔۔۔۔۔۔“ وہ حلق پھاڑ کر چلائی تھی۔ پوری شدت سے۔۔۔۔۔۔ گلے میں دراڑیں پڑیں۔۔۔۔۔۔ میں آگ میں جھونک چکی ہوں شہر یار نیازی اور اس کے جھوٹی محبت کو۔۔۔۔۔۔ میں اپنے بھائی کی بات کر رہی ہوں۔۔۔۔۔۔ اس غیور کی بات کر رہی ہوں جسے میں نے کھودیا۔ دل میں اتنی حقارت رکھنے کے باوجود تم مجھے کیسے برداشت کرتے ہو۔ تم مجھ نہ کہہ سکتے کہ زریں تم محبت کا دکھ گلے لگا لو۔۔۔۔۔۔ تم نے میری پیچھے وار کیا۔۔۔۔۔۔ میرا تماشا دیکھتے رہے۔۔۔۔۔۔ اس کوئی آسمان ٹوٹ پڑے تھے۔ اس میں اتنی ہمت رہی کہ ٹانگوں پر کھڑی رہ سکے۔

”وہ تماشا تم نے بھی دیکھا۔۔۔۔۔۔“ وہ نظروں

نہا رہا تھا۔

”وہ تمہاری محبت نہیں تھی غیور۔۔۔۔۔۔“ زریں نے اس کا گریبان پکڑ کر جھٹکا۔۔۔۔۔۔ اگلے پل وہ پاٹ پھوٹ کر زور دہی گئی۔

”میں نے تمہاری بھلائی کے لیے ایسا کیا تھا۔۔۔۔۔۔ نہیں اس سب سے دور رکھنے کے لیے کہ تمہاری اوج کے دھارے غلط سمت بہہ رہے تھے۔ تمہاری برائیاں چکروں میں پڑنے کی نہیں تھی۔ تم۔۔۔۔۔۔“ غم کی شدت سے وہ کھکھار رہی تھی۔ وہ کسی ان کی جو رخصتی سے ایک رات پہلے تک رونے میں مشغول رہی تھی۔ غیور اسے دیکھنے سے اجتناب کر رہا تھا۔ کمرے میں اسرار سا پھیلا ہوا تھا۔ بھید بھری لمبیاں ٹوٹے یقین کا دکھ روتی، سارے میں گونج رہی تھیں۔

”زریں۔۔۔۔۔۔ یہ ہو چکا ہے اور۔۔۔۔۔۔“

”اور یہ نہیں ہونا چاہیے تھا غیور! مجھے علم نہیں ہوتا چاہیے تھا۔ انسان کے اندر بہت کڑواہٹ ہے، جسے وہ خود اپنی محبت سے محاس میں بدلتا ہے۔ اپنی کو چوٹ پہنچانے سے پہلے سوچ لینا چاہیے کہ یہ حقیقت آشکار ہوگی تب بھی رشتے نہیں ٹوٹیں گے۔ خونی رشتوں کا عمر بھر کا ساتھ ہوتا ہے۔ کیا ہم اس کے بعد بھی انہیں منہ دکھانے کے قابل رہ جائیں گے؟ کیا پھر ان پر اپنا حق جتا یائیں گے؟ تمہارے دل کی کک ختم ہوئی، جیجن نکل گئی۔ کسی اور دل میں تو پھانس اٹک گئی ناں۔۔۔۔۔۔ بتاؤ کیا وہ اسے نکالنے کے لیے نئے سرے سے انتقام کے لیے یار ہو۔۔۔۔۔۔؟“

وہ آنکھیں صاف کرتے ہوئے پلکیں جھپک رہی تھی۔ جن کی باڑ پر جلن بڑھتی جا رہی تھی۔

شکر گزار ہوں، کہ اس کام کا وسیلہ تم بن گئے۔۔۔۔۔۔ تم نے کہا تھا ناں لقمان حیدر اچھا لڑکا ہے۔۔۔۔۔۔ آج میں کہتی ہوں کہ وہ ایک بہترین شخص ہے۔ میری ماں کا حسن انتخاب ہے۔“

وہ زخمی سا ہنس کر آنکھوں کنارے رگڑ رہی تھی۔ شاید اندر خشک مہندی چلی گئی تھی۔

”مجھے آج کے لیے برداشت کر لو غیور۔۔۔۔۔۔ تمہارے بہت احسان ہیں مجھ پر۔۔۔۔۔۔ میں یاد رکھوں گی کہ میرا کوئی بھائی نہیں۔۔۔۔۔۔ اللہ نے ازل سے مجھے اس رشتے سے محروم رکھ چھوڑا ہے۔ تم ایک اچھے بھائی نہیں، ورنہ میرا بھائی کبھی بہن پر وار نہ کرتا۔ کیا اپنی بہن کے عین دل پر وار کرو گے؟ نہیں۔۔۔۔۔۔ اس لیے کہ وہ ”بہن“ ہوگی میں ”بہن نہیں!“

غیور نے تڑپ کر اسے دیکھا تھا۔ جو سبز آنکھ سر پر جماتی بھاگتی ہوئی واپس جا رہی تھی۔ وہ وہیں کا وہیں کھڑا رہ گیا تھا۔ زریں صبح کہہ رہی تھی۔ ایک جھوٹی سی کک نکالنے کے لیے اس نے دوسرے دل میں اپنے لیے دراڑ ڈال دی۔ اس شام کی طرح آج بھی زریں نے اس کے غلط فعل پر اسے طمانچہ جڑ دیا تھا۔ وہ باہر نکلنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

ریاداری میں تیزی سے گزر کر اپنے کمرے میں جانی زریں سوچ رہی تھی۔

فصو روار۔۔۔۔۔۔ غیور!

سزاوار۔۔۔۔۔۔ زریں!

بے قصور۔۔۔۔۔۔ شہر یار!

کمرے کا دروازہ بند کرتے وہ ہانپ رہی تھی۔

موبائل ہنوز زمین پر گرا سابقہ حالت میں پڑا تھا۔ وہ آگے بڑھ رہی تھی ”بے قصور شہر یار۔۔۔۔۔۔ مظلوم ہونہ!“ اس نے موبائل کا بیک کور کھولا۔ ”لقمان حیدر۔۔۔۔۔۔ محبتوں سے گندھا شخص۔۔۔۔۔۔ قابل اعتبار۔۔۔۔۔۔ جھوٹوں کا امین اور شہر یار نیازی۔“ فون کی بیٹری نکالی، سم چیکٹ سے آزادی اور آنکھوں کے سامنے کی۔ ”مجھے حق نہیں کہ تمہیں لقمان بے فوقیت دوں، تم پہ بند میرے دل کے کواڑ لقمان کی دستک پر

تبدیلی پروی



بن جاتی ہے۔“

”یہ محبت مجازی خدا سے ہو تو ثواب بھی بن جاتی ہے۔“

جنگلوں نے زریں کے جواب پر تالی بجا دی تھی۔ وہ جاں نثار نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ زریں شرمیلیں سکراہٹ سے کھلنے لگی۔

”تمہاری آنکھوں میں جنگلوں میں جھونکے ہیں مگر ان کی تعداد بڑھتی گئی تو تمہیں یہیں چھوڑ جاؤں گا گاڑی حرکت میں آئی۔“

”چھوڑ جاؤ گے.....؟“ خود یہیں رہ جاتی گے۔“ وہ پورے اعتماد سے بولی۔ لقمان کی مطمئن ہنسی کی پھوار نے اسے سرشار کر دیا تھا۔ وہ پرسکون تھی اور بے حد تھی۔ فاصلے پر کھڑا غیور سنان چورنگا ہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

اپنی کو اذیت دینے والے اصل میں اپنی بیانی کے دشمن ہوتے ہیں۔ پھر جس سے عمر بھر وہ کسی اور کو دیکھ سکتے ہیں۔ نہ بھی خود کو.....!!

اور آک کے پودے جیسے لوگ کانٹوں سے عاری، نرم و ملائم، لیکن آک کا زہر یلا دودھ انسانوں کی رگوں میں نفرت کا زہر بن کر دوڑتا ہے۔ یہ زہر کسی بھی قسم کا ہو۔ بھلے ذرا سی وجہ کا..... آپ کو اندھا کر سکتا ہے اور ساری کہانی اسی ایک بات کی تھی۔

وقت تلخ سے تلخ زہر بے اثر کر سکتا ہے۔ سوائے ایک زہر کے..... اور وہ ہے انسان کے اندر کا زہر، جسے اس کے علاوہ کوئی ختم نہیں کر سکتا۔ انسان کے اپنے ظرف سے اگر یہ اندر نہ ٹھہر سکے۔ تو زندگی میں بے تسکونیاں ٹھہری نہیں سکتیں.....

☆☆

کھلنے کے منتظر ہیں۔ تمہارے لیے کوئی روزن بھی باقی۔ کھلا نہیں رہ گیا۔“ دوا لقیوں میں دینی سم سلو میون میں اڑتی ہوئی ڈسٹ بن کے اندر جاگری تھی۔ ویسے ہی جیسے بھی شہر یار نیازی نے چھینکی ہوگی..... جیسے زریں کمال نے پھینک دی۔ ہر بوجھ سے وہ آج آزاد ہوئی تھی۔ کھڑکی میں جا کر چاند اسے دیکھ رہا تھا۔ اسے پڑھ رہا تھا۔ اس کی حالت یوں جیسے۔

کتابوں میں بی خوشبو کی مانند سانس ساکن تھی۔ اور جیسے.....

دل کے بند کواڑ کے پیچھے ساکت تھی۔

☆☆☆

رخصتی کے شور میں..... گیندے کے پھولوں کی خوشبو سارا ماحول معطر کر رہی تھی۔ سیاہ رات نے روشنیاں اوڑھ کر چاندنی پھیلا رکھی تھی ننھے ننھے جنگو ہوا کے تھہر پر سوار بخور قصان تھے..... بہنوں کا شہزادہ لقمان حیدر..... محفل کی پری زریں لقمان حیدر..... کوئی غیور کو لایا تھا۔

”بہن کو نیک دعاؤں کے حصار میں سفر پر روانہ کرو۔“ سعدیہ اور مامی ماموں بڑے مان سے کہہ رہے تھے۔ زریں نے آنسو تیری آنکھوں سے اس سے نظریں ملائیں۔ غیور کا رخ بستہ ہاتھ زریں کے کھر درے عروسی لباس والے کندھے پر ٹھہر گیا۔ آنچل سنبھلتی وہ گاڑی میں بیٹھی غیور ہٹ گیا۔ مہکاریں اڑاتا وجود اسے شرارت سے دیکھ رہا تھا۔

”رور ہی ہو؟“ معصومیت سے پوچھا گیا۔ ”خوشی ہے۔“ اس کی پھنسی پھنسی آواز بھیگی ہوئی تھی۔

”اسے اپنی محبت سمجھوں؟“ وہی چھڑتا فقرہ اور ایسی معصومیت زریں نے بلا میں لے لی چاہیں۔ ”سمجھ لو۔“

”کسی نے کہا تھا محبت غیر محرم سے ہو تو عذاب

شادی کی پہلی رات ہی وہ جان گئی تھی کہ کچھ ایسا ہے جو نازل نہیں ہے لیکن شرم و حیا نے اس کی زبان پر تالا لگا دیا تھا اور یہ تالا بے باکی و بے شرمی کی چابی سے ہی کھل سکتا تھا۔ وہ اپنے اندر اٹھتے و سوسوں کے سر چل چل کر تھک چکی تھی لیکن سوالوں کے ساتھ دوسرے تھے کہ ناگ بن کر اسے ڈستے ہی جا رہے تھے وہ اچھی طرح جان چکی تھی کہ خاموشی کے اس قفل کی چابی اسے نہ ملی تو یہ زہر اس کے رگ و پے میں پھیل کر اس کے سارے وجود کو نیلا کر دے گا۔ اسے خیال آیا کہ ہمارے ہاں عورت یہ چابیاں دل کی تجوری میں رکھ کر اوپر سے اک اور تالا لگا دیتی ہے اور وہ تالا ہوتا ہے مصلحت اور سمجھوتے کا تالا اس تالے کی بھی اک چابی کبھی ہوتی ہوگی لیکن زیادہ تر عورتیں یہ چابی جان بوجھ کر کہیں رکھ کے بھول جاتی ہیں۔

ورنہ تو گمشدہ چیز کے لیے ”انا للہ وانا الیہ راجعون“ پڑھو تو مل جاتی ہے مگر کوئی عورت اس چابی کے لیے یہ نہیں پڑھتی۔ زندگی کا سفر طے کرنے کے لیے..... مصلحت اور سمجھوتہ ہی تو عورت کا زار وادہ ہوتا ہے۔

☆☆☆☆

وہ یعنی کہ جاناں فرید خان..... قربان علی کی تیسری بیوی تھی۔ قربان علی چار جوان بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا پہلی شادی ماں بہنوں کی مرضی سے ہوئی اور بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ شادی کے دوسرے مہینے ہی سے بچے کی امید کیوں نہیں ہوئی؟ کی تکرار شروع ہو گئی تھی اور یہ تکرار ساس اور تندوں کی جانب سے تھی جن کے سارے ارمانوں کا مرکز قربان علی تھا۔ تیسرے مہینے بھی جب ڈرتے ڈرتے شرمندہ سی بھابھی نے ناامیدی کی خبر دے لفظوں میں سنا دی تو شہر کی سب سے بڑی گانا کا لو جھٹ کے چکر شروع ہو گئے۔ پہلی بار ڈاکٹر صبا نے اس شرمیلی سی کم عمر لڑکی سے جب یہ پوچھا کہ شادی کو کتنا عرصہ ہو گیا ہے؟ تب نظریں جھکا کر کنول نے بتایا کہ دو مہینے تو وہ چٹکیں۔

یہ پہلا کیس ہے بی بی کی شادی کو ابھی دو مہینے ہوئے اور سرسرا والوں کو تکلیف ہونے لگی۔ بچے کی۔ وہ خود گلاہی کے انداز میں بولیں۔

انہوں نے اسے لینے کا اشارہ کیا اور اس کے چپک اپ کے بعد حیرت زدہ انداز میں اسے دیکھنے لگیں۔

”تم تو شادی شدہ نہیں ہو؟“ وہ مشکوک سی اسے دیکھ رہی تھیں۔ کنول گھبرا کر رونے لگی۔ ”مجھے بتاؤ سب سچ سچ، دیکھو تم میری بیٹی جیسی ہو اور ڈاکٹر سے کچھ نہیں چھپاتے کیونکہ ان سے کچھ چھپانا یا غلط بیانی اپنا نقصان کراتی ہے۔“ ڈاکٹر صبا کو اس پر رحم آ رہا تھا اسے لیے سمجھا رہی تھیں ورنہ ان کا ایک ایک منٹ بکاتا تھا اور اس وقت بھی خواتین کی ایک بڑی تعداد انتظار گاہ میں اپنی باری کی منتظر بیٹھی تھیں۔

”اماں کہتی تھیں اچھی بیویاں اپنے شوہروں کی عزت کا خیال اپنی زندگی سے بھی بڑھ کر رکھتی ہیں۔“ وہ ڈرتے ڈرتے مصوویت سے کہہ رہی تھی۔ ڈاکٹر صبا نے اپنا سر پکڑ لیا۔

”بیٹی! بلاؤ اپنی ساس کو کہ میں ان کو سمجھاؤں، جانے کیوں یہ مائیں بیٹوں کی باری میں کم عقل اور نا سمجھ بن جاتی ہیں۔“ وہ شدید گھبراہٹ کا شکار تھی، خوف زدہ انداز میں جلدی سے بولی۔

”خدا کے لیے ڈاکٹر فی صاحبہ! ان کو نہ بتائیں میں آپ کی منت کرتی ہوں۔“ وہ گڑ گڑانے لگی مگر قربان علی کی ماں اسی اثنا میں اندر آ چکی تھی۔

ڈاکٹر نے ساری رپورٹس اسے تھمائیں وہ ساکت سی کھڑی خوف زدہ نظروں سے اپنی ساس کے تاثرات دیکھ رہی تھی۔

”بی بی یہ آپ کی بہو بالکل ٹھیک ہے۔ آپ اپنے بیٹے کو کل ٹیسٹ کے لیے بھیج دیں۔“ ڈاکٹر کا سخی انداز ساس کو تپا گیا۔

”مگر..... وہ تو بیٹی شیر جوان ہے۔ اونچا لمبا مرد ہے میرا بیٹا! اسے کوئی بیماری نہیں۔ بکواس کرتی ہے یہ..... بد بخت ہے۔“ ڈاکٹر کے سامنے ہی

ماس نے کنول کے زرد کملائے ہوئے چہرے پر غصہ سے بھر پور ایک نظر ڈالی اور ہاتھ سے پکڑ کر پون گھسیٹے ہوئے باہر لے گئی جیسے وہ انسان نہ ہو آئے کی پوری ہو۔ ڈاکٹر افسوس بھری نظروں سے اسے گھسیٹے ہوئے دیکھ رہی تھیں، مگر پہنچتے ہی اس نا انیش عورت نے ایسا گھسٹان کارن ڈالا کہ ماں بیٹیوں کی چنچیں سارا محلہ سنتا رہا۔ قربان علی یوں ملاتتی انداز میں اسے گھورے جا رہا تھا جیسے سارے قصور اسی کے ہوں۔

”اماں میں اپنے رب کی قسم کھاتی ہوں میں نے کچھ نہیں کہا، ڈاکٹر فی خود ہی سمجھ گئی تھی۔“ وہ منمنائی مگر نفار خانے میں تو بی کی آواز کون سنتا؟

”ارے کم بخت! اگر غیرت مند ہوتی تو شوہر پہ یوں تہمت لگانے سے پہلے زہر کھا کے مرجاتی۔ غیرت والیاں تو خودکشی کر لیتی ہیں۔ تم تو چلو بھر پانی میں ڈوبنے سے بھی ڈرتی ہو۔“ ساس کی اس بات پہ اس نے باری باری سب تندوں اور پھر شوہر کو دیکھا مگر سب تائیدی نگاہوں سے اپنی ماں کو دیکھ رہے تھے۔ وہ اچانک ایک فیصلہ کر کے صحن سے بھاگتی ہوئی گودام میں گھس گئی اور جب باہر نکلے تو اس کے ہاتھ میں گندم میں رکھی زہریلی گولیاں تھیں۔

محلے میں اک عورت نے شوہر کی دوسری شادی سے دل برداشتہ ہو کر ایسی ہی گولیوں سے خودکشی کر لی تھی۔ تب کنول گلی میں کھیلنے ہوئے میت والے گھر میں گھس گئی تھی۔ آج بھی اسے یاد تھیں ان باجی عذرا کی وہ بچٹی بچٹی آنکھیں، ہسفید کفن میں نیلا چہرہ۔ اس نے گولیاں ہاتھ میں پکڑ کر سب کو دکھائیں۔

”میں..... میں..... یہ ساری کھا کر خود کو ختم کر لوں؟ تب تو میری بے گناہی کا یقین کر لو گے نا آپ لوگ؟“ اس کا پورا جسم کانپ رہا تھا۔ آواز بھی لرز رہی تھی اور آنسوؤں کا سیلاب اس کی آنکھوں سے رواں تھا۔ وہ بزدل سی موت سے ڈرنے والی لڑکی ایک ایک کو یوں دیکھ رہی تھی جیسے زبان خاموشی کہہ رہی ہو خدا کے لیے مجھے روک لو لیکن کسی نے نہ روکا۔

ایک بل کو اسے پانی سے گولیاں نکلتے دیکھ کر قربان نے آگے بڑھنے کی کوشش کی مگر ماں کی غضب ناک نے اس کے قدموں میں زنجیر پڑا دی۔

☆☆☆

کنول کا جنازہ اٹھتے ہی ماں بہنوں نے قربان کی دوسری شادی کے لیے کھسر پھسر شروع کر دی تھی۔ دوسری بیوی بھی تیسرے مہینے ڈاکٹر صبا کے روبرو ہوئی۔

”جی دو مہینے ہو گئے ہیں شادی کو۔“ ڈاکٹر فی نے اسے گھورا۔

”ایسی ہی ایک لڑکی کچھ مہینے پہلے بھی آئی تھی میرے پاس..... کیا ہو گیا ہے اس معاشرے کو اللہ تعالیٰ یہ توکل ہے نہ ایمان کامل ہے۔ بس تیسرے مہینے ہی ڈاکٹر کو دکھائیں گے۔“ وہ بڑبڑاتی ہوئی اسے چپک کرنے لگیں۔ ساس کی خراش شکل دیکھتے ہی وہ پہچان گئیں اور ساری کہانی بھی سمجھ گئیں، ڈاکٹر نے ساس سے پوچھا۔

”پہلی والی کا کیا بنا؟“

گہرا طنز تھا ڈاکٹر فی کے لہجے میں۔ انہیں لگا زیادہ سے زیادہ اس غریب کو طلاق ہی دے دی ہوگی موت کا تو اندیشہ ہی نہیں تھا۔ کیونکہ بہت صحت مند اور کم عمر تھی وہ۔

”جی ڈاکٹر فی صاحبہ! اسی دن خودکشی کر لی تھی اس کلبوہی ڈاکٹر نے، اپنی آخرت بھی خراب کر لی اس نے۔“

”مگر کیوں؟“ ڈاکٹر فی کی آنکھوں کے سامنے اس معصوم کا گڑ گڑاتا ہوا چہرہ آ گیا۔

”ارے پچھتاوا تھا کہ آپ کے سامنے شوہر پہ کیوں جھوٹا الزام لگایا۔ ملامت کے مارے خودکشی ہی کر لی تھی۔“ ڈاکٹر نے افسوس بھرے انداز میں سامنے بیٹھی ایک اور کنول کی طرف دیکھا جس کا نام تو میمونہ تھا مگر مصوویت بالکل وہی تھی جس کے قتل میں خود انہوں نے بھی اپنا حصہ ڈالا تھا۔

ڈاکٹر فی نے ایک لمحہ کچھ سوچا اور جھوٹ بول کر

تبت ٹالکم پاؤڈر



اب 3 نئی خوشبوؤں میں دستیاب



کلاسیک

سلیکٹ

لکچر

تبت ٹالکم پاؤڈر - صبح سے شام ہلکے مہکائے

چھپائے یہ بیماری سی لڑکی اچھی زندگی کی تلاش کا حاصل سمجھ رہی تھی قربان علی کو۔
وہ اس کے آس میں سکریری کی جاب کرتی تھی قربان علی نے ماں بہنوں کی شادی کی ٹکڑا سے تنگ آ کر ایک دن جانان فرید کا نام لے لیا۔
جانان..... قربان علی کی دولت اور شان دیکھ کر بخوشی اس شادی کے لیے مان گئی تھی۔

حالانکہ ایاز احمد اس کی خالہ کا خورو بیٹا بہت چاؤ سے اپنی اماں سمیت اسے پالنے آیا تھا لیکن جانان بہت پریکٹیکل مائنڈ کی لڑکی تھی۔ اسے چھوٹی چھوٹی خواہشات کے لیے ترس ترس کر باقی کی زندگی گزارنے سے ڈر لگتا تھا۔

ایاز احمد بہت مایوس تھا اپنی غربت پر افسردہ بھی تھا مگر جانان مطمئن تھی اپنے فیصلے پر لیکن شادی کی رات کے انکشافات نے اسے سمجھا دیا تھا کہ اب اسے تاریخ دہرائی بہتہ ہتھیار ڈالنے ہیں بلکہ اس نے اسی رات کچھ فیصلے کر لیے تھے اور ان فیصلوں میں ایک نئی تاریخ رقم کرنے کا فیصلہ بھی تھا۔ دوسرے مہینے سے اولاد کی خواہش کی تاریخ دہرائی جانے لگی تھی۔

قربان علی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بڑی ڈھٹائی سے اسے گانتا کا لو جھٹ کے پاس لے جانے والا اماں کا فیصلہ سن رہا تھا۔
وہ ساکت سی پچھی پچھی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”مگر میں تو بالکل ٹھیک ہوں، علاج کی ضرورت تو آپ کو ہے اور یہ بات اگر آپ کی ماں بہنیں نہیں جانتیں تو آپ تو اچھی طرح جانتے ہیں نا؟“ اس نے جھلکایا تو..... اس بات پر قربان علی کا بہت زور کا پھیر اس کے گال پر نشان چھوڑ گیا تھا اور جانان ایک ہاتھ سے گال ملتے ہوئے اسے کمرے سے باہر جانا دیکھ رہی تھی۔

”مجھے طلاق چاہیے۔“ وہ کمرے میں واپس آیا تو جانان فیصلہ کر چکی تھی۔ ایاز احمد کی منتظر نگاہوں کا

ایک معصوم جان بچانے کا فیصلہ کر لیا کیونکہ جان بچانا ہی تو ان کا نصب العین تھا چاہے جس طریقے سے پورا ہوتا۔ انہوں نے ٹیسٹ دراز میں رکھ کر کہا۔

”سب ٹھیک ہے، بس دعا کریں جب بھی رب کو منظور ہوگا دامن خوشی سے بھر جائے گا۔“
میمونہ نے شکر گزار نظروں سے ڈاکٹر کو دیکھا۔
وہ بھی ان چند مہینوں میں کنول کی موت کے پس منظر سے اچھی طرح آگاہ ہو چکی تھی اور ڈاکٹر کا بنا کچھ پوچھے سب کچھ جاننے کا خوف۔ اسے ڈرا بھی رہا تھا اس نے یہاں آنے سے پہلے چپکے سے اسٹور میں جا کر گندم میں رکھی جانے والی گولیاں بھی فلیش میں بہا دیں تھیں لیکن وہ جس جان کے بچ جانے پر ڈاکٹر کی شکر گزار تھی۔ اس جان کو اب بھی بہت کچھ سہنا تھا موت سے بھی زیادہ اذیت ناک۔ ایک بچے کے نہ ہونے کو لے کر گھر میں وہ حالات بنا دیے گئے کہ رات بھر شوہر کی بیماری سانپ بن کر ڈتی اور دن بھر اس کی سزا میں زہریلی باتوں کا زہر اس کی رگوں میں اتارا جاتا رہتا۔ سخت جان تو تھی مگر دودھ زہرلے کے اسے بھی مار گئے۔ اس نے گندم والی گولیاں نہیں کھائیں مگر کفن میں لپٹا چہرہ پھر بھی نیلا تھا۔ درد کا زہر قطرہ قطرہ اس کی رگوں میں اترتا رہا اور اسے تھوڑا تھوڑا کر کے روز مارتا رہا تھا۔ عورتیں میت پہ چہ گوئیوں میں مصروف تھیں۔

”ہائے..... دماغ کی رگ پھٹ گئی تھی بے چاری کی۔ اولاد کے لیے ترس رہی تھی، بچے نہ ہوں تو کون سا شوہر یا سسرال عزت دیتا ہے عورت کو؟“
دوسری نے ہاتھ مل کر کہا۔
”عزت کے لیے ہی تو ترس ترس کر مری ہے۔“

☆☆☆

اور اب آئی تھی قربان علی کے گھر جانان فرید! زندگی سے بھرپور یہ لڑکی بہت سے خواب آنکھوں میں سچائے قربان علی کی زندگی میں شامل ہوئی تھی۔ متوسط طبقے کی ہزاروں خواہشات دل میں

تصور اسے اس فیصلے پر جسے رہنے کا حوصلہ دے رہا تھا عیش و عشرت نہ سہی لیکن ایک نازل ازدواجی زندگی تو وہ اسے دے سکتا تھا۔ رات بھر کی سوچ کے بعد صبح کی پہلی کرن جیسا فیصلہ لگا تھا اسے۔ اس طرح اس کے سارے خوابوں کو بھی تعبیریں مل جاتیں کیونکہ قربان علی سے طلاق کی صورت میں اسے بہت کچھ ملنے کی امید تھی۔ قربان علی نے زوردار قہقہہ لگایا۔

”جاناں بیگم ہوشیاری نہ کرو جائیس تو لہ سونا دس لاکھ روپہ اور کی جریب زرعی زمین لکھوئی ہے حق مہر میں تمہارے باپ نے۔ میں تمہیں طلاق دوں گا؟ تاکہ تم جا کر نئے سرے سے اپنی زندگی شروع کر دو۔ کیوں پاگل ہوں میں؟“ وہ ششدری اسے دیکھے گی اس کی حالت اس وقت جال میں پھنسی پھلی جیسی ہو رہی تھی بالآخر اسے ہار مان کر ڈاکٹرنی کے پاس جانا ہی پڑا۔ ڈاکٹر صبا نے اسے ساس کے ساتھ دیکھ کر افسوس بھرے انداز میں ایک آہ بھری اور ساس کو کمرے سے نکال دیا۔

”بیٹی! مجھے ضرورت نہیں کہ تمہارا معائنہ کروں کیونکہ میں جانتی ہوں تمہارے ساتھ کیا ہو رہا ہے اور تم سے پہلی والیوں کے ساتھ کیا ہوا ہے اور یہ بھی جانتی ہوں کہ تمہارے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔“ وہ اطمینان بھرے انداز میں مسکراتی تھی۔

”نہیں ڈاکٹر صاحبہ! اب کی بار تاریخ دہرائی نہیں جائے گی بلکہ ان شاء اللہ تعالیٰ نئی تاریخ رقم ہوگی۔ میں جاناں ہوں، کنول بی بی یا میمونہ کل نہیں۔“

اس کی مضبوط آواز میں کیا گیا مصمم ارادہ اور اس کی چمکتی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ خود کو بچالے گی۔ ڈاکٹر صبا نے مسکرا کر کہا۔

”شاماش بیٹی! عورت صرف ظلم سہنے کے لیے دنیا میں نہیں آئی، ہم چپ چاپ ظلم سہہ کر، ظالم کے ہاتھ مضبوط کرتے ہیں، اس کا ساتھ دیتے ہیں۔ ہمیں اپنی سوچ بدل کر ہی اپنی زندگیاں بچانی ہوں گی۔ انسانوں کے اس معاشرے سے جنگل کے قوانین کا

خاتمہ کرنا ہوگا۔ میری ضرورت جب بھی پڑے مایوس نہیں کروں گی۔ بس زندگی کے لیے آسائش تک مقابلہ کرنا، ہار مان لینے والوں کا انجیا دنیا بہت برا کرتی ہے۔ ہار نہ ماننا بھی بھی کیونکہ جیت تو ہم ہار جانے کے خوف کو مار کر حاصل کر رہے ہیں۔“ وہ ان کا شکریہ ادا کر کے ہنسی مسکراتی باہر آئی۔ گھر پہنچ کر ساس نے بیٹے کو خوش خبری سنائی۔ ”ڈاکٹر نے پہلی بار امید دلانی ہے کہ جلد ہی اچھی خبر ملے گی۔“ جاناں نے دیکھا قربان علی کی بات کے رد عمل میں نظریں چرائے اپنے دانتوں سے کاٹ رہا تھا۔ وہ مسکرا کر اندر چلی گئی۔ ابھی شادی کو پانچواں مہینہ لگا تھا کہ ساس دے لفظوں میں اندر کا حال پوچھا تو جاناں شرما تے ہوئے جو بتایا وہ ساس تندوں کو سرشار کر اور قربان علی کو بے قرار۔ تنہائی میں اس کے پکڑ کر بے دردی سے ہنپتے ہوئے اس نے پوچھا۔ ”یہ کیا ڈرامے کر رہی ہو؟“

”کچھ نہیں۔“ وہ درد سے کراہتے ہوئے رہی تھی۔ ”ڈاکٹر نے طاقت کی گولیاں دی تھیں کی وجہ سے طبیعت خراب ہو سکتی ہے۔ اس نے چھوڑ دیے تھے مگر جاناں کو درد اب بھی ہو رہا ہے دوسری صبح کی ابتدا ہی ایسی تھی کہ قربان علی کا ٹھکانا۔

وہ واش روم میں الٹیاں کر رہی تھی اور آواز باہر تک پہنچی تھی۔ وہ کچھ دن سے کھانا نہیں کر رہی تھی۔ دو چار دن گزرے تو ساس نے ڈاکٹر صبا کے کلینک لے گئی۔

ڈاکٹر نے پریکٹسٹی ٹیسٹ اسے کھانا اور اس کی ساس کو اندر بلایا اور مبارکباد ”بہت مبارک ہو بی بی! تمہارا اور ماں اور باپ نے پورا کرنے کی امید پیدا کر دی ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ ٹیسٹ کا رزلٹ مثبت ہوگا۔ اور تصدیق کے لیے رزلٹ کا انتظار کریں۔“ خوشی سے ناچنے لگی۔ گھر پہنچ کر ساس نے

ابا، جاناں کے والدین کو بھی بلالیا آخر اتنی بڑی خوشخبری تھی کوئی معمولی بات تو نہیں تھی۔ قربان علی کا منہ میٹھا کر کے جو خبر اسے سنائی گئی تھی۔ ٹیسٹ کی رپورٹ سانسے میز پر پڑی تھی۔ وہ اسے آسان کی بلندی سے پاتال کی پستی تک لے گئی تھی۔

اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ جاناں ناتحانہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ساری صلیتوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے وہ آگ بگولا اور کیا۔

”یہ جھوٹ ہے۔۔۔ بدچلن عورت کس سے منہ کالا کر کے آئی ہو؟ جلدی سے بتاؤ۔“ وہ حسبِ عادت اس کے بال مٹھی میں پکڑ کر کھینچتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ ”کس کا گناہ تمہاری کوکھ میں میرے نام سے لہ رہا ہے؟“

کمرے میں موجود سب ہی لوگ نہ سمجھنے والی کیفیت میں یہ سب دیکھ رہے تھے۔ آخر جاناں کا باپ اٹھا اور تکلیف سے تڑپتی بیٹی کے بال چھڑانے لگا۔

”کیا قصور ہے میری بیٹی کا؟“ وہ غریب ضرور تھے مگر بے غیرت نہیں تھے کہ چپ چاپ دیکھتے رہتے۔

”یہ بدکردار ہے اماں! اس کے پیٹ میں میزا نہیں کسی اور کا گناہ ہے۔“ اماں سے پہلے ہی وہ ال پڑی۔

”ثبوت کیا ہے تمہارے پاس قربان علی؟“ وہ اسے مارنے کے لیے آگے بڑھا۔

”فاحشہ ثبوت مانگی ہو مجھ سے؟“ وہ منہ سے تہماگ نکالتے ہوئے، غصے سے بھرا ہوا دوڑتا ہوا اندر آیا اور ایک پل میں ایک فائل ہاتھ میں لیے واپس آ گیا۔

”یہ لو، یہ دیکھ لو ثبوت۔“ اس نے فائل سانسے کی میز پر پھینک دی۔

”میں بھی باپ نہیں بن سکتا، ڈاکٹر نے مجھے

جواب دیا ہوا ہے۔“ ایک پہاڑ تھا جو کمرے میں موجود لوگوں کے سر پہ گرا۔ سب ایک دوسرے کو دیکھنے لگے تھے۔

بڑی بہن نے شادی شدہ ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے فائل اٹھا کر پڑھ لی۔ جاناں سر جھکائے کھڑی تھی، اس کے باپ نے بھی سر جھکایا ہوا تھا۔ جاناں نے چپکے سے سب کی نظر بچا کر ڈاکٹر صبا کو مسد کال دی۔

”غلیظ عورت۔۔۔۔۔ بدچلن فاحشہ میں تمہیں طلاق دیتا ہوں۔۔۔۔۔ طلاق۔۔۔۔۔ طلاق۔۔۔۔۔“ قربان علی چیخا۔ جاناں کے والدین نے سر پکڑ لیے۔ ”ہائے قربان علی! یہ کیا کر دیا۔“ ”ساری دولت دے دی اس بدچلن کو۔۔۔۔۔“

لعنت بھیجتا ہوں اس پہ بھی اور اس دولت پہ بھی۔“ وہ دیوانگی کی حدود کو چھو رہا تھا۔

”تیرے جیسی گندی عورت کو اس گھر سے نکالنے کے لیے میں دولت جانا دے سب کی قربانی دیتا ہوں۔“ اسی اثنا میں قربان علی کے موبائل پر بنگ آئی مگر اس کی حالت ایسی نہیں تھی کہ کال ریسیو کرتا۔ بڑی کا شوہر بھی کمرے میں موجود تھا۔

اس نے میز پر رکھا فون اٹھایا۔ ”جی ڈاکٹر صبا فرمائیے؟“

”کیا؟“ دوسری طرف کی بات سن کے اس کے ہاتھوں سے فون گر گیا۔ وہ بت بنے سب چہروں کو باری باری دیکھ کر جو بولا، اس نے کمرے میں موجود سب ہی لوگوں کو بوکھلادیا۔

”ڈاکٹر صبا کا فون تھا وہ کہہ رہی تھیں کہ جاناں زونہ عزیز گل کی ٹیسٹ فائل جاناں قربان علی کے ساتھ بدل گئی ہے۔ یہ غلطی لیبارٹری والے کی ہے پلیز آپ آ کر اپنی فائل لے جائیں۔ انھوں نے کہا ہے کہ جاناں قربان علی کی پریکٹسٹی رپورٹ ٹیکہ ہے۔“

جاناں اس نار چر پیل سے واپس گھر جاتے ہوئے ڈاکٹر صبا کو شکریہ کا بیج کرنا نہیں بھولی تھی۔

☆☆

آنکھوں کی بات

گزرتے دنوں میں سب کی ناپسندیدگی جاننے لے لیے ایسے ریاضی کے کسی فارمولے کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ علیہ کا منکبہ لہجہ، عبدالباسط کی نظروں میں تحقیر، رابی اور فریال کا عجیب نظروں سے اسے مانا۔ اسے کسی غلط فہمی کا شکار نہیں ہونے دیتا تھا۔ بین کا رویہ متوازن تھا۔ لیے دیے سے انداز والی بین اس کے ساتھ اچھی نہیں تھی تو بری بھی نہیں تھی۔ پیری لا ابالی بے پروا شرارتی سازندہ دل لڑکا تھا۔ اسے اس کے آنے سے کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ باقی رہا ایمان تو شاید اسے ہی اس کے آنے سے سب سے

زیادہ فرق پڑا تھا۔ گندی رکبت اور عام سے نقوش والے ذیشان حیدر کو اس گلابی شمش نے بنا ڈور اپنی طرف کھینچنا شروع کر دیا تھا۔ پہلی نظر کی محبت وہ بھی لا حاصل۔ وہ جانتا تھا لا حاصل ہے اس کی چاہت اور اس کے باوجود اسے خود برا اختیار نہیں تھا۔ وہ اپنی ماں کی حرا کے لیے ناپسندیدگی جانتا تھا اور وہ خود بھی بھی ان کا اتنا پسندیدہ نہیں رہا تھا کہ اس کی خوشی کی خاطر ہی ماما حرا کو قبول کر لیتیں۔ ٹھنڈی مٹی سے اس کا خمیر اٹھا تھا۔ ضد سے بات منوانا، اپنی بات پر اڑنا۔ اسے بھی آیا ہی نہیں تھا۔ تب ہی تو وہ



کے ساتھ پر اعتماد سی اندر آ رہی تھی۔ کمر کے آدھ تک آتے بال بے ترتیبی سے پونی میں قید تھے۔ آنکھوں پر بڑے بڑے شیشوں والی عینک پڑ جائے وہ ان سب کو کسی اور سیارے کی مخلوق نظر آ رہی تھی۔ اس کے کینکین کتنے ہی ماڈرن کیوں نہیں تھے۔ لڑکیاں ہر طرح کا فیشن کرتیں، دوپٹے چاہے کندھے پر ایک طرف پڑے رہتے، بیصیں چاہے اسی چست ہونٹوں کے بدن کے نشیب و فراز مامے جاسکتے۔ پھر بھی پھر بھی اس گھر میں ایسے لباس کا تصور بھی کوئی نہیں سکتا تھا۔ وہ اس گھر کے لیے ناقابل قبول تھی۔ پھر چاہے کچھ بھی تھی اور اس بات کا اندازہ اسے پہلے دن ہو گیا تھا۔ بڑے ماموں کے پیچھے لاؤنج سے نکلے ہوئے اس نے سنا تھا۔

”میں حیران ہوں جین نے اس لڑکی کی تربیت کی ہے۔ لباس تو دیکھو ذرا۔ باقی آنے کا وقت پتا نہیں اس لڑکی کے کیا کیا کرتوت دکھا گا۔“

یہ چھوٹی مامی کی آواز تھی۔ کسی کی بھی ہوتی فرق پڑتا تھا۔ اندر سے آنے والی تائیدی آوازوں سے اس نے جان لیا تھا۔ انہوں نے تو اتنا بھی نہیں کیا تھا کہ ابھی دو دن پہلے اس نے ماں کو ہے۔ اس کا دل کچھ اور مضبوط ہوا تھا۔ ذہنی طور پر آنے والے ہر برے حالات کے لیے پہلے سے تھی۔ بہر حال دکھ پھر بھی اسے ہوا تھا۔

حرا منصور لڑکی نہیں اک ستارہ تھی جو ٹک کر ویاہج ہاؤس میں آگرا تھا۔ حرا منصور ماہ جین پھوپھو کی بیٹی تھی۔ وہ پھوپھو جین کو اس گھر کے بچے صرف نام اور تصویروں کی حد تک جانتے تھے۔ جن سے ناراض ہو کر دادا نے بھی نہ ملنے کی قسم کھا کر باقی سب کو بھی اسی قسم کا پابند کر دیا تھا۔ پہلے دادا اس قسم کا بوجھ لے کر مٹی تلے جاسوئے اور اب دو دن پہلے پھوپھو سب رشتوں کو اس قسم سے آزاد کر گئی تھیں۔

حرا منصور نے جب وہاں ہاؤس میں قدم رکھا تو ایک بار تو سب کو ہی چونکا دیا تھا۔ پھر چاہے وہ تک پڑھی علیہ تھی یا خود پرست عبدالباسط۔ باقی تو سب کسی کھاتے میں ہی نہیں آتے تھے۔ اصل میں کم و بیش سب کی سوچ اس کے آنے سے پہلے تک یہ ہی تھی کہ جس کی ماں کا ابھی کفن بھی میلا نہیں ہوا، پسماندہ علاقے کی وہ لڑکی جس نے رشتے کے نام پر صرف ماں ہی ماں دیکھی تھی اور اب وہ بھی نہیں رہی، ناپا پنا بھائی، کیسی دبو ہوگی۔ ڈری سہی ادھر ادھر آنسو بہائی، چھپائی پھرے گی۔ جھوٹے اور کھوکھلے ہی سہی۔ دلا سے بھی دینے پڑیں گے۔ لیکن اس نے ان سب کے اندازے غلط ثابت ہو گئے تھے۔ وہ اندازے بھی جو انہوں نے لگائے ہی نہیں تھے۔

بڑے پاپا کی گاڑی سے نکلنے والی لڑکی مردانہ ٹراؤز شرٹ میں دوپٹے سے بے نیاز خشک آنکھوں

ہمیشہ زینب کے عتاب کا نشانہ بن رہا۔ عبدالباسط اس سے چھوٹا اور بے جا ضدی تھا۔ بچپن میں اسے وہی کھلونا چاہیے ہوتا تھا جو ذیشان کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ ذیشان چپ چاپ اسے کھلونا دے دیتا۔ کوئی لڑائی جھگڑا، رونا وناویلا کچھ نہیں۔ زینب چاہتی تھیں وہ اپنی چیزیں اسے نہ لینے دیا کرے۔ شروع میں وہ اسے اکیلے میں سمجھاتی تھیں لیکن وہ اپنی فطرت کا کیا کرتا۔ ایک تو واجبی سی شکل و صورت اور اس پر مزاج بھی ایسا ٹھنڈا۔ زینب کو ذیشان کی صلہ پسند فطرت اس کی باسط سے ہار گئی تھی۔

باسط اکھر مزاج اور شہنشاہ فطرت تھا۔ اللہ نے شکل بھی شہزادوں کی عطا کی تھی اور مزاج بھی۔ اس کے سامنے ذیشان کی شخصیت دیپ سی جاتی تھی۔ یہی بات زینب کو برداشت نہیں ہوتی تھی۔ پتا نہیں کیوں ان کے اندر جھٹپانی کے بیٹے کے ساتھ اپنے بیٹے کا موازنہ چلاتا رہتا تھا۔ وہ چھپ کر ذیشان کو سینے سے بھی گریز نہ کرتی تھیں۔ جب علیہ ان کی گود میں آتی تو جیسے ان کا اندر ٹھنڈا ہوا تھا۔ وہ لڑکی ہو کر باسط سے بھڑ جاتی تھی۔ ہاں وہی تو اس کی ٹکری تھی۔ زینب کی ساری توجہ علیہ نے لے لی تھی۔ مزاج کی تندگی اور ماں کی شہ نے اسے حد سے زیادہ خود سر بنا دیا تھا۔ ذیشان نہیں پیچھے رہ گیا تھا۔ بیٹا ہو کر بھی وہ ماں کی نظر میں کچھ نہیں تھا۔ یہاں تک کہ بعد میں آنے والی فریال بھی ان کی توجہ علیہ سے ہٹانے میں ناکام رہی۔ وقت گزر گیا وہ بڑے ہو گئے لیکن مقابلے کی فضا تم نہیں ہوئی۔ مضامین کے انتخاب سے لے کر ملنے والے گریڈز تک۔ وہ کہیں بھی ماں کی توقعات پر پورا نہیں اتر سکا تھا۔ ہاں ایک بات ایسی تھی جس پر زینب نے پہلی بار اس کے فیصلے کو سراہا تھا۔ باسط نے پڑھائی پوری کرنے کے بعد نوکری کو ترجیح دی تھی جب کہ وہ گھر کے مشترکہ کاروبار کی طرف چلا آیا تھا۔ اس سب کے بعد دل میں اک موہوم سی امید رہی تھی کہ شاید..... پہلی بار وہ اپنی کوئی خوشی حاصل کر لے۔ وہ خوشی جو ایک دم سے زندگی بن گئی تھی۔

☆☆☆

”حرام نام کی بلا لگتا ہے مرنے کے بعد میں سکون نہیں لینے دے گی۔ علیہ کی آواز دروازے کے پیچھے سے ابھری تھی۔ چوری چھپے باتیں سننے تو اسے عادت تھی اور ناشوق۔ اپنا نام سن کر ازخود کے قدم دبلیز پر رک گئے تھے۔

”کیا ہوا؟“ بین نے پوچھا۔

”ہونا کیا ہے، دادو نے عذاب ڈال دیا۔ میرے گلے۔ ساری پرائیویسی ختم ہو کر رہ گئی۔ پہلے تو اس کا اعکاف ہی ختم نہیں ہوتا۔ سارا کمرے کی جان نہیں چھوڑتی۔ اب اگر کمرے سے نکلی ہی تھی تو میں نے سرمد کو اس کا پتہ پکال کر ملی میڈم بغیر ناک کیے کمرے میں آدھمکی۔ جس دروازے سے گھر آئی ہے میری سرمد سے بات ہی نہیں ہو رہی۔ سچ یہ خبر خدا دیتی رہی ہوں۔ اس کا اتنا موڈ بنا ہوا تھا۔“ علیہ کا موڈ بے حد خراب ہوا تھا۔

بین کے کچھ کہنے سے پہلے وہ کمرے میں داخل ہو گئی۔ علیہ نے جتنی سی ایک نظر بین پر ڈالا یوں جیسے کہہ رہی ہو ”میں نے سچ کہا تھا۔“

ای کی تصویروں کا البم اپنے بیک میں رکھ کر ایک دوستانہ مسکراہٹ ان دونوں کی طرف اچھال کر وہ باہر نکل گئی۔ اس کے انداز سے انہوں نے بھی اندازہ لگایا کہ اس نے کچھ نہیں سنا۔ باہر نکل کر ایک گہری سانس بھر کر اندر کی کھٹن باہر نکالتے خود کو ناراض کرتے وہ دوبارہ نانو کے کمرے میں چلی گئی۔ آخر اپنے محسنوں کی خاطر اتنا تو وہ برداشت کر ہی سکتی تھی۔ اسے تو یوں بھی کسی سے کوئی گلہ نہیں تھا۔ اکیس برس پہلے ناراضی کی چھاؤں تلے رخصت ہونے والی بیٹی کو ساری عمر جنہوں نے گھر کی دہلیز پر چڑھنے دیا۔ اس کی بیٹی کو گھر کا تحفظ دینے والوں کی دیکھو یا بال بال مقرر وضو تھی۔ یہ قرض اس نے خود اپنے کندھوں پر ڈالا تھا۔ زندگی نے اسے انتخاب کی سہولت دی تھی۔ اس گھر میں آنا اس کی اپنی مرضی تھی۔ مجبوری نہیں۔

یہ اسی شام کی بات ہے جب وہ علیہ کے ارے میں بیٹھی آنے والے سخت سے سخت حالات کے لیے خود کو تیار کر رہی تھی تب ایک دم باہر شور بلند ہوا۔ علیہ کے ساتھ وہ بھی تیزی سے باہر بھاگی۔ نانو اوندھے منہ فرش پر پڑی تھیں۔ ان کے کرنے کی آواز سن کر آنے والے بڑے ماموں اور ماما کی لڑکی ابھری تھیں۔ نانو کی سال سے ماما کی مریضہ تھیں۔ کھانے پینے سے لے کر زندگی کی تمام تر ضروریات کے لیے وہ دوسروں کی محتاج تھیں۔ کئی بار ان کے لیے کل وقتی ملازمہ رکھی گئی لیکن کوئی بھی ایک ڈیڑھ ماہ سے زیادہ نہیں ٹکا سکی تھی۔ ابھی وہ خود چھوڑ جاتی تو بھی ماموں کو اس پر اعتراض ہوتا۔ ابھی نانو خود ہی کسی بہانے نکال باہر کرتیں۔ انہیں ہتھ پکڑ کر ماموں ان سب کی طرف متوجہ ہوئے جو شور مچا رہے تھے۔

”ہزار بار کہا ہے اماں کے پاس ہر وقت کوئی نہ کوئی رہا کرے۔ لیکن میری مستان کون ہے۔ اب جب تک نئی ملازمہ نہیں آجانی سب باری باری اماں کے پاس بیٹھا کریں۔ رات کو میں خود ان کے پاس سو جاؤں گا۔ میں اماں کو اکیلا نہ دیکھوں ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔“ وہ غصے میں تھے۔

ان کی بات پر اکثر جینیوں پر شکلوں کے جال بچھے تھے۔ کئی آنکھوں میں ناگواری کی لہریں اٹھنے لگی تھیں لیکن پروا کسے تھی۔ تب ہی دو قدم بڑھا کر وہ ماموں کے پاس ہوئی تھی۔ ”اگر مناسب سمجھیں تو مجھے نانو کے پاس شفٹ کر دیں، میں پوری کوشش کر دوں گی کہ ان کا خیال رکھ سکوں۔“

اس کی بات اتنی غیر متوقع تھی کہ ایک بار تو سب ہی حیرت زدہ رہ گئے تھے۔ ماموں کے رومی اور کھوکھلے اعتراض رد کرتے اس رات وہ نانو کے کمرے میں بیچ بیک منتقل ہو گئی تھی۔

اس کے آنے کے بعد یہ پہلی رات تھی جب علیہ سمیت اس گھر کی باقی عورتوں نے بھی اس سے فیصلے کو سراہا تھا۔ اس کی موجودگی پر اطمینان کا سانس

لیا تھا۔ ورنہ ایک مفلوج بوڑھی عورت سے کسی کو کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ اور اگر دلچسپی ہوتی تو کیا نوکرانی کا ہی آسرا ڈھونڈا جاتا۔ اس کمرے میں وقت گزارنا ایک قیامت تھی اور یہ قیامت حرامصور نے خود پہ روک لی تھی۔ سب کا شکر گزار ہونا تو بنتا تھا نا۔

☆☆☆

جب سے وہ اس گھر میں آئی تھی بس کمرے تک محدود تھی۔ بین اور علیہ جب خود کھانا کھاتیں تو اس کے لیے بھی لے آتیں۔ اس نے کچن میں بھی قدم بھی نہیں رکھا تھا۔ آج پہلی بار کچن میں نانو کے لیے فریش جوس لینے آئی تھی۔ بڑی مای کوئی گلیش کے سامنے کھڑی جلدی جلدی ہاتھ چلا رہی تھیں۔ اسے نظر انداز کرتیں وہ مصروف سی آلیٹ پلٹنے لگیں۔ ”نانو کے لیے جوس لینا ہے“ ان کے متوجہ ہونے کا انتظار کرنے کے بعد وہ ڈھیٹ ہو کر خود ہی بول پڑی تھی۔

”ناشتا بنا رہی ہوں۔ ابھی نہیں بنا سکتی۔ کچھ دیر بعد آجانا۔“ بہت ناگواری سے جواب آیا تھا۔ ”ابھی ہر ایک کا الگ الگ ناشتا بنے گا۔ پھر اس میں سے بھی کیڑے نکلیں گے۔ کسی کو یہ نہیں کھانا تو کسی کو وہ نہیں کھانا۔ سب کام چورچ ہوئے ہیں۔ بجالا۔ کوئی لڑکی کچن میں چھانک لے۔ دس دس بجے تک ان کی آنکھیں نہیں کھلتیں۔ نوکرانی کے ہاتھ سے کھانا یہ نہیں کھا سکتے۔ بڑی بہو ہونے کے سارے عذاب میری جان کو ہیں۔“ بڑبڑاتے ہوئے وہ اندر کی کھولن نکال رہی تھیں۔

”سارا کام آپ اکیلی کرتی ہیں؟“ اس نے حیران ہو کر پوچھا تھا۔ ٹرے میں گرم چائے کے بھاپ اڑاتے کپ رکھتیں ماما کا ہاتھ ایک لمحے کے لیے رکا تھا۔ انہوں نے اس کا چہرہ دیکھا جہاں بے پناہ تھرتھی۔

”میں..... ہاں ظاہری بات ہے اپنے بچوں کے لیے سب کرنا پڑتا ہے۔“ اب وہ بولیں تو تھجھوڑا دھیمہ تھا۔ کوئی تو تھا جس نے مانا کہ وہ اتنا کام کرنی

”اگر آپ کو برانہ لگے تو میں آپ کی مدد کر دیا کروں؟“ بڑی آس کے ساتھ اس نے پوچھا تھا اور کوئی وجہ نہیں تھی کہ وہ انکار کرتیں۔ وہ خود اس ذمہ داری کے بوجھ سے جھٹکنے لگی تھیں۔ باسط، شیریں اور سین اور رانی ان کے پیچھے تھے۔ اپنے بچوں کے

”ہم عورتیں ہی اپنی بیٹیوں کو کمزور بناتی ہیں
ملاقات لفظ سے ہم یوں ڈراتی ہیں جیسے حرام کام ہیں
ٹکی حق پر ہوتے ہوئے بھی جب رہ کر رو کر سہ

اس کے سامان کرتے ہاتھ لچھ بھر کر دے تھے۔
ایا نہیں لگتا ہے کہ منصور احمد مر گیا ہے؟ ہاں مر ہی
ہے وہ شخص۔۔۔ اسے مرا ہی رہنے دینا چاہیے۔
ابو جھ کر اس نے ان کی غلط فہمی دور نہیں کی۔ اس
میں آنے کے بعد پہلی بار تھا جب کسی نے امی ابو
ہارے میں بات کی تھی۔ دل بری طرح اداس ہوا
آنسو اندر اتار دے وہ بلاوجہ باہر نکل کھڑی ہوئی۔

”کیا کہہ رہے تھے؟“ اس نے اتنے نارمل انداز میں پوچھا تھا جیسے کسی اور کے بارے میں بات

ہور ہی ہو۔

”وہ کہہ رہے تھے۔ آپ سے دور ہی رہیں اور یہ بھی کہ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔“ بہت شرمندگی سے اس نے بات پوری کی تھی۔

”کوئی بات نہیں گڑیا۔ جب ضرورت ہو چیکے سے مجھے دے دینا اور اگر موقع ملے تو چیکے سے بیکھ چکی لیں۔“ گہری سانس بھرتی وہ وہاں سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اس وقت اسے تنہائی کی شدید ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ آنسوؤں کا گولا ساق میں اٹک گیا تھا۔

اس نے شروع سے ایسے ہی کپڑے پہنے تھے۔ جب وہ یہاں آئی تب بھی اس کے پاس ایسے ہی کپڑے تھے۔ ڈھیلے ڈھالے یہ کپڑے ان کپڑوں سے تو کئی گنا بہتر تھے جو اس گھر کی لڑکیاں پہنتی تھیں۔ لیکن یہ تو اس کی اپنی سوچ تھی۔

☆☆☆

”کتنی گھٹیا نگلی تم۔ تمہیں تو یہ بھی خیال نہیں آیا کہ جن لوگوں نے تمہیں پناہ دی، اپنے گھر کی چار دیواری دی تم ان کے ہی گھر میں نقب لگا رہی ہو۔ اپنے محسنوں کے ساتھ ایسا گرا ہوا سلوک تم کیسے کر سکتی ہو؟“ وہ تنہا کھڑے تو لیے سے بال خشک کرتی ہاتھ روم سے باہر نکلی تھی جب بے چینی سے شہلی علیہ اس پر برس پڑی۔

”کیا..... کیا ہے میں نے؟“ اس نے الجھ کر پوچھا۔

”یہ تو اب سب کو پتا چلے گا حرا بی۔ تمہارا یہ معصومیت کا ڈرامہ زیادہ دیر نہیں چلنے والا۔ تم نے میرا دل اجاڑا ہے، میں تمہیں اجاڑ دوں گی۔ تمہیں بے گھر کر دوں گی۔“

”پہلی بات اجڑے ہوئے کو اور کیسے اجاڑیں گی آپ؟ دوسری بات میرے بے گھر ہونے میں ابھی آپ کو کوئی خشک ہے؟ اب بتائیں میں نے کیا کیا ہے؟“ بڑے ٹھہرے لہجے میں اس نے جواب دیا تھا۔

”بہت جلد پتا چل جائے گا تمہیں بھی اور سب کو بھی۔ چھوڑوں گی نہیں تمہیں۔“

مالی سی۔

”علیہ اسکا پ پر اپنے منگیتے سے بات کر رہی تھی جب میں اچانک ان کے کمرے میں چلی گئی۔“ اپنے کردار کی دکالت کتنا مشکل کام تھا اسے آج پتا تھا۔ اس کی بات پر ماموں کرسٹ کھا کر ملے تھے۔

”میرے پاس کوئی فون، کوئی رابطے کا ذریعہ اس، نا تو یہ بات جانتی ہیں۔ چوبیس گھنٹے میں ان کے ساتھ ان کے پاس گزاری رہی ہوں۔“

حیران کن بات وہ نہیں تھی۔ بات تو یہ تھی کہ وہ ہاتھ ہی نہیں تھے کہ علیہ کا سرمد کے ساتھ کوئی رابطہ بھی ہے۔ وہ بھی صرف فون کا نہیں بلکہ ویڈیو وال پر اور یہ رابطہ یہاں تک تھا وہ خود نہیں جانتے تھے۔ یہ ملاقات یا کہیں تک۔ ان سے سوچا ہی نہیں گیا۔ وہ تنگ نظر نہیں تھے لیکن زمانہ شناس تھے۔

اگر کے حالات دیکھتے ہوئے انہوں نے بچوں کو اب سہولتیں دے رکھی تھیں لیکن ایک حد تک۔ آج ان پر پتا چلا تھا کہ ان کی متین کردہ حد تو کوئی حد تھی ہی نہیں اور کوئی حد تھی بھی انہیں وہ یہ جانتے نہیں تھے۔

”میں کسی ایسے شخص کو اپنی زندگی میں شامل نہیں کرنا چاہتی جس نے محض ایک جھلک دیکھ کر اپنے سے منسوب لڑکی کے جذبات کی پروا نہ کرتے ہوئے میرے کردار پر سوالیہ نشان لگا دیا ہے۔ باقی آپ مختار ہیں مجھے میرے ناکرہہ جرم کی کوئی بھی سزا نہیں لیں، ان شاء اللہ ثابت قدم پائیں گے۔“

ماموں بنا کچھ کہے نکل گئے تھے اور آج پہلی بار وہ اپنی موجودگی کی پروا کیے بغیر روئی تھی۔ ”مجھ سے تم لیں میں نے کچھ بھی نہیں کیا۔ میں نے ماموں سے کہا ہے سچ کہا ہے۔ میرا یقین کریں نا تو۔“

”کچھ نہیں ہوتا میری بچی۔ صبر رکھیں صبر۔“ انہوں نے ایک ہاتھ سے اسے مزید قریب کرتے ہوئے کہا تھا۔ ایک عرصے سے وہ اس کمرے تک محدود رہیں لیکن انہوں نے دنیا دیکھ رکھی تھی۔ گھر کے بڑوں نے لے کر بچوں تک سب کے رنگ ڈھنگ پہنچاتی رہیں۔ علیہ کیا تھی اور کیسے تھی اس بات سے قطع نظر

وہ جانتی تھیں حرا جھوٹ نہیں بول رہی۔

حرا کے لیے یہ رات اس گھر میں گزری ہر رات پر بھاری تھی۔ آنکھوں میں نیند تو کیا نیند جیسا بھی کچھ نہیں تھا۔ رہ رہ کر ماموں کا شکستہ الزام دینا لہجہ یاد رہا تھا۔ وہ اتنی بے اعتبار ٹھہری تھی ان کی نظر میں۔ ایک چھوٹی سی غلطی کی اتنی بڑی سزا۔ نہیں۔ وہ ایسا نہیں ہونے دے گی۔ اپنا دفاع کرنا اس کا پہلا حق تھا اور ماں کے بڑھائے اسباق میں سے ایک سبق یہ بھی تھا کہ اپنا حق کسی قیمت پر نہیں چھوڑنا۔

اگلی صبح ساری رات جاگنے کے باوجود وہ گزرے کئی دنوں کی طرح وقت پر پکچ میں موجود تھی۔ سب سے پہلے ناؤ کا جوس بنایا۔ اس کے بعد باری باری سب کا ناشتا بنانے لگی۔ مامی کی آج طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لیے جیسے ہی ماموں اور باسط کا ناشتا بنا وہ آرام کی غرض سے اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ اس نے جلدی جلدی دکن کا پھیلاوا سنا اور برتن دھونے لگی۔

”نانی ماں ایک کپ چائے بنا دیں، سر بہت درد کر رہا ہے۔“ پتی دو آنکھوں سے مسکتی پتی کی میز پر آکر بیٹھنے والی علیہ ہی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھنے کی زحمت کیے بغیر ہی آرڈر جاری کیا تھا۔

حرا نے گردن پیچھے موڑ کر اسے دیکھا اور پھر سے برتن دھونے لگی۔ کوئی جواب نہ دیا ماموں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ سیاہ ٹراؤزر پر چلی چیک والی شرٹ پہنے تنہی سے برتن دھوتی وہ وہی تھی جس کی وہ شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ ناک پر جیسے جیسے کا فریم کانوں کے پیچھے سے بھی نظر آ رہا تھا۔ اس کے جیسے خون میں ابال اٹھا تھا۔

”اوہ۔ تو غیرت نام کی کوئی چیز حرامشور میں نہیں پائی جاتی۔ کیسے تم.....“

”ایک منٹ۔“ اٹھی اٹھا کر اس کی بات کاٹے وہ ایک دم پیچھے مڑی تھی۔ اس نے ٹل کھول کر ہاتھ دھوئے اور چرچن ٹاول سے خشک کرتی اس کی طرف آ گئی۔ تب تک پیر پختی علیہ وہاں سے چلی گئی تھی۔

وہ عین حرا کے سامنے کھڑی تھی۔ کالر شرٹ پکڑ کر ایک جھککے کر وہ باہر نکل گئی۔ حرا چوڑے شیشوں والی عینک کا ریٹ پر جا گری اسے کچھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس نے کیا کیا ہے بھی علیہ کے رویے پر حیران تھیں۔

”اسے کیا ہوا ہے؟“ نا تو نے پوچھا تھا۔

”مجھے کیا پتا۔“ اس نے جھک کر اپنی جیب اٹھائی۔ اب اسے اس ”بہت جلد“ کا انتظار تھا۔ حرا علیہ کہہ کر گئی تھی۔ اور یہ بہت جلد دو دن بعد آئی تھی وہ نا تو سے گئے دنوں کے قصے سننے کے ساتھ انہیں رہی تھی جب چھوٹے ماموں کمرے میں آئے تھے۔

”علیہ کے سسرال سے فون آیا تھا رات“ اس کی آواز میں کچھ تھا جو غیر معمولی تھا۔ وہ نا چاہتے متوجہ ہوئی تھی۔

”وہ کہہ رہے تھے سرمد علیہ سے شادی راضی نہیں۔“ ایک باپ اپنی بیٹی کے رشتہ ٹوٹنے کی کس دل سے سنار ہا ہوگا اسے اندازہ ہو رہا تھا۔

”لیکن کیوں بیٹا؟“ چند ماہ پہلے شہر کے ترین میرج ہال میں ہوئی متفنی کی تقریب ان آنکھوں میں ٹھہم گئی تھی۔ دونوں گھروں نے دل کھول کر پیسہ پانی کی طرح بہایا تھا۔

ماموں نے ایک نظر آنکھیں نیچے کیے ناؤ دباتی حرا کی طرف دیکھا تھا۔

”وہ کہتے ہیں سرمد کہتا ہے..... وہ علیہ نہیں حرا سے شادی کرنا چاہتا ہے۔“ انہوں نے آہستگی سے اس کی سماعتوں پر بم بھوڑا تھا۔

”حرا سے؟“ نا تو بھی حیران رہ گئی تھیں۔

اپنی انا کی جیت کے لیے، تسکین کے لیے ہم دوسروں کو اس وقت تنہا چھوڑ دیتے ہیں جب انہیں کسی سامع، کسی غم گسار کی صورت ہماری ضرورت ہوتی ہے کہ کوئی ہو جو کندھے پر ہاتھ رکھ کر صرف اتنی یقین دہانی کروادے کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ سو اپنی انا جلتے چولے میں جھونک کر اس نے علیہ کے لیے چائے کا پانی چڑھا دیا۔

چائے بنا کر بے جھجک وہ اس کے کمرے میں لے آئی تھی۔ وہ آنکھوں پر بازو رکھے شاید رورہی تھی۔ چائے اس نے سائڈ بیبل پر رکھ دی تھی۔ ”لوگ کہتے ہیں کردار پر بات آجائے تو وہاں ہر بات ختم کر دینی چاہیے۔ میں کہتی ہوں کردار پر بات آجائے تو کھل کر بات کرنی چاہیے۔“

”جھے کوئی غرض نہیں تمہارے اقوال زریں سے۔“ وہ ہنسنے لگی تھی۔ ”بالکل۔ ہونی بھی نہیں چاہیے لیکن میں ایک غلط فہمی کی وجہ سے زندگی بھر کے بچے تھوڑے تالینا چاہتی ہوں تا دینا۔ ماموں نے میرے کردار پر بات کی تھی۔ میں نے اپنی پوزیشن واضح کرنے کی کوشش بھی کی تھی جو جانے کا میاب بھی ہوئی کہ نہیں لیکن میں آپ سے کچھ نہیں کہوں گی۔ اس لیے کہ آپ خود سچ جھوٹ جانتی ہیں۔ آپ جانتی ہیں میرا آپ کے منگیتر سے کوئی رابطہ یا رشتہ نہیں تھا اور جو آپ دونوں کے درمیان ہوا وہ بھی آپ ہی جانتی ہیں۔“ اس کی آنکھوں میں جھانکتے وہ اس کے قریب ہی بیڈ پر بیٹھ گئی۔ نظر چرا کر علیہ نے بے ساختہ اذیت سے آنکھیں موند لی تھیں۔

”آپ مان کیوں نہیں لیتیں کہ وہ شخص جس نے آپ کے فون پر ایک لڑکی کی محض ایک جھلک دیکھ کر آپ کی فیملی کو پروا کیے بغیر آپ سے رشتہ توڑ کر اس سے رشتہ باندھنے کا سوچا، وہ آپ کے قابل ہو ہی نہیں سکتا۔ اللہ نے آپ کے لیے اس سے بہت بہتر کچھ رکھا ہوگا۔“ وہ رکی۔ اس کی نظریں ابھی بھی اسی پر تھیں۔ ”فرض کریں اگر آپ کی شادی کے بعد

میرا اس سے سامنا ہوتا اور وہ ایسا کچھ کہتا۔“ ”فرض کریں میں نہ ہوتی کوئی اور ہوتی۔ فرض کریں۔“ ”جھے کچھ فرض نہیں کرنا۔ خدا کے واسطے جائے یہاں سے۔“ گالوں پر بہتے سیال کے ساتھ اس نے جج میں اس کے آگے ہاتھ جوڑے تھے۔

”مقام شکر ہے علیہ بی بی! اللہ نے ایسے ہی کے ہاتھوں آپ کی زندگی محفوظ رکھی۔ چند لمحوں کے نام سے منسوب ہیں جھکاؤ کی طرح دل سر زمین سے اکھاڑ پھینٹیں۔ میری مائیں تو سجدہ ادا کریں۔ یقین کر لیں کہ وہ شخص آپ کے قابل ہے۔ اپنا دل اور ذہن صاف کریں اور جب رونا آئے میری باتیں ذہن میں دہرائیے گا۔“ اس نے کندھا تھپتھا کر وہ ہار چلی گئی تھی۔ اسے پتا تھا غلط نہیں کہہ رہی۔

چار ماہ پہلے ان کی منگنی گھر والوں کی مرضی سے ہوئی تھی اور جب سین، سرمد کی خواہش لے کر اس کے پاس آئی تو اس نے منگنی کو جواز بنا کر دل میں کڑی کھول لی تھی۔ دن رات فون پر باتیں بھردور کال۔ ہاں ملنے کی ہمت وہ بھی نہیں کر سکتی تھی حالانکہ وہ کتنی بار کہہ چکا تھا۔ ناراض بھی ہوا تھا لیکن علیہ جانتی تھی وہ یہ ہمت بھی نہیں کر سکے گی اس لیے حامی نہیں بھری اور جب اس سے بات کے دوران کی جھلک دیکھی تو مذاق مذاق میں اس کا نمبر مان لگا۔ پھر یہ مذاق اکثر ہی ہونے لگا۔ اتنا کہ وہ ہنسنے لگی۔ ”اس کے پاس کوئی فون نہیں اور میری کڑی کے ساتھ ایسی کوئی دوستی نہیں کہ اپنے فون پر بات کرواتی بھردور۔“ کھولتے خون کے ساتھ اس بڑے ٹھنڈے لہجے میں جواب دیا تھا۔

”ہوں۔ لڑکی کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔“ ”سے لہجے میں کہہ کر اس نے مزید بات کیے فون دیا اور پھر اسی شام اس کے گھر سے فون آگیا۔ ”علیہ آزاد خیال لڑکی ہے اور سرمد کی لڑکی سے شادی نہیں کرنا چاہتا، اسے حرا پسند رشتہ داری کرنی ہے تو حرا کا رشتہ دے دے

منیشن سے اس نے خود یہ الفاظ سنے تھے۔ حرا کا ل میں کوئی قصور نہیں تھا۔ صورت تو اس کا اپنا تھا لیکن مہمان بھی تو اسی کا ہوا تھا۔ نقصان اپنے ہاتھوں بھی ہوا۔ تکلیف تو ہوتی ہی ہے ناں۔ اور وہ بھی ابھی اسی لایف کے فیر میں تھی۔ حرا ٹھیک کہہ گئی تھی۔ اسے تو ادا کرنا چاہیے تھا۔ شادی کے بعد اگر یہ سب ہوتا تو ایسی ممکن ہی نہیں تھی۔ ابھی تو چار ماہ اور چند ہڈیوں کا ہی نقصان ہوا تھا۔ اس نے واقعی ہی دوگانہ ادا کر کے اللہ سے اپنے منگی روے کی معافی مانگی تھی اور شکر ادا کیا تھا کہ وقت پر جان چھوٹ گئی۔

روتے روتے وہ تھک گئی تھی۔ فون ادا کرنے کے بعد وہ اتنا پرسکون ہوئی کہ کتنا کھانا کھائے سرشام ہی پر سو گئی۔ اگلی صبح بڑی کھری کھری طلوع ہوئی تھی۔ لیٹ ٹائٹ کا لڑکی وجہ سے وہ دن چڑھے تک دلی رہتی تھی اور اب جب کہ ساری تھکاوٹ اور دل سے کثافت دور ہو چکی تھی تو آنکھ بھی جلدی کھل گئی تھی۔ منہ پر پانی کے چھینٹے مار کر وہ چکن میں چلی گئی یہاں تانی اور حرانا شے کی تیاری کر رہی تھیں۔

شہادت کی انگلی موڑ کر میز پر مارتے اس نے انڈوں کو متوجہ کیا۔ چہرے پر زردی لیکن ڈھیر سکون تھی تھا۔ حرا سے نظریں تو وہ دونوں مسکرا دیں۔ یہ دوستی لی ابتدا تھی۔

”ایک کپ چائے ملے گی؟“ میز بجاتے اس نے پوچھا تھا۔

”ٹھیک سات منٹ بعد کھانے کی میز لگے گی۔“

”بہن لے گی“ حرا نے جواب دیا۔ ”کوئی آرہا ہے کیا؟“ سمجس سے آگے ہو کر اس نے پوچھا تھا۔ تانی بے ساختہ ہنس دیں۔ ”ہاں لے لیتا تم بھی۔“

”حرا تم جھے آپ جناب مت کہا کرو اب اتنی تی بڑی نہیں ہوں تم سے۔“

”اچھا نہیں کہی۔ ابھی تم یہ برتن اٹھا کر میز پر لائی۔“ تیزی سے ہاتھ جلاتے اس نے جواب دیا۔ ”اگر تروت نے ہاتھ روک کر ایک نظر اسے دیکھا تھا۔

کندھے اچکا کر وہ چیزیں میز پر رکھنے لگی تھی۔ وہ شش کھا کر گرنے کو تھیں۔ گھر کی باقی لڑکیاں کوئی کام کر دیتیں تو انہیں حیرت بھی نہ ہوتی لیکن علیہ..... وہ بھی حرا کے کہنے پر۔ وہ حرا جس کی وجہ سے ابھی دودن پہلے اس کی منگنی ختم ہوئی تھی۔

”ابھی..... یہ کیا ماجرا ہے۔“ وہ واقعی حیران ہوئی تھیں۔ حیران تو علیہ بھی ہوئی تھی جب گھر کے مختلف کونوں سے، بیڑھیوں سے ایک ایک کر کے ساری لڑکیاں، لڑکے ناشتے کی میز پر آ بیٹھے تھے۔ سب کی ناشتہ تھوڑے تھوڑے فرق سے تقریباً وہی تھی۔ سو اس نے باری باری سب کو قائل کر لیا تھا کہ وہ ایک وقت میں اکٹھے بیٹھ کر ناشتا کر لیا کریں۔ باسط، ذیشان اور چھوٹے ماموں ان سب میں شامل نہیں تھے۔

”یہ کب ہوا اور کیسے۔“ وہ چکن میں حرا کے پیچھے کھڑی حیرت سے پوچھ رہی تھی۔

”حرا! تمہارا نام بھرا ہونا چاہیے تھا۔“ نم آنکھوں سے وہ اس کے گلے لگ گئی۔

”یہ کب ہوا اور کیسے۔“ عقب سے ابھرتی ذیشان کی آواز پر وہ دونوں الگ ہوئیں اور ذیشان کی بات پر ہنسی چلی گئیں۔

یقیناً یہ پہلی بار تھا جب حرا منصور اس گھر میں کھلکھلائی تھی اور ذیشان حیدر اس خوب صورت ہنسی کی بھول بھلیوں میں گم ہو گیا تھا۔ آنے والی نئی راتیں اس نے اس ہنسی کے تعاقب میں گزار لی تھیں۔

☆☆☆

”حرا..... بیٹا ذرا میرے کندھے تو دبا دو، ہر وقت لیٹے رہنے کی وجہ سے درد ہونے لگتا ہے۔“ وہ دیوار گیر الماری درست کرتے ہوئے رکی۔ ”بس ایک منٹ نا تو۔“ سارا پھیلاوا انھوں میں سمیٹ کر وہ ان کے پاس تھی۔

”آپ سارا دن بیٹیں رہ رہ کر بور نہیں ہوتیں؟“ نرمی سے ان کے کندھے پیچھے ہوئے وہ ان سے پوچھ رہی تھی۔

”بہت دل گھبراتا تھا شروع شروع میں۔ ہمارا مشترکہ گھر بیلو نظام تھا۔ شادی سے پہلے بھی اور بعد میں بھی۔ ہر وقت آنا جانا لگا رہتا تھا۔ اللہ بخشے بہت مہمان نواز تھیں میری ساس۔ پھر اتنا بڑا خاندان۔ بہت روفق ہوتی تھی ہمارے گھر میں۔ بیمار ہوئی تو جیتے جی قبر جی لی میں نے۔“ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر وہ خاموش ہوئی تھیں۔

”تو پھر آپ باہر کیوں نہیں۔“ اس نے سوال خود ہی ادھورا چھوڑ دیا تھا۔ اگر وہ خود کہیں آنے جانے کے قابل ہوتیں تو اس ایک کمرے تک کیوں محدود رہتیں۔ یہاں رہتے اسے اتنا تو اندازہ ہو گیا تھا کہ یہاں کے رہنے والوں کے پاس اور تو کچھ ہو سکتا ہے لیکن ایک دوسرے کو دینے کے لیے وقت نہیں۔ یوں بھی ایک بوڑھی عورت جس کی دنیا ایک کمرے اور گئے دنوں کی یادوں پر مشتمل تھی، اس سے نئی نسل کو کیا غرض ہو سکتی تھی اور اس نسل کے لیے کمانے کی مشین بنے والدین کے پاس ان کے لیے وقت نکالنا کتنا مشکل ہوتا ہوگا۔ جزییشن گیپ کا مطلب اسے اب سمجھ میں آیا تھا۔

وہ عجیب سی سوچوں کا شکار ہوئی تھی۔ اس مسئلے کا حل اس نے یوں نکالا کہ اس شام جب ماموں نانوں سے ملنے کمرے میں آئے تو نانوں سورہی تھیں، اس نے ماموں سے کہہ کر ان کے لیے وہیل چیئر منگوا لی تھی۔ ماموں نے حیرانی سے اس لڑکی کی طرف دیکھا تھا۔ ان کی ماں بھی اور دس سالوں سے بستر پر تھی جانے انہیں اس بات کا خیال کیوں نہیں آیا تھا۔ وہ روز رات ان کے پاس کچھ وقت گزار کر گویا اپنے فرض سے سبکدوش ہو جاتے تھے۔ آج احساس ہوا تھا کہ انہوں نے کیسی سزا دیے رکھی تھی اپنی ماں کو۔ جب وہ سگی اولاد ہو کر ماں کے حقوق بھول بیٹھتے تھے تو بیوی بچے کیسے ان کی ماں کی پروا کرتے۔ پروا کے لبادے میں چھپی بے پروائی جیسے لحوں میں ہوا ہوئی تھی۔ ہوتا ہے نا بعض اوقات ایک چیز روزمرہ میں شامل ہو کر اپنا احساس کھو دیتی ہے اور پھر کسی ایک

لفظ، ایک اشارے سے پوری طرح جی اٹھتی یہی ان کے ساتھ ہوا تھا۔ اگلی سہ پہر وہ خود ان کے لیے وہیل چیئر لے کر آئے تھے۔

نانو ایک لمبے عرصے کے بعد اس قید خانے میں آئیں تو پتا ہی نہیں تھا کہ یہ آزادی بھی حرام ہوں منت تھی۔ بڑے عام سے منظر جواب دہ سے نکل ہی چکے تھے، ایک بار پھر لوٹ آئے تھے خوشی سے ان کی آنکھوں سے پانی بہنے لگا تھا۔ دیر سہی پر ان کے بیٹے کو ان کا خیال تو آیا۔

ہموار سڑک پر ان کی وہیل چیئر دھکیلے ماموں خود بہت دور تک گئے تھے۔ انہیں ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ خود آج اس ہوا میں عرصے بعد سانس لے رہے تھے۔ سورج اپنے آخری بڑاؤ کی طرف رواں دواں تھا۔ پارک میں فٹ بال کھیلنے بچے جیسے ان کا بچہ تھے۔ کچھ چھوٹے بچے غباروں کے ساتھ خوش رہے تھے اور کچھ بچے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ یہی تو اصل زندگی تھی۔ یہی تو فطرت خوشیاں تھیں۔ پھر وہ کیا تھا جس سے انہوں نے اپنا اور زندگیاں بھری تھیں۔ شاید ہوس اور لالچ۔ ان کے اندر سے ہی جواب آیا تھا۔ ایک بھر پور شام اپنی ماں کے ساتھ گزار کر وہ ہشاش بشاش گھر لوٹے تھے۔

”نانو باہر جا کر مجھے بھول گئیں نا۔“ نانو کو دکھ کر حرا نے مصنوعی دکھ سے کہا تھا۔

”پتا ہے بچہ جب دنیا دیکھتا ہے تو سب بھول جاتا ہے۔ میں تو اپنی زندگی گزار چکی ہوں اب تو رونق میلے زندگی کا، زندہ ہونے کا احساس ہے۔ اب کچھ نہیں بھول سکتی میں۔“ محبت سے اپنا دایاں ہاتھ انہوں نے حرا کے سر پر رکھا۔ وہ ہنس پڑی۔

”تھینک یو حرا بیٹی!“ جاتے جاتے تم آنکھوں کے ساتھ ماموں اسے فکر یہ کہنا نہیں بھولے تھے اس رات ایک عرصے بعد اس گھر کے دو افراد کا کی نیند سوئے تھے۔

☆☆☆

”تھوڑا سادائیں طرف کرو۔“ خوب صورت

لوں سے حرا نے ایک فطری منظر کی پینٹنگ اٹھائے۔ ہار پر چڑھا اسے دیوار پر سیدھا لگانے کی کوشش کر لیا تھا جب کہ نیچے کھڑی حرا اسے ہدایات دے رہی تھی۔ ہر بار فریمیم دھماکی دایں طرف زیادہ ہو جاتا تو گی بائیں طرف۔

”بس آخری بار سیٹ کر رہا ہوں، ہو گیا تو ہو گیا۔“ وہ میں نیچے اتر جاؤں گا۔ آپ خود کریں گی۔“ وہ ہان بوجھ کر چڑا رہا تھا۔

”میں تو پہلے بھی خود ہی کرنے لگی تھی۔ تمہاری دیر دانا نا ہارٹ ہو رہی تھی۔“ سیاہ چوڑے شیشے والی ملب ناک پر جمائے، میرون چپک والی شرٹ کی اینٹیں کہیں تک فولڈ کیے وہ بھی برابری کی بنیاد پر آئے تیار ہی تھی۔

”ٹھیک ہے پھر اب خود ہی کریں، مجھ سے یہ بات رائٹ پریڈ نہیں ہوتی۔“ منہ بنا کر وہ میز سے اپنے اترنے لگا تھا جب میز سفید ماربل سے پھسل کر اتر جا کر اور وہ چھلانگ لگا کر کچن کی کوشش میں اس نے آکر لایا۔ عین اسی لمحے باسٹ اندر داخل ہوا۔ حرا بری کو کندھے سے تھامے کھڑی تھی۔ یہ منظر باسٹ کی برداشت کی حد سے بہت پرے تھا۔ کچن کی تیزی نے آگے بڑھ کر اس نے ان دونوں کو الگ کیا تھا۔

”بھائی!.....“ شیری نے وضاحت کے لیے بھولا تھا۔

”شٹ اپ۔ جسٹ شٹ اپ۔ دفع ہو جاؤ ہاں۔“ شیری حیران پریشان کھڑا تھا۔ اسے اس کھڑا دیکھ کر وہ ایک بار پھر دھاڑا تھا۔ ”سنائیں تم نا دفع ہو جاؤ یہاں سے۔“ شیری منہ نیچے کیے در کمرے میں چلا گیا تھا۔

تمہاری غلط فہمی ہے۔ اب تم ایک گھر میں ہو۔ گھر کا مطلب پتا ہے؟ ہم عزت دار لوگ ہیں۔ یہاں رہنا ہے تو کم از کم عزت کے معنی سمجھ لو۔“

”اس عزت دار گھر کی لڑکیوں کے بدن سے چپکے لباس دیکھ کر اور آپ سے بات کر کے مردوں کی ذہنت کا اندازہ تو میں بھی لگا سکتی ہوں، فی الحال میں اے کسی موڈ میں نہیں کہ یہ سب سمجھتی پھروں اس لیے اپنے سینے پر فوکس کریں تو بہتر ہوگا۔“ اس کے اطمینان سے کہنے پر اس کے تن بدن میں آگ کی بھر مچی تھی۔

”لڑکی ہولڑی بن کر رہو، ورنہ اچھے سے دیکھ لوں گا تمہیں۔“ اس نے انگلی اٹھا کر وارن کیا۔

”ہاں ضرور یہ بھی یاد رکھیے گا آپ کی بھی دو بہنیں لڑکیاں ہے، انہیں کوئی انہیں بھی دیکھ نہ لے۔“ ”یو۔۔۔۔۔۔“ لہوں پر آنی کالی اس نے بڑی مشکل سے روکی تھی۔ پہلو کے بل گرے میز کو ایک زوردار ٹھوکر مار کر وہ باہر نکل گیا تھا۔

☆☆☆

اب صبح ناشتا بنانے کے لیے سینا اور علیہ بھی آجاتی تھیں۔ سو سب مل کر ناشتا بناتی تھیں جو ظاہر ہے جلدی بن جاتا تھا۔ حرا ناٹو کو لے کر ہر صبح پارک میں جاتے کا سوچتی لیکن ٹائمنگ ہی سیٹ نہیں ہو رہی تھی۔ آج بھی وہ سب ناشتے کی میز پر تھے جب باسٹ میٹر حیاں اترتا ہوا نظر آیا۔ غیر محسوس طریقے سے حرا چن میں چل گئی تھی۔

”ارے کیا بات ہے۔ کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہا، سب لوگ ایک وقت میں میز پر اور ساری کام چور لڑکیاں بھی موجود ہیں۔“ اسے آج اسلام آباد کام کے سلسلے میں جانا تھا اور اس کی آخری معلومات کے مطابق اس کی ماں اس وقت چن میں ہی پائی جاتی تھی سو وہ ان سے ملنے وہیں چلا آیا تھا۔

”بھائی۔“ رابی چلائی تھی۔

”اچھا سوڈی۔“ شیری کی پلیٹ سے آلیٹ کا ٹکڑا اٹھا کر اس نے منہ میں ڈالا۔

”اب تو یہ خواب مہینہ پرانا ہو چلا اور آپ آج دیکھ رہے ہیں“ سبین نے کہا۔

”مجھے تو کسی نے جھوٹے منہ نہیں پوچھنا تھا۔ اب واپس آ جاؤں تو میں بھی سب کے ساتھ ہی ناشتا کیا کروں گا۔“ اس کا موڈ خوش گوار ہوا تھا۔

اندر کھڑی حرائے نے ہی سوچ لیا تھا کہ اب وہ کم از کم ناشتے کے وقت کچن میں نہیں آئے گی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ کوئی باسط کی موجودگی کے ساتھ اس کی غیر موجودگی کا سرا جوڑے اس لیے باسط کے آنے کے آنے سے پہلے ہی اگلی صبح ہی وہ نانوں کے ساتھ پارک آگئی تھی۔ آج چھٹی کا دن تھا۔ پارک میں معمول سے زیادہ چہل پہل تھی۔ اتنے دن بعد اس نے تازہ ہوا میں سانس لیا تھا۔ زندگی ایسے تروتازہ لگ رہی تھی جیسے جیگ گھاس میں اگے ڈیزی کے سفید اور گلابی ننھے پھول۔ صبح کی نرم ہوائے ذہن و دل پہ طاری ساری کثافت کو اڑا دیا تھا۔ نانو پارک میں کھیلنے بچوں کو طرف دیکھ رہی تھیں۔ کچھ ہی فاصلے پر جاٹنگ ٹریک تھا۔ ”کتنے دن ہو گئے ایکس سائز کیے بغیر۔ وہ بے اختیار ہی دارم اپ کرنے لگی۔

”نانو میں ذرا ایک راؤنڈ لے کر آئی۔“ نانو نے بے توجہی سے سنا اور دیکھے بنا ہاتھ کے اشارے سے اسے جانے کی اجازت دی تو وہ جاٹنگ ٹریک کی طرف بھاگی۔

چار سو میٹر کے ٹریک پر دو راؤنڈ لگانے کے بعد ہی وہ نڈھال ہونے لگی تھی۔ ٹریک کے عین بیچوں بیچ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر جھکے ہوئے وہ سانس درست کرنے لگی۔

سیاہ لائننگ والی شرٹ کی آستین اس نے ہمیشہ کی طرح کھینوں سے ذرا آگے تک تک فولڈ کر رکھی تھیں۔ گلابی چہرے سرخ ہو کر دمک رہا تھا۔ گہرے سیاہ سلکی بالوں کی ٹکلیں چہرے کے اطراف میں چپکی تھیں۔ گہرے سانس لیتے سیدھے کھڑے ہو کر اس نے ناک پر دھرا چشمہ درست کیا اور دائیں ہاتھ سے پسینہ پونچھ کر ہاتھ جھکا۔ تب ہی اس کے عقب سے

کسی نے کندھے پر سے پانی کی بوتل اس کی طرف بڑھائی۔ بے ساختہ اس کی گردن پیچھے گھوم گئی۔ نرم سی نظروں سے نکلتا ڈیٹان اس کے پیچھے کھڑا تھا۔ ”نی کیس پانی جھوٹا نہیں ہے۔“ نظر دلا کر اسے پانی کی کٹج جا چکی وہ جھینپ گئی۔ بڑا دلکش سا کھلی کی رنگین اڑان بھر گیا تھا۔

ٹریک سے ہٹ کر وہ اوس میں بیٹگی گھاس بیٹھ کر پانی پینے لگی۔ اسے صبح میں اس وقت پانی کی شدید طلب محسوس ہو رہی تھی۔ پانی کی بوتل منہ سے لگائے وہ سانسے جھولتے بچوں کو دیکھ رہی تھی۔ اس سے کچھ فاصلے پر بیٹھا ڈیٹان کسی وقت نظر چرا کر اسے دیکھ لیتا۔ اچانک کچھ جھجک کر اس نے حرائی کی گردن کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ وہ کچھ کر خود میں سمٹ سی گئی تھی۔ اس کی شرٹ کے کالر پر گھاس کا ٹڈا تھا جو ڈیٹان نے پکڑ کر گھاس پر دوڑ پھینک دیا تھا۔

”آپ شرما رہی ہیں؟“ وہ دچکسی سے اس کے چہرے کے رنگ دیکھ رہا تھا۔

”آپ کا میرا شرمانے کا کوئی تعلق ہی نہیں شرمانا کیسا؟“ وہ حیران ہوئی۔

”کیا مطلب؟ شرمانے کا تعلق کون سا ہوتا ہے؟“ وہ اس سے بھی زیادہ حیران ہوا تھا۔

”شرمانے کا تعلق کسی ایک سے ہوتا ہے، وہ ایک جو اپنا ہوتا ہے باقی تو سب سے پھیر کا تعلق ہوتا ہے۔“

اس کی بات سمجھ کر وہ بے ساختہ ہنسا تھا۔

”مجھے لگا آپ ڈر جائیں گی۔“

”نہیں۔ میں نہیں ڈرتی ان بے ضرر مخلوق سے۔“ اسے بے اختیار ہی یاد آ گیا جب گھر میں کوئی چھپکلی، چوہا یا کاکر وچ آ جاتا تو ماما سپرے لینے اور کمرے میں چلی جاتیں اور ان کے آنے تک جھاڑو، واپیر یا جو بھی اس وقت میسر ہوتا، اس سے اس کا کام تمام کر چکی ہوتی۔

آنکھوں کی نمی نے حال دھندلایا تو شکر کے ساتھ اس کی بوتل تھا کہ وہ نانو کی طرف

گئی۔ ڈیٹان کے ہاتھوں نے نرمی سے بوتل کے دہانے کو چھوا جسے کچھ دیر پہلے ہونٹوں سے لگائے وہ پانی پی رہی تھی۔ وہ وہیں بیٹھا اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ آنکھوں میں بہت سے خواب تھے جن کے پورے ہونے کا خود اسے بھی یقین نہیں تھا۔

☆☆☆

اسے آئے ہوئے چار ماہ ہو گئے تھے اور گھر میں آنے والی خوش کن تبدیلیاں بھی ماموں کی نظر سے پوشیدہ نہیں تھیں۔ وہ لڑکیاں جو کمروں میں بیٹھ کر کھانا کھاتی تھیں اور ذرا سی دیر پروا دیا مچا دیتی تھیں اب صبح سویرے پاشا بنانے میں مدد کے لیے کچن میں موجود ہوتی تھیں۔ آئے دن جن میں کپڑوں جو توں اور فیشن پر تنقید کلامیاں ہوتی تھیں۔ اب انھیں بیٹھی جانے کن باتوں پر توجہ لگا رہی ہوتی تھیں۔ لاؤنج آباد ہونے لگا تھا۔ اماں جو سارا دن اکیلے رہتی تھیں اب وہ بھی ان کے درمیان موجود ہوتی تھیں۔ بچوں کا ان کے ساتھ رویہ بھی بہتر نظر آتا تھا۔ علیحدہ جو کسی کو کچھ تھکتی نہیں تھی وہ بھی حرا کا دم بھرتی تھی۔ (ماہ جبین بھی تو ایسی ہی تھی۔ جادوئی شخصیت والی۔ یہ سحر اسے اپنی ماں سے ہی ملا ہوگا) گھر کی عورتیں بھی اب تو جانے کن مسکوں پر تبصرے کرتے پانی جاتی تھیں اور تو اور لڑکے بھی اب کم از کم ساتھ بیٹھے نظر آتے تھے۔ چاہے ابھی ان میں کزنز والی بے تکلفی نہیں ہوتی تھی۔ کبھی کبھی کوئی ایک ٹکلی ہی سب! کبھی ذوریں سلجھا جاتی ہے۔ حرا وہ بارکرت نیکی تھی انھیں بھی اس کے لباس پر اعتراض تھا۔ ہاں تھا۔ اب نہیں تھا۔ لاؤنج میں سب کے درمیان بیٹھی وہ کوئی پروگرام دیکھ رہی تھی۔

”ادھر آؤ میرے پاس۔“ ماموں کے کہنے پر وہ اٹھ کر ان کے پاس آگئی۔ ”کوئی پریشانی ہے تو بیٹا بہو۔ اتنی اداس کیوں ہو۔“

”وہ۔ ماموں میں گھر جانا چاہتی ہوں۔ کچھ چیزیں لیتی ہیں۔“ قدرے سوچ کر اس نے جواب دیا۔

”ہاں بیٹا! ضرور چلی جانا۔ بتا دیتا کب جانا ہے باسط یا ڈیٹان تمہیں لے جائے گا۔“ انہوں نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

”میں تو آفس سے کسی صورت چھٹی نہیں کر سکتا۔ ڈیٹان سے کہیں وہ لے جائے گا، یوں بھی آپ ہیں تو اس کی جگہ کام دیکھنے کے لیے۔“ موبائل کی روشن اسکرین پر انگلیاں پھیرتے باسط نے قدرے تحقیر آمیز لہجے میں جواب دیا تھا جسے ماموں نے نظر انداز کر دیا تھا۔

”چلو میں ڈیٹان کو بھیج دیتا ہوں۔ کب جانا ہے؟“ یہ ظاہر لاعلم بنے ڈیٹان کے دل کی دھڑکن رکھی۔

”کل..... کل چلی جاتی ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔ ڈیٹان تم کل آفس سے آف لے لو۔ حرا کو گھر لے جانا۔“

”جی ٹھیک۔“ اس نے فرماں برداری سے اثبات میں سر ہلایا۔ ساتھ ہی ساتھ شکر بھی ادا کیا کہ اس وقت ممانے کچھ نہیں سنا ورنہ کوئی شک نہیں تھا کہ وہ کسی نا کے بہانے اسے روک ہی لیتیں۔

☆☆☆

چھوٹے سے گھر کی مختصر دیوار انگوڑی بیل نے ڈھک رکھی تھی۔ کچھاتے ہاتھوں سے تالا کھول کر حرا اندر داخل ہوئی تو وہ بھی اس کے پیچھے ہی اندر آیا تھا۔ ہوا کے جھونکے نے یکدم گلے لگ کر جیسے خوش آمدید کہا تھا۔ چھوٹے سے صحن کا آدھے سے زیادہ حصہ تو بیل نے ڈھک رکھا تھا۔ گرد کی تہ نے ہر چیز کو ڈھانپ رکھا تھا۔ دیوار کے ساتھ ایک قطار میں بڑے گلوں پر بے وقت خزاں اتری تھی۔ ایک طرف میا لے کپڑے سے بایک ڈھکی ہوئی تھی۔

”آپ ایک منٹ بیٹھیں پر رکھیں۔“ اسے کمرے کے دروازے میں روک کر وہ باہر بھاگی۔ واپسی پر اس کے ہاتھ میں ایک کپڑا تھا جو وہ یقیناً جھاڑو پونجھ کے لیے لائی تھی۔ پھر اس سے کہنے لگی۔

”مجھے یاد نہیں رہا ورنہ کھانے کا انتظام کر کے

آتی۔ اگر تکلیف نہ ہو تو کارنر شباب سے اٹھے اور کچھ چیزیں لادیں تاکہ میں کھانا بنا سکوں۔“
”لا دیتا ہوں بلکہ اگر آپ کہیں تو ریڈی میڈ کھانے کا بھی آپشن موجود ہے۔“

”بالکل بھی نہیں۔ آپ پہلی بار ہمارے گھر آئے ہیں اور میں آپ کو بازار کا کھانا کھلا دوں۔ بھی بھی نہیں۔“ اس کے لہجے میں اپنے گھر کا مان تھا۔ اس کا یہ انداز ذیشان کو بہت بھلا لگا تھا۔

”ٹھیک۔ بتادیں پھر کیا کیا منگوانا ہے۔“
اسے فہرست بتا کر وہ دوبارہ کمرے میں آگئی۔ سارے کمرے کو چھاننے کے بعد وہ ڈرینگ مرر کی طرف آگئی۔ وہ اس کے آنے سے پہلے پہلے کمرے کی حالت درست کر لینا چاہتی تھی۔ اس لیے ٹوٹی کھڑکی کے آگے پردہ لگا کر وہ مرر کو کھینٹ کر کھڑکی کے آگے کرنے لگی۔ کھینٹتے ہوئے ڈرینگ مرر کا ایک کونا فرش پر پڑے چھوٹے سے کھڑے میں پھنس گیا۔ اس نے کچھ زور لگا کر ڈرینگ کو اوپر کھینچا۔ تب ہی کھڑکی کا پردہ اس کے منہ پر آن گرا۔ اس کی گرفت ڈھیلی ہوئی۔ عین اسی وقت دروازے میں ذیشان نمودار ہوا اور حرا کی نظر بھٹک کر اس کی طرف چلی گئی۔ جانے کیسے اس کے ہاتھ سے ڈرینگ کا کونا چھوٹا اور ایک چٹخ کے ساتھ وہ نیچے بیٹھ گئی۔ ذیشان تیزی سے اس کی طرف لپکا۔ پاؤں کو ہاتھ سے دبوچے وہ درد برداشت کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کے گال آنسوؤں سے بھیکے ہوئے تھے۔ چشمے کے نیچے اس کی آنکھیں گلابی پڑ رہی تھیں۔ چہرے پر بڑے تکلیف دہ تاثرات تھے۔ ذیشان نے پاس بیٹھ کر نرمی سے اس کا پاؤں اپنی طرف کھینچا جسے اس نے فوراً سمیٹ لیا۔

”ادھر دکھائیں مجھے۔“ اب کی بار اس نے سختی سے کہتے دوبارہ پاؤں اپنے سامنے کیا۔ دایاں انگوٹھا پوری طرح نیلا پڑ چکا تھا۔ ایک طرف سے ناخن بھی آدھے سے زیادہ اکھڑ چکا تھا۔
”سپر گرل بننا ضروری تھا کیا؟ میں آجاتا تو مجھ

سے کہہ دیتا تھا۔“ اسے سچ میں غصہ آ رہا تھا۔ اس کی سسکیاں اسے حد سے زیادہ تکلیف دے رہی تھیں۔
”اچھیں اب ڈاکٹر کے پاس لے چلوں۔“

”نہیں۔ ہلدی باندھتے ہیں۔“ رندھی ہوئی آواز میں اس نے کہا تھا۔ کھڑی وہ اب بھی نہیں ہوئی تھی، ہوا ہی نہیں جا رہا تھا۔ چوٹ اگرچہ انگوٹھے پر لگی تھی لیکن اس وقت تکلیف پورے پاؤں میں ہو رہی تھی۔ وہ اس کے پاس ہی ٹھٹھوں کے بل بیٹھا ہوا تھا۔ پاؤں چھونے سے وہ اس کا گر بڑھ گیا تھا اس لیے اب چھو نہیں رہا تھا۔ کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد وہ جیسے سمجھ گیا تھا۔ اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ اسے سہارا دیتے ہوئے وہ بیڈ کی طرف لے جا رہا تھا۔ وہ اس کے اتنے قریب تھی اس کے باوجود وہ وقت ٹھہرنے کی دعا بھی نہیں کر سکا۔ اس کی تکلیف کا خیال نہ ہوتا تو وہ دعا کرتا یہ وقت بار بار آئے۔

بہت تکلیف سے وہ بیڈ تک پہنچی تھی۔ ”سائڈ ٹیبل کی دراز میں فرسٹ ایڈ باکس ہے۔ ذرا پکڑا دیں مجھے۔“ پاؤں پر ابھی بھی اس کی گرفت مضبوط تھی۔ نشان دہی کی گئی دراز میں سے باکس نکال کر وہ اس کے پاس آ بیٹھا۔ وہ اس کی پٹی کرنا چاہتا تھا لیکن اب وہ کافی حد تک خود پر قابو پا چکی تھی۔ ”ایک گلاس پانی پلیز۔۔۔۔۔“

وہ اس کے پاس سے اٹھ کر پانی لینے چلا گیا۔ اس کے واپس آنے تک وہ کسی چیز سے ناخن اکھاڑ کر الگ کر چکی تھی۔ چہرے پر اذیت، بھینچے ہوئے اور آنکھوں سے بہتا پانی اسے لگا وہ اسے جانتا ہی نہیں۔ ”یہ کیا کیا آپ نے؟“ اسے شاک لگا تھا۔

”ان کا تعلق ہمیشہ رہنے والا نہیں تھا اور جب تک رہتا تکلیف ہی دیتا۔ سو اپنے لیے تکلیف کا دورانہ مختصر کیا ہے۔“ انگوٹھے اور پاس پڑے ناخن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پاؤں پر پٹی لپیٹتے وہ کہہ رہی تھی۔

”میرا خیال ہے اب گھر چلا جائے“ گہری سانس بھر کر اس نے خود کو نازل کرتے ہوئے کہا

تھا۔ کیا تھی یہ لڑکی۔ نا قابل یقین۔
”ٹھیک کہا۔ کھانا تو اب میں بنا نہیں سکوں گی“ وہ زبردستی مسکرائی۔

”انتا بھی ضبط کرنے کی کیا ضرورت ہے حرا؟ میں جانتا ہوں آپ تکلیف میں ہیں پھر ہلکی کا تکلیف کیوں؟“ اسے حرا کی ہلکی سے دکھ پہنچا تھا۔
”آپ نے سنا نہیں مرہم ہر گھر میں ہونہ ہو، نمک ہر گھر میں ہوتا ہے۔“

”میرے پاس آپ کے لیے مرہم ہی ہوگا، نہیں تو اتنا یقین کر لیں میں نمک پاشی کرنے والوں میں سے نہیں۔ اگر بوجھ اتنا بڑھ جائے کہ اپنا آپ دب جانے کا، کھو جانے کا خدشہ ہو تو بائٹ لینے میں کوئی حرج نہیں۔ بعض اوقات جو بات ہمارے لیے بوجھ بنی ہوئی ہے سننے والا اسے آپ کے لیے ہوا سے ہلکا کر دیتا ہے۔ نہ تھکائیں خود کو پلیز۔“ اس کا دھیمبا لہجہ، اس کے لفظ ایسے آج تھے جو جلاتے نہیں تھے لیکن پگھلا دینے کی صلاحیت رکھتے تھے اور کون جانے حرا منصور نے پگھلا شروع کر دیا ہو۔

☆☆☆

علیہ کا رشتہ دیکھنے کچھ لوگ آ رہے تھے۔ گھر میں اچھی خاصی رونق ہو رہی تھی۔ رشتہ یاموں کے کسی دوست کے بیٹے کا تھا اور بہت امید تھی کہ رشتہ ہو جائے گا۔ اسی لیے بہت اہتمام کیا جا رہا تھا۔ نا تو بھی ڈرائنگ روم میں مہمانوں کے ساتھ تھیں۔ پاؤں میں تکلیف کی وجہ سے وہ کمرے میں ہی تھی۔ درد اتنا بھی نہیں تھا لیکن مامی نے خود ہی اسے آرام کا کہہ کر باہر آنے سے منع کر دیا تھا سو ابھی وہ اکیلی ناٹو کے کمرے میں بیٹھی بے زار ہو رہی تھی۔ بیٹھے بیٹھے اسے نیند آنے لگی تھی۔ ابھی اس کی آنکھ لگی ہی تھی جب کمرے میں کسی کی موجودگی محسوس کر کے وہ اٹھ بیٹھی۔ ذیشان دروازے میں کھڑا تھا اور اس کی نظریں حرا کے چہرے پر تھیں۔

”آپ سو رہی تھیں، میں بس جانے ہی لگا تھا۔“ حرا کو لگا جیسے وہ وضاحت دے رہا تھا۔

”سو نہیں رہی تھی۔ ہاں بس ابھی آنکھ لگی تھی۔“ معصومیت سے اس نے جیسے غلطی کا اقرار کیا۔ عینک کے شیشوں کے پیچھے آنکھوں میں بچی نیند کا خسار گلابی ڈوروں کی صورت تیر رہا تھا۔ وہ ہمیشہ ترتیب ہی میں دکھائی دیتی تھی۔ چاہے رات کے بارہ کا وقت ہوتا یا صبح کے پانچ کا۔ یہ پہلی بار تھا جب ذیشان نے اسے بھری بھری حالت میں دیکھا تھا۔ ٹوٹی سے نکل کر بال بے ترتیبی سے چہرے کے گرد گرے ہوئے تھے۔ شرٹ پر بے شمار سلوٹیں نظر آرہی تھیں۔ وہ بے ساختہ ہنسا۔

”خیریت“ اس نے باباں ابرو اٹھا کر پوچھا۔
”وہی تو پوچھنے آیا ہو۔ ٹھیک ہیں آپ۔“
”جی ٹھیک ہوں اللہ کا شکر۔“

”ویسے جس بہادری سے آپ نے ناخن کو کھینچا تھا اس ظلم کی مجھے آپ سے توقع نہیں تھی“ جانے شکوہ تھا کیا کیا۔

”بہادری بھی کہہ رہے ہیں اور ظلم بھی پہلے سوچ لیں آپ کو لگتا کیا ہے اور تو بے توقع تو آپ کو رکھتی ہی نہیں چاہیے، تو قعات ٹوٹیں تو بہت دکھ ہوتا ہے۔ یہ بتانے کی ضرورت تو نہیں ناں۔“

وہ پھر ہنسا۔ ”میں تو سب بھول گیا ہوں۔ اب نئے سبق پڑھ رہا ہوں۔“ آہستگی سے کہتے وہ واپس مڑ گیا۔ دروازے کے سامنے سے گزرتے عبد الباسط نے ایک نظر ٹھٹک کر ذیشان کو اور ایک نظر اس کے پیچھے بستر پر نیم دراز حرا کو دیکھا اور بنا کچھ کہے آگے بڑھ گیا۔

☆☆☆

رات کے دو کا وقت تھا۔ اندھیرے نے ہر خوش رنگ منظر کو سیاہی کا ایک دھبہ بنا ڈالا تھا۔ وہاج ہاؤس کے باسی خواب و خمر گوش کے مزے لوٹ رہے تھے لیکن کوئی تھا جو رات کے اس پہر گھٹ گھٹ کر رونے پر مجبور تھا۔ گھٹتے سینے سے لگائے کروٹ پر لیٹی حرا نے آواز رو رو کر تھی۔ شام میں لاؤنج میں ہونے والی گفتگو اس کے دماغ پر ہتھوڑے برسا رہی

علیشہ کا رشتہ کیا ہوا تھا اور گھر کے بڑے بیٹے ہونے کے ناطے ماما کو باسط کی شادی کا بھی خیال آ گیا۔ باسط کے لیے انہوں نے حرا کی بات کی تھی۔ باسط جو دوست کے ساتھ ڈنر پر جانے کے لیے نکل رہا تھا ان کی بات سن کر لاؤنڈری میں ہی چلا آیا تھا۔ حرا کچن سے چائے بنا کر لا رہی تھی جب اس نے باسط کی آواز سنی۔ آواز بھی یا صور اسرافیل۔ وہ اپنی جگہ پر ہی سن ہو گئی تھی۔

گوئی اُسمان تھا جو سر پر گرا تھا۔ کیسے بے بنیاد
 الزام لگا تھا اس پر۔ علیہ والا معاملہ تو اپنی دانست
 میں وہ ختم کر چکی تھی۔ آج پتا چلا کہ اس کا دامن تو ابھی
 بھی داغ دار ہی تھا اور شیریں۔ وہ تو چھوٹا، بالکل چھوٹا
 سا بھائی تھا اس کا۔ اودہ میرے اللہ۔ کون تھا کون نہیں تھا
 اسے کچھ پتا نہیں تھا۔ کس نے کیا کیا کیا سنا وہ نہیں
 جانتی۔ وہ جیپ چاپ کمرے میں آکر سوتی بن گئی تھی۔

یہ سچ تھا کہ ذیشان کے نرم لہجے اور پر شوق نگاہوں سے وہ بہت پہلے اس کے دل کا حال جان گئی تھی اور یہ بھی سچ تھا کہ اس نے کبھی اس کے جذبات کی پذیرائی تو کیا اسے اس بات کا احساس بھی نہیں دیا تھا کہ وہ اس کی ہر از ہو چکی ہے۔ اگر وہ اسے خاموشی سے چاہ رہا تھا تو یہ اس کا اپنا فعل تھا اور وہ کیوں کسی کے فعل کے لیے جواب دہ ہوتی۔ اس نے پہلا فیصلہ ہی غلط کیا تھا سوا سب سدھارنا بھی اسے ہی تھا۔ بہت رو چکی تھی وہ ہر اب نہیں۔ چپکے سے اٹھ کر اس نے نانو کا فون اٹھایا اور مناسب الفاظ کے انتخاب سے ایک پیغام لکھا، ذہن نشین نمبر کو ایک بار دل میں دہرایا اور آہستہ آہستہ بند کر کے بیچ دیا۔ بھیجا گیا پیغام مٹا کر فون

وہ ٹریک پر پاگلوں کی طرح بھاگ رہی تھی۔
صبح کی خشک ہوا میں بھی اس کا وجود پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے اس کا پسینہ نہ کر بہہ جانے کا ارادہ ہو۔ اوائل سرما کا سورج اونچا ہو کر اس پاگل لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔ اس دائرہ کی ٹریک پر بھاگتے وہ زندگی کے دائرے سے نکلنے کی کوشش میں تھی۔ بے تحاشا بھاگنے کے بعد بھی وہ اسی مقام پر آ جاتی تھی جہاں سے آغاز کیا تھا۔ چہرے پر سخت پتھریلے تاثرات لیے لے نازی سے وہ بھاگتی ہی چلی جا رہی تھی۔

”میرے اللہ۔“ گالوں پر ہتھ آسوں کے ساتھ نانو نے بے اختیار اللہ کو پکارا تھا۔ تھکے جسم نے ساتھ دینے سے انکار کیا تو شل ٹانگوں کے ساتھ وہ نانو کی طرف آ گئی۔ دونوں کے درمیان کیسا خاموشی معاہدہ تھا کچھ نہ بوجھنے اور کچھ نہ بتانے کا۔

چوڑی طویل گھر کو جانی مشرک مڑتے ہی حرا کی
نظر میں گیٹ کے سامنے بائیک پر بیٹھے دیشان پر
پڑی۔ اس کے پاس ایک لڑکا کھڑا تھا جس کے
چہرے پر بیاہ ماسک تھا۔ قریب ہی ایک اور لڑکا ایسے

”شیری۔ شیری باہر آؤ۔ ذیشان اٹھیں۔ آ نکھیں کھولیں ہم آپ کو اسپتال لے جا رہے ہیں۔“ اس کے آنسوؤں نے ذیشان کا بھی چہرہ بھگو دیا تھا۔ پوری ہمت سے ذیشان نے آنکھیں کھول کر اس پری دس کو دیکھا۔ اس کے بعد اس کی آنکھیں بند ہو گئی تھیں۔ نرنب اس کا چہرہ پتھپتا رہی تھیں۔ گھر میں موجود سب افراد باہر نکل آئے تھے اور بد قسمتی سے ان میں گھر کا کوئی مرد شامل نہیں تھا۔

”شیری کہاں ہے؟“

”وہ تو کالج چلا گیا۔ مم..... میں ایسویٹس کالج کرتی ہوں۔“ سین اندر بھاگی۔

”کو..... رکھو بار آؤ۔ بہت خون بہہ رہا ہے۔“
سننے میں گولی لگی تھی جبکہ بانیک سے گرنے کی وجہ سے
سرگٹ کے پہلو میں کھڑے ستون سے جا کر لایا تھا۔
خون بے تحاشہ بہا رہا تھا۔ وہ مضطرب سی تھی۔

”آپ مل کر انہیں بانیک پر بٹھائیں۔ علیحدہ تم
بجناں کر بیٹھ جانا میں بانیک پر لے جاتی ہوں۔“
یہ سمجھ کر میں نے وہ اپنے حواسوں میں نہیں جبکہ ابھی تو
حواسوں میں لوٹی تھی۔ حلقہ سے اٹھ کر اس کے

قیمت	معنی	کتاب کا نام
500/-	ٹائپ چوہدری	فرید کے گدھے
250/-	ٹائپ چوہدری	مجدد شاہ
400/-	فرحت اشپانی	مہر
250/-	فرحت اشپانی	نیرودے گانو
500/-	فرحت اشپانی	جڑیاں چٹے
350/-	فرحت اشپانی	لہو لہریں
300/-	فرحت اشپانی	کھانک
400/-	آسیح پرنس	لوہی کی رہائی
400/-	آسیح پرنس	آزاد گزشتہ
200/-	میرہار	ایک نیا مہم
180/-	میرہار	مامل
450/-	میرہار	میرٹل
300/-	ہلک	لہو لہریں
120/-	ہلک	پتہ پاں کے گزے
300/-	ہلک	میرے خواہد ہوں
300/-	فرحت اشپانی	فرحت اشپانی
300/-	آسیح پرنس	میرے گزشتہ
500/-	رضا گزشتہ	میرے گزشتہ
180/-	زیر کار	میرے گزشتہ
180/-	زیر کار	میرے گزشتہ
250/-	زیر کار	میرے گزشتہ
150/-	فرحت اشپانی	میرے گزشتہ
350/-	رضا گزشتہ	میرے گزشتہ
300/-	میرے گزشتہ	میرے گزشتہ
400/-	میرے گزشتہ	میرے گزشتہ
400/-	میرے گزشتہ	میرے گزشتہ
300/-	میرے گزشتہ	میرے گزشتہ
400/-	میرے گزشتہ	میرے گزشتہ

بانیک سیدھی کی اور بیٹھ کر ہیملٹ پہن لیا۔ سب کی مدد سے ذیشان کو بانیک پر بٹھایا گیا۔ علیہ نے اسے پیچھے سے گلے سے لگا کر قابو کر رکھا تھا۔ اس کا چوڑا سینہ حرا کی پشت سے جڑا تھا۔ دونوں کے لیے اس کا وزن سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا اس کے باوجود ہمت کر کے وہ اسے ایک پراسٹیوٹ ہسپتال لے آئی تھیں۔ اگرچہ پولیس کیس تھا لیکن پیسے کی اہمیت سے کسے انکار ہے؟

علیہ نے سین سے لیے فون سے گھر فون کر کے ہسپتال کا بتا دیا تھا جس کی وجہ سے تھوڑی دیر میں ہی یاموں اور ماما وغیرہ آگئے تھے۔

”گولی کندھا چکر کر گئی تھی۔ اب صرف زخم ہے جس کی پٹی کر دی گئی ہے اور سر پر لگی چوٹ سے زیادہ خون بہا تھا غالباً اسی کی وجہ سے بے ہوش ہوئی تھی۔ وقت پر لے آنے کی وجہ سے بچت ہو گئی ہے۔ اب خطرے کی کوئی بات نہیں۔“ ڈاکٹر کے رٹے رٹائے جملے اس وقت کسی نعت سے کم نہیں تھے۔ سب نے اللہ کا شکر ادا کر کے شکریہ ادا کرنے کے لیے اسے دیکھا تھا مگر وہ وہاں بھی ہی کب؟

وہ تو ان سب کے وہاں پہنچتے ہی گھر واپس آگئی تھی۔ وجود مشکل اور طبیعت بری طرح مشکل تھی۔ اسے ڈیپر ساری تنہائی کی ضرورت تھی۔ تھکے تھکے قدموں سے چلتے ہوئے وہ اندر داخل ہوئی۔ دروازہ کھولتے ہی سامنے کھڑے شخص کو دیکھ کر ایک بار تو ٹھٹھک کر رہ گئی۔

”السلام علیکم! ابو۔“ چار قدموں کا فاصلہ طے کرنے میں سانس پھولنے لگی تھی۔ سامنے کھڑا شخص وہی تھا، جس کا نام اس کے نام کی پہچان تھا منصور احمد۔

سلام کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر پیار دیتے ہوئے اسے پہلو سے لگایا۔ نانو گنگ سی بستر پر بیٹھی تھیں تو حرا منصور احمد کے زندہ ہونے سے جا بھر گئی۔

”میں تمہیں لینے آیا ہوں کتنا وقت لگے گا پیکنگ میں۔“ نانو کو نظر انداز کرتے ہوئے بڑے نرم

لہجے میں انہوں نے حرا سے پوچھا۔
”بس پانچ منٹ۔“ نانو سے نظر چراتے
اندر چلی گئی۔

حرا کی بات سے نانو کو اتنا شاک لگا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے تو انہوں نے اتنے یقین سے منصور احمد سے کہا تھا کہ حرا اس کے ساتھ جانا تو دور اس کی شکل دیکھنا بھی گوارہ نہیں کرے گی۔ ایک باپ کے ہونے ہوئے اس نے قیموں کی طرح زندگی گزار رہی تھی۔ اب وہ کیسے اس باپ کے ساتھ جانے کو راضی ہوگی۔ انہیں تو یہ بھی پتا نہیں تھا کہ وہ زندہ ہے اور حرا جاتی ہے اور یہ بھی کہ اسی نے رات میچ کر کے انہیں بلایا تھا۔

”مجھے معاف کیجئے گا نانو میں نے کوشش کی تھی آپ کے ساتھ، آپ کے پاس رہنے کی لیکن ہر کوشش کامیاب تو نہیں ہو سکتی ناں۔“ اس کے لہجے میں صدیوں کی تھکن تھی۔ چند ماہ نے ہی اس لڑکی کو اتنا بے حال کر دیا تھا کہ وہ چاہے کبھی اسے روک نہ پائیں اور حرا منصور خاموشی سے ان کی زندگی سے نکل گئی۔

☆☆☆

بہت پہلے ہی اس نے ماں کے دکھوں کا پوچھ بانٹ لیا تھا۔ منصور احمد کی طلب کوئی اور تھی لیکن گھر والوں نے زبردستی ماہ جبین ان کے پلے باندھ دی تھی۔ دو سال تک انہوں نے مختلف حیلے بہانے اپنے ان چاہے سرال والوں کو تنگ کر کے رکھا۔ لیکن جانے وہ کس مٹی سے بنے تھے کہ ماہ جبین کو پھر بھی ان کے سنگ رخصت کر دیا۔ وہ نہیں جانتے تھے اس رخصتی کے لیے ماہ جبین نے کیا قیمت چکانی ہے۔ ماہ جبین کو اگر ان کی دلی وابستگی کا علم ہوتا تو شاید وہ اپنی ضد سے پیچھے ہٹ جاتیں۔ منصور احمد گھر والوں کے ہاتھوں مجبور انہیں بیاہ تو لائے لیکن بڑی مشکل سے ماں باپ کی زندگی تک اس ان چاہے رشتے کو نبھاتے رہے۔ ساڑھے تین سال کی مختصر مدت کا رشتہ ختم ہونے سے پہلے شاہینہ ان کی زندگی میں بیوی کی حیثیت سے آچکی تھی۔ انہیں لگا تھا ماہ جبین اسے گھر لوٹ جائے گی۔ وہ نئی زندگی میں کھو کر اسے

بھول چکے تھے اور بھلائے ہی رکھتے اگر شاہینہ انہیں اولاد دینے کے قابل ہوتیں۔ انہیں ماہ جبین کے پاس اپنی بیٹی کی یاد آتی۔ انہوں نے وہاں ہاؤس کا رخ کیا تو منہ کی کھائی پڑی۔ انہوں نے کچھ کہے سنے بغیر منصور احمد کو گھر سے نکال دیا تھا۔ پھر ایک اتفاق ہی تھا کہ وہ اپنے گھر اس گھر چلے گئے جہاں انہوں نے کرائے پر ماہ جبین کو رکھا تھا۔ ماہ جبین اپنا زیور اور جہیز قیمتی چیزیں کراس گھر کو خرید چکی تھیں۔ انہوں نے پہلی ملاقات میں ہی دروازے میں کھڑی ماہ جبین کے پاؤں پکڑ لیے تھے۔ حرا نے ماں کے پیچھے سے اس خوش حال شخص کو دیکھا تھا جس کی ایک تصویر کرے کی دیوار پر لٹکی تھی۔ حرا کو دیکھ کر وہ مامی بے آب کی طرح چلا تھا لیکن ماہ جبین نے اس کے منہ پر دروازہ دے مارا تھا۔ پھر وہ اکثر آنے لگا۔ بند دروازے کے پار کھڑا صدائیں لگا تا وہ شخص بھکاری نہیں تھا لیکن بھکاری بن گیا تھا۔ اولاد کی خواہش کیسی ظالم تھی۔ وہ اور شادی کر لیتا لیکن شاہینہ کو اذیت نہیں دینا چاہتا تھا۔

ماہ جبین جس نے اتنی اذیتیں اٹھائی تھیں وہ اس شخص کو یہ سکون نہیں دے سکتی تھیں۔ انہوں نے حرا کو سب کچھ بتا دیا۔ اس چھوٹے سے ذہن میں ہر بات غیر جانبداری سے ڈال کر اس سے فیصلہ مانگا تھا اور اپنے حق میں جواب سن کر آسودہ ہو گئی تھیں۔ انہیں یقین تھا منصور ان سے حرا کو چین نہیں سکتا اس کے باوجود انہوں نے حرا کو ایک مرد کی طرح پالا تھا۔ نزاکت اس کے قریب بھی نہیں آنے دی تھی۔ گھر کے سخت سے سخت کام کے لیے اپنے لفظوں سے ہمت دی تھی۔ اس کے خود پر اعتماد کے پودے کو تناور درخت بنانے میں جان لگا دی تھی۔ زمانے کے موسموں سے لڑنے کے لیے اس کا اندر مضبوط کیا تھا۔ حرا ایک ایسا موم تھی جو اپنی ماں کے بنائے سانچے میں با آسانی ڈھلتا چلا گیا۔ ماں کے بعد اس نے ماں کی خواہش کا احترام کرتے باپ سے دوری بنائے رکھنے کا فیصلہ کیا۔

ذرا سہارے پہنچتے ہی تیار ہو

عمران ڈائجسٹ

Email: id@khawateendigest.com

2018

کے شمار

ایک جگہ

واپسی کے

محبت وہ جذبہ ہے جو ساری کائنات کے لیے ایک مرکزی حیثیت رکھتا ہے اسی جذبہ کو بیان کرتی سیدہ عطیہ زہرہ کی ایک اچھوتی تحریر،

زبان خنجر

اعلاص کی ماری ایک دو شیزہ جو مقام پرستوں میں گمری ہوئی تھی رشتوں میں بدصورتی اور منافقت کا احوال بیان کرتا

جاوید راہی کا ترجمہ،

بادلوں کا محل

بدلے اور جذبات کی آگ میں جلنے والے اقدام راشد بن راحت کے قلم سے،

دھندلی را

دنیا میں سب گل ہاتھ لے کر قاتل کا کیا تھا، وچرل ایک عورت تھی

زر زور اور زمین دنیا میں شادی کی جڑیں

ماہ وش طالب کی کج بانی،

مقید خاک

پراسرار زمین سے وابستہ حیرت انگیز واقعات کی بازگشت،

ایک شخص کی آپ بیتی

ضواریہ ساحر کی ایک سفر جہاز خری مائل میں،

اس کے علاوہ دیپس دیپس کی روایتیں، سمبھیس اور تجسس سے بھرپور 9 مشہور و معروف مصنفین کی طبع رائے و ترجمہ کہانیاں

ستمبر 2018 کا تازہ شمارہ آج خریدیں

مرنے سے پہلے ماہ جبین نے اسے منصور کا نمبر
بجھ پتا دے دیا تھا کہ اگر وہ چاہے تو اپنے باپ کے
پاس چلی جائے۔ وہ اس وقت ان کے پاس جانا نہیں
چاہتی تھی۔ اس کے باوجود کئی راتیں وہ اس کا رڈ کو
ہاتھ میں لیے بیٹھی رہی یہاں تک کہ وہ منہ رو پتا اس
کے ذہن میں محفوظ ہو گیا تھا۔ منصور احمد ماہ جبین کی
وفات پر شہر سے باہر تھا وہ یقین ممکن تھا کہ وہ مرگ
والے گھر میں آکر بھلا پھلا کر اسے اپنے ساتھ چلنے
پر آمادہ کر لیتے۔ اس نے جان بوجھ کر انہیں لاعلم رکھا
تھا۔ اس نے اپنا فیصلہ خود کیا تھا۔ اسے تسلیم تھا کہ یہ
فیصلہ غلط تھا اور اب اس نے اس فیصلے کو سدھارنا تھا۔
منصور احمد اس کا باپ تھا، اسے اس کی چاہ تھی۔ اس
یہی بہتر لگا کہ وہ ان کے پاس چلی جائے۔ اب اگر
یہ بھی اس کا غلط فیصلہ تھا تو وہ دل و جان سے اس کے
نتائج بھگتے کو تیار تھی۔

☆☆☆

ذیشان کے ساتھ لیا گیا تھا تو صرف وہی جانتا تھا کہ
یہ سب بے بنیاد تھا۔ اسے اپنے لیے ایسے بے حال
ہونے دیکھنے سے پہلے تو وہ بھی نہیں جانتا تھا کہ اس
کی حرا کی زندگی میں کوئی اہمیت ہے۔ ہو سکتا ہے یہ
اس کے وہم ہی ہو۔ شاید اس کی جگہ گھر کا کوئی اور فرد
ہوتا تب بھی اس کا یہی رد عمل ہوتا لیکن دل تو خوش فہم
ہی تھا ناں۔

اس نے انتظار کیا تھا کہ شاید زینب اس سے
اس معاملے پر بات کریں۔ لیکن زینب اتنی پاگل نہیں
تھیں۔ باسط جس لڑکی کو مسترد کر چکا تھا وہ اسے
ذیشان کے لیے کیسے قبول کر لیں اگرچہ ان کا دل
نہیں مانتا تھا کہ حرا کا شری یا ذیشان سے کوئی ربط رہا
ہوگا۔ حرا یقین نہ بھی کرتیں تو اپنے گھر کے بچوں پر
انہیں پورا یقین تھا اور کچھ بھی ہو سکنے کے امکان کو نظر
میں رکھتے ہوئے انہوں نے ذیشان سے اس معاملے
پر کوئی بات نہیں کی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ ان کا بیٹا
اپنے منہ سے اقرار کرے کہ ان کا بھرم توڑ دے۔ ہاں
یہ اور بات کہ ذیشان حیدر نے پہلی بار ماں کے سامنے
اپنی خواہش پر اور نظر اٹھا کر رکھی تھی۔ وہ تو اسے دیکھ کر
حیران رہ گئی تھیں۔ ان کے سامنے کھڑا ان کا اپنا بیٹا تھا
انہیں خود کو یقین دلانا پڑا تھا۔ وہ نہ تو اکھڑتا نہ ضدی
لیکن اس کی بات میں ایک عزم تھا، التجا تھی۔ انہوں
نے بار بار اس کی خواہش کو رد کیا اور وہ بار بار ان کے
باس آتا رہا یہاں تک کہ الفاظ ختم ہو گئے تھے۔ وہ ان
کے پاس اب بھی آتا تھا لیکن اب اس کی زبان نہیں
نظر سوال کرتی تھی۔

☆☆☆

گھر میں علیہ کی شادی کا چنگامہ جاگ اٹھا
تھا۔ متقی کے بعد سے ہی جہیز کی تیاری شروع ہو گئی
تھی لیکن اب تو تمام لڑکیوں کو اسے کپڑے اور
کپڑوں کے ساتھ کی میپنگ چیزوں کی فکر ستا رہی
تھی۔ بارات کے لیے ہال بک کر دیا گیا تھا لیکن
مہندی کے لیے لڑکیاں کسی طور پر بھی ہال کے لیے
راضی نہیں ہوئی تھیں۔

”دس بجے تو ہال کا ٹائم ختم ہو جاتا ہے اور دس
بجے تک تو ہمارا فنکشن شروع بھی نہیں ہوتا۔ سب کی
منتظرہ رائے یہی تھی اسی لیے مہندی کے فنکشن کے
لیے گھر ہی سجایا گیا تھا۔ گیندے کے زرد پھولوں اور
سرخ مہین کپڑے کے پردوں سے سجاوٹ کی کئی
تھی۔ فنکشن کے لیے لان میں انتظام کیا گیا تھا۔
وسیع لان کو دو حصوں میں تقسیم کرتی سرخ کارپٹ کی
رہ گزر بنائی گئی تھی جس کی اطراف میں خواب ٹاک
سبز روشنی کے گلوب تھے۔ رہ گزر کے اختتام پر سرخ
وسیع پھولوں سے نشست کی چھت بنائی گئی تھی۔
اطراف میں انہیں پھولوں کی لڑیاں تھیں۔ نشست
کے علاوہ پورا لان نیم تاریک تھا۔ نشست پر دو دھیا
سفید روشنی تھی۔ علیہ روایتی پیلے رنگ کے جوڑے
میں ملبوس خود بھی زرد پھول لگ رہی تھی۔ ہر تھوڑی
دیر بعد وہ مضطرب سی ادھر ادھر نظر دوڑاتی۔ اسے حرا کا
انتظار تھا۔ دادو سے منصور احمد کا پتہ لے کر اس نے حرا
کے نام شادی کا کارڈ پوسٹ کیا تھا اور اسے یقین تھا
کہ حرا ضرور آئے گی۔

تقریب شروع ہونے میں وقت تھا۔ مہندی
لگانے کے لیے پارلر سے لڑکیاں بلوائی تھیں۔ جب
وہ آئیں تو ان کے ساتھ ایک اور لڑکی بھی تھی۔ چہرہ
شناس تھا لیکن وہ پہچان نہیں پائی۔ چند سیکنڈ کے بعد
ذہن میں حرا کی شبیہ ابھری تو علیہ کی جج نکل گئی۔
جامہ دار کے برعکس سرخ غرارے پر آدھی آستین والی
اوپن شارٹ شرٹ کمر تک آتے بالوں میں بڑے
بڑے کرل لہریں سی پیدا کر رہے تھے۔ مانگ سے نکلتی
چھوٹی سی ہندا کشادہ ماتھے پر چمک رہی تھی۔ وہ اس
وقت وہ حرا لگ ہی نہیں رہی تھی جسے وہ سب جانتے
تھے۔ اس کے کپڑوں اور میک اپ کا لحاظ کیے بغیر
علیہ بری طرح اس کے گلے لگی تھی۔

”مجھے یقین تھا تم ضرور آؤ گی۔“ اسے زور
سے سمجھتے ہوئے وہ بولی تو حرا مسکرا دی۔
باری باری وہ سب سے ملی تھی اور یہ بھی شکر کہ
گزی باتوں کا کسی نے ذکر نہیں کیا تھا۔ کسی نے بھی

اس کے خاموشی سے چلے جانے کی وجہ نہیں پوچھی
تھی۔ جہاں سب ہی اس کے خالص لڑکی والے
روپ بہ حیران تھے وہیں سب ہی نے جی بھر کر اسے
نمرانا بھی تھا۔ آج تو اس کے چھپ ہی نرمائی تھی۔ نا تو تو
ویسے بھی اس کے صدمے واری چاہتے نہیں تھکتی تھیں
آج تو وہ لگ بھی اتنی پیاری رہی تھی۔ اپنی بیس سالہ
زندگی میں یہ پہلی شادی تھی جس میں وہ شریک ہوئی
تھی۔ سب کچھ بھلا کر وہ خوش تھی۔ لان کے ایک
کونے میں بیٹھی وہ یہ سب دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہی تھی
جب رانی آکر اس کے سر پر سوار ہوئی۔

”چلیں میری تھوڑی سیلپ کروا دیں، مہندی
کی پلٹیں نیچے لانی ہیں۔“ وہ اس گوشہ عافیت سے نکلتا
نہیں چاہتی تھی۔ یوں بھی اس کا لباس اس کے لیے
امتحان بنا تھا۔ بہت سے بہانے بناتے اس نے بہتیرا
منع کیا لیکن وہ اسے لیے بغیر گئی نہیں۔ بمشکل اپنے
کپڑے سنبھالتی وہ اس کے ساتھ چل دی۔

دونوں ہاتھوں میں مہندی کی پلٹیں پکڑے وہ
سیڑھیوں سے اتر رہی تھی۔ دو پٹا فریال نے کندھے
سے لے جا کر کمر پر باندھ دیا تھا، اس کے باوجود
غرارے سے انھن ہو رہی تھی۔ اس کا دھیان
کپڑوں کی طرف ہوا تھا جب کسی لڑکی کے پاس سے
گزرنے پر اسے ہلکا سا دھکا لگا اور اسے غرارے سے
الٹ کر وہ توازن کھو بیٹھی۔ مہندی کی پلٹیں ہلکے سے شور
سے زمین پر جا پڑی تھیں اور وہ اوپر آنے کے لیے
پہلی سیڑھی پر قدم رکھے باسط پر۔ شاخ گل کی طرح
چلکیلا بدن اپنی فطری خوشبو کے ساتھ اس کی ہانہوں
میں جھول رہا تھا۔ اسے لگا جیسے وہ مہک سا گیا ہو۔
اس کے حواس اس کے ساتھ نہیں تھے۔ اگر وقت روکا
جا سکتا تو وہ یہیں روک لیتا۔ اس کی بند آنکھیں ایک
دم سے کھلی تھیں اور باسط کو کرنٹ لگا تھا۔ ایک لمحے کی
تاخیر کے بغیر وہ پھٹکی کی طرح تڑپ کر اس کی بازوؤں
سے لگی تھی۔ ایک نگاہ غلط بھی اس پر ڈالے بغیر وہ
وہاں سے چلی گئی تھی۔ وہ کیوں اس کو کوئی وضاحت
دیتی۔ مہندی کی پلٹیں وہیں پڑی تھیں اور وہ اسی

سیڑھی پر کھڑا تھا۔

”حرا.....!“ سرگوشی کی صورت اس کے ہونٹوں سے اس کا نام ادا ہوا تھا تو یہ حرا بھی۔ خوش گوار سنی حیرت نے اسے گھیر لیا تھا۔ حرا کے جانے کے بعد ممانے باسط کے روپے پر بہت افسوس کیا تھا۔ وہ چاہتی تھیں کہ وہ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کر لے۔ آخر اس کی ماں تھیں اور جانتی تھیں کہ اس کے لگائے سب الزام بے بنیاد اور جھوٹے تھے۔ تب اس نے نخت سے منہ پھیر لیا تھا۔ اور اب اس ایک لمحہ میں فیصلہ از خود ہو گیا تھا۔ مسکراتے ہوئے گیا لحد سوچتے وہ آگے بڑھ گیا۔

☆☆☆

تقریب دور سے دیکھتے ہوئے بھی وہ بے حد لطف اندوز ہوتی تھی۔ باری باری سب لڑکیوں نے اسے بلایا بھی لیکن وہ اپنی جگہ سے نہیں ہٹتی۔ ان کپڑوں کی وجہ سے جو ہو گیا تھا وہ کافی تھا۔ وہ مزید کوئی تماشا نہیں چاہتی تھی۔ سب لڑکیوں نے مہندی لگائی تو بے حد اصرار سے حرا کے ہاتھوں پر بھی مہندی لگا دی۔ یہ پہلی بار تھا جب حرا نے اس کی پہلی مہکائی تھی۔ رات کافی بیت چکی تھی اور کسی کے سونے کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ پوری کوشش کے بعد بھی وہ بچے تک اس کی آنکھیں نیند سے بند ہونے لگی تھیں۔ ناٹو کو ادھر ادھر دیکھا لیکن وہ نظر نہیں آئیں تو وہ ان کے کمرے میں چلی گئی۔ اس کا اندازہ تھا کہ وہ اپنے کمرے میں ہوں گی لیکن وہاں کی کونا پائروں لیٹ کر سو گئی۔

مہندی کی تقریب ختم ہوتے ہوتے سحری کا وقت ہو گیا تھا۔ سب اپنے اپنے کمروں میں سونے کے لیے جا چکے تھے۔ ذیشان بھی کام نمٹا کر سونے کے لیے کمرے میں آیا تھا جب ایک خواب کو بستر پر سوتے دیکھا۔ کھلے بال اس کے سینے پر بکھرے تھے۔ ایک ہاتھ سینے پر اور دوسرا اس کے پہلو میں تھا۔ لمبی انگلیوں کی پوریں مہندی سے سرخ ہوئی تھیں۔ وہ گہری نیند میں تھی۔ حرا..... یہاں..... اس کے کمرے میں۔ اس کا دل جیسے دھڑکنے بھول گیا تھا۔ شاید اس کی نیند کے احترام میں کہ کہیں دھڑکنے

اس پری وٹ کے آرام میں مل نہ ہوں۔ سردیوں میں دادو سے بیڑی کی گرمانش برداشت نہیں ہوتی تھی اس لیے سردی کے کچھ مہینے وہ ان کے ساتھ کمرہ بدل کر آ کر رہا تھا۔ اسی غلط فہمی کی وجہ سے وہ یہاں بھی۔ سنو راپوٹ لیے اس کی خواہش اس سے چند قدم کی دوری پر تھی۔ وہ اس کے قریب ہوا۔ اس کی پرشوق نگاہیں اس کے چہرے پر جمی تھیں۔ وہ سوتی ہوئی بھی کھل کر مسکرائی دی۔

کس لیے تم نیند میں شرما رہے ہو اس طرح خواب میں کیا آگے ہیں ہم تمہارے سامنے بڑی آہستگی سے اس نے شعر گنگنایا۔ مندی مندی سی آنکھیں کھل کر بند ہوئیں اور اگلے ہی لمحے پوری کھل گئیں۔ پلکوں تلے خوابوں کی پوری وادی سانس لے رہی تھی۔ چشمے کے شیشوں کا جابجی اب تو حائل نہیں تھا۔ اس کے دل کو گدگدی سی ہوئی۔

”آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟“

”میں آپ کو سوا ہوا دیکھ چکا ہوں اس لیے میں یہ نہیں پوچھوں گا۔ آپ بتائیں میرے کمرے میں کیوں سو رہی ہیں؟“ اس کا لہجہ شریر ہوا تھا۔

”آپ کا کمرہ؟“ گردن جھما کر اس نے ارد گرد دیکھا۔

”یہ تو ناٹو کا کمرہ ہے۔“

”اطلاع کے لیے شکریہ لیکن آپ کو اپنی معلومات اپ ڈیٹ کرنے کی ضرورت ہے کیوں کہ سردیوں میں یہ کمرہ میرے استعمال میں ہوتا ہے۔“

”اوہ۔ سو سو۔“ وہ ایک جھٹکے کے ساتھ بستر سے اٹھی تھی۔

”آپ جا چیں تو یہاں سو سکتی ہیں“

”نہن..... نہیں۔ شکریہ۔ مجھے پتا نہیں تھا۔“

تھا۔ پہلا قدم اٹھاتے ہی وہ ڈگمگائی۔

”سنبھل کر۔“ لودیتی نظروں سے نکتے ذیشان نے اس کے بازو پکڑ کر سہارا دیا۔ وہ اس سے چند قدم دور ہو کر کھڑی ہوئی تھی۔ کھڑکی سے مسکرائی چاندنی شرینظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے کس کی گرمانش حرا منصور کی نرم ہاتھوں سے ہوتے ہوئے اس کا دل پکھلا رہی تھی۔ وہ یہی طرح نروس ہو رہی تھی۔ جھک کر ہیڈلار کر اس نے ہاتھ میں پکڑ لی۔ جانے کے لیے وہ اس کے قریب سے گزری تھی جب بے اختیار ذیشان نے اس کا راستہ روک لیا۔

”ایسے بھی بہت اچھی لگ رہی ہیں۔“ بوجھل لہجے میں کہہ کر اس نے راستہ چھوڑ دیا۔ سب نے اس کی تعریف کی تھی لیکن دل ایسے تو کسی کے کہنے سے نہیں دھڑکا تھا پھر اب کیوں اور اس کیوں کا جواب وہ جانتا نہیں چاہتی تھی یا جانتی تو تھی بس ماننا نہیں چاہتی تھی۔ دھڑکنے سنبھالتی وہ باہر نکل گئی۔ وہ اسے جاتا دیکھ رہا تھا۔ حسانی خوشبو میں بے نیکی پر اسے باقی کی رات جاگ کر گزارنا تھی۔

☆☆☆

بارات آنے والی تھی۔ ثروت ہال کے دروازے میں کھڑی اس بچہ پر دلہن بنی علیحدہ کو دیکھ رہی تھیں۔ ڈیپ ریڈ کمرے کے روایتی لہنگے میں اس کا روپ کسی شہزادی کی طرح دمک رہا تھا۔

”آپ پریشان ہیں ماما؟“ انہیں ایسے گم صم کھڑے دیکھ کر اندرا تا باسط ان کے پاس رک گیا۔

”ارے نہیں۔ پریشانی کس بات کی۔ سوچ رہی ہوں اگر میرا بیٹا ہاں کر دیتا تو آج اس کے بھی سہرے کے پھول کھل جاتے۔“

”آج ہاں کر دوں تو؟ وہ خوش مزاجی سے بولا تو ثروت کو حیرت کا جھکا لگا۔ باسط اور ایسی خوش مزاجی۔ قرب قیامت کی نشانی تو نہیں۔

”اب تو تھوڑا وقت تو دو۔ میں کوئی لڑکی دیکھ لوں۔ پیاری۔“

”تو جو لڑکی پہلے ڈھونڈی تھی۔ وہ پیش کش ختم

ہو گئی کیا؟“ اس نے بات کاٹی۔ بظاہر اس نے ہلکے پھلکے انداز میں بات کی تھی لیکن ثروت بھی ماں تھیں۔ وہ جانتی تھیں یہ سب بے وجہ نہیں اسی لیے ایک دم چونک اٹھی تھیں۔

”تو کیا میں حرا کے لیے ہاں سمجھوں“

”بالکل۔ دل و جان سے ہاں ہے۔“ سینے پر ہاتھ رکھ رکھ کر وہ جھکا۔

”لیکن۔ تم نے تو کہا تھا.....“ انہوں نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

”بھول جائیں ماما! وہ..... وہ سب جھوٹ تھا۔ آئی ایم سوری۔ میں اس سے بھی معافی مانگ لوں گا۔ آپ بس جلدی سے بات کہیں۔“ ان کے پہلو میں کھڑے باسط نے ان کے گلے میں ہاتھیں ڈال کر لاڈ سے ان کے کندھے پر سر رکھا۔

”ضرور بیٹا! بس ذرا شادی سے فارغ ہو لیں تو میں اماں سے بات کرتی ہوں کہ وہ منصور سے بات کریں۔ ظاہری بات ہے حرا ان کی بیٹی ہے۔ اور ان کے پاس ہے تو ان سے پوچھنا پڑے گا۔“ انہیں نے سوچتے ہوئے اسے تسلی دی۔

”آئی لو یو ماما! یو آر دایسٹ ماما ان ڈاور لڈ۔“ اندر آتی ہوئی زینب نے ایک ایک لفظ بغور سنا تھا۔ تو اب عید الباسط بھی اس کا طلب گار ہوا تھا۔ اس سے بہتر موقع انہیں کب مل سکتا تھا باسط کی خواہش پر ذیشان کی خوشی کو فوقیت دے کر جیشیانی کو نیچا دکھانے کا۔ بیٹی کی رخصتی کو بھول کر ان کا دماغ نئے جوڑ توڑ میں مصروف ہو گیا تھا۔ انہیں جو بھی کرنا تھا یکے پیروں پر اور جلدی کرنا تھا۔ ذیشان کی باران کے سامنے اپنی خوشی کے لیے کھڑا ہوا تھا۔ وہ جانتی تھیں اس کی طبیعت میں لہروں کی شوریدگی نہیں، وہ گہرا اور ٹھہرا سمندر ہے۔ وہ تو بھی اپنی ضرورت کے لیے بھی ان تک نہیں آیا تھا لیکن حرا ایک ایسی خواہش، ایسی خوشی تھی جس کے لیے وہ بار بار ان تک آتا رہا، اس کی ہر نظر سوال بن گئی تھی۔ اب وہ اس کی خواہش پوری کر کے پوری زندگی کے لیے اس کے آگے سرخرو ہو سکتی

تھیں۔ حراسے تو انہیں پہلے بھی کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ وہ فوراً ساس کے پاس جا چکی تھیں۔ ایک وہی تھیں جو اس معاملے میں ان کی مدد کر سکتی تھیں۔ آخر ان کی اکلوتی اور پیاری نواسی کا معاملہ تھا۔ پھر لڑکا بھی ذیشان جیسا ہیرا تھا وہ ہیرا جسے کسی تراش کی بھی ضرورت نہیں تھا۔

حسب توقع وہ سن کر ہی خوش ہو گئی تھیں۔ ہتھیلی پر سرسوں بجاتے وہیں ہال میں منصور احمد سے بھی بات کر لی گئی تھی۔ انہوں نے سارا اختیار احرار کو یہ کہہ کر دے دیا تھا کہ اس کی زندگی ہے اگر اس رشتے سے اسے خوش ملتی ہے تو انہیں وہ اس کی خوشی کے لیے دل و جان سے راضی ہیں۔

حراسے بات کرنے کی ذمہ داری بھی نانوکو سونپ دی گئی تھی۔ زینب چاہتی تھیں کہ جلد از جلد سب کچھ طے پا جائے۔ ان کے دل میں جیٹھانی کی طرف سے ایک خوف سا تھا کہ تاخیر کی صورت وہ جیتی بازی نہ ہار جائیں۔ اسی لیے انہوں نے بار بار تاکید کے ساتھ جلد بات کرنے کا وعدہ لیا تھی۔

علیہ کی رخصتی کے بعد جب گھر آئے تو سارے ہی لاؤنج میں بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ موضوع سخن بلاشبہ علیہ کی شادی کی تقریب تھی۔ کس نے کیا پہنا، کون کہاں سے تیار ہوا، کون کیسا لگ رہا تھا، کل کیا پہنا جائے وغیرہ۔ اسی لیے کچھ حرا کو وہاں اپنا آپ مس فٹ لگ رہا تھا۔ اسی لیے کچھ دیر زبردستی وہاں بیٹھے رہنے کے بعد وہ اٹھ کر نانوکو کے کمرے میں چلی گئی۔ ہائی ٹیل کی وجہ سے پیروں میں شدید درد ہو رہا تھا۔ ہیل اتار کر اس نے بال بوتی میں قید کیے اور تبدیل کرنے کے کپڑے نکالنے لگی۔ شکر ہے کپڑوں کی وجہ سے آج کچھ تماشائیں ہوا۔ لائے ہوئے کپڑے چھوڑ کر وہ صبح استون درک تھیں شلوار لے آئی تھی سو کوئی مسئلہ نہیں ہوا تھا۔ وہ چیخ کرنے جا رہی تھی جب شیریں نانوکو کمرے میں چھوڑ گیا تھا۔ انہیں بستر پر لٹا کر وہ ان کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

”اندر کیوں آگئی تھیں؟“

”ویسے ہی۔ مجھے ان جیسی باتیں نہیں آتیں اور نہ ہی مجھے ان کی باتوں کی سمجھ آتی ہے۔ اس لیے سو وقت برباد کرنے سے بہتر ادھر آ کر سو جاؤں۔“ اس کے انداز میں ایسی بے ساختگی اور بھولا پن تھا کہ انہیں بے اختیار اس پر پیارا آ گیا۔ وہ ذیشان کے ساتھ حراسے رشتے کی بات پر اپنا خوش تھیں کہ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد ہی اصل بات کی طرف آگئی تھیں۔

”زینب نے تمہارا رشتہ مانگا ہے ذیشان کے لیے اور منصور نے سب تمہاری مرضی پر چھوڑ دیا ہے۔ اب بتاؤ تم کیا چاہتی ہو؟“

اس کا چہرہ ایک دم بے تاثر ہوا تھا۔ نانوا اندازہ نہیں کر پائیں کہ ان کی بات پر وہ دھجی ہوئی تھی یا ناراض۔ کیوں کہ خوش تو وہ بہر حال نہیں تھی۔

”میرا اس گھر اور اس گھر کے افراد سے جو تعلق ہے میں اسے ہی برقرار رکھنا چاہتی ہوں اور میں چاہتی ہوں کہ مجھے کسی بھی نہ رشتے کے لیے مجبور نہ کیا جائے۔“ آہستگی سے کہہ کر اپنے کپڑے اٹھاتی وہ تبدیل کرنے چلی گئی۔

اس کا دل چاہ رہا تھا وہ خوب سارا رو لے۔ خوشیوں کی دستک پر اس نے دروازہ تو بند کر لیا تھا لیکن اب محبت کی صدا پر کان کیسے بند کرے؟ ذیشان کوئی ہیرہ نہیں تھا۔ عام سی شکل و صورت والا عام سا لڑکا تھا اور باسط جیسے خوش شکل کے سامنے کچھ زیادہ ہی عام لگتا تھا۔ اب یہ تو حراجاتی تھی یا اس کا خدا کہ وہ اس کے لیے کتنا خاص تھا۔ انجان دیس میں نظروں سے چھلنی کرتے لوگوں میں وہی تو تھا جو خاموش آنکھوں سے اس کی مسجانی کرتا تھا۔ اتنے پتھر بھوں میں اکیلا پھول برسانے والا بھی خاص نہ ہوتا تو کون ہوتا؟ وہ ان عام سی آنکھوں سے جھلکتے پر خلوص محبت کے جذبات کی اسیر ہوئی تھی اور اب جب دل میں چھپی دعائیں مستجاب ہونے کا وقت آیا تھا تو اس نے خود انکار کر دیا تھا۔ عبدالباسط سے اسے شدید نفرت محسوس ہوئی تھی۔ اس رات اس نے واپسی کی تیاری شروع کر لی تھی۔ پاپا کو کوئی کام تھا جس کی وجہ سے

انہیں آج ہی واپس جانا پڑ گیا تھا اور اگر نانوا اس سے پہلے بات کر لیتیں تو یقیناً وہ بھی ان کے ساتھ ہی چلی جاتی۔ بے دلی سے ویسے کی تقریب دیکھ کر جب علیہ کو گھر لے کر آئے تو اپنا مختصر سامان اٹھا کر نانوکو اللہ حافظ کہتی وہ وہاں ہاؤس سے باہر نکل آئی تھی۔ پاپا سے کہہ کر اس نے گاڑی منگوائی تھی۔ باہر آ کر اس نے گاڑی کی تلاش میں نظر دوڑانا شروع کی ہی تھی جب سیاہ وٹراس کے عین سامنے آ کر رکی۔

”زیادہ وقت نہیں لوں گا بلکہ اگر کہیں گی تو آپ کو گھر تک چھوڑ آؤں گا۔ پلیز بیٹھیں۔“

ڈرائیونگ سیٹ سے اتر کر گاڑی کا اگلا دروازہ کھولے ذیشان اس احترام سے کہہ رہا تھا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے قدم آگے بڑھ گئے۔ اس سے بیک پڈ کر اس نے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول کر اندر رکھ دیا اور آ کر اس کے برابر بیٹھ گیا۔ تارکول کی سیاہ سڑک پر گاڑی انجان منزلوں کی طرف چل پڑی۔ خاموشی بڑی خاموشی سے ان کے ساتھ ساتھ تھی۔ پہلے تو وہ چپ چاپ اس کے بولنے کا انتظار کرتی رہی لیکن جب کافی دیر تک وہ کچھ نہیں بولا تو خود ہی بات شروع کی۔

”آپ کیوں آئے ہیں؟“

”یوں ہی.....“ اس نے سرسری سا جواب دیا۔

”انکار کی وجہ جاننے آئے ہیں؟“

”نہیں انکار کو اقرار میں بدلنے“ ایک گہری نظر اس پر ڈال کر اس نے جواب دیا۔ حراسے دل مضبوط کیا تھا۔ وہ کسی کو کسی سوال کا جواب نہیں دینا چاہتی تھی اسی لیے خاموشی سے نکل رہی تھی۔

”وہ کیسے؟“

”جب تک ڈاکٹر کو مرض نہ بتائیں وہ کس بیماری کا علاج کرے گا؟“

”ڈاکٹر قابل ہو تو مرض کی تشخیص بھی خود ہی کر لیا کرتا ہے۔“

”او کے۔ اب سیدھی بات۔“ گاڑی اس نے

بچوں کے لئے

چھوٹی چھوٹی کہانیاں



بچوں کے مشہور مصنف

حمود خاور

کی لکھی ہوئی بہترین کہانیاں

پر مشتمل ایک ایسی خوبصورت کتاب جسے آپ اپنے بچوں کو تحفہ دینا چاہیں گے۔

ہر کتاب کے ساتھ 1 ماسک مفت

قیمت - 300/- روپے

ڈاکٹر خاور - 50/- روپے

بندوبست گاہک منگوانے کے لئے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

ایک جگہ روک دی تھی۔ ”اگر آپ باسط کے لگائے الزامات کی وجہ سے انکار کر رہی ہیں تو یقین کر س جتنا آپ کو ان کے جھوٹے ہونے کا پتا ہے ہم سب کو بھی آپ پر انتہائی یقین ہے۔ تاہم ثروت کے سامنے اس نے خود مانا ہے کہ وہ جھوٹے اور بے بنیاد الزام تھے۔ ماما نے خود سنا تھا۔“ اپنی مرضی کی کانت چھانٹ کر کے زینب نے ذیشان سے بھی ان باتوں کا ذکر کیا تھا۔ وہ اسے یہی تاثر دے رہی تھیں کہ باسط کی باتوں کی وجہ سے وہ اس رشتے سے انکاری تھیں۔

”حرا! آپ بے فکر رہیں میرے لیے میری خوشی اور چاہت سے بھی اہم آپ کی عزت ہے اور میں کیا یہاں سب ہی آپ سے محبت کرتے ہیں آپ کی عزت کرتے ہیں۔“ اپنے ہاتھوں پر نظر جما کر بیٹھی حرا حیران ہوئی تھی۔ اس نے تو آج تک خود سے بھی اعتراف نہیں کیا تھا کہ باسط کی باتوں سے دل برداشتہ ہے۔ وہ ان لوگوں کے ساتھ چار دن بھی اس الزام کے ساتھ نہیں رہ سکی تو عمر بھر کیسے رہ سکتی تھی۔ وہ اعتراف کرتی بھی کیسے؟ اس کا ضمیر اسے ملامت نہ کرتا کہ وہ جو کردار کی بات پر لڑنے کو حق سمجھتی ہے وہ ایسے کیسے سب چھوڑ کر جاسکتی ہے۔

”آپ کو ان سب کی محبت اور عزت کا احساس کبھی نہیں ہوا؟“

”احساس ہے تب ہی تو میں بھی پیار کرتی ہوں“ اس نے آہستگی سے جواب دیا۔ نظریں اب بھی اپنے ہاتھوں پر تھیں۔

”آپ سے بھی.....“ بے ساختہ روانی میں کہہ کر اس کی شرارت سمجھ میں آنے پر اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ وہ کھل کر ہنسا تھا اور اس کی ہنسی سے حرا بری طرح جھینپ گئی۔ اس کا جھکا سر مزید جھک گیا۔ اس کے شرمانے کا منظر ذیشان نے بڑی دلچسپی سے دیکھا تھا۔ اس نے ہمیشہ اسے پراعتماد اور سرانگھا کر بات کرتے دیکھا تھا۔ سو اس کے لیے اس

کے یہ انداز غیر متوقع تھا۔

”آپ شرمانی بھی ہیں؟“ اس کے شرمانے سے وہ شوخ ہوا تھا۔

”کیوں؟ پراعتمادی لڑکیاں بے شرم ہوتی ہیں؟“ وہ سرانگھا کر فوراً بولی تھی۔ اس کی حاضر جوابی سے ذیشان بہت محظوظ ہوا تھا۔ دونوں کا مشترکہ ہنسی کا مناظرہ ہوا۔ اس میں مہر کا تھا۔ آسمان پر چاند نے ان کی نظر اتاری تھی۔

☆☆☆

حرا کا اقرار نے گھر بھر میں برقی رودروازی تھی۔ ابھی تو علیہ کی شادی کا ہنگامہ تھا تھا کہ ایک اور شادی۔ ارے بھئی نکاح ہی تو شادی ہوتی ہے نا۔ علیہ تو اتنی خوش ہوئی تھی کہ نئے نوے دو لے کر کبھی لحاظ کیے بغیر اسے ہاتھوں سے پکڑ کر گھما دیا تھا۔ اگرچہ پاپا نے ایک دو بار اس خواہش کا اظہار بھی کیا تھا کہ گھما کر گھما کر چند دن پہلے یہ معاملات طے پا جاتے تو علیہ کے ساتھ ذیشان کی بھی شادی کر دی جاتی لیکن علیہ خوش تھی کہ بھائی کی شادی اس کی شادی کے ساتھ نہیں رکھی گئی ورنہ اپنے اکلوتے بھائی کی شادی اس نے خاک انجوائے کرنی تھی۔ ثروت اور باسط کے علاوہ سب ہی خوش تھے۔

ثروت پر تو یہ خبر بجلی بن کر گرئی تھی۔ ان کے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اتنی جلدی ہاتھ سے سب نکل جائے گا۔ ان کے لیے تو دہرا صدہ تھا۔ وہ سین کے لیے ذیشان کا سوچے بیٹھی تھیں۔ اس بات کو بھلا کر منہ منہ سے کہا تھا علیہ کا باسط کے لیے دیکھ لیں گھر کی بیٹی گھر میں رہ جائے گی۔ علیہ انہیں خود ہی پسند نہیں تھیں سو انہوں نے اس بات کو آگے نہیں بڑھایا۔ حرا کی جگہ کوئی اور ہوتی تو شاید ان کو اتنا دکھ نہ پہنچتا۔ حرا تو انہیں بھی پسند تھی اور اب تو باسط بھی رضامندی دے چکا تھا اور باسط۔ اسے حرا سے محبت تھی پانچویں اس بات کا فیصلہ وقت پر بھی چھوڑ دیا جائے تو فی الحال وہ اس کی شدید ترین خواہش تھی۔ وہ خواہش جو شہدہ کی تھی۔ نا آبودہ خواہشیں

شدید نہ بھی ہوں تو دل سے نکلنے میں وقت لیتی ہیں۔ اب تو حرا کو رہنا بھی اسی گھر میں اور اس کی نظر کے سامنے تھا۔ یہ نامل خواہش اس کی پراسی اور ہار قبول کرنا کم از کم اس کے لیے اتنا آسان نہیں تھا اس لیے کسی کے بھی علم میں لائے بغیر اس نے اپنی پوشیدہ دوسرے شہر میں کروالی تھی۔ ابھی تک کے لیے وہ انتہائی کر سکتا تھا۔ بہت جلد اس نے ملک سے باہر جانے کا بھی ارادہ باندھ لیا تھا۔ حرا سے نفرت کے ساتھ رہنا اس کے لیے زیادہ آسان تھا۔ کاش وہ اس کے لیے قابل نفرت ہی رہتی۔ کاش اس کے احساس اس کے لیے ناپسند نہ تھے۔ کاش اس نے ماما سے بات نہ کی ہوتی۔ لاتعداد کاش تھے جو اس کی زندگی مشکل بنا رہے تھے۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کسی جادو کے زور پر خود کو غائب کر لیتا۔ کچھ خواب ایسے بھی ہوتے ہیں جو جتنے بھی مختصر ہوں تاوان میں پوری عمر لگ جاتی ہے۔ حرا کی محبت بھی اس کے لیے وہی خواب تھی۔

☆☆☆

منصور احمد کے لاکھ انکار پر بھی نانوں نے ان کی ایک نہیں چلنے دی اور حرا کے نکاح کی تقریب دہاج ہاؤس میں ہونا قرار پائی۔ اصل میں ذیشان چاہتا تھا کہ نکاح کسی میرج ہال یا کہیں بھی اور نہ ہو بلکہ اس پاکیزہ رشتے کی بنیاد اس گھر میں ہی رکھی جائے تاکہ محبت کو امر کرتے ان لمحوں کو وہ جب چاہے کھلی آنکھوں سے جی سکے۔ نانوں نے جس طرح حرا کا انکار سب سے خفیہ رکھ کر اس سے بات کی تھی اور پھر اسے منانے اس سے بات کرنے کا موقع فراہم کیا تھا اسی طرح وہی اس وقت بھی اس کے کام آئیں۔ اپنی بیماری کا بہانہ بنا کر انہوں نے سب کو چپ کر دیا تھا اور اس طرح ایک بار پھر لان کو نئے سرے سے آراستہ کیا گیا تھا۔ اس تقریب میں صرف قریبی رشتہ داروں کو مدعو کیا گیا تھا۔ ارادہ تھا کہ رخصتی پر سب کو اکٹھا کر لیا جائے گا۔ سوروشیوں میں نہانے لان میں چند گئے چنے مہمانوں کی موجودگی میں فی پنگ میکی

میں ملبوس دہن بنی حرا کے جملہ حقوق ذیشان حیدر کے نام لکھ دیے گئے تھے۔

گلابی رنگت والی کانچ کی گریڈ ذیشان کی پرشوق نگاہوں سے بری طرح شرماری تھی۔ اس نے وہاں سب کے سامنے کھانا کھانے سے بھی انکار کر دیا تھا۔ تب ہی ماموں کے کہنے پر اسے کھانا کھانے کے لیے سین اسے اندر لے جانے کے لیے آگئی۔ بھاری زیور اور بڑے سے دوپٹے کے ساتھ کام والی میکی اور اس پر اس کا میک اپ۔ سب سے بڑھ کر اس کی جیل۔ دلہناپے کے روپ سے اچھے وہ اچھی تو اس کی نظر دو قدم دور ہونوں میں دبی مسکراہٹ سے اسے دیکھتے ذیشان پر بڑی۔ جلدی سے نظر جھکا کر اس نے تیزی سے قدم بڑھائے اور بری طرح لڑکھڑائی۔ اس کا ہاتھ سین کی گرفت سے نکل چکا تھا۔ عین ممکن تھا کہ وہ دلہن بنی زمین بوس ہو جاتی ایک لمحے کی تاخیر کیے بنا آگے بڑھ کر ذیشان نے اسے سنبھال لیا۔ قریب سے ہی ”اودو.....“ کی آواز بلند ہوئی۔ ہونٹ کاٹتے وہ اپنی میکی سیٹ کرنے لگی۔ سین اس کے پیچھے کھڑی اس کا دوپٹا ٹھیک کر رہی تھی جب سب کی نظر بچا کر ذیشان اس کے قریب ہوا۔

”آپ ٹراؤزر شرٹ ہی پہنا کر بس پھر مجھے بھی آپ کے پیچھے بایک پر بیٹھنے میں آسانی ہوگی۔ ایسے کپڑے کمرے تک کے لیے رکھ لیتے ہیں تاکہ جب بھی گریں مجھ پر ہی گریں۔“ اس کی شوخ نگاہیں حرا کی آنکھوں میں محبت ناسے لکھ رہی تھیں۔ حرا کا چہرہ شرم سے سرخ ہوا تھا۔ اسی وقت فریال نے ہاتھ میں پکڑے کمرے سے اس خوب صورت لمحے کا عکس قید کر لیا تھا۔ محبت نے سنہری خوشبوؤں کی رہ گزر پر قدم رکھ دیے تھے جہاں لکھ لکھ خوشیوں کے چراغ روشن تھے۔

☆☆

نگہت عبداللہ

پہلیس سوچ بید گئیں

حیدر علی اور احمد علی دو بھائی تھے۔ حیدر علی بڑے تھے، چھوٹے بھائی احمد علی کے لیے وہ مشفق باپ تھے۔ احمد علی کا انتقال ہو چکا تھا اور حیدر علی جس حد تک نمن ہوتا بھانوج اور بچوں کی مدد کرتے ہیں۔

حیدر علی کو ان کے مزاج کے برعکس بیوی ملی تھیں۔ وہ جتنے نرم خوتے حمیدہ بیگم اسی قدر تیز و طرار اور کسی حد تک بد زبان بھی۔ احمد علی کی بیوی فائزہ ان ہی کی طرح نرم مزاج اور درگزر کرنے والی تھیں۔

حیدر علی کی تین بیٹیاں سپنہ، خزینہ اور شہرینہ تھیں جبکہ احمد علی کے دو بچے حمزہ اور بیلا تھے۔

سپنہ کی شادی ہو چکی ہے۔ خزینہ اپنے باس تیمور غزنی کو پسند کرتی ہے جبکہ خزینہ کا خالہ زاد شریل اس کو چاہتا ہے۔ حمزہ اور شہرینہ کا رشتہ، حیدر علی نے حمیدہ بیگم کی مرضی کے خلاف بھائی کی زندگی ہی میں ان کی کم عمری ہی میں کر دیا تھا جو وقت کے ساتھ ان کے دلوں میں بھی مضبوط ہو چکا ہے۔

حیدر صاحب کا آفس میں دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہو جاتا ہے۔ حمزہ کو جا ب مل جاتی ہے لیکن اس کے باس حسان صاحب کی بیٹی ریکا اس کو پسند کر لیتی ہے جو قافو قافا حمزہ کو اپنی باتوں سے پریشان کرتی ہے۔

تیمور غزنی اور سارہ کی کوئی اولاد نہیں ہے سارہ مس کیرج ہونے کی وجہ سے اب بھی ماں نہیں بن سکتی۔ سارہ، تیمور سے اپنی دوست زوئی کا بے بی لینے کا کہتی ہے لیکن تیمور اس بات پر دل سے رضا مند نہیں ہے۔



سونا کے مشورے پر تیمور دوسری شادی کے لیے سوچنے لگا ہے اور خزینہ اسے بالکل موزوں نظر آتی ہے لیکن وہ خزینہ سے جھوٹی محبت کا اظہار کرتا ہے اور اسے سارہ کے بارے میں نہیں بتاتا اور کہتا ہے کہ فی الحال کھر والے راضی نہیں ہیں اس لیے وہ خزینہ سے چھپ کر شادی کرے گا اور بعد میں انہیں منالے گا۔ خزینہ تیمور کی محبت میں رضا مند ہو جاتی ہے اور حمیدہ بیگم کو بھی اس شادی پر راضی کر لیتی ہے۔ تیمور خزینہ کو ایک الگ فلیٹ میں بیاہ کر لے جاتا ہے۔

گیارہویں قسط



”سارہ بہت شوق سے بچے کی شاپنگ کرتی پھر رہی ہے۔ ابھی بھی اسی سلسلے میں لگی ہوئی ہے۔“ بابا نے سارہ کے لیے اس کی پریشانی سمجھتے ہوئے بتایا پھر اپنا سوال دہرایا۔

”کس کا بچہ ایڈاپٹ کر رہے ہو؟“

”جی وہ..... میرا ایک دوست ہے۔“

”دوست؟“ بابا کی آنکھوں میں ہنوز سوالیہ نشان تھا۔

”آپ نہیں جانتے بابا اسے۔ بولٹن یونیورسٹی میں ہم ساتھ تھے۔ اور کیونکہ ہمارے شعبے الگ ہیں اس لیے پارٹنر وغیرہ میں ہمارا ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا نہیں ہے۔“ وہ اب سنبھل کر بول رہا تھا۔

”ہوں۔“ بابا ہنکارا بھر کر جانے کیا سوچنے لگے تو اسے اس موضوع سے ہٹنے کا موقع مل گیا۔

”سارہ کب لگی ہے ماما؟“

”شام سے کچھ پہلے..... تم اسے فون کر کے معلوم کرو کہاں ہے۔“ ماما نے بتا کر کہا۔

”جی.....“ اس نے جیب سے سیل فون نکالا اور نمبر پیش کرتے ہوئے ان کے کمرے سے نکل کر اپنے کمرے میں آتا تو بیل جاتے ہی سارہ کے سیل فون کی ٹون کمرے میں گونجنے لگی۔

تیور غزنی نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا پھر سارہ کے سیل فون پر نظر پڑی تو خاصا بددل ہوا۔

”شٹ.....“ وہ لائن کاٹ کر بیڈ پر ڈھس گیا۔ اب انتظار کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ لیکن اسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ وہ ابھی چیخ کرنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ سارہ شاپرز سے لدی پھندی کمرے میں داخل ہوئی اور اسے جوتوں سمیت بیڈ پر نیم دراز دیکھ کر تعجب سے پوچھنے لگی۔

”تم ابھی آ رہے ہو کئی!“

”نہیں دیر ہوئی۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ پھر اس کے سیل فون کی طرف اشارہ کیا تو وہ معذرت کرنے لگی۔

”سوری..... سوری تمہی! میں سیل لے جانا بھول گئی اور سچ میں خود اتنی پریشان ہوئی۔ یہی خیال رہا کہ تم مجھے کال کر رہے ہو گے اور اسی لیے تو میں جلدی آ گئی ہوں۔“

”اچھا رکھو یہ سب اور جلدی سے کھانا لگاؤ میں چیخ کر کے آتا ہوں۔“

وہ اس خیال سے کہ کہیں سارہ اپنی شاپنگ دکھانے نہ بیٹھ جائے فوراً واش روم میں بند ہو گیا اور قصد اس نے شاور لینے میں کچھ دیر لگائی تھی۔ پھر سیدھا ڈائننگ روم میں آیا تو سارہ کھانا لگا چکی تھی۔

”ماما..... بابا.....؟“ اس نے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”وہ مغرب کے بعد کھالیتے ہیں پھر بھی میں نے ان سے ابھی پوچھ لیا تھا۔“

سارہ کو شاید بھوک لگی تھی اس نے اپنی پلیٹ میں سالن نکالتے ہی کھانا شروع کر دیا تو وہ بے دھیانی میں اسے دیکھنے لگا۔ شاید اس لیے کہ خزیہ لاکھ بھوک بھوک چلاتی لیکن اس سے پہلے تو الہ نہیں توڑتی تھی، یہ پہلا غیر ارادی موازنہ تھا۔ جسے لاشعور سے شعور تک سفر کرنے میں زیادہ وقت نہیں لگا کہ کھانے کے بعد جب سارہ بچے کی شاپنگ اسے دکھا رہی تھی تو اس کی نظروں میں خزیہ کا چہرہ سما گیا۔ جس کے چہرے پر چمکتی الوہی خوشی کے مقابلے میں سارہ بھیگی پڑ گئی تھی۔ اور یہاں وہ پھر ڈسٹرب ہو گیا تھا۔ رات جانے کیا کیا سوچتا رہا اور صبح آفس پہنچتے ہی سو نیا آبی کو فون کیا اور اس کی کھلتی آواز سنتے ہی بولا تھا۔

”آپ کی میں بہت پریشان ہوں۔“

”کیوں اب کیا پریشانی ہے؟ ماشاء اللہ باپ بننے والے ہو۔“ سونیا کم ہی سنجیدہ ہوتی تھی۔

”ہاں لیکن میری کچھ بھی مجھ میں نہیں آ رہا دھر خزیہ بچے کے لیے اتنی حساس ہے اور ادھر سارہ دن گن رہی

شہرینہ نے آنکھیں بند کی تھیں کان تو بند نہیں کیے تھے پھر بھی اسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ غالباً آنکھوں کے اندر خوف ناک منظر تھا جس نے اس کے حواس گم کر دیے تھے۔ کئی دیر بعد اسے حمزہ کی آواز دور سے آتی محسوس ہوئی تھی۔ وہ پوچھ رہا تھا۔

”کیا ہوا جب کیوں ہو گئیں۔ بولو ناں۔“

”حمزہ.....“ ہنوں کی بے آواز جنبش کے ساتھ اس نے ذرا سی آنکھیں کھولیں شفاف سڑک پر بابا ایک سے باتیں کر رہی تھی۔ کچھ دیر اسے حمزہ کی شرارت سمجھنے اور خود پر قابو پانے میں لگی۔ پھر محض اس پر جتانے خاطر کہ وہ خائف نہیں ہوئی تھی کھلتی آواز میں پوچھنے لگی۔

”اب ہم کہاں پرواز کر رہے ہیں؟“

”ارے تم زندہ ہو۔ میں تو سمجھا تھا تمہاری روح۔ وہ کیا کہتے ہیں.....“

”نفسِ عسری سے پرواز کر گئی۔“ اس نے فوراً گلزا لگا یا تو وہ بے ساختہ ہنسنا تھا۔

”ہنس لو تمہاری ہنسی تو میں گھر جا کر نکالوں گی۔ ابھی میں صرف انجوائے کرنا چاہتی ہوں۔ سچ حمزہ مجھے نہیں پتا تھا کراچی کی شاہیں اتنی خوب صورت ہوتی ہیں۔“ اسے دائمی ٹھنڈی ہوا کھلکھلا نے پر مجبور کر رہی تھی۔

”ہوتی تو نہیں ہیں۔ ابھی کیونکہ میں ساتھ ہوں اس لیے تمہیں ہر شے خوب صورت لگ رہی ہے۔“

نے چھیڑا تو وہ قصداً استہزاء انداز میں بولی گئی۔

”اوہو، خوش فہمی تو دیکھو۔“

”دل پر ہاتھ رکھ کر بتاؤ۔ خوش فہمی ہے یا حقیقت!“ حمزہ نے کہا تو اس نے جھٹ حمزہ کے دل پر ہاتھ رکھ دیا۔

”بے وقوف میرے نہیں اپنے دل پر۔“

”میرا دل تو پاگل ہے۔“ وہ کہہ کر ہنسی چلی گئی تھی۔

☆☆☆

تیور غزنی کو آج آفس میں دیر ہو گئی تھی۔ اٹھنے سے پہلے اچانک اسے خیال آیا کہ سارہ نے کال نہیں کی۔ اور اسے تو کام میں موقع ہی نہیں ملا تھا۔ لیکن سارہ وہ تو دیر ہو جانے کی صورت میں ضرور کال کرتی تھی۔ قدرے اچنبھے میں سارہ کو کال ملاتے ہوئے آفس سے نکلا تھا۔ دوسری طرف بیل جاتی رہی لیکن کال رسیو نہیں ہوئی۔ جس سے متوجش ہو کر وہ تمام راستہ بار بار ٹرائی کرتا رہا لیکن جواب نہ ارد۔ پھر گھر آتے ہی وہ تقریباً بھابھا قدموں سے اپنے کمرے میں آیا تھا۔

”سارہ.....!“ اس کی آواز گھبرائی ہوئی تھی۔

”سارہ.....“ کمرہ ڈزیننگ روم، واش روم وہ کہیں نہیں تھی۔

”کہاں چلی گئی۔“ اس کا دل ڈوب رہا تھا۔ لٹے پیروں ماما سے پوچھنے ان کے کمرے میں آیا تو بابا

وہیں موجود تھے۔

”ماما، سارہ کہاں ہے؟“ وہ سلام کرنا بھول گیا۔

”سارہ کو تم نے جس کام سے لگایا ہے وہ اسی میں مصروف ہے۔“ ماما کے جواب سے زیادہ ان کے

چہرے، سپاٹ لہجے سے الجھ کر وہ بابا کو دیکھنے لگا تو وہ اسے بیٹھنے کا اشارہ کر کے پوچھنے لگے۔

”کس کا بچہ ایڈاپٹ کر رہے ہو؟“

”جی.....!“ وہ اس اچانک سوال کے لیے تیار نہیں تھا۔

ہے۔ میں کیسے! کیا کروں گا۔“ ذہنی انتشار کے باعث وہ اپنا مفہوم واضح نہیں کر پا رہا تھا۔ لیکن سونیا پھر بھی تھی۔

”تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے تجھی۔ میں نے سب سوچ لیا ہے۔“

”ک..... کیا سوچا ہے آپ نے۔“ وہ الٹ ہوا تھا۔

”یہ میں ابھی بتاؤں گی۔ بس تم اطمینان رکھو۔ ان شاء اللہ سب ٹھیک ہوگا۔ اور ہاں کب کی ڈیٹ ہے ڈاکٹر نے؟“ سونیا نے اپنی طرف سے اسے اطمینان دلا کر پوچھا تو وہ گہری سانس کے ساتھ بولا تھا۔

”جانتی نہیں..... میرا مطلب ہے ابھی ڈیٹ نہیں دی۔“

”ٹھیک ہے۔ جب بھی ڈاکٹر ڈیٹ دے مجھے پہلے سے بتا دینا۔“

”اچھی بات ہے۔“ وہ خون رکھ کر سوچنے لگا کہ جانے سونیا نے کیا پلان کیا ہے۔

☆☆☆

شہرینہ کو آج اپنے گھر جانا تھا۔ اس نے خزیںہ سے کہا تھا کہ وہ پہلے عالیہ خالہ کے گھر جائیں گے اور وہاں سے امی کو ساتھ لیں گے۔ خزیںہ اس سے متفق ہو گئی تھی۔ لیکن جب نکلنے سے پہلے شہرینہ نے حمیدہ بیگم کو فون کیا تو معلوم ہوا کہ وہ گھر آچکی ہیں۔ یوں عالیہ خالہ کے ہاں جانا ملتوی کر کے خزیںہ پہلے اسے شاپنگ مال لے گئی جہاں اس نے خاص طور سے شہرینہ کے لیے شاپنگ کی۔ کیونکہ تیور غزنی نے اس سے کہا تھا کہ اس کی بہن پہلی بار ان کے ہاں رکی ہے تو وہ اسے یوں خالی نہ جانے دے۔ کوئی تحفہ ضرور دے اور اس نے اپنی طرف سے بھی تحفہ دینے کو کہا تھا۔ اس لیے جب شہرینہ نے منہ کیاتو وہ بڑے آرام سے بولی تھی۔

”یہ میں نہیں غزنی دے رہی ہیں۔ اگر تم نہیں لوگی تو وہ ناراض ہوں گے۔“

”لیکن خزی، یہ سب بہت زیادہ ہے۔“

”کوئی زیادہ نہیں اور اب بتاؤ کہاں چلتا ہے؟“ خزیںہ نے گاڑی اشارت کرتے ہوئے اسے دیکھا تو وہ سبھی نہیں۔

”کہاں چلتا ہے مطلب.....؟“

”مطلب گھر تو جاتا ہی ہے اور کہیں گھومنا چاہو تو.....؟“

”تو سمندر کا نظارہ کراؤ۔“ وہ فوراً بولی تھی۔

”کیوں، کل جزہ تمہیں ادھر نہیں لے گیا؟“

”نہیں سارا شہر کھمایا لیکن ادھر نہیں لے گیا۔ سچ بہت دن ہو گئے سمندر دیکھے ہوئے آخری بار یاد ہے تمہاری شادی سے پہلے ہم دونوں حمزہ کے ساتھ ہی گئی تھیں۔“

”ہاں اور میں نے کیا تمام شادی کے بعد روز آیا کرنا۔ لگتا ہے حمزہ نے وہی بات پکڑ لی ہے۔“ خزیںہ یاد کرتے ہوئے محظوظ ہوتی تھی۔

”اگر ایسا ہے پھر تو میں واقعی روز جاؤں گی۔“ شہرینہ بے ساختہ بولی تھی۔

”لیکن اب نوی دیکو کا حال برا ہے۔ اتنا گند مچا دیا ہے۔ میرا بالکل دل نہیں چاہتا وہاں جانے کو۔ خیر تم فکر مت کرو تمہیں میں سمندر کا نظارہ کرا دیتی ہوں لیکن مجھے پانی میں جانے کو مت کہنا۔“ خزیںہ نے پہلے ہی سے بار بار کرا دیا تھا اس لیے شہرینہ نے اصرار نہیں کیا لیکن خود کو نہیں روک سکی۔ دور سے لہروں کا مچلنا دیکھتے ہی اس کا دل بھی جھل گیا۔

”بس خزی پانچ دس منٹ۔“ اس نے چپلیں گاڑی ہی میں اتار دیں اور ننگے پاؤں تیز قدموں سے چلتی

کیلی ریت پر آتے ہی رک گئی۔

وہ ہمیشہ اس منظر میں کھو جاتی تھی۔ دور سمندر یوں لگتا تھا جیسے آسمان سے گھل رہا ہو۔ وہ بہت شوق سے اپنے موبائل سے مودی بنانے لگی کہ اچانک موبائل اسکرین پر حمزہ کا چہرہ دکھ کر وہ خوش گوار حیرت میں گھر گئی اور فوراً کیمرو نیچے کر کے اسے پکارنا چاہتی تھی کہ اس کے ساتھ ایک پری وشن کو دیکھ کر اس کی آواز حلق ہی میں اٹک گئی۔ اور بالکل غیر ارادی طور پر اس نے کیمرا آن کر کے ان دونوں کو فوکس کیا اور کلک کا بٹن دبا کر پھر انہیں دیکھنا چاہا لیکن اس کی آنکھیں دھندلا گئی تھیں۔

”کل وہ اس کے ساتھ تھا اور آج..... وہ جو کوئی بھی تھی اسے حمزہ کا اس کے اڑتے بالوں سے اٹھیلیاں کرنا لگا گیا تھا۔ پلٹ کر بھاگتے ہوئے وہ آکر گاڑی میں بیٹھی تھی۔

”ارے اتنی جلدی آئیں۔“ خزیںہ نے تعجب کا اظہار کیا پھر اس کا چہرہ دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ ”تم روری ہو؟“

”نہیں وہ پانی۔“ وہ دوپٹے کے پلو سے اپنا چہرہ صاف کرنے لگی۔ ورنہ تو یہ تھا کہ اس کا پھوٹ پھوٹ کر رونے کو دل چاہ رہا تھا۔

”یہ کیا کر رہی ہو ٹو لے۔“ خزیںہ نے ٹوک کر گاڑی آگے بڑھا دی۔

پھر وقفے وقفے سے خزیںہ ہی کوئی بات کر لیتی لیکن وہ بالکل خاموش تھی۔ حلق میں انکا گولا اسے ہوں ہاں بھی نہیں کرنے دے رہا تھا۔ ایک دو بار خزیںہ نے کسی بات پر جواب طلب نظروں سے اسے دیکھا بھی لیکن وہ یوں بن گئی جیسے سن ہی نہیں رہی۔ اور گھر آتے ہی وہ سیدھی دوش روم بھاگ گئی اور ابھی صرف منہ پر پانی کے چھینٹے مار کر نکل آئی۔ کیونکہ جانتی تھی خزیںہ زیادہ دیر نہیں رکے گی اور واقعی خزیںہ کھڑے کھڑے ہی حمیدہ بیگم سے بات کر رہی تھی۔

”بیٹہ جاؤ۔ میں چائے لاتی ہوں بلکہ کھانا کھا کر جانا۔“ اس نے کہا تو خزیںہ نے ہاتھ کے اشارے سے اسے منع کیا کیونکہ حمیدہ بیگم بول رہی تھیں۔

”ٹوکی دیکھنے میں اچھی ہے اور گھر انہ بھی اچھا لگ رہا تھا۔ اب اللہ کرے بات بن جائے۔“

”بن جائے گی ان شاء اللہ پھر عالیہ خالہ سے کہیے گا شادی میں دیر نہ کریں۔ آج حالات ایسے ہیں منگنیاں ہوتی ہیں ٹوٹ جاتی ہیں پتا بھی نہیں چلتا۔“ خزیںہ نے کہا تو وہ جو اندر کھولنے لیے کھڑی تھی بول پڑی۔

”پاں تو ایسے ہی تو نہیں منگنیاں ٹوٹیں کوئی بات ہوتی ہے جب ہی ٹوٹی ہیں۔“

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو اور میں بھی یہی کہنا چاہ رہی ہوں کہ ایسی باتوں کی نوبت ہی نہیں آنے دینا چاہیے۔ چٹ منگنی اور پٹ بیاہ۔“ خزیںہ نے اس کی تائید کی پھر حمیدہ بیگم سے کہنے لگی۔

”اور امی آپ بھی اب دیر نہ کریں۔ میری ذلیوری کے بعد اس کی شادی طے کر دیں۔“

”کوئی ضرورت نہیں۔“ وہ یکدم ہتھ سے اکھڑ گئی۔ ”خبردار جو تم نے میری شادی کا نام لیا تو۔ میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں مجھے نہیں کرنی شادی۔ سنا آپ نے امی۔ میں آپ کے ساتھ رہوں گی۔“

”ارے تو اس میں اتنا۔“ خزیںہ کی بات ہونوں ہی میں رہ گئی۔ کیونکہ وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ دل جو بو جھل ہو رہا تھا اور رونے کو بہانہ چاہیے تھا۔

حمیدہ بیگم حیران پھر پریشان ہو گئیں اور پریشان تو خزیںہ بھی ہوئی لیکن ٹھٹک بھی گئی تھی۔ البتہ ٹوکنے سے باز رہی اور بڑی مشکل سے اسے چپ کرنا پھر بہلا کر گئی تھی۔

☆☆☆

کبھی کبھی رات اپنے اندر بڑے اسرار لیے آتی ہے۔ ایسی ہی رات تھی۔ خاموشیوں میں لیٹی ہوئی نہ خواب ناک، نہ خوف ناک۔ دل کے کھلیانوں سے سرسراہٹ ہوئی گزر رہی تھی۔ اس بات سے بے خبر کہ کون نیند

میں مدہوش ہے اور کسی کی آنکھوں سے نیند روٹھ گئی ہے۔ اگر ایک پل ٹھہر کر دیکھتی تو اسے اس لابی کی لڑکی ترس ضرور آتا جس کے گرد کل تک سنہرے خوابوں کے جلتو جگمگاتے تھے اور آج وہی خواب اسے رلا رہے تھے۔ ”حزہ..... حزہ“ وہ نیکی میں منہ چھپائی یا ہونٹوں پر سختی سے ہاتھ جماتی کسی کی صورت یہی نام ابھر رہا تھا۔ اگر کوئی اور اسے بتاتا کہ اس نے حزہ کو ایک انتہائی خوب صورت لڑکی کے ساتھ ساحل کی ٹھنڈی ہوا میں اٹھ لیا کرتے دیکھا ہے تو وہ مر کبھی یقین نہ کرتی۔ اور اب اپنی آنکھوں سے دیکھا جھٹلا نہیں پا رہی تھی۔ اچانک اسے یاد آیا جب وہ حمیدہ بیگم کے ساتھ حزہ کے گھر کی تھی۔ تو وہاں حزہ نے بظاہر اسے چھینٹنے کی غرض سے کہا تھا کہ ایک پری اس پر عاشق ہو گئی ہے اور اسے اپنے ساتھ پرستان لے جانا چاہتی ہے۔ ”تو یہ سب وہ پری.....!“ اس نے سر ہانے رکھا اپنا موبائل اٹھا لیا اور آن کر کے حزہ اور اس لڑکی کی تصویر دیکھنے لگی۔ بار بار اس کی آنکھیں دھندلا تیں اور وہ یہی سے رگڑ کر پھر نظریں تصویر پر جمادیتی۔ جبکہ اس کے اندر تنفر بڑھتا جا رہا تھا۔

”جھوٹے مکار..... میں اب تم سے کبھی بات نہیں کروں گی۔ میری طرف سے اس کے ساتھ پرستان جاؤ یا بھاؤ، میں، میرا تم سے کوئی تعلق نہیں۔“ وہ دانت پیستے ہوئے دل ہی دل میں حزہ سے مخاطب تھی پھر اچانک کچھ سوچ کر اس نے وہ تصویر حزہ کے وائس اپ پر سینڈ کر دی اور ساتھ ہی تہیہ کر لیا کہ وہ اس کی جھوٹی داستانیں ہرگز نہیں سنے گی۔

☆☆☆

حسب معمول آفس جانے سے پہلے موبائل چیک کرتے ہوئے حزہ کو بڑی زور کا جھٹکا لگا تھا۔ اس کی اور ربیکا کی تصویر وہ بھی شہرینہ نے سینڈ کی تھی۔

”یا اللہ اس نے ہمیں کہاں دیکھ لیا۔“ اس کی پریشانی فطری تھی۔ اور پھر شہرینہ کا سوچ کر کہ جانے وہ کیا سمجھ رہی ہوگی اس کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ ناشتا بھی ٹھیک سے نہیں کر پا رہا تھا۔ نہ روزانہ کی طرح پیلا کے ساتھ چھینٹ چھاڑ بھی اور یہ کہاں ممکن تھا کہ اس کی غیر معمولی خاموشی محسوس نہ کی جاتی۔ فارخہ بار بار اسے دیکھ رہی تھیں اور گوکہ صبح کے وقت ٹوکنے سے گریز کرتی تھیں لیکن اس وقت رہا نہیں گیا۔ پوچھ لیا۔

”تمہاری طبیعت ٹھیک ہے بیٹا۔“

”جی اماں۔“ وہ چونک کر انہیں دیکھنے لگا۔

”میں تمہاری طبیعت کا پوچھ رہی ہوں۔ پریشان لگ رہے ہو۔“ فارخہ نے تشویش ظاہر کی تو وہ سر جھٹک کر بولا۔

”کوئی پریشانی نہیں اماں میں ٹھیک ہوں۔“

”لگ تو نہیں رہے۔“ بیلا بول بڑی۔ ”پراٹھا آدھا بھی نہیں کھایا اور چائے بھی۔“

”ٹھنڈی ہو گئی ہے۔“ وہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ”اچھا اماں چلتا ہوں۔“

”رکیں بھائی مجھے بھی کاج چھوڑ دیجیے گا۔ آج میری دین نہیں آئے گی۔“ بیلا فوراً چائے کا آخری گھونٹ لے کر اپنا بیگ اٹھانے اندر بھاگنے لگی تھی کہ اس نے روک دیا۔

”دین نہیں آئے گی تو چھٹی کر لو۔ میرے پاس ناٹم نہیں ہے۔“

”بھائی میں تیار ہوں۔“

”تو یقیناً بیٹہ کہہ پڑھ لو۔ اچھا اماں۔“ وہ جلت میں ہاتھ ہلاتا باہر نکل آیا تھا۔

اور پھر آفس پہنچے ہی اس نے شہرینہ کو کال ملائی تو دوسری طرف تیل جاتے ہی لائن کاٹ دی گئی جس سے شہرینہ کی ناراضی کا اندازہ کر کے اس نے دو تین بار پھر اس کا نمبر پیش کیا اور ہر بار نتیجہ وہی رہا تب مایوس ہو کر ٹیکسٹ لکھ کر سینڈ کر دیا۔

”میری بات سنو شہرینہ.....!“ اس کے بعد وہ انتظار ہی کرتا رہا جواب تو کیا آتا شہرینہ نے اس کا نمبر ہی بلا کر دیا تھا۔ جس سے صورت حال کی یقینی کا احساس ہوتے ہی اس کا دل جا ہار بیک ٹوٹ کر دے جواسے بے بس کر دیتی تھی۔ حقیقتاً اس کے اندر ایسا ہی ابا اٹھ رہا تھا کہ ادھی پیل کی ٹنگ ٹنگ کرتی ربیکا اس کے سامنے آن بھی۔ غالباً اسے جیت لینے کے احساس میں سرشار تھی۔ میز پر دونوں بازو جما کر براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کل شام کے رنگین لمحات کھو جتے گی۔ پھر مایوس ہو کر پوچھنے لگی۔

”کیا ہوا ہے تمہیں۔ کیا کسی کا خون کرنے آئے ہو؟“

”ہاں۔“ ہنا حرکت کیے حزہ نے جواب دیا تھا۔

”کس کا؟“ وہ اچھل پڑی۔ ”بتاؤ ناں حزہ..... کیا سچ سچ تم نے..... مجھے تمہاری آنکھوں.....“

”ہاں میری آنکھوں میں خون اتر رہا ہے۔“ وہ ایک دم میز پر ہاتھ مار کر بولا تھا۔ ”اور میں سچ سچ خون کروں گا، اپنا یا تمہارا۔“

”مائی گاڈ! تم یقیناً پاگل ہو گئے ہو۔“ وہ تھلا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ لیکن پھر بیٹھ گئی۔ ”میری سمجھ میں نہیں آتا تمہیں یہ رہ کر یہ دورے کیوں پڑتے ہیں۔ نہیں بلکہ تم ایکٹنگ کرتے ہو۔ بہت شوق ہے تمہیں ایکٹر بننے کا تو چلو میں تمہیں.....“

”شٹ اپ..... وہ دانت پیس کر بولا۔ تم جاؤ اپنے روم میں۔“

”نہیں جاؤں گی۔ کیا کر لو گے۔“ اس کی ضد اور ہٹ دھرمی دیکھ کر حزہ کا دماغ گھوم گیا۔ خود پر ضبط کرنا محال تھا، اس لیے وہ خود ہی اٹھ کر نہ صرف روم بلکہ آفس سے ہی نکل آیا اور قریبی کینے میں بیٹھ کر چائے آرڈر کر کے سگریٹ سلگائی۔ ذہن اس بری طرح تھج رہا تھا کہ سمجھ ہی نہیں پا رہا تھا اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ چائے پھر چائے اس کے بعد کتنی بھی دیر وہ وہیں بیٹھا رہا۔ جب ذہن کچھ سوچنے کے قابل ہوا تب جیب سے سیل فون نکال کر اس نے حسان صاحب کو کال ملائی اور یہ سوہنے تک وہ الرٹ ہو چکا تھا۔

”سر! حزہ بات کر رہا ہوں۔“ ان کی ویلو کے جواب میں وہ فوراً بولا تھا۔

”ہاں کیا بات ہے۔ آج آفس نہیں آئے؟“ انہوں نے پوچھا تو وہ بغیر تہید کے کہنے لگا۔

”سر! ایم سواری! میں مزید آپ کی جاب جاری نہیں رکھ سکتا۔ کیونکہ مس ربیکا کی وجہ سے میری پرسنل لائف بہت ڈسٹرب ہو گئی ہے۔“ وہ رکا کہ شاید حسان صاحب کچھ کہیں گے لیکن ادھر خاموشی تھی تب اس نے مزید کچھ کہنے کا ارادہ ترک کر کے لائن کاٹ دی۔ لیکن ممکن نہیں ہوا۔ کیونکہ وہ جو یہ چاہ رہا تھا کہ آج یہ باب ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے تو اسے لگا دو جملوں میں تو بات بھی پوری نہیں ہوئی، باب کیسے بند ہو سکتا ہے۔

کتنی دیر وہ خود پر جھنجھٹا رہا کہ اسے احسان صاحب کے بولنے کا انتظار کرنا چاہیے تھا اور ان ہی سے کہلوانا چاہیے تھا کہ ربیکا اب اس کے راستے میں نہیں آئے گی۔ جب تک وہ اسٹینڈ نہیں ہیں گے وہ کبھی نہیں کر سکتا۔ بہر حال اب دوبارہ انہیں کال کرنا ٹھیک نہیں تھا اس لیے اگلے وقت پر ٹال کر وہ شہرینہ سے بات کرنے کی تدبیر کرنے لگا۔ کیونکہ اس کا نمبر تو وہ بلا کر چکی تھی۔ جس پر اسے غصہ بھی آ رہا تھا۔ دل ہی دل میں اسے سخت ست کہتے ہوئے اس نے ٹائم دیکھا پھر ادھر ادھر آوارہ گردی کرنے کے بعد مقررہ وقت پر اس کے کاج چاہنیا۔

اس کا خیال تھا ہمیشہ کی طرح دھوکا دے گا کہ اسے اپنے ساتھ چلنے پر مجبور کر دے گا۔ پھر کہیں بیٹھ کر اسے ساری رام کہانی سن کر اپنی طرف سے اس کا دل صاف کر دے گا۔ اسے یقین تھا وہ دیر تاراض نہیں رہے گی۔ پھر واپسی کا سفر دونوں ہی خوشی طے کریں گے۔ یہی سب سوچتے ہوئے وہ کاج گیٹ پر نظر پڑا جہاں سے لڑکیاں ٹولیوں کی صورت نظر آ رہی تھیں۔ پھر اسے وہ دشمن جاں نظر آ گئی اور اس سے پہلے کہ وہ ہاتھ ہلاتا شہرینہ

نے اسے دیکھ لیا اور فوراً پلٹ کر گیٹ کے اندر غائب ہو گئی۔ تو فوری طور پر اس کی سمجھ میں نہیں آیا کیا کرے۔
 ”پاکل لڑکی۔“ وہ تقریباً ایک گھنٹہ وہیں کھڑا دانت پیتا رہا۔ کالج خالی ہو گیا پھر گیٹ بند ہونے پر اسے یہ خیال آیا کہ وہ پچھلے گیٹ سے چلی گئی ہوگی، وہاں اچانک کڑی دھوپ کا احساس ہوا تھا۔

☆☆☆

حزہ اور شہرینہ لڑتے تھے تو پھر جلدی مان بھی جاتے تھے۔ آج پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ وہ منہ موڑ کر چلی جس سے حزہ کی جان پرین آئی تھی۔ گھر آ کر بھی اسے چین نہیں تھا۔ اپنے کمرے میں وہ مسلسل ہلستا رہا کہ اس کے پاس جانے کو چل رہا تھا لیکن یہ ڈر کہ کہیں وہ اسے حمیدہ بیگم کے سامنے رسوا نہ کر دے، وہ ہمت نہیں رہا تھا۔ لیکن شام تک وہ بے بس ہو گیا۔ دل سے مجبور ہو کر اس کی طرف چل پڑا۔ کیونکہ گیٹ شہرینہ ہی کھولتی تھی اس نے سوچا اسے وہیں روک کر بات کرے گا لیکن اسے سخت مایوسی ہوئی جب گیٹ کھلنے کے ساتھ ساتھ سامنے بیگم نظر آئیں۔ بمشکل سلام کر رکھا۔

”خوش رہو۔ ابھی میں تمہیں یاد کر رہی تھی۔“ حمیدہ بیگم نے کہا تو وہ ان کے ساتھ اندر آتے ہوئے پوچھنے لگا۔

”سب ٹھیک تو ہے ناں تانی جان۔“

”ہاں اللہ کا شکر ہے بس وہ شہرینہ۔“

”کیا وہ شہرینہ کو؟“ وہ بے صبری کا مظاہرہ کر گیا۔

”چاہیں کس بات کا غصہ ہے۔ سچ بغیر ناشتائے کالج چلی گئی آ کر بھی کچھ نہیں کھایا۔ دو دن خزانہ کے گھر کیا رہ کر آئی مزاج ہی نہیں مل رہا۔“ حمیدہ بیگم بولتے ہوئے لاؤنج ہی میں بیٹھ گئیں مجبوراً اسے بھی بیٹھنا پڑا۔

”موسم کا اثر ہوگا تانی جان!“ وہ یہی کہہ رکھا۔

”موسم کوئی نیا تو نہیں بدل رہا یہاں تو ہر دوسرے دن موسم بدلتا ہے۔ مجھے تو کوئی اور ہی چکر لگ رہا ہے۔“ حمیدہ بیگم کی آخری بات پر وہ پریشان ہو گیا۔

”کیسا چکر؟“

”جنات و نجات کا۔ دیکھتے نہیں ٹی وی پر کیسے لڑکیوں پر اثر ہوتا ہے اچھی بھلی لڑکیاں چیخنے چلانے لگتی ہیں۔ یہ بھی ضرور کسی گندی جگہ سے پھلا گئی ہے جو اس پر.....“ حمیدہ بیگم تشویش سے بولے جا رہی تھیں۔

”اوہ.....“ وہ سینے میں رکی سانس بحال کر کے گویا ہوا تھا۔ ”ارے نہیں تانی جان ایسا کچھ نہیں ہے۔ اور جو ٹی وی پر دکھایا جاتا ہے اس پر تو آپ یقین ہی نہ کیا کریں۔ سب ڈراما ہوتا ہے۔“

”ٹی وی میں ڈراما ہوتا ہوگا اور جو میں حقیقت میں دیکھتی ہوں۔ پچھلی گلی میں مظہر صاحب کی بیٹی اچھی بھلی تھی۔ ادھر کچھ عرصے سے بیٹھے بیٹھے چیخنے چلانے لگتی ہے۔“

”اف تانی جان! بس کریں۔ ہوگا اس کے ساتھ کوئی مسئلہ۔ آپ شہرینہ کے لیے ایسا مت سوچیں۔“ وہ گھبرا کر بولا تھا۔ پھر خود پر قابو پا کر کہنے لگا۔

”اصل میں تانی جان خزانہ کی شادی کے بعد سے وہ خود کو اکیلا محسوس کرنے لگی ہے۔ جب کوئی بات کر لے والا نہیں ملتا تو موڈ آف کر لیتی ہے۔ آپ اسے کسی نہ کسی کام سے لگائے رکھا کریں۔“

”میں کیا لگائے رکھوں خود ہی کرتی ہے۔ مجھے تو کسی کام کو ہاتھ نہیں لگانے دیتی۔“

”اچھی بات ہے۔ ابھی کیا کر رہی ہے؟“ وہ خود کو روکتے روکتے بھی اس کے بارے میں پوچھ گیا۔

”سورہی ہے کب سے اٹھا رہی ہوں اس سے مس نہیں ہو رہی۔“ حمیدہ بیگم شہرینہ سے نالاں نظر آنے لگیں۔

”چلیں میں آپ کے لیے چائے بناتا ہوں۔“ وہ کہنے کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔ حمیدہ بیگم روکنا چاہتی تھیں مگر

نے تیزی دیکھائی فوراً بچکن میں آ گیا۔ اور گو کہ صرف چائے بنانی تھی لیکن وہ جان بوجھ کر برتنوں کو اٹھا بیچ کر تارہا شاید آواز سن کر شہرینہ اٹھ کر آ جائے۔ لیکن اسے غالباً اس کے آنے کا یقین تھا جب ہی کمرے سے نہیں نکلی۔

حمیدہ بیگم کے ساتھ چائے پینے کے بعد بھی وہ کتنی دیر بیٹھ رہا۔ نظریں بار بار اس کے کمرے کی طرف اٹتی رہیں لیکن اس نے جھلک تک نہیں دیکھائی۔ آخر وہ مایوس لوٹا تھا۔ اور اب غصہ کم پریشانی زیادہ تھی۔ کیونکہ اتنی بیدگی سے تو وہ کبھی ناراض نہیں ہوتی تھی۔ اور حق بجانب بھی تھی۔ کاش وہ پہلے سے اسے ربیکا کے بارے میں بتاتا۔ اب پتا نہیں وہ اس کا یقین کرے گی یا نہیں۔ اس رات وہ یہی سب سوچتا رہا تھا اور اگلے دن آفس پہنچنے کے بعد یاد آیا کہ اس نے کل حسان صاحب کو فون کر کے جاب جاری رکھنے سے معذرت کی تھی۔

”شٹ.....“ وہ پہلے خود پر ہتھ بٹھایا پھر سوچا اسے حسان صاحب سے براہ راست بات کر لینی چاہیے۔ اس کے مدد سے جاب جاری رکھنے یا چھوڑ دینے کا سوچے گا۔ پھر وہ خود کو حسان صاحب سے بات کرنے کے لیے تیار کر رہا تھا۔ لیکن کال بلاوا آ گیا۔ یہی اچھا ہوا اسے خود سے نہیں جانا پڑا۔ خود کو پرسکون کر کے وہ ان کے روم میں داخل ہوا تھا۔

”بیٹھو حمزہ۔“ اس کے سلام کا جواب سر کے اشارے سے دے کر انہوں نے اسے بیٹھنے کا کہا تو وہ بھی آرام سے بیٹھ گیا۔

”ہاں، کیا کہہ رہے تھے کل تم.....“ قدرے رک کر وہ اس کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔

”سر، میں مس ربریکا کو نہیں سمجھا سکتا۔ وہ بہت ضدی ہیں۔ میرا خیال ہے آپ کو ہی اسٹینڈ لینا پڑے گا۔“ وہ بہت سنبھل کر بولا تھا۔

”ہوں..... حسان صاحب کی نظریں یوں جھکیں کہ اسے ان پر ترس آنے لگا۔ ایک باپ بیٹی کے سامنے اس قدر بے بس تھا۔ شاید اسی لیے لوگ بیٹی کی آرزو نہیں کرتے۔ اس کا دل چاہا خاموشی سے اٹھ کر چلا جائے۔

اگر قریب تھا کہ وہ اٹھ جاتا حسان صاحب نے خود ہی اسے جانے کا کہہ دیا۔

”اسے اٹھنے کے لیے چیئر کے بازوؤں پر مضبوطی سے ہاتھ جمانے پڑے تھے پھر وہ دروازے کے قریب ناکہ حسان صاحب نے پکار لیا۔

”سنو..... وہ پلٹ کر گر گیا تو حسان صاحب نے میز کی دراز سے اپنا کارڈ نکالا اور اس کی بیک پر کچھ لکھ کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولے۔

”رائل ٹیکسٹائل میں ریمز صاحب کو یہ کارڈ دے دینا۔ وہاں تمہاری جاب ہو جائے گی۔“

”تھینک یوسر.....“ اس نے بڑھ کر کارڈ لیا پھر ان سے ہاتھ ملا کر باہر نکلا تو اسے لگا جیسے وہ آزاد ہو گیا ہو۔

☆☆☆

ہمیشہ کی طرح اس نے رات کا کھانا برائے نام ہی کھایا تھا پھر اٹھنے لگی تھی کہ حسان صاحب پکار کر بولے تھے۔

”رابی! مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔“

”جی ڈیڈی.....“ ربیکا نے ٹیبل پر دونوں بازو رکھ کر گویا اٹھنے کا ارادہ ترک کر دیا۔

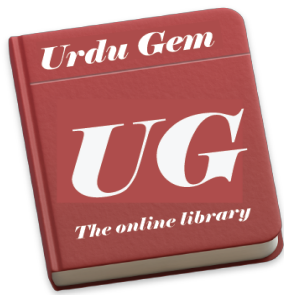
”شیر وانی صاحب نے تمہارے لیے حسن شیر وانی کا پرنسزل دیا ہے۔“ حسان صاحب سوپ پیتے ہوئے اتنی ہی شرم شروع ہوئے تھے۔

”مجھے اور تمہاری ماما کو بھی ہر لحاظ سے یہ پرنسزل ٹھیک لگ رہا ہے۔ پھر تم نے بھی حسن شیر وانی کو دیکھا اور

نہیں لگتا ہے تمہاری اس کے ساتھ اچھی انڈر اسٹینڈنگ ہو سکتی ہے۔ اس لیے میں چاہتا ہوں تم سنجیدگی سے اس

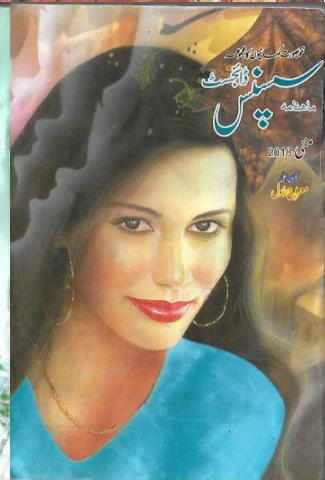
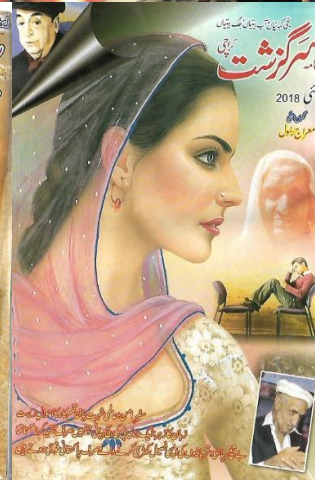
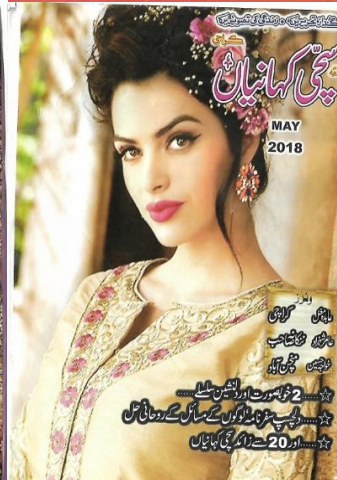
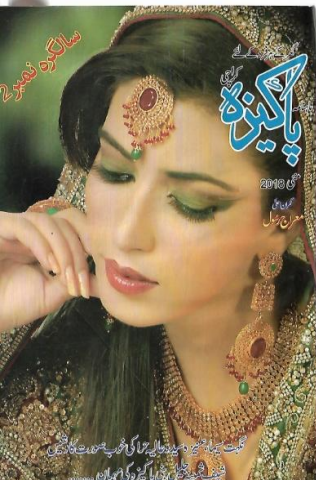
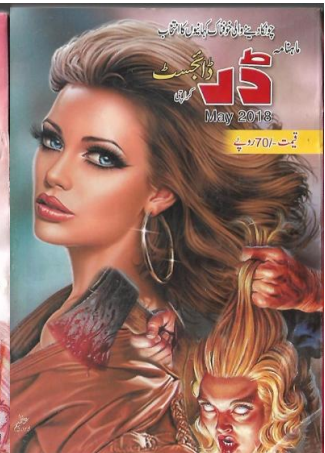
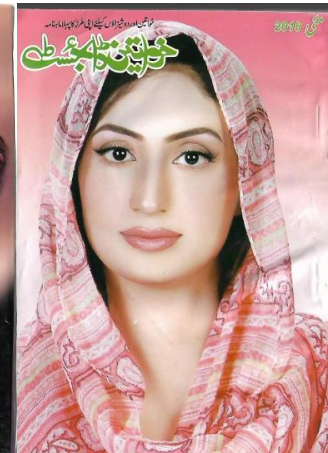
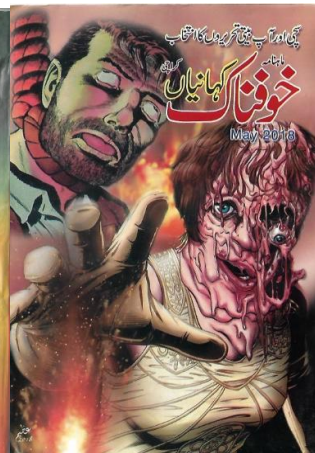
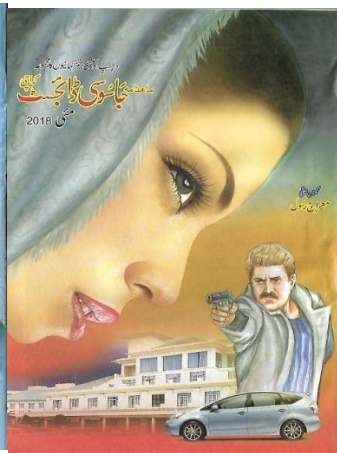
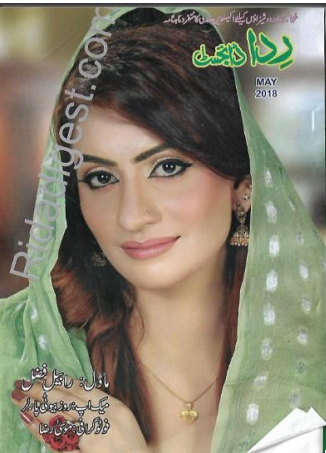
شے پر غور کرو تا کہ میں شیر وانی صاحب کو جواب دے سکوں۔“

بات کے اختتام پر انہوں نے ربیکا کو دیکھا جو بڑے سکون سے ان کی بات سن رہی تھی۔ ان کے دیکھنے پر



UrduGem.com

URDU KA KHAZAANA



ذرا سے کندھے اچکائے پھر اسی سکون سے بولی تھی۔

”سوری ڈیڈی آپ شہروانی صاحب کو انتظار میں نہ رکھیں۔ ابھی جواب دے دیں انہیں۔ میں بیٹے میں انٹر سٹوڈنٹ ہوں۔ آئی ایم سوری۔“

”زیریکا.....“ شمرہ نے کچھ کہنا چاہا کہ وہ ہاتھ اٹھا کر بولی۔

”مما! میں آپ کو حمزہ کے بارے میں بتا چکی ہوں۔ کیا آپ نے ڈیڈی کو نہیں بتایا۔“

”بتایا ہے۔ تمہاری ممانے مجھے سب بتایا ہے۔“ حسان صاحب ضبط کی انتہاؤں پر تھے۔ جبکہ زیریکا ضبط کھوری تھی۔

”پھر آپ اس سے ہٹ کر کیوں بات کرتے ہیں۔“

”اس لیے کہ حمزہ کی طرف سے کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔ اس کے ماں باپ بہن بھائی کوئی آیا ہے۔

رشتہ لے کر؟“ انہوں نے شمرہ کو دیکھا تو وہ فوراً بولیں۔

”کوئی نہیں۔“

”پھر بیٹا! جب کوئی آیا ہی نہیں تو میں کیسے اس کے بارے میں سوچ لوں۔ میں تو اسی کی بات کروں۔“

ایک بار نہیں گئی بار آ چکا ہے اور ہمارے جواب کا انتظار کر رہا ہے۔“

حسان صاحب نے اپنے تئیں اسے لا جواب کیا تھا۔ لیکن وہ تو جیسے اسی انتظار میں تھی۔

”حمزہ کو میں نے روک رکھا ہے ڈیڈی اب آپ کہتے ہیں تو وہ اپنے گھر والوں کو لے آئے گا اور انہیں آپ

انتظار مت کروائے گا۔“ وہ کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی تو شمرہ پریشان ہو کر حسان صاحب کو دیکھنے لگیں۔ جن کا

بالکل ساٹ تھا۔ انہوں نے شمرہ کا دیکھنا اور ان کی پریشانی محسوس ضرور کی لیکن ان کی طرف متوجہ نہیں ہوئے۔

”ایک منٹ بیٹا۔ کیا تم نے حمزہ کے بارے میں اچھی طرح سوچ لیا ہے۔ آئی مین وہ جس کلاس سے

رکتا ہے وہاں تم کیسے ایڈجسٹ کر سکو گی۔“ خان صاحب کا انداز ہنوز دوستانہ تھا۔

”یہ میرا مسئلہ ہے ڈیڈی..... آپ اس میں نہ الجھیں۔“

”لیکن بیٹا تمہیں اگر کوئی تکلیف ہوگی.....“

”مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔“ وہ فوراً بولی تھی اور شمرہ اب چپ نہیں رہ سکیں بلکہ چیخ پڑیں۔

”یہ کیا بکواس ہے حسان۔ یہ تو باگل ہے آپ تو ہوش سے کام لیں۔ کیوں اسے اتنی دھچک دے رہے ہیں۔“

”ریٹیکس شمرہ اور زیریکا تم اپنے کمرے میں جاؤ۔ تمہاری ماما کو میں سمجھا لوں گا۔“ حسان صاحب نے

ٹوک کر کہا تو زیریکا جاتے جاتے رک کر بولی تھی۔

”اور ماما کو یہ بھی سمجھا دیجیے گا ڈیڈی کہ حمزہ اور اس کے گھر والوں کو وہی عزت ملنی چاہیے جیسے آپ

مہمانوں کو دیتے ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ۔“ اپنی بات کہہ کر وہ رک نہیں فوراً پلٹ کر تیز قدموں سے

کمرے میں بند ہوئی تھی۔

”ہرگز نہیں..... ہرگز نہیں۔“ شمرہ دانت پیس رہی تھیں۔ فرحان صاحب پر ہنسن گئیں۔

”اور آپ..... آپ نے حسان کیسے اس دو ککے کے لڑکے پر بھروسہ کر لیا کہ وہ زیریکا کو سمجھالے گا۔ دیکھ لیا کیا

ہے اس نے کہ وہ اس سے ہٹ کر کچھ سوچنا ہی نہیں چاہتی اور آپ مزید اسے شہد دے رہے ہیں۔ آ کر کیا سوچ کر؟“

”یہ سوچ کر کہ وہ اپنی مرضی سے ٹھوکر کھانا چاہتی ہے تو کھانے دو۔“ جان صاحب جلدی سے بولے تھے۔

”نہیں، نہیں میں یہ سب برداشت نہیں کر سکتی۔ شمرہ کا پارہ مسلسل بڑھتا جا رہا تھا۔

”فارگا ڈیک شمرہ! تم مجھے مزید پریشان مت کرو۔“ حسان صاحب اٹھ کر چلے گئے۔ لیکن شمرہ وہ

تکملاتی رہی تھیں۔“

☆☆☆

حمزہ نے حسان صاحب سے کارڈ لے تو لیا تھا لیکن اب شش و پنج میں تھا کہ اسے حسان صاحب کے ریفرنس سے

نامہ چاپ کے لیے جانا چاہیے یا نہیں۔ اس وقت وہ سوئے لیٹا تھا پھر کچھ خیال آیا تو کارڈ نکال کر دیکھنے لگا۔ عجیب

لمبن تھی۔ کافی سوچ بچار کے بعد آخراں نے وہاں جانے کا فیصلہ کر لیا۔ کیونکہ جاب آسانی سے نہیں ملتی تھی۔

احسان صاحب کو شاید اس پر رحم آ گیا تھا۔ کچھ بھی تھا اسے بھی بہر حال حسان صاحب سے کوئی شکایت

نہیں تھی۔ وہ تو خود بے جاری بیٹی کی ضد سے تنگ تھے۔

”وہ لڑکی یقیناً سائیگی ہے۔ حسان صاحب کو اسے کسی سائیکالوجسٹ کو دکھانا چاہیے۔ خبر مجھے کیا جان

ادنی میری اس سے۔“ اس نے سر جھٹک کر انگڑائی لی پھر لائٹ آف کر کے لیٹا تھا کہ اس کا موبائل بجنے لگا۔

”اس وقت کون ہے۔“ اس نے سر ہانے کے قریب رکھا موبائل اٹھا کر دیکھا اسکرین پر زیریکا کا نام جگمگا رہا تھا۔

”بچی شیطان ہے۔“ اس نے موبائل آف نہیں کیا یونہی بیٹا ہوا داپس رکھ دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ موبائل

ف ہوا پھر اگلے لمحے دوبارہ بجنے لگا۔ یعنی جب تک وہ کال ریسیو نہیں کرے گا ادھر وہ بڑائی کرتی رہے گی۔

”کرتی رہے۔“ خاموشی میں موبائل کی سرکلی ٹون جیسے لوری کا کام دے رہی تھی۔ وہ محفوظ ہوتا داتی سو گیا تھا۔

صبح وہ قاخرہ اور بیلا کے اٹھانے پر نہیں اٹھا بلکہ اپنی مرضی سے اٹھا تھا۔ پھر فریش ہو کر کمرے سے نکلا تو قاخرہ

نے ایک ہی سانس میں کتنے سوال کر ڈالے۔

”کیا بات ہے، طبیعت ٹھیک ہے۔ اتنی دیر تک سوئے۔ آفس نہیں جانا کیا؟“

”جاؤں گا۔“ وہ بے نیازی سے کہہ کر تخت پر بیٹھ گیا۔

”ناشتا لاؤں!“

”جی..... بیلا کالج چلی گئی کیا؟“ اس نے کمرے کی کھڑکی سے اندر جھانکتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں..... دیر ہوگی اسے گئے ہوئے۔ قاخرہ کہتے ہوئے پچن کی طرف بڑھ گئیں تو متوجہ سا ہو کر اس نے

اد دیکھنے کے لیے جب سے موبائل نکال کر دیکھا۔ دس بج رہے تھے اور کیونکہ اسے جلدی نہیں تھی اس لیے

ایمان سے تھا۔ جب ہی کالز چیک کرنے لگا۔ کیونکہ اسے یاد آ گیا تھا کہ وہ موبائل کی ٹون سنتے سنتے سویا تھا۔

یا کی پانچ کالز کے ساتھ خزینہ کی کال دیکھ کر وہ چونکا تھا۔

خزینہ کال کر رہی تھی۔ اس نے سوچتے ہوئے فوراً خزینہ کا نمبر ملا دیا۔ تو دوسری بیل کے ساتھ ہی اس کی

از سنانی دی۔

”ہیلو۔“

”ہاں خزینہ رات تم کال کر رہی تھیں۔ سوری! میں جلدی سو گیا تھا۔ سب ٹھیک تو ہے ناں.....!“ اس نے

اٹو جیہ پیش کر کے پوچھا۔

”اللہ کا شکر ہے سب ٹھیک ہے۔ تم سناؤ۔“ خزینہ نے کہا تو وہ بلا ارادہ بولا تھا۔

”کیا سناؤں.....؟“

”شہریتہ سے تمہاری لڑائی وڑائی ہوئی ہے کیا؟“ خزینہ نے پوچھا تو وہ قدرے شگڑا گیا۔

”نہیں تو..... کیا کہہ رہی ہے شہریتہ؟“

”کچھ نہیں میرا مطلب ہے میں نے اس سے بھی پوچھا ہے اور وہ کہہ رہی ہے ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ پھر حمزہ

ایوان لگ رہا ہے جیسے تم دونوں کے درمیان کوئی بات ہوئی ہے۔“ خزینہ ہمیشہ کی طرح خزینہ کی بات کر رہی تھی۔

”اب میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ ویسے تمہیں ایسا کیوں لگ رہا ہے؟“ اس نے اچانک کسی خیال کے تحت



پوچھا تھا۔

”بتاؤں گی۔ ابھی تم کہاں ہو؟“

”گھر پر ہوں۔ بس آفس کے لیے نکلنے والا ہوں۔“

”چلو ٹھیک ہے، پھر فرصت سے بات کر س گے۔ چچی جان کو سلام کہو۔“

”اللہ حافظ.....“ وہ فون رکھ کر سوچنے لگا۔ یہ اطمینان تو ہو گیا تھا کہ شہرینہ نے ربیکا کے بارے میں نہیں بتایا۔ کیا ایسا کیا ہوا ہے جو شہرینہ کو ان کے بیچ لڑائی یا ناراضی کا شک ہو رہا ہے اور اس نے شہرینہ سے بھی باز پرس کی ہے۔

”کس کا فون تھا؟“ فائرہ اس کے سامنے ناشتے کی ٹرے رکھتے ہوئے پوچھ رہی تھیں۔

”خزینہ کا.....“ وہ چونک کر بولا تھا۔

”اچھا ایسی ہے میری بیٹی۔ کیا کہہ رہی تھی۔“ فائرہ خزینہ کا سن کر خوش ہو گئیں۔

”ٹھیک ہے۔ سلام کہہ رہی تھی آپ کو۔“

”علیکم اسلام..... میری بات کر دیتے۔“ فائرہ نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

”آپ فون کر لیا کریں اسے اور کتنے دن ہو گئے آپ تائی جان کے پاس بھی نہیں گئیں۔ جانا چاہیے آپ کو۔“

”شہرینہ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ وہ ناشتے میں مصروف ہو کر بول رہا تھا۔

”ہائیں۔ شہرینہ کو کیا ہوا ہے؟“ فائرہ پریشان ہو گئیں۔

”پتا نہیں پرسوں میں گیا تھا۔ شہرینہ کو تو نہیں دیکھا۔ سوری تھی۔ تائی جان نے بتایا اس کی طبیعت کا اور وہم

بھی کر رہی تھیں۔ کہ کوئی سایہ وادیہ ہو گیا ہے اس پر۔“

”اللہ نہ کرے۔“ فائرہ مزید دہل گئیں۔

”آپ آج چلی جائے گا بیلا کے ساتھ۔“

”ضرور جاؤں گی اور تم پرسوں کی بات آج بتا رہے ہو۔ اسی وقت بتاتے ہیں اسی وقت جاتی۔ ہائے میری

معصوم بچی۔ اللہ اپنی امان میں رکھے۔“

فائرہ کا بس نہیں چل رہا تھا اسی وقت چل پڑیں۔ لیکن مجبوری تھی۔ بیلا کالج سے آتی تو گھر پر تالا دیکھ کر

پریشان ہو جاتی۔

”اچھا اماں..... وہ در و مال سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا..... آج میں نبی جگہ جا رہا ہوں دعا کیجیے گا۔“

”نبی جگہ مطلب.....؟“ فائرہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگیں۔

”نبی جاب کے لیے۔ پرانی ختم ہو گئی۔“

”کیوں پرانی کیوں.....“

”بس بتایا تھا ناں وہاں مسئلہ بہت تھے۔ دعا کیجیے گا یہاں اللہ بہتر کرے۔ اور ان شاء اللہ بہتری ہی ہو

گی۔“ ٹھیک ہے چلتا ہوں۔

وہ فائرہ کے مزید سوالوں سے بچنے کی خاطر قصد اُجالت دکھاتا ہوا نکلا تھا۔

☆☆

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

”وہ جا رہا ہے عمامہ..... اسے روک لو.....“ ماریہ کے لہجے میں انتہائی تندی تھی۔

”کیوں روک لوں آخر کیا تعلق ہے میرا اس سے.....“ میں غصے سے بولی۔

”وہ محبت کرتا ہے تم سے..... اتنی محبت کون کرے گا تم سے؟“

ماریہ مجھے قائل کرنے پر بضد تھی اس کی ہر بات میں دلائل چھپے تھے۔ میری ساری توجہ کیسٹری کے نوٹس پر تھی۔ مجھے ماریہ کی باتوں میں ذرا بھی دلچسپی نہیں تھی بلکہ اب تو میں تنگ آ چکی تھی ان باتوں سے۔ تب میں نے غصے سے نوٹس بند کیے اور تیز نظروں سے ماریہ کو دیکھا۔

”اور میں لعنت بھیجتی ہوں اس کی محبت پر.....“ میرے لیے وہ ہی محبت کافی ہے جو میرا باپ مجھ سے کرتا ہے۔ کسی دوسری محبت کی تائید مجھے ضرورت ہے اور نا ہی پروا۔ مجھے محبت سے ہی انکار تھا۔

بیک کندھے پر لٹکائے کتابیں سینے سے لگائے میں جا رہی تھی، جب ماریہ، کی غصے سے بھری آواز نے میرا تاقب کیا۔

”تم جھوٹی ہو عمامہ!“

میں سر جھٹکتی لاہوری سے باہر نکل آئی فضول کی بحث میں الجھنے کا میرا کوئی موڈ نہیں تھا۔

☆☆☆

میری واپسی تک بابا بھی گھر پہنچ چکے ہوتے تھے..... اکثر ایسا ہوتا تھا کہ وہ جلدی آجاتے تو کھانا بھی خود بنا لیتے، ورنہ میں اور بابا مل کر کھانا بناتے تھے۔

آج بابا اور میں آگے پیچھے ہی گھر پہنچے تھے۔ اس لیے فریش ہونے کے بعد میں نے جلدی جلدی زرونی بنائی اور ساتھ ہی رات کا بچا سا گرم کیا، تب تک بابا سلاہ بنا چکے تھے۔ کھانا تیار تھا۔ کھانے کے بعد میں اور بابا اپنے اپنے کمروں میں آرام کی غرض سے چلے آئے۔ روزانہ جب بھی میں یونیورسٹی سے آ کر بستر پر لیٹی تو لمحوں میں نیند کی وادیوں کی سیر کرنے لگتی تھی، مگر آج دل بے چین تھا اور دماغ ماریہ کی باتوں میں الجھا

ہوا تھا۔ میں ناچاہتے ہوئے بھی ان سوچوں کا سفر کرنے لگی جن پر چلنے سے بھی ڈرتی تھی۔

میں پانچ سال کی تھی جب امی اس دنیا سے رخصت ہو گئیں اور ان کے بعد بابا نے ہی ہر رشتے کی کمی پوری کی تھی وہ باپ ہونے کے ساتھ ساتھ میری مائیں بھی بنے تھے۔ انہوں نے میرے لیے کون سی قربانی تھی جو نہیں دی تھی۔ اپنا آرام بھلا کر میری پرورش کی۔ پورے خاندان کی مخالفت لے کر مجھے پڑھایا ورنہ ہمارے خاندان کی لڑکیوں نے تو اسکول کا منہ بھی نہیں دیکھا تھا اپنی عزت کی حفاظت کرنے کے لیے لمبے چوڑے درس دیے تھے اور نا ہی دیگر جذباتی مکالمے بولے تھے۔ انہیں جو سیکھ دینی تھی وہ میری پرورش کے دوران بابا پہلے ہی دے چکے تھے۔ سبق پڑھانے کے انہوں نے مجھے امتحان گاہ میں چھوڑا تھا۔ انہیں دنیا سے بڑھ کر مجھ پر مان تھا۔ وہ جانتے تھے پوری دنیا اپنا زور لگا دیتی لیکن ان کی بیٹی ان کا مان کبھی ٹوٹنے نہیں دے گی۔

اور اب اس مان کو ٹوڑنے ولید سجان کی محبت آگئی تھی یہ محبت اپنا پورا زور لگا رہی تھی اور میرا دل کا پٹنہ لگا تھا۔

☆☆☆

وہ یونیورسٹی کی چوتھی منزل پر کھڑا تھا، سارے اسٹوڈنٹس گراؤنڈ میں جمع تھے..... ہر طرف شور تھا..... لیکن مجھے وہ شور نہیں سنائی دے رہا تھا مجھے تو بس ماریہ کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

”عمامہ اسے روک لو..... ورنہ وہ مر جائے گا۔ تم جانتی ہو وہ کتنا ضدی ہے۔“ ماریہ اتنی بے چین اس لیے بھی تھی کہ وہ اس کا گہرا دوست تھا۔ بچپن کا دوست۔ مجھ سے دوستی بھی تو اس نے ولید سجان کے لیے ہی کی تھی۔ ”یار چھوڑ دو اپنی ضد..... زبان سے نہیں تو، آنکھوں سے ہی اقرار کرو۔“

”یہ ضد نہیں ہے یہ میرے باپ کا مان ہے۔ ان کے پڑھانے اسباق ہیں۔ تم مجھے اس کام کے لیے مجھ پر مت گرد، جس کے لیے میرا دل راضی نہیں۔“ میں نے قطعیت سے جواب دیا لیکن ولید سجان کی نظروں کی

تپش میرے برف دل کو پگھلانے لگی۔

”تمہارے بابا کا مان کسی کی زندگی سے زیادہ اہم ہے عمامہ!“ ماریہ نے تاسف سے مجھے دیکھا۔

”ہاں ہے۔ لیکن تم یہ بات کبھی نہیں سمجھ سکو گی وجہ ہماری کلاس کا ڈیفینس ہے۔“

میں نے پہلی بار نظر اٹھا کر ولید سجان کو دیکھا۔ اس کی نظریں مجھ سے کھ رہی تھیں۔ ”تم جھوٹی ہو عمامہ!“ اور میری نظریں بنا کوئی پیام دیے جھک گئیں۔ میں نے واپسی کے سفر کے ابھی محض تین قدم اٹھائے تھے اور تب ہی سارا گراؤنڈ چیخوں کے شور سے گونج اٹھا تھا۔ ولید سجان نے اپنی محبت ثابت کرنے کے لیے چوتھی منزل سے چھلانگ لگا دی تھی۔

☆☆☆

اور چوتھی منزل سے چھلانگ لگانے کے باوجود بھی وہ بچ گیا تھا۔ زیادہ کچھ نہیں بدلا بس یہ ہوا کہ اسے یونیورسٹی سے فارغ کر دیا گیا اور ساتھ ہی بھی ہوا کہ اس کی کمر کے تین مہرے زخمی ہو گئے۔ بائیں ہاتھ اور ٹانگ کی ہڈی تین جگہ سے فریکچر ہو گئی اور سر پر شدید چوٹیں آئیں۔

ساری کلاس اس کی عیادت کے لیے گئی۔ وہ تین ماہ ہسپتال گزارا اور تین ماہ میں ہر روز ماریہ مجھ سے اس کی عیادت کو جانے پر اصرار کرتی رہی۔

”دیکھو اقرار کرنے سے انکل کا مان ٹوٹے گا“ عیادت کرنے سے تو نہیں۔ ہمارے نبی تو دشمن کی بھی عیادت کرتے تھے، وہ تو پھر تم سے بے پناہ محبت کرتا ہے۔“

میں اس کے دلائل کبھی سنجیدگی سے سنتی کبھی نہیں دیتی لیکن میرے فیصلے کمزور نہیں پڑے۔ دل پر لگا کراڑ گئے۔ لاسٹ سمسٹر کا لاسٹ پیپر تھا جب ماریہ نے مجھے اس کا نمبر دیتے آخری التجا کی۔

”وہ جا رہا ہے یہ ملک چھوڑ کر اسے صرف تم روک سکتی ہو..... پلےز روک لو!“ اور اس بار میں اس کی بات سن کر کم کم ہو گئی تھی۔ آج رات میرے چاچو کی میٹلی آ رہی تھی میرے رشتے کے سلسلے میں۔ بابا بہت خوش تھے اور

ساتھ ہی سارا خاندان بھی خوش تھا کہ میں نے بنا کوئی چاند چڑھائے کیسٹری میں ماسٹر ز کر لیا ہے۔

میں نے ولید سجان کو فون کرنے کی غلطی نہیں کی تھی۔ میرا رشتہ پچھا زاد خاور سے ملے ہو گیا تھا۔ بابا کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ یہ بھی تو ایک اعزاز ہوتا ہے کہ ماں باپ اولاد کی شادی اپنی پسند سے کریں اور بابا کی اتنی قربانیوں کے بعد اگر میں نے یہ اعزاز انہیں دیا تھا تو اس میں کوئی بڑی بات نہیں تھی ہر اچھی بیٹی اپنے باپ کو یہ اعزاز ضرور دیتی ہے۔

☆☆☆

میرے کمرے میں اس وقت ماریہ اور میرے علاوہ دوسرا کوئی نہیں تھا۔ وہ بڑی مہارت سے میرے چہرے پر میک اپ کر رہی تھی۔ کل رات مہندی کی رسم سے پہلے میرا خاور سے نکاح ہو گیا تھا۔ اور آج اس کے سنگ میری رخصتی تھی، میری اکلوتی سنبلی مجھے خاور کی دلہن بنا رہی تھی۔ اس دن کے بعد اس نے مجھ سے ولید سجان کے متعلق کوئی بات نہیں کی تھی اور نا ہی میں نے خود کوئی سوال کیا تھا۔

”جانتی ہو عمامہ! سجان نے جاتے ہوئے مجھ سے کیا کہا تھا۔“ ماریہ میرا پٹائیٹ کر رہی تھی جب سنجیدگی سے بولی۔

میرا دل دھڑک کر رہ گیا، میں پوچھ بھی ناسکی کہ ماریہ آج کے دن تم اس کا ذکر کیوں کر رہی ہو۔

”اس نے مجھ سے کہا تھا۔ میں جانتا ہوں یہاں سے ماریہ اگر عمامہ کو اپنے دل سے مر کر بھی نہیں نکال سکوں گا۔ عمامہ جیسی لڑکیاں ہوتی ہی محبت کے قابل ہیں۔ ماں باپ کا مان اور عزت رکھنے والی لڑکیوں سے کوئی ایک بار محبت کرے تو تا عمر اس کی محبت میں مبتلا رہتا ہے۔“

یاد رہے بولتے ہوئے اس کے دوپٹے میں پن لگا رہی تھی۔ اس کی ساری توجہ دوپٹے کی طرف تھی اور یہ مقام شکر تھا۔

عمامہ کی آنکھوں میں چمکتے موتی صرف آئینے نے دیکھے تھے اور وہ چیخ کر عمامہ سے کہہ رہا تھا۔

”تم جھوٹی ہو عمامہ..... جھوٹی۔“

☆☆

لڑکھار عشق

تیسری قسط



”سجیکٹ بھی نہیں تو.....“ دل آویز کچھ شرارت بھری مسکراہٹ کو چہرے پر سجا کر بولی۔
”فیورٹ سجیکٹ.....؟“ مانی حیران ہوا تھا۔
”محبت.....“ وہ ہلکھلائی تو مانی نے یکدم لب بھینچ لیے۔

”تو محبت تمہارے لیے ایک سجیکٹ ہے۔“ مانی نے سنجیدگی سے پوچھا۔
”صرف سجیکٹ نہیں..... میری زندگی کی سب سے بڑی سچائی ہے۔“ وہ ایک بار پھر گہری بات کر گئی تھی۔
”اور سچائی ہمیشہ کڑوی ہوتی ہے۔“ مانی کا جواب نہایت برجستہ تھا۔
”اللہ نہ کرے۔“ وہ زیر لب بولی۔

”بہر حال آج کالینس بہت اچھا ہے۔ تم ایسا کروٹھیٹ بک کروادو۔ جب تک ٹھیٹ کی ڈیٹ نزدیک آتی ہے مزید پریکٹس بھی ہوگی تو جو تھوڑی بہت غلطیاں ہو رہی ہیں وہ بھی درست ہو جائیں گی.....“ مانی نے یک لخت ہی موضوع بدل دیا۔
”اوکے، ٹھیک ہے۔“ دل آویز نے گاڑی اب واپسی کی راہ پر موڑ دی تھی۔ کیونکہ اب اس کے لپس کا وقت ختم ہو رہا تھا۔

☆☆☆

”ممی کیا ہوا ہے؟“ عدی یک لخت سنبھلا تھا۔

”کیوں نہیں کروانا چاہتی تھی.....“ دل آویز نظریں روڈ پر بیٹھے سبک رفتاری سے گاڑی کو آگے بڑھائے جا رہی تھی کہ مانی نے سوال کیا۔

”میں جلدی سے ڈرائیونگ پاس کر لینا چاہتی ہوں اب۔“ وہ ذرا کی ذرا اس کی طرف دیکھ کر بولی۔
”میرے اب تک کے کیریئر میں تم سب سے زیادہ انوکھی اسٹوڈنٹ ہو۔“ مانی نے ہر بار کی طرح ایک بار پھر کہا۔ ”تمہیں ڈرائیونگ سکھانے کے لیے مجھے سارے حربے آزمائے پڑے ہیں۔“ مانی نے اب دل آویز کو مکمل اعتماد سے ڈرائیونگ کرتے دیکھا تو مسکراتے لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ”ایسے ہی ڈرائیونگ کرو گی تو بہت جلد ٹیسٹ دینے کے قابل ہو جاؤ گی۔“

”محبت ہم قدم ہو تو ساری مشکلیں آسان ہونے لگتی ہیں۔“ دل آویز مدھم مسکراہٹ کے ساتھ گنبد لہجے میں بولی اور خاموش ہو گئی۔

”وہی آج تم خلاف معمول کچھ خاموش ہو۔“ مانی کو لہجہ بھر میں اس کی خاموشی کھنسنے لگی تھی۔ حالانکہ وہ خاموش نہیں تھی۔ حالانکہ اس کی ہر اک جنبش چلا کر اقرار محبت کر رہی تھی۔ لیکن مانی..... ایک بار پھر اس کی محبت سے اجتناب برت رہا تھا۔

”نہیں میں خاموش نہیں ہوں۔ بس آج تھوڑی سی تھکی ہوئی ہوں اور پھر زیر بحث میرا فیورٹ

”بیٹا دیکھ کر ڈرائیو کروٹاں۔“ خمن نے آگے رکی ٹریفک کو دیکھا تھا۔ اگر وہ زور سے نہ چلاتیں تو عدی نے آگے والی گاڑی کو ٹکرا مار دی ہوتی۔ کیونکہ آگے والی گاڑی کی بریک لائٹس آن تھیں جبکہ عدی گاڑی آگے بڑھا رہی تھی چلا جا رہا تھا۔

”اف می آپ کے ساتھ ڈرائیونگ کرنا بھی بہت مشکل ٹاسک میں سے ایک ہے۔“ عروش کی موجودگی میں خمن کا عدی کو سرزنش کرنے پر وہ جل سا ہو کر رہ گیا۔

”بیٹا پرانی امانت ساتھ ہے تو ذرا احتیاط برتنی چاہیے ناں۔“ خمن نے کہا۔

”کوئی بات نہیں آئی۔“ عروش پیچھے بیٹھنے کے باوجود عدی کے چہرے پر چھائی خجالت بخوبی دیکھ سکتی تھی۔ اس لیے مسکرا کر کہا۔

”کوئی بات کیسے نہیں۔ ان کو تو بس بہانے چاہیے ہوتے ہیں نیچے ست اور ٹکا ثابت کرنے کے۔“ عدی نے نزو کی نظروں سے خمن کو دیکھ کر منہ بسور کر کہا۔ تو عروش مسکرانے لگی۔ خمن نے بھی مسکرا کر عدی کے نزو ٹھے انداز کو دیکھا تھا۔

”تم سناؤ بیٹا پاکستان میں سب خیریت ہے ناں؟ تمہارے گھر میں؟ میری عفاف کیسی ہے؟“ خمن نے عروش سے پوچھا۔

”الحمد للہ آئی سب خیریت ہے۔ عفاف بھی ٹھیک ہے۔ آپ سب کو بہت یاد بھی کرتی ہے۔“ عروش نے ان کو آگاہ کیا۔

”جھوٹ۔“ عدی نے تیزی سے کہا تو عروش نے متغیر نظروں سے اسے دیکھا۔

”مجھے تو نہیں یاد کرتی۔۔۔۔۔ آئی ایم شیور! آپ نے کبھی میرا نام بھی نہ لیا ہوگا۔“ عدی ابھی تک منہ بسور ڈرائیونگ کر رہا تھا۔

”ہاں دیسے یہ سچ کہا۔ مجھے تو معلوم بھی نہ تھا کہ عفاف کا کوئی بھائی بھی ہے۔“ عروش مسکراہٹ دبا کر بولی۔

”دیکھا دیکھا می۔ مجھے پتا تھا۔۔۔۔۔ ایک میں ہی

تو ہوں فالٹو جس کا کبھی کوئی ذکر ہی نہیں کرتا۔۔۔۔۔“ عدی نے اپنی نظروں سے عروش کو دیکھا تھا۔

”بیٹا وہ مذاق کر رہی ہے۔“ خمن نے عدی کے گبڑے تیوروں کو دیکھ کر کہا۔

”دیسے یہ سچ نہیں ہے۔۔۔۔۔ میں مذاق کر رہی ہوں۔“ عروش کو عدی کے تاثرات لطف دے رہے تھے۔ پھر بھی سچ کو مذاق نہ دیا۔

”عدی بھائی میں واقعی مذاق کر رہی ہوں۔ عفاف سب کو بہت یاد کرتی ہے۔“ عدی کچھ نہ بولا تو عروش نے نرم لہجے میں کہا۔

”بھائی۔۔۔۔۔“ عدی نے چیخ کر کہا۔ خمن نے اسے دیکھا۔

”کیا ہوا۔۔۔۔۔“ عروش نے حیرت سے اسے دیکھا تھا۔

”میں صرف عدی ہوں۔ عدی بھائی نہیں۔۔۔۔۔“ عدی نے ٹیکسی نظروں سے بیک ویو مرر سے اسے گھورا تھا۔

”سوری میں سمجھی عمر میں آپ مجھ سے بڑے ہوں گے تو۔۔۔۔۔“

”بات عمر کی نہیں رہنے کی ہوتی ہے، تم مجھے ان، ان، یہ، وہ، جو مرضی ہے کہو لیکن بھائی قطعی نہیں۔۔۔۔۔“ عدی نے اچھے خاصے تھے لہجے میں اسے ٹوکا تھا۔

”لگتا یہ بھی وہی شقوق ہے جن کو عزت راس نہیں آتی۔“ عروش دل ہی دل میں بڑبڑائی اور شپٹا کر خمن کو دیکھا۔ جو انتہائی تعظیمی نظروں سے عدی کو گھور رہی تھیں۔

”عدی یہ کیا بدتمیزی ہے۔“ انہیں نے اسے سرزنش کیا۔

”جی۔۔۔۔۔ یہ بدتمیزی نہیں، سیفٹی ہے۔“ عدی نے شریر انداز سے خمن کو دیکھا تھا۔ انہوں نے سر پھینک لیا۔

”یہ نہیں سدھرنے والا۔۔۔۔۔ عروش بیٹا تم اس کی باتوں کا برا نہیں منانا یہ ایسے ہی فضول ہانکنا رہا ہے۔“ خمن نے عروش کو دیکھ کر کہا۔

”کوئی بات نہیں آئی میں مائنڈ نہیں کرتی۔“ عروش مروت بھانے میں ماہر تھی۔

”ہائے داوے“ صرف عدی“ کیا میں آپ کا فون پوز کر سکتی ہوں؟ اپنی خیریت کی اطلاع دینی ہے۔“ عروش کی مسکراہٹ میں شرارت کا عنصر عدی کو چونکا گیا۔

”ہا ہا ہا۔۔۔۔۔“ خمن نے ہنس کر عدی کو چڑایا تھا اور عروش کو داد دی تھی۔

”جی ہاں کر سکتی ہیں۔۔۔۔۔“ عدی نے ڈرائیونگ کرتے کرتے موبائل اس کی طرف بڑھا دیا تھا۔

”جی السلام علیکم لالہ! عروش بول رہی ہوں۔“ دوسری طرف سے کال ریسیو کی گئی تو عروش نے کہا۔

”ہاں لالہ میں خیریت سے پہنچ گئی ہوں۔“

”نہیں۔۔۔۔۔ کوئی مشکل نہیں ہوئی، فلائٹ ٹائم پر تھی۔“

”آئی اور عدی آئے ہیں۔“ عروش دھیمی آواز میں مبین کو بتا رہی تھی۔ ایک طرف گفتگو واضح کر رہی تھی کے دوسری جانب سے کیا پوچھا جا رہا تھا۔

”وہ ڈرائیو کر رہے ہیں۔ آپ آئی سے بات کر لیں۔“ عروش نے نظریں اٹھائی تو عدی کی آنکھیں اسنے آپ پر مرکوز پائیں۔ دوسرے پل اس نے موبائل خمن کی طرف بڑھا دیا جبکہ عدی دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ اب خاموشی سے ڈرائیو کر رہا تھا۔

”نہیں بیٹا بالکل فکر نہ کرو۔ میری اپنی بیٹی ہے۔“

”ماشاء اللہ اتنی پیاری بیٹی سے اگر کوئی غلطی ہو بھی جائے تو درگزر ہو جاتی ہے۔“ اپنی تعریف پر عروش یک دم نزو ہونے لگی۔

”جلدی ہم گھر پہنچ جائیں گے پھر عروش کا نمبر بھی ایکٹو ہو جائے گا تو پھر خوب باتیں کر لیتا۔“ خمن نے مسکراتے ہوئے مبین کو بتایا۔

”ہاں ان شاء اللہ بیٹا بہت خیال رکھیں گے۔ یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے بھلا۔۔۔۔۔“ خمن نے پھر تسلی

دی اور پھر چند سی باتوں کے بعد فون بند کر دیا۔

تقریباً پچاس منٹس کی ڈرائیو کے بعد وہ گھر پہنچ گئے تھے۔ جہاں احسن ندیم نے بھی عروش کا نہایت فراخ دل سے استقبال کیا۔

”بہت شکریہ۔ انکل آپ سے مل کر بہت اچھا لگا، مجھے بالکل ایسے لگا جیسے میرے پایا ہیں آپ!“

عروش گلوگیر لہجے میں اپنے آپ پر ضبط کرتے ہوئے بولی۔

”یہ آپ کا اپنا ہی گھر ہے۔ کسی تکلف کی ضرورت نہیں۔“ احسن ندیم نے بھی اپنائیت بھرے لہجے میں کہا۔

”لگتا ہے کسی ڈرامے کی شوٹنگ چل رہی ہے۔“ عدی اس کا سامان لے کر اندر داخل ہوا تھا۔ ان کی اس تکلف و مروت بھری گفتگو سے زچ ہوتا ہوا بولا۔

”عدی۔۔۔۔۔ بری بات بیٹا!“ خمن نے اسے گھر کا۔

”ممی پلیز اب میں بڑا ہو گیا ہوں۔ کم از کم ایک لڑکی کے سامنے تو نہ ڈانٹیں۔“ عدی ایک بار پھر چڑ کر بولا۔ تو عروش ہنسنے لگی۔

”کوئی بات نہیں صرف عدی ایسے تو ہوتا ہی رہتا ہے۔“ عروش شریر لہجے میں بولی تو عدی نے چونک کر اسے دیکھا۔ کچھ کہنا چاہ رہا تھا لیکن زبان پتالے لگے تھے۔ تو فقط اسے گھور کر رہ گیا۔

عروش کو بات بات پر منہ بسور کر شکایت کرنے



والا عدی اچھا لگا تھا۔ اب تک کے سفر میں وہ اتنا تو سمجھ چکی تھی کہ عفاف کی فیملی اچھی اور سچی ہوئی ہے۔ آپس میں دوستی بھی ہے، بے تکلفی بھی اور ایک دوسرے کے لیے احترام بھی۔ ”چلو یہ ٹینشن تو دور ہوئی۔ اب وقت اچھا گزر جائے گا اور جو میں سوچ کر یہاں آئی ہوں وہ بھی آسان ہو جائے گا۔“

”آؤ میں تمہیں تمہارا کمرہ دکھا دوں۔ فریش ہو جاؤ تو پھر کھانا کھانا ہے۔ تمہیں ریست بھی کرنا ہوگا۔“ وہ انہی خیالوں میں گن گئی کہ ٹمن کی آواز پر اٹھ کھڑی ہوئی کہ واقعی اب بھوک بھی لگ رہی تھی اور نیند بھی آ رہی تھی۔ اگلے لمحے وہ ٹمن کے ہمراہ اپنے کمرے کی جانب بڑھ رہی تھی۔ جبکہ عدی کی نظروں نے دور تک اس کا تعاقب کیا تھا۔

☆☆☆

”آئی آپ کو مدد چاہیے کیا؟“ ٹمن صبح سے کچن میں مصروف تھیں کہ عروش اپنے ساری پیپرز اپنے کمرے میں رکھ کر ان کے پاس آ گئی۔

”ارے نہیں بیٹا تم کیا مدد کرو گی آج تمہارے اکل کی پسند کی چیزیں بنانے لگی ہوں۔ جاب سے آف ہے ناں ان کا تو آج ذرا ارادہ ہے۔“ عروش کی بات پر ٹمن نے پلٹ کر اسے دیکھا۔

”واہ..... ہمارے گھر میں بھی پایا کی پسند کی ڈشز بنا کرتی تھیں۔ اب لالہ کی پسند کی بھی بنتی ہیں۔ میری کو کنگ بھی اچھی ہے دادو نے سب سکھایا ہے مجھے، میں آپ کی مدد کر سکتی ہوں۔“ عروش کو گھر کا ماحول میسر آتا نظر آ رہا تھا۔ تو خوش دلی سے ٹمن کو مدد کی آفر بھی کی۔

”ٹھیک ہے پھر تم بھی کچھ بنا لو۔ اپنی کوئی پسند کی ڈش۔“ ٹمن نجانے کیا سوچ کر کہنے لگیں۔

”ٹھیک ہے میں بناتی ہوں۔“ ٹمن نے ہاں؟ تو میں اپنی ایک ٹیبل ریسپی بنائی ہوں۔“ عروش نے ٹمن سے پوچھا تو انہوں نے اگلے لمحے فریزر سے ٹش نکال کر اس کو دے دی۔

”ٹھیک یو آئی۔“ عروش ٹش کا پکٹ پکڑ کر

مسکرا کر بولی۔

”یہ ریسپی میری اپنی ہے۔ دادو کے ساتھ مل کر بنائی تھی تو لالہ کو بہت پسند آئی تھی۔“ عروش ٹمن کو بتانے لگی۔

”دادو نے بتائی تو پھر اپنی ریسپی تو نہ ہوئی ناں۔“ اس سے پہلے کے ٹمن کچھ کتنی عدی کی کچن میں آمد ہوئی اور وہ اپنے مخصوص سچے انداز میں کہنے لگا۔

”بیٹا اس نے کیا ہے کہ دادو کے ساتھ مل کر بنائی تھی۔“ ٹمن نے سچ کی تو وہ مزید برہم ہوا۔

”آپ کبھی میری سائڈ نہ لیتا۔“ وہ میز پر رکھی فروٹ باسکٹ سے کیلا اٹھا کر کھانے لگا اور منہ بند کر بولا تو عروش بے ساختہ ہنس پڑی۔ عدی نے ناراض نظروں سے اس کی ہنسی کو دیکھا۔

”کوئی سوتیلوں کے ساتھ بھی ایسا رویہ نہیں رکھتا جیسا مجھ اکلوتے کے ساتھ رکھا جاتا ہے۔“ عدی نے ایک بار پھر اپنی ناقدری کا رونا رونا شروع کیا تھا۔

”نہیں ایسا تو ہمیں کے آپ سوتیلے ہی ہیں؟“ عروش نے مسکراہٹ دبا کر پوچھا تو عدی نے یک دم اسے دیکھا۔

”کیا مطلب.....؟“ عدی نے ابرو اچکا کر اسے دیکھا۔

”میرا مطلب ہے کہ ایک ہفتہ ہو گیا مجھے آئے ہوئے لیکن اکل آئی کا آپ کے ساتھ رویہ اکلوتے بننے والا تو بالکل بھی نہیں، ہاں سوتیلے والے پریرسج ہو سکتی ہے۔“ عروش اب اس کو حقیقی معنوں میں زچ کرنے کی ٹھان چکی تھی۔ ٹمن نے حیرت سے اسے دیکھا تو اس نے آنکھ دبا کر انہیں خاموش رہنے کا کہا اور عدی کے تاثرات سے لطف لینے لگی۔

”او میڈم! تم یہاں پڑھائی کرنے آئی ہو کہ بچا پے کٹنی کا رول ادا کرنے۔“ عدی نے مسکرائیں نظروں سے اسے دیکھا۔

”مہی..... بتائیں اس کو کہ میں سوتیلیا نہیں ہوں بس ایسے ہی ناقدری کی موت مارا جا رہا ہوں۔“ عدی

ایک بار چہرہ منہ بنا چکا تھا۔

”ارے نہیں بیٹا۔ تم تو ہمارا سہارا ہو۔ ہماری جان ہو۔“ ٹمن نے محبت پاش نظروں سے عدی کو دیکھا تھا۔

”تم کیوں ہنس رہی ہو.....؟“ ٹمن کی بات پر عدی اتر آیا تھا، جبکہ عروش لب بھینچے اپنی مسکراہٹ روکنے کی کوشش میں مصروف تھی۔ عدی اس کی معنی خیز مسکراہٹ کو دیکھ کر اکڑے انداز میں پوچھنے لگا۔

”نہیں، کچھ خاص نہیں۔“ وہ گہری مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

”بیٹاؤ.....“ عدی نے جارحانہ انداز میں اس سے دریافت کیا۔

”وہ کچھ نیکی آئی نے مجھے آنکھ ماری ناں۔“ اس لیے ہی آگئی.....“ عروش، عدی کو چھیڑنے لگی تھی۔

”عروش.....“

”مہی.....“ عدی اور ٹمن ایک ساتھ چلائے تھے۔ جبکہ عروش اب ہلکھلا کر ہنس رہی تھی۔ اب ٹمن بھی ہنس رہی تھیں جبکہ عدی ہلکھلائی عروش کو دیکھ کر ایک بل میں سکتے میں آ گیا تھا۔ دل میں ایک بار پھر وہی گھنٹیاں بجنے لگی تھیں جو نون پر ایئر بیس سے ابھرتی اس کی آواز سن کر بجتی تھیں۔

”مہی ذرا دھیان رکھنا۔ یہ آگ لگانے آئی ہے۔“ عدی نے گہری نظروں سے عروش کو دیکھ کر ٹمن کو کہا تھا۔ اس کے الفاظ اور تھے لیکن مطلب اور تھا عروش نے شیشا کر دیکھا۔

”جی نہیں..... میں مذاق کر رہی تھی۔“ عروش اب عدی سے مخاطب تھی۔

”ہاں بیٹا عروش ایسی نہیں ہے۔“ ٹمن نے عروش کی طرف داری کی۔

”ہاں ہاں ایک میں ہی تو ہوں ایسا..... باقی تو کوئی ایسا نہیں ہے۔“ عدی کا بات بات پر روٹھ جانا عروش کو حیرت سے دوچار کرتا تھا۔

”ویسے ایک بات کافی عجیب لگی مجھے.....“

عروش۔ عدی سے کہنے لگی تو اس نے نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

”قاریور کا نیڈ انفارمیشن..... میں جیس نہیں ہوتا۔“ اس سے پہلے کے عروش کچھ کتنی عدی نے کہہ کر اسے حیران کر دیا۔ اور وہ سوچ کر وہ گئی کہ عدی کو کیسے پتا چلا کہ وہ کیا کہنے والی ہے۔

”انداز تو جیلتی والے ہی ہیں۔“ ٹمن اب واپس کام کرنے کے لیے رخ موڑے کھڑی تھیں۔ عروش نے اپنی حیرانی کو پوشیدہ رکھتے ہوئے کہا۔

”تو تم میرے انداز نوٹ کر رہی ہو.....“ عدی کا لہجہ معنی خیز تھا۔

”نہیں..... لیکن جب کوئی چیز نظروں کے بالکل سامنے ہو تو نظر انداز بھی نہیں ہوتی۔“ عروش نے کہا اور رخ موڑ کر چھٹی کی طرف متوجہ ہو گئی۔

جبکہ عدی خود بھی اپنے انداز پر حیران ہوا جا رہا تھا۔

”مہی میرے لیے کیا بنا رہی ہیں؟“ عدی نے ٹمن سے پوچھا۔

”نفس.....“ ٹمن نے ذرا کی ذرا عدی کی طرف دیکھا اور شریر مسکان کے ساتھ کہا۔

”تھینک یو مہی.....“ عدی ان کی معنی خیز مسکراہٹ سے محفوظ ہوتا ہوا بولا۔ عروش نے پلٹ کر دیکھا اور ایک لمحے میں سمجھ گئی کہ عدی کو نفس پسند ہے..... دوسرے بل وہ اپنی ساری توجہ اپنی اسپیشل ڈش کی طرف مرکوز کر چکی تھی۔

”کاش لالہ اور دادو بھی ہوتے یہاں۔ دودن سے بات بھی نہیں ہوئی۔“ وہ ایک دم بڑبڑاتی تھی۔

”تم اتنی بے دفا ہو سکتی ہو میں نے بھی سوچا بھی نہ تھا۔“

”لیکن تم اتنی ہی بے دفا ہو گئی میں نے بھی سوچا تھا۔“ اب عروش اپنی ڈش کو لاسٹ سچ دے رہی تھی کہ عفاف کا میج اس کو ایک دم بہت زیادہ خوشی سے دوچار کر گیا..... ٹمن اپنی ڈشز تقریباً تیار کر چکی تھیں اور اب عروش کچن میں آئی تھی اس لیے اس کا میج آتے ہی اس نے کال ملائی۔

”میں نے کب بے وفائی کی؟ تم ہی ہو جو وہاں جا کر سب بھول بھال گئی ہو۔“ عفاف نے قدرے جڑے تیوروں سے کہا۔

”میں آج کو تنگ کر رہی ہوں۔“ عروش نے اون کا گیس نارک سیٹ کر کے فٹس ٹرے اس میں رکھتے ہوئے عفاف کو بتایا۔

”کیا۔“ عفاف کو گویا کرٹ لگا۔

”تم کیوں کر رہی ہو.....؟“ عفاف نے پوچھا۔

”تو یہ تم تو ایسے اچھی ہو جیسے میں کوئی اچھوت ہوں۔“ عروش نے ناراضی کا اظہار کیا۔

”نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ مجھے اس لیے حیرت ہوئی کہ می عمو! خود ہی ساری کو تنگ کرتی ہیں

ناں۔ ہائے داوے کیا پکار رہی ہو۔“ عفاف نے اس کو بتایا اور پھر پوچھا۔

”آجی نے ہی ساری ڈشز بنائی ہیں۔ میں تو صرف فٹس فرائڈ بنا رہی ہوں۔“ عروش اوون کی گلاس

ڈور سے فٹس ٹرے کو دیکھ کر اسے بتایا۔

”او اچھا مطلب عدی کی فیورٹ ڈش بنائی جا رہی ہے۔“ عفاف نے شریہ لہجے میں کہا۔

”یہ اس تک چڑھے عدی کی فیورٹ ہے؟ پہلے پتا ہوتا تو کبھی نہ بنائی۔“ عروش ناگواری سے گویا

ہوئی۔

”ہیں؟ وہ کیوں بھلا؟ لڑائی ہو گئی ہے کیا؟“ عروش کا لہجہ عفاف کو چونکا گیا تھا۔

”یہ تمہارا بھائی بات بات پر منہ سورا لیتا ہے۔ اور میں کیوں اس کے حکم مانوں؟“ عروش کا انداز

شکا بننا تھا۔ عفاف دل کھول کر مسکرائی۔

”کون سا حکم.....؟“ حکم کی بات پر عفاف جھٹکی

تھی۔

”یہی کے جہاں جاؤ مجھے بتانا، مدد کروں گا..... یہ، وہ ایسے ہی فضول میں۔“ عروش نے

شکایت تو شروع کی لیکن اب بات بنانا مشکل ہو رہی تھی۔

”ارے..... یہ اس کے حکم نہیں ہیں۔ میں نے ہی کیا تھا اسے کہ تمہیں سپورٹ کی ضرورت ہوگی تو مدد

کرے۔“ عفاف نے اسے حقیقت بتائی۔

”ہاں اس نے یہی کہا تھا۔ لیکن.....“

”تم نے یقین نہیں کیا۔“ عفاف نے اس کا جملہ مکمل کیا۔

”ہاں ناں تو اور کیا..... اس نے حکم دیا تو.....“

اب کے عروش بھی منہ سوراے ہوئے لگی تھی۔

”اور لاڈلا ہے ناں، تو یوں ہی منہ سورا اپنے لاڈ اٹھواتا ہے۔ تمہارے سامنے بھی اس لیے ہمہ

وقت منہ سوراے رکھتا ہوگا.....“ عفاف اسے عدی کے بارے میں بتانے لگی۔

”اب میں تو اس کے لاڈ اٹھانے سے رہی.....“ عروش تیزی سے بنا دھیان دیے ہوئی تھی۔

”کیوں؟ کیا میں اتنا برا ہوں؟“ اس سے پہلے

کے عفاف کی آواز اس کے کان میں پڑی..... ایک مردانہ آواز نے اس کے اوسان خطا کر دیے۔ عروش نے

پلٹ کر دیکھا تو بچن میں عدی کھڑا تھا۔ دونوں ہاتھ باندھے نظریں اس پر جمائے نچانے کب سے کھڑا اس

کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ اتنی خوشی کہ پتائی نہ چلا.....

”عدی آیا ہے وہاں؟“ اس سے پہلے کے عروش کسی قسم کا رد عمل ظاہر کرتی عفاف نے اس سے

پوچھا۔

”ہاں.....“ عروش مدھم آواز میں بولی۔

”اچھا میری بات کرو! اس سے.....“ عفاف نے کہا تو اس نے عروش سے خاموشی سے موبائل کچھ

فالے پر کھڑے عدی کی جانب بڑھا دیا۔

اس پر نظریں چماتے عدی نے فون پکڑا..... تو

عروش ہاتھ مروڑتی وہیں کھڑی رہ گئی۔

کچھ سفا کیلے کرنے پڑتے ہیں۔ بنا کسی سہارے، بنا کسی گائیڈ لائن کے۔ بنا کسی سے مشورہ کیے۔ بین نیازی بھی ایک ایسے ہی سفر کی طرف قدم بڑھا چکا تھا جہاں اس کو کسی کا ایک لمحے کا سہارا بھی

میسر نہ تھا۔ کوئی اس کو حوصلہ دینے والا نہ تھا۔

”بین نیازی محبتوں کے سفر استے آسان نہیں ہوا کرتے اور پھر ایک طرف محبت..... تل تل مارتی ہے،

لحہ لہہ سلگاتی ہے۔ سفر اتنا طویل نہیں ہے، پٹ جاؤ۔ محبت پل صراط سے کم نہیں ہوتی، بہت احتیاط، بہت

نیک بینی اور صاف من سے نہ سنبھالی جائے تو نارسائی کی دھمکی آگ میں جھونکنے میں زیادہ دیر نہیں لگاتی۔“

سفر طویل نہیں ہے لیکن اب واپسی ممکن نہیں ہے۔ میں نہیں جانتا کہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔ میں یہ بھی

نہیں جانتا کہ یہ کیسی محبت ہے۔ اس کے انکار، بار بار انکار نے اس محبت کی شدت میں اضافہ کیا ہے۔

ایسے کیوں ہو رہا ہے میں نہیں جانتا۔ دل اس کی جانب اس قدر کیوں کھچا چلا جا رہا ہے میں نہیں

جانتا۔ چندھوں نے مجھے بین نیازی کو اتنے بے بس کیوں کر دیا۔ میری اپنی بھی سمجھ سے بالاتر ہے۔

جب دوا سے کچھ حاصل نہ ہو تو دعا کر لینی چاہیے۔ ہم قبولیت کی گھڑی سے بے خبر ہیں۔ کون

سالمہ ہماری فریاد کو عرش پر پہنچا کر قبولیت کا شرف بخش دے ہم نہیں جانتے۔ مجھے اب قبولیت کے اس

پل کے اس پل کو کھوجنا ہے، انتظار کرنا ہے۔ محبت کا انتظار، اسی جذبے، اسی جنون سے۔“

دعائے اپنا کام نہ کیا تو..... دوسرا آپشن موجود تو ہے ہی، بین نیازی ایک بار پھر شش و پنج میں مبتلا الجھ رہا

تھا۔ اس سے وہ لمحات فراموش کرنا کسی طور بھی ممکن نہ ہو رہا تھا۔ بارش میں بھیگی دل آویز نے ایسا کوئی ظلم

پھونکا تھا۔ بین نیازی بے بسی کی آخری حدوں سے جا کھرا اور اب اس کا لاسٹ سمسز شروع ہو چکا تھا۔ پھر

یہاں قیام کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا تھا، اس کو پاکستان واپس جانا تھا اور دل آویز اس سے اتنی دور بھی کہ ایک

ہی شہر، ایک ہی جگہ رہنے کے باوجود وہ اس کی پرچھائی

بھی نہ پاس کا تھا۔

وہ سمجھ نہ کہ اس کو کیا کرنا چاہیے۔ ایسا کیا کرنا

چاہیے کہ دل آویز کو اس سے محبت ہو جائے۔ محبت نہ ہی تھی لیکن ایک انسیت تو ہو جائے۔ ایک ایسا تعلق تو

بن جائے کہ وہ اس کی بات سن لے، بنا کسی ناگواری کے، بنا کسی جھنجھلاہٹ کے۔ لیکن دل آویز تو ان کی

طرف دیکھنے کی بھی روادار نہیں تھی۔

”بین نیازی، اب ایک ہی راستہ بچا ہے، خاموشی سے دعا کا۔ ابھی تمہاری محبت کو تمہاری قسمت

بننے کا وقت نہیں آیا ہے۔ اور تم..... بین نیازی ابھی محبت کے حصول کو بھول کر باقی معاملات پر توجہ دو۔“

”بینین بیٹا! سورہے ہو کیا؟“ ابھی نچانے یہ

تکرار اور کتنی طویل ہوئی کہ ان کے کندھے کو ہلا کر پوچھا گیا تو بین نیازی نے آنکھیں کھول دیں۔

”نہیں دادو! جاگ رہا ہوں۔“ وہ دونوں ہتھیلیوں سے آنکھوں کو گرگڑ کر بولا۔

”اتنی دیر سے آوازیں دے رہی ہوں۔ اب تو فکر ہونے لگی تھی کہ بول کیوں نہیں رہے۔“ سفینہ

مشکرانہ انداز میں بولیں۔ بینین نے حیرانی سے انہیں دیکھا اور پھر خود کو سرزنش کرنے لگا۔ ایسی کیفیت اس

پر بھی کبھی طاری ہوئی تھی۔ ہر طرف سے بے گانگی، لاتعلقی اور بے زاریت، اس کے حواسوں کو چھین لیتی

تھی اور سامنے والا یا تو مشکوک نظروں سے اس کی ذہنی حالات کو دیکھتا یا پھر فکر مند سے..... لیکن بینین

نیازی اگلے چند منٹوں میں نارمل ہو چکا ہوتا تھا۔ ابھی بھی وہ نچانے کتنی دیر سے جس کیفیت میں مبتلا تھا،

سفینہ کی ایک آواز..... جب اس کی ساعت سے کھراکی تو وہ اٹھ بیٹھا اور محض کچھ ہی پل میں حال میں

لوٹ آتا تھا۔

”کیوں کیا ہوا؟ خیریت ہے؟“ بینین نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

”ہاں خیریت ہے، آج عفاف سے بات ہوئی تھی۔“ بینین نے فی وی کار میوٹ اٹھا کر فی وی

آن کیا تو سفینہ بولنے لگیں۔

”اچھا تو..... خیریت سے ہے وہ؟“ مبین نے نظریں ابٹی وی اسکرین کی طرف مرکوز کر کے پوچھا۔

”ہاں خیریت سے ہے، بہت ہی پیاری بچی ہے۔ بہت خیال کرتی ہے جب بھی بات ہو تو ایسی محبت سے پیش آتی ہے کہ دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔ ایسا شیریں لہجہ ہے کہ بے اختیار مسکراتے پر مجبور کر دیتی ہے۔“ عروش کی ہدایت کے عین مطابق سفینہ عفاف کی اچھائیوں کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنے لگی تھیں۔

”آپ مجھے عفاف کی تعریفیں سنانے کے لیے جگہ رہی تھیں؟“ مبین نے ایک نظر ان کو دیکھ کر سنجیدگی سے دریافت کیا۔

”ارے نہیں بیٹا، جگا تو اس لیے رہی تھی کہ تم مجھے باریکٹ لے چلو۔ کچھ چیزیں ملتی ہیں اور یہ بھی کہ کافی دیر سے چائے نہیں پی ہے۔ تم نے کھانا بھی نہیں کھایا اور عفاف کا بھی پیغام تھا کہ تم اس سے رابطہ کرو۔“ سفینہ ہولے سے ہنس کر اسے بتانے لگی تھیں تو عفاف کے پیغام کے ذکر پر مبین نیازی ٹھنک کر رہ گئے۔

”کیوں؟ خیریت تو ہے ناں۔ عفاف نے رابطے کا کیوں کہا؟“ مبین پوچھے بناتہ رہا۔

”ہاں میرے خیال میں خیریت ہی ہے شاید.....“ سفینہ نے جان بوجھ کر آفیشل کام کا حوالہ نہ دیا تھا حالانکہ عفاف کی تاکید تھی لیکن عروش کا کہنا ماننا پڑا اور آدھا ادھر اور پیغام پہنچا دیا۔

”یہ ہے اس کا نمبر۔“ سفینہ نے اپنی ذاتی ڈائری (جہاں وہ نمبر لکھا کرتی تھیں) مبین کے سامنے کی تو مبین عفاف کے نام کے ساتھ لکھا نمبر اپنے موبائل میں محفوظ کرنے لگا۔

”عفاف.....“ زیر لب اس نام کو دہرایا گیا اور ایک مسکراہٹ نے چہرے کا احاطہ کیا۔

”دادو آپ کھانا لے آئیں، میں فریش ہو کر آتا ہوں پھر ماریٹ چلیں گے۔“ دوسرے پل وہ

سر جھٹک کر سفینہ کی جانب متوجہ ہوا تھا اور قدم باہر کی جانب بڑھا دیے جبکہ سفینہ نے اس کے چہرے پر ابھرنی مسکراہٹ کو گہری اور ذومعنی نظر سے دیکھا تھا۔

☆☆☆

وہ لال گلاب کے پھولوں کا گلدستہ پکڑے کھڑی انتظار کی کوفت کو با مشکل برداشت کر رہی تھی۔

گنہرے لال گلاب کے پھولوں کا گلدستہ بہت خوب صورت تھا، صرف چھ گلاب، چند ایک ادھ کلی کلیاں اور چند گلابوں کی تازگی جو بن رہی تھی۔ اس نے مسکرائی نظروں سے ان کو دیکھا تو دل میں ایک عجیب سی لطافت محسوس کی۔

”محبت..... کتنا ٹھنک ہوتا ہے یہ سفر۔ لیکن پھر بھی ایک چاشنی ہمہ وقت اس کے ہمراہ ہوتی ہے۔“ وہ دھیرے سے مسکرائی۔

”میں نے کب سوچا تھا کہ میں بھی کبھی اس جذبے کی اسیر ہو جاؤں گی اور اپنے سے چندہ سال بڑی عمر کے انسان سے ایسی محبت ہو جائے گی کہ میں.....“

”ہیلو..... ریڈی؟“ ابھی وہ نظریں ہاتھ میں پکڑے گلابوں پر جماتے خود کلامی میں مصروف تھی کہ آواز پر اس کی سوچوں کا سلسلہ ٹوٹا۔

”نیں ریڈی.....“ دوسرے پل وہ ساری سوچوں کو جھٹک کر آگے بڑھی تھی۔

”السلام علیکم!“ وہ پرمست لہجے میں کہتے ہوئے گاڑی کے پاس آ کھڑی ہوئی۔

”وعلیکم السلام! بیٹھو گاڑی میں۔ مجھے گیراج میں تھوڑا سا کام ہے۔ تمہیں پہلے اس لیے پک کر رہا ہوں کہ پھر ادھر نہیں آنا پڑے گا۔“ وہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھی تو مانی نے اس کی طرف دیکھ کر کہا تو دل آویز نے متغیر نظروں سے اسے دیکھا۔ دل ایک عجیب لے پر دھڑکا تھا۔ بنا کچھ کہے اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”بہت پیارے پھول ہیں، کس کے لیے

ہیں؟“ مانی نے ڈرائیونگ کرتے ہوئے اس کے ہاتھ میں پکڑے گلابوں کو دیکھ کر پوچھا۔

”آپ کے لیے۔“ یہ کہتے ہی اس نے وہ پھول ڈرائیونگ کرتے مانی کی جانب بڑھاتے ہوئے بولی۔

”میں بہت کریزی اسٹوڈنٹ ہوں ناں بہت محنت کرنی پڑتی ہے آپ کو۔ تو میں نے سوچا، آپ کا شکریہ ادا کر دوں۔“ دل آویز کا نہ صرف لہجہ بلکہ اس کے ہر ایک لفظ سے محبت ٹپک رہی تھی اور ہلکی سی شرارت کا بھی شائبہ موجود تھا۔ مانی نے پھر اس کی طرف دیکھا نہ ہی ہاتھ بڑھا کر پھولوں کو پکڑا، وہ منتظر تھی لیکن..... مانی کا گیراج آ گیا اور وہ معذرت کر کے باہر نکل گیا۔

”اب تمہارے لیسن کا وقت شروع ہوا ہے، اس لیے اب تم ڈرائیونگ کرو۔“ دل آویز گاڑی میں بیٹھی انتظار کر رہی تھی کہ مانی دس منٹ میں ہی واپس آ گیا اور اس سے مخاطب ہوا تو دل آویز اب ڈرائیونگ سیٹ سنبھال چکی تھی۔ ڈیش بورڈ پر پھول رکھے تھے جواب مانی کے بالکل سامنے تھے۔

دل آویز اب ڈرائیونگ شروع کر چکی تھی۔ ایک دم دل آویز نے بریک لگائے اور ڈیش بورڈ پر رکھا ہوئے مانی کی گود میں آگرا تھا۔ دل آویز ہلکھلا کر ہنسی اور مانی نے لب بھینچ لیے۔

”یہ پھول آپ کے لیے ہیں، ان کو معلوم ہے کہ ان کا اصلی حق دار کون ہے۔“ دل آویز نے سامنے ٹریفک لائٹس کو بدلتے دیکھتے ہوئے بریک پر پاؤں رکھا اور شوخ انداز میں مانی کو کہنے لگی۔

”تمہاری ڈرائیونگ اب بہت اچھی ہو گئی ہے، تم نے ٹیسٹ بک کروایا؟“ مانی نے اس کی ہر اک شوخی کو نظر انداز کرتے ہوئے اس سے پوچھا تھا۔

”ٹیسٹ نہیں بک ہو رہا ہے، بہت لیٹ ڈیٹ مل رہی ہے۔“ دل آویز نے مانی کو آگاہ کیا۔

”تم بک کرادو، ساتھ میں نوٹ لکھ دو کہ کنسلیشن میں تم سے رابطہ کیا جائے۔ جب بھی کوئی

ٹیسٹ کینسل ہوا تم کو جگہ مل جائے گی۔“ مانی اب بے انتہا سنجیدگی سے اس سے مخاطب تھا۔

”دیکھ..... دیکھ کر.....“ دل آویز نے شیشے سے دیکھا کہ ایک گاڑی اس کو اور ٹکٹ کر رہی ہے تو ایک لحظہ نہ جانے کیا ہوا کہ دل آویز نے اپنی گاڑی کی اسپنڈ بڑھادی تاکہ دوسری گاڑی کو جگہ نہ مل سکے، اور ٹکٹ کرنے کے لیے، تو مانی نے تیزی سے اس کو دارن کیا کہ وہ اس وقت ایک خطرناک موڑ پر ہے اور اپنی طرف والے بریک پیڈل کو دبا کے اور اسٹیرنگ وھیل پر ہاتھ رکھ کر گاڑی کو معمولی سا بائیں جانب کیا اور ٹکٹ کرنے والی گاڑی کو گزر جانے دیا اور دل آویز کو ڈانٹنے لگا۔

”آئی ایم سوری۔“ حسب معمول وہ ایک بار پھر معذرت کرنے لگی۔

”تمہیں احساس ہونا چاہیے کہ تمہاری غلطی بڑی تھی، درگزر نہیں ہو سکتی۔“ مانی نے سپاٹ انداز میں کہا۔

دل آویز نے بنا اس کے کہے گاڑی کو ایک سائڈ روڈ کی طرف موڑ دیا تھا اور ایک جگہ گاڑی پارک کر دی تھی۔

”آپ کی آنکھیں اتنی بڑی تو نہیں پھراتی چھوٹی سی غلطی آپ کو اتنی بڑی کیسے لگتی ہے۔“ دل آویز، گاڑی کا انجن آف کر کے مانی کی طرف مڑ کر شریر انداز میں اس کی طرف دیکھ کر اس سے دریافت کرنے لگی تو مانی نے نظریں اٹھا کر اس کے ایک الگ انداز کو سنجیدگی سے دیکھا۔

”ویسے آپ کی پرسنالٹی بہت ڈشنگ ہے اور ایسے سنجیدہ چہرہ لیے، ماتھے پر گھور ڈالے چھوٹی چھوٹی غلطیوں کو بڑا بڑا سمجھ کر ایسے غصے سے دیکھتا۔ مجھے تو ذرا بھی ڈر نہیں لگتا آپ سے۔“ دل آویز کا پل بھر رک کر الہز انداز میں کہنا صاف ظاہر کر رہا تھا کہ اس نے بات بدلی ہے، مانی نے گہرا سانس خارج کیا۔

”یہ اچھی بات ہے کہ تمہیں مجھ سے ڈر نہیں لگتا۔ میرا مقصد اپنے اسٹوڈنٹ کو ڈرانا نہیں ہے،

لیکن غلطی پر ٹوکنا پڑتا ہے، سمجھنا پڑتا ہے۔“ مانی اس کے خاص انداز کو نظر انداز کر کے سرسری لب و لہجہ میں کہنے لگا تھا دل آویز نے لب سمجھ لیے۔

”کیا آپ غلطیاں معاف نہیں کرتے؟“ دل آویز نے عام سے انداز میں پوچھا۔

”غلطیاں معاف نہ کرتا، ہوتا تو تمہیں ایک سال اور تین مہینے سے سکھانہ رہا ہوتا۔“ چھ مہینے میں میرے اسٹوڈنٹ ڈرائیونگ پاس کر لیتے ہیں۔ تم ریگولر ایک سال اور تین مہینے سے بنا کوئی لیسنس مس کیے ڈرائیونگ سیکھ رہی ہو لیکن اگر اب بھی ایسی غلطیاں کرو گی تو غصے میں آنا تو میرا حق بنتا ہے۔“ مانی ہلکے ہلکے انداز میں کہنے لگا۔

”آپ نے ہی کہا تھا کہ ہر کسی میں سیکھنے کی صلاحیت الگ لیول پر ہوتی ہے، شاید میری صلاحیت کا لیول کچھ زیادہ ڈاؤن ہے۔“ دل آویز نے اپنا ہی مذاق اڑایا تھا۔

”تم ٹیسٹ بک کروادینا اور اب گاڑی چلاؤ کرو۔ لیکن ذرا احتیاط سے کہ یہ اسٹریٹ روڈ کا ٹی بڑی ہے۔“ مانی مدھم سی مسکراہٹ کو ہونٹوں پر آنے سے روکے روڈ پر چلتی ٹریفک کو دیکھ کر اس سے بولا تو دل آویز کو گاڑی کا انجن اسٹارٹ کرتے ہی بنی۔

”آپ کو معلوم ہے ریڈروز کا کیا مطلب ہوتا ہے۔“ دل آویز نے مانی کی طرف دیکھا جس کی زانو پر سرخ گلابوں کا گل دستہ رکھا تھا اور یقیناً پھولوں کا مانی کی گود میں ہوتا ایک بے اختیارانہ عمل تھا۔ جس کو دل آویز نے بہت محبت بھری نظروں سے دیکھ کر سوال کیا تھا۔

مانی نے اس کی طرف دیکھا تھا، کندھے اچکا کر بنا کچھ بولے لالعلی کا اظہار کیا تو دل آویز نے ایک نظر مانی کو دیکھا۔ ایک نظر..... بہت سے راز کھولتی ہے وہ ایک نظر..... بہت سے رنگوں سے مزین وہ ایک نظر..... بہت معنی خیز تھی وہ ایک نظر.....

وہ اب ڈرائیونگ کی طرف متوجہ تھی لیکن

دانٹوں تلے دبے ہونٹ پر کھلتی مسکراہٹ صاف بتا رہی تھی کہ اب یہ لب و لہجہ تو دل کی بات کہیں گے اور مانی مسلسل خاموش تھا۔ اس نے اصرار نہیں کیا تھا، سرخ گلابوں کا مطلب جاننے کی ضد نہیں کی تھی۔ دل میں چور تھا تب ہی تو حقیقت کا سامنا کرنے سے اجتناب برتنا جا رہا تھا۔ محبت پر وہ پوشی کی ساری کوششوں کو رد کر دیتی ہے۔

”سرخ پھول محبت کی علامت ہے۔ جب کبھی لفظ اظہار نہ کر سکیں تو سرخ گلاب وہ سارے جذبے عیاں کر دیتا ہے جو زبان سے نہیں کہے جاسکتے۔“ یہ لمحے برسوں سے دل آویز کے دل میں چپتی محبت کو لفظوں میں ڈھل جانے کے تھے۔

مانی نے آہستگی سے رخ موڑ کر دل آویز کو دیکھا۔ وہ گاڑی پارک کر چکی تھی، لیسنس کا وقت ختم ہو گیا تھا۔ مانی کو چونک جانا چاہیے تھا، دل آویز پچھلے ایک سال اور تین مہینے سے جو جذبے ڈھکے چھپے انداز میں مانی پر عیاں کر رہی تھی اب کھلے عام صاف شفاف انداز میں کہہ رہی تھی۔ لیکن اس کا انداز حسب معمول نہایت پرسکون تھا۔

”آپ سے محبت ہے مجھے۔“ دل آویز یوں گویا ہوئی جیسے کسی جرم کا اقرار کر رہی ہے۔ یوں بولی گویا مانی کوئی نا سمجھ بچہ ہے جس کی سمجھ میں اس کے انداز نہ آتے تھے۔

”نجانے کب سے، نہیں معلوم کہ کتنے دن گزر گئے۔ نہیں جانتی کہ کتنی راتیں یوں ہی کاٹ دیں لیکن یہ سچ ہے کہ آپ میرے لیے بہت خاص ہیں۔“ دل آویز انتہائی مدھم آواز میں اقرار محبت کرنے لگی۔ وہ سب کہہ رہی تھی جو صرف سوچا کرتی تھی۔ مانی نے اپنی روش نہ بدلی۔ ان ہی خاموشیوں اور ساپٹ انداز میں بیٹھا تھا۔ دل آویز اس کی طرف دیکھ نہ پا رہی تھی لیکن اس کی سنجیدگی محسوس کر کے اس نے اس کی طرف دیکھا۔

”آئی ایم سوری۔“ وہ اس کی طرف متوجہ نہ تھا تو دل آویز حسب عادت پھر بولی۔

”تم اپنا پروڈیٹل لائسنس مجھے دو۔ میں تمہارا ٹیسٹ بک کرادوں گا۔ تم اب ٹیسٹ کے لیے ریڈی ہو۔“ اس کی ہر اک بات کو، ہر اک جذبے کو نظر انداز کر کے وہ جب بولا تو فقط یہ.....

دل آویز نے بے حد جب سے اس کے بڑھے ہاتھ کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر اک سایہ لہرایا اور دوسرے بل بیک سیٹ پر رکھا ایک اٹھایا اور والٹ سے لائسنس نکال کر مانی کے ہاتھ پر رکھا اور دوسرے لمحے دروازہ کھول کر گاڑی سے باہر نکل گئی۔

☆☆☆

”کسی کی باتیں چھپ چھپ کر سننا اخلاقی جرم ہے۔“

”اور یوں سرعام کسی کی باتیں کرنا کیا یہ جرم نہیں ہے۔“ عفاف نے چند ایک باتوں کے بعد فون بند کر دیا تھا تو اب عروش تیوریاں چڑھاتے عدی سے مخاطب ہوئی لیکن اس کا وہ بدو جواب اس کو شیشا گیا۔

”جی نہیں، یہ لڑکیوں کی باتیں ہیں۔“

”لڑکیوں کی باتوں میں لڑکے کی برائی ہوتی ہے کیا۔“ عدی حیران ہی تو ہوا تھا۔

”نہیں تو..... اور بائے وا، صرف عدی..... ہم آپ کی کوئی برائی نہیں کر رہے تھے۔“ عروش اپنی بات پڑٹ کر بولی۔

”کسی کو تک چڑھا کہنا اس کے ذکر پر منہ بسورنا، واہ واہ مس عروش نیازی! کیا اعلا اخلاقی ہیں آپ کے۔“ عدی کو اس کا بار بار صرف عدی کہنا اب سچ معنوں میں زچ کرنے لگا تھا۔ اس لیے سارے اخلاقیات کو بھول کر اس پر طنز کرنے لگا تو عروش نے زبان دانٹوں تلے دبائی۔

”تو اس میں برائی کیا ہے یہ تو حقیقت ہے۔“

عروش اب بے نیازی سے بولی۔

”میری بہن سے میری شکایتیں لگا کر اب زیادہ ٹھیکیداری بننے کی ضرورت نہیں ہے۔“ عدی جھنجھلایا تھا۔ اس کا اشارہ اس کے لا پرواہ انداز کی

طرف تھا۔ عروش اپنی ہنسی نہ روک سکی تو رخ موڑ گئی، تو عدی اس کو گھور کر رہ گیا۔

”دیکھو مجھے یہ بالکل بھی پسند نہیں ہے کہ میں بات کر رہا ہوں اور کوئی منہ موڑے۔“ عدی بارعب آواز میں بولا۔

”اوکے بولیں، میں سمجھی تھی آپ کی بات ختم ہو گئی ہے۔“ عروش ہی کو ضبط کرتی سرخ چہرہ لیے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”اونہہ.....“ عدی نے ناگواری سے اسے دیکھا اور دوسرے بل پلانا اور بچن سے باہر نکل گیا۔

”ہاہاہا..... بالکل انسان۔“ عروش دل کھول کر ہنسی اور ایک بار پھر عدی کو لقب دیا۔

☆☆☆

”بابا جانی! آپ تو مجھے بھول ہی گئے ہیں۔“ اس کا شکایتی انداز احسن ندیم کی سماعت سے ٹکرایا۔

”بیٹیاں تو بابا کی جان ہوتی ہیں اور ہم اپنی جان کو کیسے فراموش کر سکتے ہیں؟“ احسن ندیم نے پدرزادہ محبت سے پُر لہجے میں جواب دیا۔

”تو اتنے دن ہو گئے آپ نے نہ تو متوجع کیا نہ کال۔“ عفاف منہ سر کر کہنے لگی۔

”اتنے دن ہو گئے؟“ احسن ندیم جو صوف پر نیم دراز تھے یک دم اٹھ بیٹھے۔

”پاکستان میں دن کتنے گھنٹے کا ہوتا ہے؟“ احسن ندیم نے اس سے پوچھا۔

”دن تو بارہ گھنٹے کا ہی ہوتا ہے لیکن رات کو بھی شامل کرنا پڑتا ہے ناں تو چوبیس گھنٹے کے بعد دوسرا دن شروع ہو جاتا ہے۔“ عفاف کا زودھا لہجہ احسن ندیم کو مسکرانے پر مجبور کر گیا۔

”اچھا تو اس کا مطلب ہوا کہ چوبیس گھنٹے ہو گئے ہمارا رابطہ نہیں ہوا۔“ احسن ندیم نے مصنوعی حیرانی سے کہا۔

”بابا جانی اب آپ مذاق اڑا رہے ہیں۔“

”نہیں بیٹا! بس ہمیں یاد کرتا ہوں بہت، ویسے بیٹا ایک ضروری بات بھی کرنی ہے تم سے۔“

اس لیے میں چاہتا تھا کہ تم یو کے آ جاؤ۔“ احسن ندیم نے سہولت سے اپنی خواہش اس کے سامنے رکھی۔
 ”کون سی ضروری بات بابا جانی!“ وہ ٹھٹکی تو تھی لیکن پھر بھی پوچھنا بھی ضروری تھا۔
 ”بیٹا تمہاری مٹی نے بہت دفعہ تم سے بات کی تو ہے، لیکن تم نے ہر دفعہ ٹال منول سے جواب دیا ہے۔ بیٹا تم ہماری زندگی ہو لیکن ایک بہت بڑی ذمہ داری بھی۔ میں نے عدی سے زیادہ تمہیں سپورٹ کیا ہے، بیٹیوں کو رخصت کرنا نہایت ضروری بھی ہوتا ہے اور فرض بھی اور یہی مناسب عمر بھی ہے۔ تمہارا یو کے آنا اگر فی الحال ممکن نہیں، کیوں کہ انسٹی ٹیوٹ کی ذمہ داری بھی لے لی ہے اور اپنی جاب بھی تو میں ایسا کرتا ہوں پاکستان کا چکر لگاتا ہوں۔“ احسن ندیم کی باتیں عفاف نہایت خاموشی سے سن رہی تھیں۔

”ہاں بابا جانی! آپ پاکستان آ جائیں۔“ عفاف جو ان کی باتوں سے پریشان ہو رہی تھی ایک دم پر جوش انداز میں بولی۔

”ہاں ٹھیک ہے، تم بھی سوچ لو اس بارے میں۔ ہم نے تمہاری بات مانی تھی، تمہیں جاب کے لیے پاکستان جانا تھا، کچھ کرنا تھا ہم نے ساتھ دیا تو بیٹا اب.....“

”جی بابا جانی! آپ نے ہمیشہ میرا ساتھ دیا تھا اور اب آپ کی ہی وجہ سے میری جاب ماشاء اللہ بہت اچھی ہے اور ان شاء اللہ آگے بھی اچھا ہوگا۔“ عفاف، احسن ندیم کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی بولی تو احسن ندیم کا سر ایک بار پھر فخر سے بلند ہو گیا۔

”تم یہاں کیا کر رہی ہو؟“ عروش ڈرائنگ روم کے باہر کھڑی تھی کہ آواز پر ایک دم ہلکلا گئی۔

”آئی! آپ کوئی دھوڑ رہی تھی۔“ اس نے ایک دم بات پتائی تھی ورنہ وہ ایک اخلاقی جرم کی مرتکب ہو چکی تھی۔ احسن ندیم کی باتیں جو عفاف سے کر رہے تھے سن چکی تھیں اور جان گئی تھی کہ عفاف

کے لیے اب جلد از جلد رخصتی کا انتظار کیا جا رہا ہے۔
 ”کیوں بیٹا! خیریت؟“ شمن اس کو ہمراہ لیے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئیں۔

”وہ آئی! کھانا تیار ہے ناں تو پوچھنا تھا کہ کب تک کھانا ہے۔“ عروش نے اطلاع دی۔
 ”عدی کہیں باہر گیا ہے تو وہ آئے تو پھر کھاتے ہیں۔“ شمن احسن ندیم کے برابر بیٹھے ہوئے ہو گئیں۔

”ٹھیک ہے آئی میں اپنے روم میں جا رہی ہوں۔ جب کھانا کھانا ہوا تو مجھے بتا دیجیے گا میں کھانا لگا دوں گی۔“ عروش جلد از جلد سفینہ سے بات کرنا چاہ رہی تھی کہ ان کو بتا سکے۔ عفاف کی شادی کا ذکر چھڑا ہوا ہے اور انہیں مبین کے لیے بات کرنی ہے۔ خوش مزاجی سے کہہ کر شمن کے اثبات میں سر ہلاتے ہی وہ اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔

☆☆☆

اتوار کا دن اس کے لیے مصروف ترین دن ہوتا تھا۔ ڈھیر سارے کام کرنے ہوتے تھے۔ سب سے پہلے اس نے دھونے والے کپڑوں کو الگ کیا۔ وہ کپڑے جو ہاتھ سے دھونے تھے، وہ الگ رکھے اور کچھ کو ڈرائی کلین کروانا تھا وہ الگ کیے اور اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

ہاتھ سے دھونے والے کپڑوں کو دھو کر پھیلا دیا اور اب بچن میں کام کرنا تھا۔ ابھی چند برتن سمیٹے تھے کہ کافی کی طلب نے ہاتھ روک دیے، وہ سارے کام چھوڑ کر اپنی طلب کو پورا کرنے لگی۔

کافی بنا کر وہ بچن سے باہر نکلی۔ اس کا ہمیشہ سے طریقہ کار تھا کہ کافی یا چائے وہ آرام سے پیٹھ کر پیا کرتی تھی۔ اس دوران وہ کوئی کام نہیں کرتی تھی۔ کافی کا کپ لیے وہ صوفہ پر جا بیٹھی تو چارجر پر لگا موبائل بچا اٹھا۔ اس نے کافی کا سپ لیا اور موبائل کا لیس کا بٹن پیش کر کے موبائل کان سے لگا لیا۔

”السلام علیکم!“ سلام پر اس نے دوسرے پل موبائل کان سے ہٹا کر نمبر کو دیکھا۔ جانا بچانا انداز

اس کو ایک بار پھر غصہ دلانے لگا۔
 ”وعلیکم السلام!“ اس نے سپاٹ انداز میں سلام کا جواب دیا۔

”آپ کا پیغام مل گیا تھا لیکن مصروف رہا، اس لیے دو دن سے رابطہ نہیں کر سکا۔ سب خیریت ہے؟“

”پیغام دینے والے نے یقیناً پیغام کی نوعیت سے بھی آگاہ کیا ہوگا؟“ اس کا انداز دو ٹوک تھا۔

”نہیں۔ آپ کے نمبر کے ساتھ بس اتنا کہا گیا تھا کہ آپ نے کہا ہے کہ میں رابطہ کروں۔“ مبین نیازی نے وہی کہا جو سفینہ نے کہا تھا لیکن عفاف بے یقین تھی۔

”میں نے دادو سے کہا تھا کہ آفیشل کام کے سلسلے میں بات کرنی ہے۔ میرے پاس آپ کا کالیکٹ نمبر نہیں تھا تو آپ خود مجھ سے رابطہ کریں۔“ عفاف نے تیز لہجے میں اپنے آپ کو سچا ثابت کرنے کی کوشش کی۔

”دیل..... آپ دادو سے میرا نمبر لے کر خود مجھ سے رابطہ کر لیتیں تو زیادہ بہتر رہتا اور آپ کو اس پل اپنے آپ کو سچا بھی ثابت نہ کرنا پڑتا۔“ مبین نیازی ہلکے پھلکے انداز میں اس سے مخاطب تھا۔

”کیوں؟“ عفاف تنک مزاجی سے بولی۔

”آپ کی آسانی کے لیے کہہ رہا ہوں۔“ مبین نیازی اپنے مخصوص انداز میں بولا۔

”خیر مسٹر نیازی! میں نے.....“

”آپ کو اتنا قابل ہونے کی ضرورت نہیں ہے، آپ مجھے مبین کہہ سکتی ہیں۔“ جانے کیوں مبین نے ایک بار پھر اسے مسٹر نیازی کہہ کر پکارنے سے روکا۔
 ”آفیشل میسرزوان فارملی ہینڈل نہیں کیا جاتا مسٹر نیازی!“ عفاف نے سنجیدگی سے کہا تو مبین نیازی لب بچ کر رہ گیا۔

”امید کرتی ہوں کہ بدھ کو دس بجے سے لے کر چار بجے تک آپ فری ہوں گے۔“

”ملاقات کا ارادہ ہے کیا؟“ مبین نیازی کا

لہجہ مسکرایا تھا۔

”جواب کے لیے انٹرویو کا وقت ہے۔“ عفاف دانت پیس کر بولی۔

”ہاں تو ملاقات ہی ہوئی ناں؟“ وہ اپنی شرارت پر قائم تھا۔
 ”مسٹر نیازی!“

”آئی ایم سوری۔“ اس سے پہلے کہ عفاف اس کو مزید سرزنش کرنی، مبین نے معذرت کر لی۔
 ”میں پوری کوشش کروں گا کہ.....“

”مسٹر نیازی! کوشش نہیں، یو یو ٹو بی دیر ان ٹائم (آپ کو وہاں وقت پر پہنچنا ہے)۔ میرے پاس انٹرویو کرنے کا کوئی تجربہ نہیں ہے اور ہم نے امیدواروں کو انٹرویو کال کر دی ہے۔“ عفاف اس کی بات کاٹ کر تیزی سے بولی۔

”مس عفاف! آپ شاید بھول رہی ہیں کہ میں آپ کا پاس ہوں۔“ مبین نیازی اس کے انداز پر حیران ہوا تھا۔

”مسٹر نیازی! شاید آپ بھی بھول رہے کہ میں انسٹی ٹیوٹ میں پائرنٹر ہوں۔“ عفاف نے یاد دہانی کرائی۔

”بائے داؤے، آپ کی اس حد تک کے دلچسپی کی وجہ؟“ مبین نیازی کے لیے اس کا رویہ حیران کن تھا۔

”مجھے یہ ذمہ داری دی گئی ہے مسٹر نیازی! عروش سے وعدہ کیا تھا کہ انسٹی ٹیوٹ کی سادھ میری وجہ سے بھی متاثر نہیں ہوگی۔“ عفاف نے نیک نیتی سے کہا تو مبین اس کے غلوں سے متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکا۔

”ٹھیک ہے، کل انٹرویو کے لیے میں آپ ساتھ ہوں گا۔“ مبین نے اپنی کلائی میں بندھی گھڑی میں ٹائم دیکھتے ہوئے کہا۔ ”صبح اگر آپ ذرا جلدی آفس پہنچ جائیں تو پلاننگ کر لیں گے۔ ابھی تو کافی لیٹ ہے آپ کے لیے تو مناسب بھی نہیں ہے گھر سے نکلتا۔“ مبین کا انداز کیت رنگ تھا۔

”نہیں، اس سے صرف ایک ہی بار ملاقات ہوئی ہے، ہاں فون پر رابطہ ہے لیکن فون پر کوئی بات

”اچھا پہلے میں سے تو بات ہو، یہ نہ ہو وہ بھی راضی نہ ہو۔“ سفینہ نے اسے کہا۔

”اور اگر بھی کرنی پڑ جائے تو؟“ دونوں بازو باندھے عدی نے سوال کیا تو وہ ہنستا ہنستا کہنے لگا: ”ایسی نوبت کبھی نہیں آئے گی۔“ عروش نے

”ہمارے درمیان سب کچھ ہو سکتا ہے لیکن دو سی قطع نہیں۔“ عروش نے دانت پیس کر اسے کہا۔

”سب کچھ؟“ عدی نے فقط دو لفظوں کو پکڑا تھا اور سب کچھ کی وضاحت مانگی تھی۔
”بدنیز، جاہل.....“ عروش نے من ہی من اسے مزید القاب سے نوازا۔
”خجنی نفرت.....“ وہ فقط دو لفظ کہہ کر خاموش ہو گئی۔

”جب ہر ملاقات میں باتوں میں تکی ہو، لہجے جذبات سے عاری اور بے مروت ہوں۔ کوئی بھی بات جانے کی مشاس سے شروع تو ہو جائے لیکن ختم کافی ٹی کر ڈاؤن ہو تو ایسے میں کوئی بھی عہد باندھنا دوستی جیسے پاکیزہ جذبے کے ساتھ نا انصافی ہوگی۔“ عروش نے کافی کا گھونٹ لیا اور اپنی طرف سے اس کو لا جواب کرنا چاہا۔

”تم عہد باندھو میرا وعدہ ہے کہ کوئی نا انصافی نہیں ہونے دوں گا۔“ عدی ہولے سے ہنس کر بولا تو اس کا لہجہ ہی نہیں الفاظ بھی ذمہ داری تھے۔ عروش نے جھینپ کر اسے دیکھا، اگلے لمحے کافی کا کپ دھو کر رکھنے کے بجائے بچا ہوا ایک گھونٹ اس پر اچھال کر باہر نکل گئی اور وہ اپنی نئی شرٹ پر کافی کے داغ کو دیکھ کر ہنسنے لگا۔

”ایک عہد تو باندھنا ہی ہوگا تمہیں عروش نیازی! چاہے دوستی کا ہو یا محبت کا۔ جسٹ ویٹ.....“ زیر لب بڑبڑایا اور باہر نکل گیا۔

☆☆☆
”آپ کا امپریشن میری نظر میں کچھ اتنا اچھا نہیں ہے مسٹر نیازی! برائے مہربانی اس کو مزید خراب نہ کریں ورنہ میرے لیے آپ کے ساتھ انسی ٹیوٹ کے لیے کام کرنا بہت مشکل ہو جائے گا۔“ پچھلے ایک گھنٹے سے عفاف، مبین نیازی کے انتظار میں اس کے آفس میں بلے پاؤں کی ٹلی کی مانند گھوم رہی تھی۔

”ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں ضروری بات کہتی ہوں، کوئی وعدہ نبھانا ہو اسے آواز دینی ہو، اسے واپس بلانا ہو

ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں.....“ مبین نے ہنستے ہوئے اس کے تیوروں سے محفوظ ہوتے ہوئے منیر نیازی کی غزل کا قطعہ پڑھا تو عفاف نے آگ برسانی لگا ہوں کو اس پر مرکوز کیا۔

”آئی ایم سوری۔ صبح دیر سے آنکھ کھلی اس لیے لیٹ ہو گیا ہوں۔“ مبین نیازی کا انداز ہر طرح کی فکر سے نا بید تھا اور عفاف کو اس کا بکلی لاپرواہ انداز ہی دانت کچکپکانے پر مجبور کرتا تھا۔ وہ اتنی پی ہوئی تھی کہ اس اوکے بھی نہ کھا اور مبین نیازی فائل میں لگے پیپرز نکال کر اب اس کے سامنے بیٹھا انٹرویوز کے اہم سوالات کو اس سے ڈسکس کرنے لگا تھا۔

ساڑھے دس بجے پہلا انٹرویو تھا۔ درمیان میں ایک گھنٹے کے وقفے کے بعد شام کے پانچ بجے وہ فائدہ ہستہ تھے اور طے کر لیا تھا کہ کون سے تین لوگوں کو جاب کے لیے اپائنٹمنٹ لیٹر بھیجنا ہے۔ مبین نیازی اب عفاف کو ساری تفصیل سمجھا رہا تھا اور کچھ جلدی میں بھی تھا کیوں کہ چھ بجے اس کی اپنی ایک انتہائی اہم میٹنگ بھی چوکسی طرح بھی ٹینسل نہ ہوئی ہاں تاخیر سے ہو گئی تھی۔ اب وہ جلدی جلدی عفاف کو سمجھا کر نکلتا جا رہا تھا۔

”مس عفاف! مجھے ابھی جانا ہے، سو پلیز آپ سے پیپرز ریڈ کر کے ہی جانا۔ باقی تفصیلات ہم کل ڈسکس کریں گے۔“ مبین نے اسے مزید ہدایات دیں اور وہاں سے نکل گیا۔

عفاف کے لیے مبین نیازی کا رویہ سمجھنا ایک انتہائی کٹھن کام تھا۔ اگر مبین نیازی غصے والا ہے تو اس کے ساتھ اس کا رویہ ایسا کیوں نہ تھا؟ مبین کا اس کے ساتھ فلرٹ کا بھی انداز نہ تھا۔ دوستانہ بھی نہ تھا لیکن جانے کیوں اس کا انداز دینا بھی نہ تھا جیسا عروش نے کہا تھا، دوسرے لفظوں میں ڈراپا تھا۔

”لالہ گھر کی لڑکیوں کے لیے بہت پروٹیکو ہیں۔“ عروش نے کہا تھا۔
”تو کیا مسٹر نیازی مجھے گھر کی لڑکی سمجھ رہا

ہے؟“ وہ بڑبڑاتی اور دوسرے لمحہ اس نے طائرانہ نگاہ اس کے آفس میں ڈالی جو فرینے سے سیٹ ہوا تھا۔ اس کی میز پر چیزیں جس انداز سے براجمان تھیں وہ مبین نیازی کی نفاسات کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ عفاف اپنی کرسی سے اٹھ کر مبین کی کرسی کے پاس آکھڑی ہوئی تھی۔

ایک طرف نوٹ بک دکھائی تھی، بلا ارادہ ہی اس کے ہاتھ بڑھے اور دوسرے پل اس نے نوٹ بک کو کھول لی۔

یہ پل اس کے لیے انتہائی حیرت کے تھے۔ دل کے اسٹیکر پورے صفحے پر چپکائے گئے تھے۔ ”دل آویزا“ عفاف نے ایک اسٹیکر پر لکھے لفظ کو بخور دیکھا تھا۔

”لگتا ہے کسی لڑکی کی ڈائری ہے۔“ وہ زیر لب ہنسی تھی۔ پھر یک دم چونگی اور اس ایک لفظ کو بخور دیکھا۔

”اتنا بڑا آفس ہے لیکن ایک پین تک نہیں رکھا ہوا۔“ وہ چیخ پر بڑبڑاتی تھی اور کام کرنے لگی تھی لیکن ہر جگہ دیکھنے کے بعد بھی اسے پین نہ ملا۔ ہاتھ پر ہاتھ رکھے وہ بیٹھی رہی۔ تقی دیر گزری لیکن وہ کوئی پیپر ورک نہ کر سکی۔ اس پر ایک عجیب سی یاسیت طاری ہونے لگی تھی۔ ٹھکن کا احساس ہونے لگا تھا۔

”کچھ لمحات بہت عجیب ہوتے ہیں، بہت طاقت ور بھی۔ ہمیں کہاں سے کہاں پہنچا دیتے ہیں اور ہم ان کی گرفت سے خود کو کبھی بھی آزاد نہیں کر سکتے۔ اگر میں سگریٹ پیتی ہوئی ناں مسٹر نیازی تو اس وقت یہ آفس دھواں دھواں ہو چکا ہوتا لیکن..... اب پتا چلا کہ لڑکے اتنے سگریٹ کیوں پیتے ہیں۔“ عفاف اس پل خود اپنے آپ کو سمجھ نہ پا رہی تھی، دونوں ہاتھ سے بالوں کو پیچھے کیا اور بڑبڑاتی۔

”اگر میری مدد کی ضرورت پڑی تو کال یا میٹج کر لیجئے گا۔“ مبین نیازی نے جاتے جاتے کہا تو

تھا۔ ”مجھے آپ کی مدد کی ضرورت نہیں پڑے گی۔“ اس نے اس کی آفر کو رد کیا تھا۔ وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا تھا اور اس کی مسکراہٹ کو وہ اب سمجھ رہی تھی۔

”مسٹر نیازی! اتنا ایٹنی ٹیوڈ؟“ اس نے اس کا نمبر ڈائل کیا لیکن کال ریسپونڈ نہ کی گئی۔

وہ اپنا بیک اپنے آفس رکھ کر آئی تھی ورنہ فقط ایک پین کے لیے اس کی ضرورت اسے بھی نہ پڑتی۔ اس کے کال ریسپونڈ کرنے پر عفاف بہت چڑی تھی، وہ بات بات پر جھنجھلا رہی تھی۔

”مسٹر نیازی! مجھے آپ کا وہ قیمتی، ہیروں سے جڑا اکلوتا پین چاہیے تاکہ میں پیپر ورک مکمل کر کے گھر جاسکوں۔ آپ اب بتانا پسند فرمائیں گے کہ کہاں چھپا کر گئے ہیں۔“

اس نے بیج ٹائپ کیا، ہر ایک لفظ کو طعنے میں ڈبو کر لکھا گیا تھا۔

”ہاااا.....“ میسج ملتے ہی مبین نیازی ہنسا تھا۔ ”پڑنی ناں ضرورت؟ میرا اکلوتا، لاڈلا، ہیروں سے جڑا پین رانکنگ ٹیبل کی تیسری دراز میں ہے۔ آرام سے، ذرا احتیاط سے نکالنا۔ میری پرسل چیزوں کو کوئی چھیڑے مجھے محاورہ نہیں۔“ مبین نیازی نے جلدی جلدی تیج کا ریسپلا کیا اور اس کی بجلت کا اندازہ اس کی اسپیکر مس فیک سے ہو رہا تھا۔

”مجھے کوئی شوق نہیں ہے کسی کی پرسلو میں بنا اجازت دخل اندازی کا اور ویسے بھی آپ کے پرسل دراز میں ہوگا ہی کیا؟ چند آفیشل فائلز، سگریٹ کی ادھ کھلی ڈبی اور ایک لڑکی کی تصویر۔“ عفاف نے جیسے مرجھیں چباتے ہوئے ٹائپ کر کے سینڈ کا بنن دبا یا اور دراز کھول کر پین کو تلاش کرنے لگی۔

”آپ کی دوسری دونوں باتوں سے میں اتفاق نہیں کرتا لیکن بہر حال یہ بحث پھر کسی وقت کے لیے چھوڑتے ہیں۔“ مبین نیازی نے اس کے میسج کو پھر پورا نچوڑے کیا تھا۔

”ہائے۔“ بالفاظ کہے، عفاف نے تین حرف لکھ بیٹھے تھے تو مبین نیازی زیر لب مسکراتے ہوئے اپنا لام کرنے لگ گیا اور عفاف کو بھی ہل گیا تھا تو وہ بھی کام میں مگن ہو گئی تھی۔ کچھ لمبے بعد آفس کا دروازہ کھلا اور آنے والے نے اسے حیرت سے دوچار کر دیا۔

مبین نیازی نے اس کے حیرت کدہ چہرے کی طرف دیکھ کر ہاتھ سے معذرت کا اشارہ کیا۔ ”چونکہ وہ اس وقت اس کی آمد کی توقع ہی نہ کرتی تھی تو قیاسی۔“ ”آپ یہاں؟“ عفاف اس سے پوچھنے بنانہ رہی جو ایک فائل کو اٹھائے بیٹھا تھا۔

”ابھی مینٹنگ ختم ہوئی ہے تو میں نے سوچا۔ دیکھتا جاؤں آفس میں کوئی چیز چوری وغیرہ تو نہیں ہو گئی۔“ اس سے پہلے کہ مبین نیازی کچھ کہتا عفاف نے اس کا جملہ مکمل کیا۔

”نہیں، خیر اب ایسی بات تو نہیں۔“ مدہم مسکان کے ساتھ مبین نے اس کے شک کی لٹی کی۔ ”ایسی ہونی بھی نہیں چاہیے کیونکہ یہ آفس دوسرے لفظوں میں کسی کباڑ خانے سے کم نہیں۔ ایک ایک شراپین تک تو یہاں موجود نہیں۔“ عفاف نے استہزاء سے لکھے میں کہا لیکن مبین نیازی کچھ نہ بولا اور خاموشی سے فائلز کو اسٹڈی کرنے لگا۔

”مسر نیازی! کیا آپ نے اپنے آپ کو کبھی ڈانٹا ہے؟“ وہ نجاب نے کیا سوچ رہی تھی یا شاید اپنے آپ کو ڈانٹ ہی رہی تھی کہ اکثر وہ لائق باتوں پر اپنے آپ کو سرزنش کرتی رہتی ہے، اس کی طرف نگاہ اٹھی تو اس کو متوجہ پا کر بے دھیانی میں پوچھا۔

”ڈانٹا.....؟ میں دو، تین دفعہ اپنے آپ کو قتل بھی کر چکا ہوں۔“ مبین نیازی نے ہنسنے لکھے میں کہا تو عفاف نے ہنسنے لکھیں نظروں سے اسے دیکھ کر رخ موڑ لیا۔

”بائے۔“ بالفاظ کہے، عفاف نے تین حرف لکھ بیٹھے تھے تو مبین نیازی زیر لب مسکراتے ہوئے اپنا لام کرنے لگ گیا اور عفاف کو بھی ہل گیا تھا تو وہ بھی کام میں مگن ہو گئی تھی۔ کچھ لمبے بعد آفس کا دروازہ کھلا اور آنے والے نے اسے حیرت سے دوچار کر دیا۔

مبین نیازی نے اس کے حیرت کدہ چہرے کی طرف دیکھ کر ہاتھ سے معذرت کا اشارہ کیا۔ ”چونکہ وہ اس وقت اس کی آمد کی توقع ہی نہ کرتی تھی تو قیاسی۔“ ”آپ یہاں؟“ عفاف اس سے پوچھنے بنانہ رہی جو ایک فائل کو اٹھائے بیٹھا تھا۔

”ابھی مینٹنگ ختم ہوئی ہے تو میں نے سوچا۔ دیکھتا جاؤں آفس میں کوئی چیز چوری وغیرہ تو نہیں ہو گئی۔“ اس سے پہلے کہ مبین نیازی کچھ کہتا عفاف نے اس کا جملہ مکمل کیا۔

”نہیں، خیر اب ایسی بات تو نہیں۔“ مدہم مسکان کے ساتھ مبین نے اس کے شک کی لٹی کی۔ ”ایسی ہونی بھی نہیں چاہیے کیونکہ یہ آفس دوسرے لفظوں میں کسی کباڑ خانے سے کم نہیں۔ ایک ایک شراپین تک تو یہاں موجود نہیں۔“ عفاف نے استہزاء سے لکھے میں کہا لیکن مبین نیازی کچھ نہ بولا اور خاموشی سے فائلز کو اسٹڈی کرنے لگا۔

”مسر نیازی! کیا آپ نے اپنے آپ کو کبھی ڈانٹا ہے؟“ وہ نجاب نے کیا سوچ رہی تھی یا شاید اپنے آپ کو ڈانٹ ہی رہی تھی کہ اکثر وہ لائق باتوں پر اپنے آپ کو سرزنش کرتی رہتی ہے، اس کی طرف نگاہ اٹھی تو اس کو متوجہ پا کر بے دھیانی میں پوچھا۔

”ڈانٹا.....؟ میں دو، تین دفعہ اپنے آپ کو قتل بھی کر چکا ہوں۔“ مبین نیازی نے ہنسنے لکھے میں کہا تو عفاف نے ہنسنے لکھیں نظروں سے اسے دیکھ کر رخ موڑ لیا۔

”بائے۔“ بالفاظ کہے، عفاف نے تین حرف لکھ بیٹھے تھے تو مبین نیازی زیر لب مسکراتے ہوئے اپنا لام کرنے لگ گیا اور عفاف کو بھی ہل گیا تھا تو وہ بھی کام میں مگن ہو گئی تھی۔ کچھ لمبے بعد آفس کا دروازہ کھلا اور آنے والے نے اسے حیرت سے دوچار کر دیا۔

مبین نیازی نے اس کے حیرت کدہ چہرے کی طرف دیکھ کر ہاتھ سے معذرت کا اشارہ کیا۔ ”چونکہ وہ اس وقت اس کی آمد کی توقع ہی نہ کرتی تھی تو قیاسی۔“ ”آپ یہاں؟“ عفاف اس سے پوچھنے بنانہ رہی جو ایک فائل کو اٹھائے بیٹھا تھا۔

”ابھی مینٹنگ ختم ہوئی ہے تو میں نے سوچا۔ دیکھتا جاؤں آفس میں کوئی چیز چوری وغیرہ تو نہیں ہو گئی۔“ اس سے پہلے کہ مبین نیازی کچھ کہتا عفاف نے اس کا جملہ مکمل کیا۔

”نہیں، خیر اب ایسی بات تو نہیں۔“ مدہم مسکان کے ساتھ مبین نے اس کے شک کی لٹی کی۔ ”ایسی ہونی بھی نہیں چاہیے کیونکہ یہ آفس دوسرے لفظوں میں کسی کباڑ خانے سے کم نہیں۔ ایک ایک شراپین تک تو یہاں موجود نہیں۔“ عفاف نے استہزاء سے لکھے میں کہا لیکن مبین نیازی کچھ نہ بولا اور خاموشی سے فائلز کو اسٹڈی کرنے لگا۔

”مسر نیازی! کیا آپ نے اپنے آپ کو کبھی ڈانٹا ہے؟“ وہ نجاب نے کیا سوچ رہی تھی یا شاید اپنے آپ کو ڈانٹ ہی رہی تھی کہ اکثر وہ لائق باتوں پر اپنے آپ کو سرزنش کرتی رہتی ہے، اس کی طرف نگاہ اٹھی تو اس کو متوجہ پا کر بے دھیانی میں پوچھا۔

”ڈانٹا.....؟ میں دو، تین دفعہ اپنے آپ کو قتل بھی کر چکا ہوں۔“ مبین نیازی نے ہنسنے لکھے میں کہا تو عفاف نے ہنسنے لکھیں نظروں سے اسے دیکھ کر رخ موڑ لیا۔

”بائے۔“ بالفاظ کہے، عفاف نے تین حرف لکھ بیٹھے تھے تو مبین نیازی زیر لب مسکراتے ہوئے اپنا لام کرنے لگ گیا اور عفاف کو بھی ہل گیا تھا تو وہ بھی کام میں مگن ہو گئی تھی۔ کچھ لمبے بعد آفس کا دروازہ کھلا اور آنے والے نے اسے حیرت سے دوچار کر دیا۔

مبین نیازی نے اس کے حیرت کدہ چہرے کی طرف دیکھ کر ہاتھ سے معذرت کا اشارہ کیا۔ ”چونکہ وہ اس وقت اس کی آمد کی توقع ہی نہ کرتی تھی تو قیاسی۔“ ”آپ یہاں؟“ عفاف اس سے پوچھنے بنانہ رہی جو ایک فائل کو اٹھائے بیٹھا تھا۔

”ابھی مینٹنگ ختم ہوئی ہے تو میں نے سوچا۔ دیکھتا جاؤں آفس میں کوئی چیز چوری وغیرہ تو نہیں ہو گئی۔“ اس سے پہلے کہ مبین نیازی کچھ کہتا عفاف نے اس کا جملہ مکمل کیا۔

”نہیں، خیر اب ایسی بات تو نہیں۔“ مدہم مسکان کے ساتھ مبین نے اس کے شک کی لٹی کی۔ ”ایسی ہونی بھی نہیں چاہیے کیونکہ یہ آفس دوسرے لفظوں میں کسی کباڑ خانے سے کم نہیں۔ ایک ایک شراپین تک تو یہاں موجود نہیں۔“ عفاف نے استہزاء سے لکھے میں کہا لیکن مبین نیازی کچھ نہ بولا اور خاموشی سے فائلز کو اسٹڈی کرنے لگا۔

”مسر نیازی! کیا آپ نے اپنے آپ کو کبھی ڈانٹا ہے؟“ وہ نجاب نے کیا سوچ رہی تھی یا شاید اپنے آپ کو ڈانٹ ہی رہی تھی کہ اکثر وہ لائق باتوں پر اپنے آپ کو سرزنش کرتی رہتی ہے، اس کی طرف نگاہ اٹھی تو اس کو متوجہ پا کر بے دھیانی میں پوچھا۔

”ڈانٹا.....؟ میں دو، تین دفعہ اپنے آپ کو قتل بھی کر چکا ہوں۔“ مبین نیازی نے ہنسنے لکھے میں کہا تو عفاف نے ہنسنے لکھیں نظروں سے اسے دیکھ کر رخ موڑ لیا۔

”تو جاؤ ناں، آپ کون سا چھوٹے ہیں جو آپ اکیلے نہیں جاسکتے۔“ عروش ہولے سے اسی تو عدی نے اسے گھورا۔

”میں نے یہ نہیں کہا کہ میں چھوٹا ہوں اور اکیلے نہیں جاسکتا۔ بابا جانی پاکستان جا رہے ہیں تو می اکیلی ہوں گی۔“ عدی نے ایک بار پھر منہ لٹکا کر کہا۔

”اکیلی کیوں ہوں گی؟ میں بھی تو ہوں ناں۔“ عروش بے نیازی سے بولی۔
”ویسے اٹکل اور آئی دو نوں کیوں نہیں جاتے؟ آپ نیو یارک چلے جاؤ۔“ دوسرے پل عروش نے حل پیش کیا۔

”اور گھر میں؟“ عدی کو اس کا آئیڈیا پسند آیا تھا۔

”میں تو ویسے بھی دن بھر یونیورسٹی میں ہوتی ہوں۔ رات کو سونا ہی ہوتا ہے تو کوئی مسئلہ نہیں۔“ عروش مسکرائی۔

”مطلب ہم پورا گھر تمہارے حوالے کر کے خود چلے جائیں۔“ عدی نے آنکھیں پھیلا کر اسے دیکھا۔

”میں کوئی ڈاکو نہیں ہوں، جو پیچھے سے گھر کا صفایا کر کے فرار ہو جاؤں گی۔“ عروش یک دم حکیمہ لہجے میں بولی۔

”کیا معلوم..... ہم نے تو یہی سنا ہے کہ خوب صورت لڑکیاں چوری کرنے میں ماہر ہوتی ہیں۔“ عدی کے ذہنی جملوں میں اب اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

”مسٹر صرف عدی! میں چور نہیں ہوں، اگر اعتبار نہیں کرنا تو نہ کریں لیکن الزام تو نہ لگائیں۔“ عروش چڑ کر بولی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ایک تو میری کافی پی گئے اور پھر میرے مشورے پر مجھے ہی مشکوک بنایا جا رہا ہے۔“ وہ باہر کی طرف قدم بڑھاتی بڑبڑاتی تھی۔

”آئی ایم سوری۔“ عدی کے الفاظ پر وہ رک

گئی تھی۔

”میں نیکسٹ ویک تک نیو یارک جا رہا ہوں۔ بابا جانی اور می کو راستی کرنا ہے۔“ عدی جابلے کیوں اسے بتا رہا تھا، وہ بھی نہیں۔

”اوکے، ڈونٹ وری۔ اٹکل اگر پاکستان جائیں گے تو میں پوری کوشش کروں گی آئی کا خیال رکھ سکوں۔“ اس کی معذرت پر عروش نے بھی لہجے کے حکیمہ پن کو زائل کر دیا تھا۔

”ہاں، بس بابا جانی مان جائیں تو.....“ عدی نے کافی کا خالی اس کی طرف بڑھایا تو اس نے منہ بسور کر اسے دیکھا اور تھام لیا۔

”تو ہماری دوستی ہوئی؟“ عدی نے اس سے پوچھا۔

”نہیں۔“ عروش نے ہٹ سے نہ کر دی۔

”مطلب؟“ وہ چیخا تھا۔

”مطلب یہ صرف عدی کہ ہماری دوستی ہے، نہ دشمنی۔ جتنا تعلق ہے اتنا کافی ہے۔“ عروش شریہ لہجے میں بولی۔

”تعلق ہمیشہ ایک سائیں رہتا، بگڑ جاتا ہے یا پھر سنور جاتا ہے۔“ عدی نے اسے نظروں کے حصار میں لے کر کہا۔

”ہاں شاید.....“ عروش نے اس کی بات کی تائید کی تھی۔

”تو.....؟“ وہ مزید کچھ نہ بولی تو عدی نے پوچھا۔

”جتنا تعلق ہے اتنا کافی ہے۔“ عروش کو اس کے لہجے میں جھانکنا اصرار چوٹا رہا تھا، کئی کتر اکراس نے بات کو مختصر کیا۔

”کافی تو میں پی چکا ہوں۔ اب بس ایک ہی خواہش ہے۔“ دروازہ کھولنے کے لیے اس کا بڑھا ہوا ہاتھ رکھا تھا۔

”کہ“ ”صرف عدی“ کے درمیان ایک لفظ کا اضافہ ہو جائے۔“ عدی نے مسکراہٹ دبا کر کہا اور اس کے دائیں جانب سے آگے بڑھ کر دروازے

لے پاس جا رکا۔ عروش نے بڑھا ہوا ہاتھ سینا تھا، دو لہجے پیچھے ہوئی اور متعجب و متغیر نظروں سے اسے دیکھا۔

”میرا.....“ اس کی طرف گہری نظروں سے دیکھ کر بیٹا اس کا ری ایکشن جانے وہ باہر نکل گیا تھا۔ جبکہ عروش حیرانی سے اس کی خواہش کو سوچنے لگی۔

”میرا..... کیا فضول بات ہے؟“ وہ زیر لب بڑبڑاتی اور پھر سر جھٹک کر بچن کی جانب بڑھی کہ کافی کا پ رکھنا تھا۔

”صرف عدی میں ایک لفظ کا اضافہ.....“ وہ مسلسل سوچ رہی تھی۔

”صرف میرا عدی.....“ وہ دہرا رہی تھی۔ غفلتوں کو جب ترتیب دیا تو دوسرے پل دل پر ہاتھ رکھا۔ یک دم دھڑکنوں میں ایک انتشار پیدا ہوا تھا، ایک اہل چل پچی تھی۔

”بدترین..... بے شرم..... رکنا تو بتاتی اس کو۔“ دوسرے پل اس نے خود کو ڈپٹا اور دانت پیس کر اس سے مخاطب ہوئی۔

”بتاتی کیسے عروش نیازی، تمہیں تو سمجھ ہی نہ آتی تھی۔“ اگلے لمحے اس نے اپنے ہی سر پر چپٹ اڑی اور پھر ہنسنے لگی۔ اس کی ہنسی میں ایک اصرار پچھا تھا، ایک خرابی، انا بھی اور ہاں بھی۔

☆☆☆

وہ ہر دم ہنسنے والی، چپکنے والی..... دوسروں کو لگ کر نے والی دل آویز۔ ایک جو کن بن چکی تھی، بے گانہ پن، بے ربط باتیں، حالت زار سے انہیت، ہر سارے تجھے محبت کی دین تھے۔

”جھٹھے، مسلسل انتظار کا کرب سہنا ایک نازک دماغ دل آویز کے لیے کسی طرح بھی ممکن نہ تھا۔ وہ ہر کمری رہی تھی لیکن مانی.....“ ”کیا مانی اتنے سنگ ل ہیں؟ میری محبت اتنی بے مول ہے کیا کہ اس کو نی بے دردی۔ بے رحمی سے نظر انداز کر دیا جائے؟ بڑبڑاتی رہا لائے می..... جسٹ ولس..... مجھے کچھ

کہنے تو دیں۔ مجھے ایک موقع تو دیں۔ محبت میرے اختیار میں نہیں ہے مانی پلیز..... مجھے ایک اختیار دے دیں۔“

”نجانے کتنی کا لڑ، کتنے میسج..... مانی کو دیے جاسکتے تھے۔ اب تو ان کا لڑ اور میسج کی کتنی بھی حدیں پھلانگ چکی تھی۔“

کرب، بے بسی، سنگ دلی، انتظار اگر یہ سب محبت کی میراث ہیں تو دل آویز مالا مال تھی۔ سات ہفتے تک مانی کی جانب سے کوئی جواب موصول نہ ہوا تھا۔ وہ مقررہ وقت پر اس کا انتظار کرتے کرتے اب تھک چکی تھی۔

وہ جو ایک ہفتہ با مشکل گزارتی تھی، کبھی ایسا بھی کیا کہ ہفتے میں دو لسنز لیے لیکن اب وہ جس اذیت میں دو چار دن گزار رہی تھی، وہ ہی جانتی تھی۔ اس نے پھر اس کے نام پر کلک کیا، ایک بار پھر کانگ کا بٹن دبا دیا۔

”مانی.....!“ اس طرف سے موبائل آن ہو گیا تھا لیکن مسلسل خاموشی تھی۔

”لیس اسپیکنگ!“ سپاٹ لہجہ اسے کرچی کرچی کر گیا تھا۔

”میں دل آویز۔“ اس کی سوچیں بے ربط ہو چکی تھیں۔

”مجھے معلوم ہے، بولو۔“ مانی کا انداز نہایت دو ٹوک تھا۔

”مجھے کہنے دیں کہ مجھے آپ سے بے پناہ محبت ہے۔ میں جانتی ہوں آپ اس کو محبت نہیں سمجھتے۔ کسی کے کہنے سے محبت نہیں ہوتی، دل نہ ہو، مرضی نہ ہو کوئی کام تو ڈھنگ سے ہوتا نہیں۔ محبت تو بس ہو جاتی ہے، کسی سے بھی، کبھی بھی، کبھی بھی۔“ وہ بول رہی تھی، جانتی نہیں تھی کہ کیا کہہ رہی ہے۔ لفظ بے ربط تھے، آنسو خشاروں پر بہہ رہے تھے اور مانی، اپنی ازلی خاموشی اور سفاکی کے عروج پر تھے۔

”کچھ نہیں ایسی ہوتی ہیں، جن کو اکھاڑ پھینکو پھر بھی وہ آگ آتی ہیں اور کچھ بچ ایسے بھی ہوتے

ہیں جن کو ہم بہت محبت سے بولتے ہیں۔ اچھی زمین کو دیکھ بھال کر ان نیچوں کو مٹی تلے دباتے ہیں لیکن وہ نہیں اگتے۔ محبت بھی ایک ایسا ہی بیج ہے، زبردستی نہیں اگتا، نہ ہی اکھاڑ کر پھینکنے سے وہ میٹ جاتی ہے۔ مانی کی خاموشی اسے ریزہ ریزہ کر رہی تھی۔

”اچھا پھر.....“ کھنکھناتے دو لفظوں میں جو چھین تھی وہ اس کے اندر تک اتر گئی۔

”مجھے ایک بار آپ کا سامنا کرنے کی اجازت دے دیں۔ میں سب بتانا چاہتی ہوں۔“ اس کا جی چاہا وہ دھاڑیں مار مار کر اپنی محبت کا ماتم کرے۔ ملنے کا کہنا اس کی مجبوری تھی، مانی نے گہرا سانس لیا۔ اب تو دل آویز بھی خاموش تھی۔

”اوکے۔“ اس کے ایک لفظ نے اسے زندگی کی نوید سنائی تھی۔

”کل میں فری ہوں، کل دو بجے ملاقات ہوگی۔“ مانی نے وقت طے کیا اور فون بند کر دیا۔

دل آویز آنسو کو صاف کرتے ہوئے مسکرائی تھی۔ اس کی مسکراہٹ میں پنہاں درد نے اس کی مسکان کا گلہ گھونٹا تھا۔

لیکن اس نے مانی سے ملنا تو تھا ہی، اپنی صفائی تو دینی ہی تھی۔ اس کی ناراضی، اس کی بے گامگی کو کسی طرح ختم کرنا تو تھا ہی۔ مقررہ وقت پر وہ اس کا انتظار کر رہی تھی..... لیکن.....!!!

☆☆☆

”بابا جانی! سچ؟“ اس کی پر جوش چپکتی آواز نے احسن ندیم کے چہرے پر مسکراہٹ بکھیر دی تھی۔

”ہاں بیٹا سچ میں۔ تم سے ملنے کا بہت دل کر رہا ہے۔“ احسن ندیم عفاف کو اپنے پاکستان جانے کی اطلاع دے رہے تھے۔

”اور می؟ کیا وہ نہیں آ رہی ہیں؟“ عفاف نے ان سے پوچھا۔

”نہیں بیٹا! عدی نے کوئی پروگرام بنالیا ہے نیویارک جانے کا اور عروش بھی گھر میں اکیلی ہوگی۔ ہماری پاس رہتی ہے تو بیٹا ہماری ذمہ داری ہے۔ اس

لیے تمہاری می نہیں آ رہی ہیں۔ میں بھی صبراً دن کے لیے آ رہا ہوں۔ تمہیں کچھ لوگوں سے ہے، تمہاری زندگی کا بھی فیصلہ اب ہو جانا چاہیے۔ احسن ندیم نے عفاف کو اپنی پاکستان آمد کی بتائی۔

”جی بابا جانی جو آپ کو مناسب لگتا ہے۔“ عفاف نے اسے اختیار آپ کے پاس ہی ہے۔“ عفاف نے مسکراہٹ کے ساتھ گہرا سانس لیا اور مکمل فرما کر برادری کا ثبوت دیا۔

”جینک ہو بیٹا! تم سے اسی طرح کے رسالے کی توقع تھی۔“ احسن ندیم واقعی خوش ہوئے تھے۔

”مجھے خوشی ہے بابا جانی کہ میں آپ کی توقعات پر پوری اتر رہی ہوں۔“ احسن ندیم نے کہا۔

”بابا جانی ایک بات کرنی تھی۔“ اس نے پہلے کہ احسن ندیم کال بند کرتے، عفاف نے کہا۔

”ہاں، شیور بولو۔“

”آپ کو عروش کیسی لگی ہے؟“ عفاف نے عدی کی خواہش کو ذہن میں رکھ کر پوچھا۔

”بہت پیاری بیٹی ہے، ہنس کھ اور ملنسار۔“ احسن ندیم نے دل کھول کر اس کی تعریف کی۔

”مئی سے صلاح مشورہ کر کے عروش کو لے کے لیے منتخب کر لیں اور اب پاکستان آ رہے ہیں۔ دادو اور مسٹر نازی سے بات کر لیں۔“ مانی نے معاملات ان لوگوں کے ساتھ مل کر طے کر لیے۔

عفاف اس موقع کو گونا گونا نہیں چاہتی تھی۔ جاتی عدی کو عروش پسند ہے۔ تو بہن ہونے کا حق کرتے ہوئے عفاف سارا راستہ ہموار کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”ہاں بیٹا! ہم نے بھی عدی کی دلچسپی میں کی ہے۔ چلو میں آتا ہوں ناں تو پھر بات کر گے۔“ احسن ندیم نے بھی رضا مندی ظاہر کر لی۔

عفاف کے اندر اطمینان پھیل گیا۔

☆☆☆

محبت اور انتظار..... محبت میں انتظار..... انتظار..... انتظار..... اور محبت..... کیا محبت نے مجھے صرف انتظار ہی دان کیا ہے؟

دل آویز مقررہ وقت پر..... مقررہ جگہ پر مانی کا انتظار کر رہی تھی۔ گزرتا ہر لمحوں سے بے جان گر رہا تھا، دل آویز برسوں سے وہاں کھڑی انتظار کی سولی پر لٹک رہی تھی۔ کچھ لمحے، کچھ پل بہت بھاری ہوتے ہیں، ان کا بوجھ اٹھانا جان جانے کا سا لگتا ہے۔

آخر کار ایک گاڑی اس کے پاس آ کر رکی، اپنے خیالوں میں اتنی محو تھی کہ چونکی بھی نہیں۔ چند لمحوں بعد گاڑی کا دروازہ کھول کر مانی باہر نکلا تو دل آویز نے اس کی طرف دیکھا۔ ٹنگی باندھے وہ اسے دیکھے جا رہی تھی، دل زور سے دھڑک کر اپنی نارمل رفتار میں واپس آ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک حیرانی تھی، نگاہیں ساکت تھیں۔

”دل آویز!“ مانی جو اس کی طرف دیکھ رہا تھا، اس کی بیکار پر دل آویز دھیمے سے مسکرا کر اس کی طرف بڑھی۔ اس نے ارادہ کر رکھا تھا، وہ کوئی بے وقوفی نہیں کرے گی، اپنے آپ کو نارمل رکھے گی۔

”السلام علیکم!“ وہ دروازہ کھولے کھڑا تھا، دل آویز نے اسے سلام کیا۔

”وعلیکم السلام!“ مانی اپنے مخصوص سنجیدہ انداز میں بولے۔ سر تا پیر اسے دیکھا۔ وہ نظریں جھکائے کھڑی تھی۔ شرمندہ، ہاتھوں کی انگلیوں کو مروٹی، اس کے چہرے پر ایک اضطراب جھلک رہا تھا جسے مانی نے بے ساری دیکھ لیا تھا۔

”تم ڈرائیو کرو۔“ مانی گاڑی کی چابیاں اس کی طرف بڑھا کر بولا۔ دل آویز نے اسے دیکھا۔ وہ ڈرائیو نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن اس کے پاس انکار کا کوئی جواز موجود نہ تھا۔ اس نے چابیاں تھام کر ڈرائیو کی سیٹ سنبھالی، انٹیشن میں چابی گھما کر گاڑی اشارت کی۔

دل آویز نے کن انگیوں سے مانی کو دیکھا۔ وہ

منتظر تھی کہ مانی اسے بتائے گا کہ کہاں جانا ہے۔ لیکن شاید بھول گئی تھی کہ سات مہینے پہلے والا وقت اب پلٹ کر نہیں آئے گا۔ وہ حقیقت جو مانی کے سامنے آ چکی تھی وہ اب کسی صورت پر وہ پوشی کے زمرے میں نہیں رہی تھی۔ مانی کا رابطہ نہ کرنا ظاہر کرتا تھا کہ وہ غم میں ہے۔ حقیقت جان لینے کے بعد اس کو برا بھلا کہے گا لیکن اس وقت اس کی موجودگی میں اس کی خاموشی، مانی کے غم کو نہیں ایک لالچ اور سفاکی کو ظاہر کر رہی تھی۔ دل آویز کے لیے یہ گھڑیاں انتہائی تکلیف دہ تھیں۔ سچ کو دبا کر کیڑے پیچ کیا، اسٹیلیٹر پر پاؤں رکھا، انڈیکسٹر بھی آن کیا لیکن ساری جتنی ہمت ناپید ہو چکی تھی۔

”آرام سے گاڑی کو آگے بڑھاؤ، لیکن پہلے اچھی طرح دیکھ لو۔ روڈ ورک کی وجہ سے احتیاط کی ضرورت ہے۔“ مانی کو یقیناً اس پر ترس آیا تھا۔

”گاڑی کو ایسی جگہ لے کر جاؤ جہاں خاموشی ہو۔“ مانی نے کہا۔

”اور کتنی خاموشی چاہیے۔“ دل آویز دل ہی دل میں بولی۔ اثبات میں سر ہلایا اور گاڑی کو اپنی من پسند جگہ لے آئی۔ جاڑے کے موسم میں، خزاں کے عروج پر دل آویز کی یہ پسندیدہ ترین جگہ تھی۔ فلورنس پارک کی حدیں، اس وقت فلورنس پارک میں اکا دکا لوگ موجود تھے۔ اس لیے خاموشی تھی، موسم بھی ایراؤڈ تھا۔ چند ایک گاڑیاں روڈ کے سائڈ میں پارک تھیں۔ دل آویز نے گاڑی پارک کی، مانی نے ذرا سا جھک کر ونڈو سے باہر کے مناظر ملاحظہ کیے۔ اب وہ اپنی سابقہ مخصوص خاموشی کے ہمراہ اپنی ہی سیٹ پر آرام سے بٹھارہ گیا تھا۔

”آئی..... آئی ایم سوری.....“ جب خاموشیاں حد سے سوا ہونے لگیں تو دل آویز کو وحشت ہونے لگی۔ یوں محسوس ہوا دل کا ایک ٹکڑا ٹوٹ کر کسی گہری کھائی میں جا گرا ہوا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی دل آویز کو اس خاموشی کو توڑنا پڑا۔

”کس بات کی معذرت؟“ مانی انتہائی کرخ

لجے میں اس سے استفسار کر رہا تھا۔ دل آویز فقط اس کو دیکھ کر رہ گئی۔

”مجھے..... شاید..... میں.....“ دل آویز کے لفظ کھنکھاتے تھے۔

”جھوٹ..... جھوٹ..... دھوکا..... اودھوے محبت کے؟“ مانی کے لہجے سے آگ برس رہی تھی۔

”نن..... نہیں..... جھوٹ..... نہیں..... محبت ہے۔“ دل آویز بوکھلائی تھی۔

”دل آویز! ڈیڑھ سال تک تم.....“ مانی نے قہر آلود نظر اس پر ڈال کر نگاہ پھیری تھی۔ ”تم نے مجھے بے وقوف بنایا ہے دل آویز! تم نے نہ صرف مجھے بلکہ اپنے آپ کو بھی بے وقوف بنایا ہے۔ یہ سب کر کے تم کیا ثابت کرنا چاہ رہی تھیں دل آویز؟“ مانی نے اس کا لائنس اس کے سامنے کیا۔

”نہیں..... نہیں..... بے وقوف نہیں بنایا۔“ اس کے سفاکانہ انداز پر وہ تڑپ اٹھی۔

”تم نے جھوٹ بول کر اپنا پیسہ اور میرا وقت ضائع کیا ہے دل آویز! کیا ہے یہ سب؟ کیوں ہے؟“ مانی کے لب و لہجے کی کڑکشی اس کے اوسان خطا کر رہی تھی۔

”میں نے جھوٹ نہیں بولا۔“ وہ مدہم آواز میں بولی۔

”تو یہ کیا ہے؟ تمہارے پاس فل لائنس موجود ہے اور تم..... میری قابلیت کو چیلنج کیا تم نے۔ میری محنت کو مٹی میں رول دیا۔“

”نن..... نہیں..... ما..... مانی..... آئی سوڑ ایسا نہیں ہے۔“

”کیا ہے یہ پھر؟“ مانی نے دل آویز کا لائنس اس کے سامنے کیا تھا۔

”محبت.....“ وہ زیر لب بولی۔

”شٹ اپ..... جھٹ شٹ اپ..... محبت کا نام بھی لیا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔“ مانی نے انتہائی ترش لب و لہجے سے اس کی بات کاٹی تھی۔ دل آویز نے سہم کر اسے دیکھا۔

”میرے پاس کوئی رستہ نہیں تھا۔“ دل آویز نے آواز میں پھر بولنے لگی تھی۔

”میں ٹیسٹ پاس کر چکی تھی، آپ کو اکڑا کر کرتی تھی، آپ کے ساتھ وقت گزارنے کا یہی رستہ نظر آیا تا کہ میں آپ سے ڈرائیونگ شروع کر دوں۔“ دل آویز نے آنسوؤں کو ہونے اسے دیکھ کر کہا تھا۔ ”میں نے آپ کا دل نہیں اڑایا۔“

دل آویز کے سامنے اس وقت جو مانی تھا وہ اس کے لیے قطعی ایک انجان انسان تھا۔ انتہائی کرحش، سپاٹ، حد سے زیادہ روڈ۔ اتنے شدید رد عمل کی وہ توقع نہ کر رہی تھی۔ اس کے اس برتاؤ نے اس کی ساری ہمت کو ریزہ ریزہ کر دیا تھا۔ اس انداز، اس کے الفاظ یہاں تک کہ اس کی محبت کے بے ربط ہو چکی تھی۔

”تم نے جھوٹ بول کر میرا وقت ضائع کیا ہے۔ میں نے اتنی محنت کی پر نہ کی۔ اپنے سارے ہنر کو تم پر آزمایا اور تم..... یہ دھوکا ہے دل آویز! محبت نہیں۔“ جب جب اس نے کہا ”یہ محبت نہیں“ دل آویز کو اپنی سانس رکی محسوس ہوئی، وہ لرز کر جاتی۔

”آپ کا تو وقت ضائع نہیں ہوا ناں۔“ اس کے اس نے اس کے اعتراض کو جھٹلایا تھا۔

”آپ کی محنت بھی ضائع نہیں ہوئی ہے۔ میں آپ سے بہت زیادہ سیکھا ہے، یوں سمجھ لیں آپ سے میں نے صرف ڈرائیونگ نہیں، زندگی سیکھی ہے۔ آپ صرف ڈرائیونگ نہیں سکھاتے ہیں۔“ دل آویز کے لہجے میں اصرار تھا، بے بسی تھی۔

پرفیقین دلانے کی کوششیں بھی تھیں۔

مانی نے اس کو دیکھا۔ اپنی سپاٹ، کرحش، نظروں سے۔ دل آویز کی دھڑکنیں اب رک جانی چلنے لگی تھیں۔

”مانی..... میں.....“

”تم نے اپنا ڈرائیونگ لائنس مجھ سے

بھاپا۔ میری ہر ٹیکنیک کو رد کیا تم نے، ٹانگ کیا تم نے۔“

”محبت کی میں نے بس.....“ مانی نے پھر وہ ہی اعتراض کیا تو دل آویز چیخ اٹھی۔ اسی لمحے تیز ہوا کے جھونکے سے سڑک پر بکھرے پتوں میں بھی ہل چل ہوئی تھی۔ گہرے بادل بھی برسنے لگے تھے، پارک میں موجود چند لوگ بھی وہاں سے نکل رہے تھے۔

دو شاسانگا ہوں نے گہری نظر سے دل آویز کو دیکھا تھا۔ بارش کی رفتار میں اضافہ ہوا تھا، ونڈ اسکرین کے دھندلا جانے کے باعث وہ نگاہیں دل آویز کے تاثرات کو، اس کی آنکھوں سے بہتے درد کو دیکھ نہ سکی تھیں۔

”اونہ..... ربش.....“ مانی نے متغیر نگاہوں سے اسے دیکھ کر رخ موڑا تھا۔ دل آویز نے انتہائی دکھ سے اسے دیکھا تھا۔

”آپ..... چند لمحوں کے لیے میرے جھوٹ کو فراموش کر سکتے ہیں کیا؟ میں چاہتی تو اب بھی اپنا لائنس آپ سے چھپائے رکھتی مانی! میں نے خود وہ آپ کے ہاتھ پر رکھا تھا۔“

”کیا یہ آسان ہے کہ میں اس دھوکے کو فراموش کر دوں؟“ مانی غرایا تھا۔

”یہ محبت بھی آسان نہیں ہے لیکن میں قائم ہوں اس پر۔“ دل آویز نے لبوں کو کاٹ کر کہا تھا۔

دو ڈھائی سالہ محبت اور سات ہفتوں کا کرب ناک انتظار۔ لا حاصل ٹھہرا یا جارہا تھا۔ دل آویز نے ہوا جارہا تھا۔ نظروں میں اپیل رجم اور منظور محبت کی درخواستیں پھڑ پھڑا رہی تھیں اور مانی، سفاکی اور پتھر دل کا عملی نمونہ پیش کر رہا تھا۔

”میرے جذبات نے، میرے دل میں آپ کی محبت نے یہ قدم اٹھوایا تھا مانی! میں نے جھوٹ نہیں بولا۔ اگر بولا بھی ہے تو آپ کو کوئی نقصان نہیں ہوا، میں نے ہر اک لائن کی بے منت کی ہے۔“ دل آویز نے اسے محبت کا یقین دلاتے ہوئے حساب

کتاب کی بات کی تھی۔ مانی نے یک لخت اس کی طرف دیکھا۔

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم نے اپنے والدین کو بھی دھوکا دیا ہے۔“ مانی کی بات پر ول آویز کی محبت لڑکھڑانے لگی تھی۔

”ہاں دیا ہے دھوکا..... سب کو دیا ہے۔ خود کو، اپنے پیرئس کو، آپ کو۔ لیکن محبت..... میری محبت شفاف ہے۔“ دل آویز ہڈیانی انداز میں چلائی تھی۔

”تم ابھی چھوٹی ہو دل آویز! یہ محبت نہیں ہے۔“ مانی سفاکی اور کڑکشی کی حدوں کو چھو رہا تھا۔

اب قدرے نرم لہجے میں اس سے کہنے لگا۔ دل آویز نے ڈڈبانی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ مانی نے ایک دم اس کی طرف سے نظروں کو پھیرا تھا۔

”میں نے دھوکا نہیں دیا ہے۔ آپ کا ساتھ چاہیے مجھے، میں سچ کہہ رہی ہوں۔ میں نے بہت شدت سے چاہا ہے، آپ یہ نہ دیکھیں کہ میں نے ڈرائیونگ لائنس کے ہونے کے باوجود آپ سے ڈیڑھ سال تک ڈرائیونگ سیکھنے کی کوشش کی ہے۔ یہ میری محبت ہے، جس کے لیے میں نے اس حد کو توڑا ہے۔“ دل آویز کا لہجہ اس کا ہر اک لفظ منتوں سے بھر پور تھا۔ مانی نے متغیر نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

”پندرہ سال کے فرق کو میں کسی طرح بھی فراموش نہیں کر سکتا ہوں اور نہ ہی تم اس فرق کو مٹا سکتی ہو۔ یہ محبت نہیں محض ایک خیالی پلاؤ ہے جو بھی بھی ”دم“ تک نہیں پہنچ سکتا ہے۔“ مانی چند لمحے پہلے جس سفاکی سے باہر نکلا تھا، ایک بار پھر اسی حصار میں مقید ہو گیا تو دل آویز نے تڑپ کر اسے دیکھا۔

”آپ ایک بار سوچیں تو سہی، میری محبت کو محسوس تو کر س پیلیز.....“ وہ ہاتھ جوڑے باقاعدہ گڑ گڑانے لگی تھی۔

”بے وقوفیاں تمہاری عمر کا حصہ ہیں۔“ مانی نے غصیلے لہجے میں ایک بار پھر اسے ڈانٹا۔

”محبت کے بدلے محبت کی بھگ نہ مانگو۔ یہ تمہاری سو کا لڈ محبت کی تو ہیں ہے۔“ مانی نجانے

کیوں اس قدر پتھر دل تھا۔ یک دم ہی دل آویزاں بنیانی کیفیت سے نکل آئی تھی، اب وہ خاموشیوں کے حصار میں دھنسی جا رہی تھی۔

”میرے نزدیک محبت کے صرف دو اصول ہیں، جس سے محبت ہے اس کے لیے ساری حدیں توڑ دو۔ مٹ جاؤ اس کی چاہت میں اور اگر وہ اس بے انتہا محبت کی گہرائی تک نہیں پہنچ سکتا تو..... مٹا دو محبت کو، دل سے کھرچ کر نکال دو۔ محبت کے بدلے محبت کی کبھی بھیک نہ مانگو۔“ مانی نے اس کی طرف دیکھ کر ایک ایک لفظ کو تمام تمام کر بیان کیا تھا۔

”محبت کو کھرچ دینا ممکن نہیں ہوتا۔ میں نے محبت کی ساری حدیں توڑ دیں۔“ دل آویز یا سیت بھرے لہجے میں امید طلب نظروں سے اسے دیکھنے لگی تھی۔

”تو اب مٹا دو، تم وہ نہیں جو مجھے چاہیے۔“ مانی نے بار بار ماری جانے والی ٹھوکر ایک بار پھر ماری تھی۔ دل آویز کی آنسوؤں میں روائی آئی تھی، لیکن اسے ترس نہ آیا تھا۔

”مٹوں کو رانگاں کر دیا، محبت کی گہرائی پر مٹی ڈال دی۔ آنسوؤں کو بے مول کر دیا اور اب برداشت نے دم توڑ دیا تھا۔“

دل آویز نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور باہر نکل گئی۔ ہر طرف بکھرے خزاں کے منظر جو بھی پہلے دل کش لگا کرتے تھے۔ ویرانی میں ڈھل گئے، تیز بارش میں بھاگتی ہوئی، درختوں کو پتوں کو، بارش کے پانی کو روندتی ہوئی وہ آگے بڑھی جا رہی تھی۔ اپنے پیچھے جانے کا احساس نہیں تھا اس کو، وہ بھاگ رہی تھی۔

ہر طرف سے بے گانہ تھی، ہر طرف سے انجان۔ ان شناسا نگاہوں کے حصار میں تھی۔ مبین نیازی نے متغیر و متوجہ نظروں سے اس کا تعاقب کیا تھا لیکن جان نہ سکا تھا کہ وہ اس طرح اتنی تیز بارش میں بھاگتی ہوئی کہاں گئی ہے۔ بے تحاشا سوال دل میں لیے مبین نیازی نے اس کو نظروں سے اوجھل ہوتے ہوتے دیکھا تھا۔ وہ آج تک ان سوالوں کے

جوابات کھوج رہا تھا لیکن تاحال ناکامی کا سامنا تھا۔

☆☆☆

عفاف نے جیسے ہی اسٹی ٹیوٹ کے آگے قدم رکھا مبین نیازی وہاں موجود تھا اس کی شوٹنگ طرہ آواز میں ادا کیے گئے جملے نے اس کے قدم روک لیے تھے۔

”الحمد للہ، آپ کو بھی احساس ہوا کے وقت پر کہیں جایا جاسکتا ہے۔“ عفاف نے بھی لہجے کو کرخت بنانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ مبین نیازی نے حیران لگا ہیں اس پر مرکوز کیں، لیکن وہ رتی بھر بھی متوجہ نہ تھی۔

مبین کا ارادہ اس کو اپنی طرف متوجہ کرنا بھی نہ تھا لیکن نہ جانے کیوں مبین اس کی طرف متوجہ ہو جاتا تھا۔ شعوری یا لا شعوری طور پر عفاف اسے متوجہ کر رہی دیتی تھی۔

مبین نیازی چاہنے کے باوجود عفاف سے زیادہ بات نہ کر پارتا تھا۔ عفاف اسے کسی تفصیلی بات کا موع نہ دیتی تھی، جو بات بھی ہوتی تھی اسٹی ٹیوٹ کے حوالے سے ہی ہوتی تھی۔

تقریباً اگلے ڈیڑھ گھنٹے تک وہ دونوں ساتھ رہے، جو اسٹاف اپائنٹ کیا تھا ان کے ساتھ معاملات طے پا چکے تھے۔ جو بھی فارمیٹرز تھیں پوری ہو چکی تھیں۔

”آپ۔۔۔ شاید آج مبین مینشن کو روتی بننے کا ارادہ رکھتی ہیں۔“ سارے کام ختم کر کے عفاف بنا کچھ کہے، ہنا کسی ضرورت یا الوداعی کلمات کے آفس سے باہر جانے لگی تو مبین نے اسے روکا۔

”جی ہاں، کافی دن سے دادو سے ملاقات نہیں ہوئی ہے۔“ عفاف نے سرسری انداز میں جواب دیا۔ اس نے پہلے ہی دادی کو فون کر کے کہہ دیا تھا۔

”چلیں میں بھی گھر ہی جا رہا ہوں۔“ مبین نیازی نے اسے کہا۔

”بہت شکریہ، میں پہلے اپنے گھر جاؤں گی۔ بابا جانی کو کال کرنی ہے، وہ کل پاکستان آ رہے

ہیں۔“ عفاف نے سہولت سے انکار کرتے ہوئے اسے احسن ندیم کی پاکستان آمد سے آگاہ کیا۔

”خیریت؟“ انکل پاکستان کیوں آ رہے ہیں؟“ مبین نے قدم اس کی جانب بڑھاتے ہوئے اس سے پوچھا۔ عفاف نے اسے دیکھا، ایک لمحہ نظر اور مبین حیران ہی تو ہوا تھا۔

”مجھ سے ملنے کے لیے آ رہے ہیں۔“ عفاف نے کہا اور اس سے پہلے کہ مبین نیازی مزید کوئی سوال پوچھتا وہ آفس سے باہر نکل گئی اور مبین نیازی گہرا سانس لے کر رہ گیا پھر وہ بھی چابیاں اٹھا کر باہر نکل گیا۔ مبین نیازی گھر پہنچا تو سفینہ کو اپنا منتظر پایا۔

”تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔“ سفینہ نے آج سے پہلے مبین سے اس انداز میں بات نہ کی تھی۔ یوں اچکاچانا، باتوں کو تول تول کر منہ سے نکالنا، یقیناً لمبییر معاملہ ہی ہے۔

”جی دادو! آپ کہیں، میں سن رہا ہوں۔“ مبین اب مکمل طور پر ان کی طرف متوجہ تھا۔

”خیریت دادو؟ ایسی کیا بات ہے جو آپ شش و پنج میں مبتلا ہو رہی ہیں؟“ مبین کا انداز تفتیش لیے ہوئے تھا۔

”بیٹا! اب مبین مینشن کو ایک بھوک کی ضرورت ہے، جو تمہاری بھی دیکھ بھال کر سکے اور باقی سبب بھی سنیا ل سکے۔“ سفینہ نے بلا خردہ بات کہہ دی دی جس کے لیے کتنی دیر سے مشکل کا شکار ہو رہی تھیں۔

”یہ بیٹھے بیٹھے بھوک کی ضرورت کیسے پڑ گئی؟“ مبین اب قطعی لائق کا مظاہرہ کرنے لگا تھا۔

”بیٹھے بیٹھے نہیں پڑی، کافی عرصے سے ہے۔ تمہیں تو اپنے اور کاموں سے ہی فرصت نہیں ملتی کہ کبھی اپنی زندگی کے بازے میں بھی کچھ سوچو۔“ سفینہ نے اسے گھر کا تھا لیکن مبین نیازی رتی بھر بھی متوجہ نہ رہا تھا۔

”نہیں، یہ ممکن نہیں ہے۔ میں محبت کو یوں اتنی جلدی بار نہیں سکتا۔“ مبین نے دل میں سوچا لیکن دادی کو کوئی جواب نہیں دیا۔

”دیکھو بیٹا! اب تو لوگ بھی باتیں بنانے لگے ہیں۔“ سفینہ کی سنجیدہ اور ایسوشل بلک میلنگ قسم کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرانی تو مبین نیازی کو اپنی اندر کی ٹکرا کر پوسٹ ڈال کر ان کی طرف دیکھنا پڑا۔

”دادو لوگوں کا تو کام ہی باتیں بنانے کا ہے۔“ وہ قدرے بے زار لہجے میں ان کو دیکھ کر بولا۔

”کچھ بھی ہو بیٹا! لیکن اب وقت آ گیا ہے کہ تم کوئی فیصلہ کرو۔ میں نے اور عروس نے عفاف کو تمہارے لیے پسند کیا ہے۔“ مبین نیازی نے کچھ کہنے کے لیے لب وا کیے ہی تھے کہ سفینہ کی اگلی بات نے اسے حیران کر دیا تھا۔ ”کل اس کا باپ آ رہا ہے تو میں ان سے بات کروں گی۔ تمہارے پاس چند دن ہیں، سوچ لو لیکن یاد رکھنا ہم فیصلہ کر چکے ہیں۔“ سفینہ نے عروس کی ہدایت کے عین مطابق دو ٹوک بات کی تھی جبکہ مبین نیازی عفاف کا نام سن کر ہولفتوں کی طرح اس لمحے ان کو دیکھنے لگا تھا۔

”اتنے دن سے تم اس کے ساتھ کام کر رہے ہو، یقیناً اندازہ ہو گیا ہو گا کہ کیسی لڑکی ہے۔ بہت عرصے سے عروس بھی اس کو جانتی ہے۔ میری بھی جب جب ملاقات ہوئی ہے اس نے متاثر کیا ہے۔“ سفینہ نے ایک بار پھر عفاف کی تعریفوں کے پل باندھنے شروع کیے تھے۔

”دادو! یہ ممکن نہیں ہے۔ عفاف ہی نہیں مانے گی اور میں.....“

”تمہیں عفاف کی فکر کی ضرورت نہیں ہے اس کو راضی کرنا اس کے والدین کا کام ہے۔ تمہیں میں نے اپنا فیصلہ سنا دیا ہے، اس گھر میں عفاف ہی آئے گی اور اس کے باپ کے آتے ہی میں ان سے رشتے کی بات کرنے والی ہوں۔“ عروس کی ہدایت

کے مطابق سفینہ نے رعب دار آواز میں مبین کو اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔

”دادو! آپ نا انصافی کر رہی ہیں۔“ مبین کی زبان گنگ ہو چکی تھی۔

”تم اسے جو بھی سمجھو، میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔“ سفینہ کے توند انداز میں بدلے ہوئے تھے۔

”دادو پہلے آپ عفاف سے بات کر لیں۔“ مبین نیازی کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا۔

”تمہیں کہا تو ہے کہ عفاف کی فکر نہ کرو۔“ وہ ماتھے پر ہل ڈال کر بولیں۔

”لیکن اگر اس سے زبردستی ہاں کروائی گئی تو زندگی تو میری برباد ہوگی ناں۔“ ان کو وہاں سے اٹھتا۔

دیکھ کر مبین نے احتجاج کیا۔

”اچھا، ابھی آئے گی ناں تو اس سے پوچھ لوں گی۔“ سفینہ نے ہاتھ اٹھا کر اسے کہا اور اس کو وہی ہکا بکا چھوڑ کر وہاں سے چلی گئیں اور مبین نیازی کے چاروں طرف جیسے سائیں سائیں ہونے لگی تھی۔

”یک دم ہی بے انتہا بے چینیوں نے اس کے دل کو اپنی پلیٹ میں لیے لیا تھا۔“

”کیا ایک اور کوشش کرنا، اسے محبت کا یقین دلانا ممکن ہو سکتا ہے؟ مبین نیازی ایک بار پھر منت کرنے میں کوئی حرج ہے کیا؟“

”کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بار بار پلیٹ کر دیکھنے سے بھی چیزیں نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہیں، شاید اس محبت کی عمر اتنی ہی تھی اور انجام ایک ”شادی“ ہے؟“

”تو ہتھیار ڈال رہے ہو مبین نیازی؟“

اب کوئی بھی جواب نہ تھا، مبین نیازی کے پاس، فقط خاموشی۔ ایک گہری چپ اور محبت.....

جائے کنٹا وقت گزر رہا تھا۔

”السلام علیکم!“ اس کی چپکتی آواز نے اس کی سوچوں کے تسلسل کو توڑا تھا۔ مبین نیازی کی نگاہیں اب اس پر جمی تھیں۔

”آریو! وہ کب مہر نیازی؟“ عفاف کو تشویش

لاحق ہوئی لیکن اس نے پلکیں نہ جھپکیں، نہ جواب دیا۔

”مہر نیازی!“ تنگی باندھے اس پر نگاہوں کی بے باکی اب اس کو ناگوار گزرنے لگی تھی۔ وہ قدرے اوچی آواز میں اس کو پکارنے لگی۔ یہی آواز اس کو حواس میں لانے میں کامیاب ہوئی۔

مبین نے چونک کر پلکیں جھپکیں، ایک گہری، سرد آہ بھری اور بنا کچھ کہے وہاں سے چلا گیا اور عفاف کے لیے اس کا یہ برتاؤ ناقابل برداشت ثابت ہوا۔ اس نے باہر کی جانب قدم بڑھائے۔

”کیا ہوا بیٹا! کہاں جا رہی ہو؟“ عفاف کے بڑھتے قدموں کو سفینہ کی آواز نے روکا تھا۔ اس نے انہیں دیکھا اور اگلے لمحے اپنا ارادہ بدل کر ان کی جانب بڑھی۔

”السلام علیکم دادو! کسی ہیں آپ؟“ ان کے سوال کو نظر انداز کر کے عفاف نے قدرے بٹاش لہجے میں ان سے پوچھا تو سفینہ نے مسکرا کر اسے گلے لگا لیا۔

”میں ٹھیک ہوں، تم کیسی ہو؟ کافی انتظار کروایا تم نے تو.....“ سفینہ کے ہمراہ وہ صوفہ پر براجان ہو چکی تھی۔

”دادو! کل بابا جان پہنچ رہے ہیں ناں تو می سے بات ہو رہی تھی۔ عدی نے آج شام نیویارک جانا ہے تو بس اس لیے دیر ہو گئی۔“ عفاف نے سفینہ کو ساری تفصیل بتائی۔ انداز مدہم اور قدرے کھویا سا تھا۔

”تو بیٹا! تمہاری می بھی آ جاتی ساتھ۔“ سفینہ نے اس سے کہا۔

”جی دادو! وہ بھی آئیں گی لیکن کچھ عرصے بعد۔“ عفاف نے ابھی مدہم آواز میں کہا تھا۔ وہ ابھی تک مبین نیازی کی غیر متوقع رویہ کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ وہ سمجھ نہ پا رہی تھی کہ اس کو کیا رد عمل ظاہر کرنا چاہیے۔

جب سے عروش یو گئی ہے، عفاف کی مبین

ہازی کے ساتھ ملاقاتوں میں اضافہ ہوا ہے تب سے آج تک کی ساری ملاقاتیں اس کی ذہن کی انکریں پر چل رہی تھیں۔

ایک الجھن تھی، کچھ راز تھے۔ خاموشی ہاتھ کرتی تھی لیکن آواز سماعت سے ٹکرانے سے پہلے ہی دم توڑ دیتی تھی اور وہ مزید الجھ کر رہ جاتی تھی۔

وہ جو نہیں ہم دیکھتے تھے وہ جو ہمیں ہم چاہتے تھے وہ جو تم سے ہوتے تھے روبرو وہ جو نہیں مانگتے تھے ہر سو وہ اب اب کہیں نہیں

وہ اب ہی لمحے خاک ہوئے

مبین نیازی وہاں سے نکلا تو پلیٹ کر بھی نہ دیکھا، اب اپنی مخصوص جگہ (اسٹری روم) میں روکنگ چیئر پر بیٹھا اپنے آپ کو کوس رہا تھا۔ نگاہوں کی بے باکی پر نادم ہو رہا تھا۔ سفینہ کے حکم بھرے انداز میں فیصلہ سنانے کا اثر تھا جس نے اس کو عفاف کے سامنے بے اختیاری پر مجبور کیا تھا۔

مبین نیازی ایک الجھن اور شدید بے چینی کا شکار رہا تھا۔

عفاف رویہ ایسا تھا کہ اس کو ایک بار پھر ٹھکرائے جانے کا زخم برداشت کرنا تھا۔

لمحے بجتے جا رہے تھے، اس کو خبر نہ تھی۔ یہ بھی معلوم نہ تھا کہ عفاف ابھی تک مبین مبین میں ہے یا چلی گئی ہے۔

گھڑی کی ٹک ٹک میں اضافہ ہو رہا تھا، پل گزرتے جا رہے تھے اور مبین نیازی پل پل سلگ رہا تھا۔

”محبت..... المیہ یہ بھی ہے کہ ہم صرف اپنی محبت کی گہرائی ناپ سکتے ہیں۔ کسی دوسرے کی تڑپ، محبت، بے قراری، درد کا ہمیں اندازہ نہیں ہوتا۔ ہمیں صرف اپنی محبت خالص لگتی ہے۔

صرف اپنی محبت سمجھ میں آتی ہے۔

صرف اپنی محبت خاص لگتی ہے۔

صرف اپنے جذبات پر خلوص لگتے ہیں۔

صرف اپنی تڑپ کا احساس تھا اسے، صرف

اپنے انتظار کا درد تھا اسے۔

مبین نیازی کو بھی اپنی محبت خاص لگتی تھی۔

دوئوں کے حصے میں ملن ہوتی ہے؟ کس کے حصے میں فقط انتظار..... یہ فیصلہ ابھی ہوا نہ تھا۔

وقت رک رک کر چل رہا تھا لیکن بے کلیوں اور بے چینیوں میں اضافہ ہوا جا رہا تھا۔

صرف اپنے جذبات پر خلوص لگتے ہیں۔

صرف اپنی تڑپ کا احساس تھا اسے، صرف

اپنے انتظار کا درد تھا اسے۔

مبین نیازی کو بھی اپنی محبت خاص لگتی تھی۔

خالص لگتی ہے، صرف اپنے رت جگوں کا حساب

از رہا تھا۔ صرف اپنی محبت کی گہرائی کا اندازہ تھا۔

دوئوں کے حصے میں ملن ہوتی ہے؟ کس کے حصے میں فقط انتظار..... یہ فیصلہ ابھی ہوا نہ تھا۔

وقت رک رک کر چل رہا تھا لیکن بے کلیوں اور بے چینیوں میں اضافہ ہوا جا رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

کبھی یہ آرزو کہ

وہ جو مانگے وہ مل جائے اسے

کبھی یہ دوسو کر.....

اس نے میرے سوا کچھ مانگا تو نہیں

اس نے مدہم آواز میں یہ نظم پڑھی۔ اس لمحے اس نے پھیلے ہاتھوں کو چہرے پر پھیر کر انتہائی حیران نگاہوں سے اسے دیکھا۔

”کیا مانگا؟“ اس کو متوجہ پا کر عدی نے مدہم مسکراہٹ کے ساتھ دھمے لہجے میں پوچھا۔

”سب کی خیر۔“ عروش جائے نماز کو تہ کرتے ہوئے جواب دینے لگی تھی۔

”اور میرے لیے؟“ الفاظ عام تھے لیکن لہجہ خاص۔ فقط تین لفظوں میں ہزاروں سوال پوشیدہ تھے۔ محبت جہاں تک رہی تھی۔ عروش نے شپٹا کر اسے دیکھا تھا۔

”آپ کے لیے بھی۔“ مختصر جواب کے بعد اس نے رخ موڑا تھا۔

”بس؟“ ایک لفظ میں بہت سے افروز پنہاں تھے، آنکھوں کے سوال کو بخوبی پڑھ لیا تھا۔ میرا لہجہ، میری باتیں بہت ہی عام ہیں لیکن میں جذبہ پاک رکھتا ہوں، محبت خاص رکھتا ہوں عدی نے مسکراہٹ دبا کر آنکھوں میں قوس قزح کے رنگوں کو سمو کر اسے دیکھ کر شعر پڑھا۔ تو کمرے کے اس کونے میں اس کی ہنسی کی جھنکار گونجنے لگی۔ عدی نے گہری نگاہ سے اسے دیکھا تو عروش نے دائیں ہاتھ سے منہ دبا کر اپنی ہنسی کو روکنا چاہا۔

”اوں..... ہوں..... مت روکو۔ اسی چپکتی آواز نے تو میرے ایمان کو ڈمگایا تھا۔“ عدی کا لہجہ ایک استحقاق سے بھر پور تھا۔

”عروش نے اسے تنبیہ کیا۔
”مجھے لفظوں کے ہیر پھیر سے الجھن ہوتی ہے۔ صاف گواہان ہوں اس لیے دو ٹوک بات کروں گا۔“ عدی نے دونوں ہاتھوں کو چیز کی پائکس میں ڈالا۔ اپنی محبت کے رنگوں سے مزین لگا ہوں کو اس پر مرکوز کیا اور بولنا شروع کیا۔ عروش نے پہلو بدلا تھا۔

”میں چاہتا ہوں کہ تم یہاں سے کہیں نہ جاؤ۔ اس کے لیے میں تم سے اجازت نہیں لے رہا، یہ میرا فیصلہ ہے۔“ عدی نے دھونس جمائی۔ عروش نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

”میں آپ کے فیصلے کی پابند نہیں ہوں۔“ عروش نے رعب جمانا چاہا۔

”کون سا فیصلہ؟“ عدی نے دونوں بازو کو سینے پر باندھا لیکن اس پر سے نظروں کو ہٹانے بغیر کہا۔

”وہی فیصلہ جس کے لیے آپ کو میری اجازت کی ضرورت نہیں۔“ عدی کا انداز عروش کو زچ کرنے کے ساتھ ساتھ زروس بھی کرنے لگا تھا۔ ”کیوں منظور نہیں ہے؟“ عدی نے سوال

کیا۔
”دل کے معاملے میں کیوں یا کیسے جیسے سوال نہیں کیے جاتے۔ دل ان اعتراضات سے مبرا ہو کر اپنے فیصلے سناتا ہے۔“ عروش نے لب کاٹ کر بڑی گہری بات کی تھی۔

”ہم..... اوکے۔ تمہاری منظوری میرے لیے ضروری ہے۔ جب دل کا معاملہ میرے حق میں فیصلہ دے تو دیر نہ کرنا۔“ عدی نے قدرے سنجیدگی سے کہا۔ عروش نے متعجب نگاہوں سے اسے دیکھا۔ ”ہار مان لی؟“ وہ پلٹا تو عروش نے سوال کیا۔ ”ہاں۔“ عدی نے پلٹ کر اسے دیکھا تھا۔ ایک گہری نظر اس پر جمائی اور گہیر لہجے میں کہا تو عروش کی نظریں جھک گئیں۔

”جب دل میرے لیے گواہی دے تو آ جاتا۔“ عدی نے نہایت پر شوق نظروں سے اس کی جھکی پلکوں کو دیکھا تھا۔ ایک لمحہ کے لیے ایمان پھر ڈمگایا لیکن ضبط کے بندھن مضبوط تھے۔

”پاگل.....“ وہ زیر لب بولا۔ عروش نے یک لخت نظریں اٹھائیں اور دھیرے سے مسکرا دی۔

”گواہی مل گئی اب انتظار باقی ہے۔“ عدی نے قدرے شوخ لہجے میں کہا۔ ایک قدم اس کی طرف بڑھایا لیکن عروش دو قدم پیچھے ہوئی تو وہ گہری مسکراہٹ کے ساتھ وہاں اُسے نکل گیا تو عروش نے دونوں ہاتھوں سے دل کو تھما اور گہرا سانس خارج کیا۔

”صرف میرا عدی۔“ دل نے سرگوشی کی اور اس کے چہرے پر بے شمار رنگ انڈیل دیے۔

☆☆☆

”احسن ندیم نے سوچنے کے لیے وقت مانگا ہے۔“ مبین نیازی سفینہ کی اطلاع پر چونکا تھا، یک دم ان کی طرف دیکھا۔

”آپ نے عفاف سے پوچھا تھا؟“ مبین نیازی کے رگ دپے میں بے چینی در آئی تھی۔ ایک بار پھر ٹھہرے پانی میں ٹنگریاں اچھالی گئی تھیں۔ ”نہیں بیٹا! مجھے مناسب نہیں لگا تھا، اس لیے

کوئی ذکر نہیں کیا۔“ سفینہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے گویا ادائیں تو مبین نیازی نے پہلو بدلا۔

احسن ندیم پاکستان آ چکے تھے۔ دونوں فیملیز کی ملاقات بھی نہایت خوش گوار رہی تھی اور مبین نیازی نے بھی جتنی امکان کوشش کی تھی کہ احسن ندیم کو کوئی شکایت نہ ہو، مہمان نوازی نبھاتے ہوئے انہوں نے احسن ندیم کو مبین مینشن میں رہنے کی دعوت بھی دے ڈالی۔ جس کو انہوں نے نہایت سہولت سے منع کر دیا تھا۔

”بھئی ہم تو اپنی بیٹی کے پاس ہی رہیں گے۔ اتنے سالوں بعد یہ موقع ملا ہے۔“ احسن ندیم محبت پاش نظروں سے عفاف کو دیکھ کر بولے تھے۔

”تو عفاف آپ بھی آ جائیں۔“ مبین نیازی بلا ارادہ بولا تھا۔ جہاں اس کے الفاظ پر عفاف نے شپٹا کر اسے دیکھا تھا وہاں سفینہ بھی چونکی تھیں۔

”نہیں، بابا جانی کو کچھ میننگز بھی کرنی ہے اور ایسے ہی آپ لوگ بھی ڈسٹرب ہوں گے۔“ عفاف نے بھی دھمکے لہجے میں منع کر دیا۔

”آپ دونوں کون سا چھوٹے بیٹے ہو جو ڈنگے، تنگ کرو گے اور ہم ڈسٹرب ہو جائیں گے۔ بہر حال جو آپ لوگوں کو مناسب لگے۔“ مبین نیازی نے سکرا کر کہا اور مبین مینشن میں ان کی آمد کو ان کی مرضی پر چھوڑ دیا لیکن مبین مینشن کا رہن سہن، سفینہ کی بردباری اور مبین نیازی کا اعلا اخلاق احسن ندیم کو گرویدہ بنا کر گیا تھا۔

”کوئی بات نہیں بیٹا! جتنے دن یہاں ہوں، ان شاء اللہ ملاقات ہوتی رہا کرے گی۔“ رخصت لیتے وقت احسن ندیم نے خوش مزاجی سے کہا تھا۔

اور پھر ملاقاتیں ہوتی رہیں اور موقع دیکھتے ہی سفینہ نے احسن ندیم سے عفاف کو مانگ لیا اور اب مبین نیازی سے اسی بات کہہ رہی تھیں۔

”اگر آپ پہلے عفاف سے پوچھ لیں تو زیادہ مناسب رہتا۔“ مبین نیازی نے اپنے لڑکھڑاتے لہجے پر قابو پاتے ہوئے سفینہ سے کہا تھا۔

”احسن ندیم نے عروش کا رشتہ مانگا ہے، اپنے بیٹے کے لیے۔“ مبین نیازی اس نئی اطلاع پر بے تحاشا حیران ہوا تھا۔

”عدی کے لیے؟“ انہوں نے کنفرم کیا تو سفینہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

”ادلے بدلے کی شادی۔“ مبین نیازی زیر لب بولا اور سفینہ کی طرف دیکھا جن کے چہرے پر ایک پریشانی جھلک رہی تھی۔

”ہمارے ہاں آج تک وغیرہ نہیں ہوا۔ اگر احسن ندیم پہلے بات کرتے تو میں بھی بھی عفاف کو تمہارے لیے نہ مانگتی۔“ سفینہ نے کہا تو مبین نیازی نے انہیں دیکھا، فقط ایک نظر۔ دل ایک انداز سے دھڑکا تھا۔ ایک خاص اداسے چلا تھا لیکن وہ اس لمحے ان دھڑکنوں کی اضطرابی کو کوئی بھی نام دینے سے قاصر تھا۔

اب ایک انتظار..... ایک اور کرب ناک انتظار..... اس کی اضطرابیت میں اضافہ کر کے، سینہ تانے ان کے سامنے براجمان تھا اور اسے ان اذیت ناک لمحوں کو کاٹنا تھا۔ لیکن کیسے؟ جب لمحوں کی طوالت صدیوں بر محیط ہو جائے تو ان کو کیسے گزرا جاتا ہے مبین نیازی کو علم نہ تھا۔

☆☆☆

”بابا جانی!“ عفاف ہاتھ مروڑتی ان کے ساتھ براجمان تھی۔

”بیٹا! یہی مناسب وقت ہے۔“ احسن ندیم نے محبت بھری نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ اس کی اضطرابی کیفیت بار بار پہلو بدلنا اس کی دلی کیفیت کی بھرپور عکاسی کرتا، احسن ندیم کی نگاہوں سے کسی طور چھپانہ نہ سکا تھا۔

”جی بابا جانی! میں سمجھتی ہوں۔“ وہ نظریں جھکا کر ہوئے بولی تھی۔

”میں نے عدی کے لیے عروش کی بات کی ہے۔ ماں جی نے سوچنے کا وقت مانگا ہے لیکن انہوں نے بھی مبین کے لیے تمہارا ہاتھ مانگا ہے۔“

احسن ندیم کی اطلاع پر عفاف پر جیسے کوئی بم آگرا ہو۔ اس نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے انہیں دیکھا۔
”اور سچ کہوں تو مبین نیازی مجھے پسند آیا ہے۔“
مبین نیازی کے نام نے ان کی اطلاع کی صداقت پر مہر ثبت کی گئی۔

سنجیدہ مزاجی اور ہنس کھ پر سنائی کا مالک ہے۔ اپنے کام کے معاملے میں بہت ایمان دار بھی ہے۔ فیملی بھی ہے اور بزنس بھی۔ ہر لحاظ سے وہ مجھے مناسب لگ رہا ہے، باقی بیٹا جب ہم کسی کے ساتھ چوبیس گھنٹے رہتے ہیں، اپنی زندگی اس کے ساتھ شیئر کرنے لگتے ہیں تو بہت سارے معاملات میں اونچ نیچ تو ہوتی رہتی ہے۔“ احسن ندیم نے ہمیشہ کی طرح اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ انداز سمجھانے کا نہیں بتانے کا تھا۔

سمجھا تو اسے جاتا ہے جو نا سمجھ ہو۔ جو ہر معاملے کو سمجھتا ہو، جس کو اچھائی برائی کی تمیز ہو، انہیں تو صرف بتایا جاتا ہے۔ فیصلہ تو وہ خود ہی کرتے ہیں۔

”آپ کا فیصلہ مجھے منظور ہوگا بابا جانی! چاہے وہ فیصلہ مبین نیازی کے حق میں ہو یا کسی بھی اور کے۔“ عفاف نے احسن ندیم کی طرف دیکھا تھا تو اس نے مسکرا کر سر جھکا دیا۔

”مجھے لگتا ہے کہ میرا فیصلہ مبین نیازی کے حق میں ہی ہوگا لیکن بہر حال اس کے لیے چند مزید ملاقاتیں درکار تو ہیں ہی اور ٹھوڑی سی چھان بین بھی۔“ احسن ندیم نے گویا فیصلہ سنا دیا تھا، مطلب کے اس کی زندگی کا فیصلہ ہونے جا رہا تھا۔

”مبین نیازی۔“ عفاف غیر مرمی نقطے پر نظر پڑ جائے زیر لب بولی۔ گہری سانس لی اور اپنے آپ کو ایک کڑے امتحان کے لیے تیار کرنے لگی۔

☆☆☆

توقعات کا بھرم رکھنا پڑتا ہے، فیصلوں کا اختیار دے دیا جاتا ہے۔ دعا کے لیے اٹھائے گئے ہاتھوں پر یقین بھی رکھنا پڑتا ہے۔ اور جب بھرم کا سر چل دیا جائے۔ فیصلے، محبت

کے خلاف ہونے لگیں، دعا، عرش سے ٹکرا کر لوٹ گئے۔

اپنی خواہشوں کا گلہ بھی گھونٹ پڑے۔
زندگی آسان نہیں ہوتی ہے اور مہم!
”آسانیاں“ تو محبت کی دشمنی کے کسی صفحے پر بھی درج نہیں ہیں۔

”تم اس محبت کو ہمیں دفن کر دو اور چلی جاؤ یہاں سے۔“

”اس کے لیے میرے وجود کو بھی مٹا ہوگا، مجھے بھی دفن ہونا پڑے گا۔“

ایک خاموشی سی تھی جو اس کے اندر اترتی چلی جا رہی تھی۔ دل کو کلکوں میں بکھرتا ہوا وہ محسوس کر رہی تھی۔

تین ہفتے گزر چکے تھے اور ابھی تک دل آویز کے کانوں میں مانی کا سفاکانہ لہجہ، نشتر چھوٹے الفاظ کی کوچ کم نہ ہوئی تھی۔ دل کے پتھنے کی آوازیں تو اتر سے آ رہی تھیں۔

”میری محبت کیا اتنی معمولی ہے؟“
”کیا میری محبت میں اتنی بھی پیش نہیں کہ مانی کے دل کو گرما سکتی؟ پگھلا سکتی؟ میرے وجود کو مٹا ہوگا۔ دفن ہونا ہوگا۔“ وہ ہاری تھی۔ ٹوٹ چکی تھی، بکھر رہی تھی لیکن سینے والا کہیں نہ تھا، کوئی نہ تھا۔ جو تھا اس کے وجود سے دل آویز بے خبر تھی۔

آ نکھیں خشک ہونے کا نام نہ لے رہی تھیں مسلسل بہتا گرم سیال اب اس کی آنکھوں کو جلا چلا تھا لیکن وہ تو جیسے اپنی دشمن بن چکی تھی۔

”دفن کر دو محبت کو اور چلی جاؤ یہاں سے۔“
”میرے وجود کو بھی مٹا ہوگا، مجھے بھی دفن ہونا پڑے گا۔“

مسلسل ہوتی بازگشت اس کو بہکا رہی تھی، اس کو محبت کے ساتھ ساتھ خود کو بھی دفن کرنے پر اکسار رہی تھی۔

اور پھر اس کا وجود بے جان ہونے لگا۔ آنکھوں نے کھلے رہنے سے انکار کر دیا۔ وہ پانی جو

پچھلے تین ہفتوں سے کسی طرح خشک نہ ہو رہا تھا، اس نے بھی اب بہنے سے انکار کر دیا تھا۔

کمرے میں اندھیرا تھا۔ اس کا بے جان وجود، خاموشی اور دیرانی..... کمرے کا دروازہ کھلا، روشنی نے منظر کو صاف کیا۔ آنے والے نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی، اگلے پہل نظر اس دہرے ہوتے ہوئے وجود پر ایک کر رہ گئی۔ وہ دیوانہ وار اس کی طرف لپکتے لگے۔ اگلے لمحے وہ ایسولینس کو کال ملا رہے تھے۔

تھر تھر کانپتے ہاتھوں سے جس مشکل سے نمبر ملایا جا رہا ہے اس کا اندازہ ان کے سینے سے شرابور چہرے، اڑتی رنگت سے بخوبی ہو رہا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے بہت بڑا نقصان ہو چکا ہے، جیسے وہ اس کو کھو چکے ہیں۔

”دل آویز..... دل آویز..... آنکھیں کھولو..... دل آویز..... کیا ہو گیا تمہیں؟ تمہاری نبض کیوں نہیں چل رہی؟“ ان کا ہاتھ کی پوروں نے اس کی کلائی کو تھما تھا۔ ”تم سانس کیوں نہیں لے رہی ہو.....؟“ وہ اس کو سمجھوڑ کر حواس باختہ ہو رہے تھے، چلا رہے تھے۔

پکار مسلسل تھی۔ ”دل آویز..... دل آویز.....“ لیکن جواب نہ دار۔

☆☆☆

”ماشاء اللہ بیٹا! بہت شکریہ۔ اب مبین مینشن کی رونقوں میں بھی اضافہ ہوگا۔“

”ہاں ان شاء اللہ..... لیکن آپ اب ہماری درخواست بھی منظور کر لیں تاکہ ہمارے گھر سے جانے والی رونق کا کچھ ازالہ ہو سکے۔“ احسن ندیم نے سفینہ کو عفاف کی رضا مندی کی خبر سنا دی تھی اور اس لمحے ان کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔

”ہاں، اگر عدی بیٹا اور عمن سے ملاقات ہو جاتی تو ہمارے لیے فیصلہ کرنے میں آسانی ہوتی۔“ سفینہ نے جھجکتے ہوئے کہا۔

”ہاں وہ تو عدی کے نیویارک سے واپس آتے ہی آ جائیں گے۔ عروش کو بھی چٹیاں ہوں گی

تو سب آ جائیں گے۔“ احسن ندیم نے کہا تو سفینہ نے طمانت بھرا سانس خارج کیا اور رضا مندی ظاہر کر کے فون بند کر دیا اور دوسرے پہل مٹھائی کا آرڈر دیے لگیں۔

مبین نیازی ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو سامنے ٹیبل پر مٹھائیوں کے ٹوکڑے رکھے ان کی حیرتوں میں اضافہ کرنے کے لیے کافی تھے۔

”خیریت دادو؟ یہ اتنی مٹھائی کہاں سے آئی؟“ مبین نے سفینہ کی مصروفیت کو دیکھا۔

”تم کہاں تھے؟ کتنی کالز کی ہیں لیکن اٹھا ہی نہیں رہے تھے۔“ سفینہ نے اس سے پوچھا۔

”ہاں دادو! ڈرائیونگ کر رہا تھا، اس لیے نہیں اٹھا سکا تھا۔ لیکن خیریت؟“ مبین اپنے مخصوص صوفہ پر بیٹھتے ہوئے ان سے ایک بار پھر ان مٹھائیوں کی بابت پوچھنے لگا۔

”آج احسن ندیم کا فون آیا تھا۔ اس نے تمہیں عفاف کے لیے منظور کر لیا ہے۔“ سفینہ نے انتہائی پر مسرت لہجہ میں بتایا لیکن مبین نیازی کو یوں محسوس ہوا جیسے کمرے کی محبت اس کے سر پر آگری ہو۔ جیسے کسی نے اس کے بالکل باس بم پھوڑا ہو۔

اپنی سماعتوں پر شبہ ہوا تھا لیکن یہ مٹھائیاں، سفینہ کی خوشی اس بات کی گواہ تھی کہ جو انہوں نے کہا ہے وہ سچ ہے۔

مبین نیازی اتنا شاکڈ تھا کہ ایک لفظ تک نہ کہہ سکا، اس کے چہرے کے تغیر و تبدل پر سفینہ نے تعجب سے اسے دیکھا تھا۔

(ان شاء اللہ باقی آئندہ ماہ)

مستحقا

آرت 400/-

32735021



”تو نے راشن میں سے پیسے مارے ہیں حرام خور؟“ وہ پلٹ کر غرائی۔

”نہیں چاچی۔“ وہ سامنے سر جھکائے کھڑا تھا۔

”دس روپے کم کیوں ہیں پھر؟“

”فضل چاچا نے اس مہینے چاول اور گھی کے پیسے

بڑھادیے ہیں۔“ وہ اپنی جگہ چورسا بن گیا۔

”میں پوچھوں گی فضل سے جا کر، اگر یہ جھوٹ

ہو تو تیرا حشر بڑا کر دوں گی۔“ وہ اسے سامنے سے

ہٹاتے ہوئے چلی گئی۔ وہ جھاڑاٹھا کر صحن کی صفائی

کرنے لگا۔ ہوا کے ساتھ بہت گرد آنے لگی تھی۔

بڑی یاری تھی کریم کی اس کے باپ سے۔ اپنے

ماں باپ کی موت کے وقت وہ گیارہ سال کا تھا۔

”ہمارے چھ آٹھ بچوں کی دو وقت کی روٹی پوری

نہیں ہوتی، اس کا پیٹ کہاں سے بھریں گے۔“

خاندان والوں نے اس کی ذمہ داری سے ہاتھ اٹھا

لیا۔

کریم اسے اٹھا کر اپنے گھر لے آیا گویا دوستی کا

فرض ادا کیا ہو اور فرض کو قرض سے بدل دیا۔ وہ قرض

جو بعد میں اسماعیل کو چکانا تھا۔ انم اکلونی بنی تھی اس

کی، اس کے بیاہنے کے بعد اسماعیل نے اس کے

بڑھاپے کا سہارا بن جانا تھا۔

”آج سے یہ ہی تیری ماں ہے۔“ کریم نے صدیقہ سے اسے ملوایا۔

”ایسے جوان لونڈے کی ماں نہیں بن سکتی میں۔“

پھر وہ اس کی صدیقہ چاچی بن گئی۔

کریم نے اس کے لیے صحن میں چار پانی ڈال

دی۔ دو کمرے کے گھر میں اس کے لیے اتنی ہی جگہ

تھی۔ دو اس طرح سے کہ صحن پر پہلے ٹین کی چادر ڈالی

تھی مگر برسوں پہلے تیز آندھی اڑا کر لے گئی۔ دو وقت

کی روٹی پیٹ بھر کر مل جانے کو عید کے دن کی طرح

بکھنے والے، ٹین کی چادر ڈالنے کے پیسے کہاں سے

لاتے۔ پھر وہ کمر اکھلائ بن گیا۔ خون جمادینے والی

سردی ہو یا پیسے میں نہلا دینے والی گرمی۔ اسماعیل کا

ٹھکانا وہی صحن کا کوٹہ تھا۔

وقت گزرنے لگا۔ کریم کی انم پہلی جماعت سے

چوتھی جماعت میں آگئی اور اسماعیل چوتھی جماعت

سے آگے نہیں پڑھ سکا، اس کا دل نہیں لگتا تھا پڑھائی

میں مگر پھر بھی اس کی بہت اہمیت تھی۔ کریم اسے اپنے

ساتھ کام پر لے جاتا چاہتا تھا اور صدیقہ اسے گھر پر

روکنا چاہتی تھی۔ وہ بھی کریم کے ساتھ سبزی کا ٹھیلہ

لے کر گلی گلی پھرتا، ابھی گھر میں چاچی کے حکم کے

مطابق سارے کام کرتا۔ ہاتھ باندھے سر جھکائے

سارے گھر میں پھرتا وہ کسی غلام کی مانند لگتا تھا، بے

دام غلام۔

☆ ☆ ☆

”تو اپنے لیے زردہ لینے آیا ہے؟“ جمیلہ خالہ کے

بڑے لڑکے نے نیاز کی تھیلی اسے تھمائی۔ اس مٹی کے

پتلے کی بھی خواہش ہو سکتی ہے۔ حیرت سی حیرت۔

”اماں! میٹھا کھانے کا بہت دل کر رہا ہے،

بنادو!“ انم مت کر رہی تھی۔

”تیرے باپ کی فیکٹریاں چل رہی ہیں جو

تیرے لیے زردے کی دیکیں چڑھاؤں میں۔“

صدیقہ بگڑی۔

”تھوڑے سے بنادو۔“

”نہیں بنا سکتی، جادوچ ہو یہاں سے۔“

اور وہ برتن مانجنے کی تار پھینک کر محلے کی جمیلہ

خالہ کے دروازے کے باہر جا کر کھڑا ہو گیا۔

”یہ چلے۔“ کچن میں روٹی انم کو اس نے

زردے کی تھیلی پکڑائی۔

”تو کہاں سے لایا؟“

”کھالے، چوری کر کے نہیں لایا، جمیلہ خالہ کے

گھر ناز بنی تھی۔“

انم نے پہلی بار اس کی بھرپور آواز کو سنا اور نہ وہ

تو اماں کے سامنے منمناتا ہی رہتا تھا۔

پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔ اس کی اہمیت اور بڑھ گئی،

انم میٹھے کی شوقین تھی۔ گڑ کی ڈلی، گڑیا کے بال، موتی

چور کے لڈو۔۔۔ وہ فرمائش کرتی اور وہ پوری کر دیتا۔

انم پہلی بار میٹھے کے اتنے ذائقے چکھ رہی تھی۔ چکھ تو

وہ بھی پہلی بار ہاتھ، نئے رشتے کی منہاس کو۔

”تو مجھے اسماعیل بھائی کہا کر۔“ چند دن میں اس

نئے رشتے کا تعین ہو گیا۔

☆ ☆ ☆

وہ صحن میں چادر ڈالے لینا تھا۔ چار پانی کا پاپا تو

شروع سے ہی ٹوٹا تھا، اتنا جھوٹی تھی وہ کہ جب بھی

اس پر لینا تو لگتا تھا زمین پر آن پڑے گا۔

”مہمانوں کے لیے رکھی تھی چار پانی، ٹوٹے توڑ

ڈالی ذلیل۔“

اس نے پایا جڑوا لیا مگر چار پانی پر دوبارہ کبھی نہیں

سویا۔

”تو کب تک ان کی مفت میں خدمت کرتا رہے

گا؟“ فضل دین نے اس کے ہاتھ میں چائے کی

پیالی تھمائی۔ بڑا خدا ترس بندہ تھا وہ۔

دیوار سے دیوار ملی تھی کریم اور فضل دین کی،

چھوٹے سے گھروں میں باتیں گھر تک نہیں رہتی

تھی۔

”وہ مجھے مفت میں پال رہے ہیں چاچا! میں ان

کے کئی کام کر دیتا ہوں تو کیا برائی ہے؟“ وہ ناشتا لینے

دکان آیا تھا۔



”کئی۔۔۔ ان کے سارے کام ٹوٹ ہی کرتا ہے۔“

چلا جا یہاں سے، کوئی ہنر سیکھ کر اپنا کام شروع

کر دے۔“

”ایسے ہی کام نہیں ملتا چاچا! جہاں بھی جاؤں گا

لوگوں کی جوتاں سیدھی کرنی پڑیں گی، اس سے بہتر

ہے کہ اپنے محسنوں کی ہی کر لوں۔“

”دیکھ اسماعیل!“ فضل دین نے ہمدردی سے

اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اس کے منہ سے سسکی

نکلے۔

”دروازے سے نکل گیا تھا اندھیرے میں، کندھا

سوچ گیا۔“

”لوہے کے بنے دروازے ہیں نا کریم کے گھر

میں؟“ فضل دین طنز بولا۔ ”صدیقہ نے پھر مارا

ہے تجھے؟“ فضل دین کے لہجے میں ترس ہی ترس

تھا۔

اسامیل کی آنکھوں میں کچھلی رات کا منظر لہرایا۔
”دورونی کھا گیا حرام خوراک اس قابل ہے ہی نہیں کہ تجھے ساتھ بٹھا کر کھلایا جائے۔“ صدیقہ نے سامنے پڑاٹوا سے دے مارا۔
”نیند میں تھا اس لیے لگ گئی۔“
”ساری زندگی ظلم برداشت کرتا رہے گا ان بد ذاتوں کا؟“
”چاچی میرا انتظار کر رہی ہوں گی۔“ وہ چائے چھوڑ کر چلا آیا۔



”میری سہیلیاں کالج کی رنگ برنگ چوڑیاں پہنتی ہیں۔ انہیں دیکھ کر میرا بھی جی لپچاتا ہے۔“ انم کی فرمائش اسے انوکھی لگی۔
”درجن بھر لادے مجھے سبز رنگ کی۔“ وہ بے دام غلام بھلا انکار کیسے کرتا۔
”یہ کیا ہو رہا ہے؟“ صدیقہ نے اسامیل کو چوڑیاں دیتے دیکھا۔
”ادھر دے مجھے۔“ اس نے انم کی کمر کے پیچھے کیے ہاتھوں سے چوڑیاں بچھٹ کر لی۔
”اماں میں نے اسامیل بھلا۔۔۔۔۔“
”کینے! تجھے شرم نہیں آتی۔ اپنی گھر کی عزت پر نظر رکھتا ہے۔“ صدیقہ کی دھاڑ پر اس گھر کے درد دیوار بل گئے۔
”چاچی!۔۔۔۔۔!“ اس الزام پر اس کی آنکھیں پھٹ گئی۔
”عشق و عاشقی کرے گا تو؟ میری بیٹی سے؟“ وہ بانس کا ڈنڈا لے کر اس پر پٹیل پڑی۔
”تو غلط سمجھ رہی ہے اماں! اسامیل بھائی ہے میرا۔“ اس نے صدیقہ کا ہاتھ پکڑا۔
”پندے ہٹ بے حیا، اسے بھائی بول کر اس کے کرتوتوں پر پردہ ڈال رہی ہے۔“ صدیقہ کے دھکے پر انم کا سر دیوار سے جا لگرایا۔
”میں تجھے زندہ نہیں چھوڑنے والی۔“ صدیقہ

وحشی بنی اسے مار رہی تھی۔

”بھائی! تو چپ کیوں ہے؟ بتا اماں کو سچ۔“ وہ ہاتھ سے اپنا زخم دباے چلائی۔
وہ منہ ٹانگوں میں دیے مار کھاتا رہا تھا۔ پہلے کبھی چاچی کو جواب نہیں دیا، تو آج آواز نکالنے کی ہمت کہاں سے لانا۔
”اوئے چھوڑ اسے بد بخت!“ کریم نے اسے دور کیا۔ صدیقہ اسے مار مار کر ہانپنے لگی۔
وہ لکڑاٹے ہوئے وہاں سے اٹھ کر کچن میں گھس آیا۔
”عقل گھاس چرنے لگی ہے تیری؟ کیوں ایسے جنگلیوں کی طرح مار رہی ہے؟“
”احسان فراموش نکلا ہے یہ۔“
کریم صدیقہ کو کمرے میں لے گیا۔ باہر خاموشی چھا گئی۔
وہ گھٹنوں میں سر دیے بیٹھا رہا، سر سے نکلنے خون کو آستین سے رگڑ کر صاف کیا۔
”اپنا سامان اٹھا، مجھ سے پیسے لے اور بس پکڑ کر چلا جا اس شہر سے۔ بہت بڑی زمین ہے اللہ کی، تیرے لیے کچھ نہ کچھ رکھا ہوگا اس نے۔“ آج صبح ہی فضل دین نے اسے نئی راہ دکھائی تھی۔
اس نے اپنی نیل و نیل کمر کو دیوار سے ٹکایا تو درد کی ایک لہر دوڑ گئی۔ تکلیف سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا، صبح سویرے کے بٹایا پیسے اس نے چاچی کو واپس نہیں کیے تھے۔
آنسو کو خون سے غم قہقہے سے صاف کیا۔ کھن میں آکر اپنے چند جوڑوں کی پوٹی باندھی، چاچا اور چاچی کا کمرہ ہنوز بند تھا۔ انم دیوار سے لگی بیٹھی اسے نکلی باندھ دیکھ رہی تھی مگر نہ جلی نہ منہ سے کوئی آواز نکالی اور وہ دروازہ پار کر گیا۔ اس کا چلے جانا ہی بہتر تھا۔
اس کے چلے جانے کا سب کو بہت دکھ تھا۔ ان کا بے دام غلام، مستقبل کا سہارا ان کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ انم نے ساتویں کے بعد پڑھائی چھوڑ دی، اسے زندگی کے پڑھائے سبق سمجھ میں نہیں آتے تھے،

کلاس کے سبق کیسے یاد رکھتی۔

”کیا فرق پڑتا اگر اس کی انم سے شادی ہو جاتی، اپنی بیٹی گھر میں ہی رہ جاتی۔ اگر تو اس وقت عقل کی اندھی نہ بنتی تو سب سچ رہتا۔“ کریم کا قلق ہی ختم نہ ہوتا تھا۔
”ہاں تاکہ میری بیٹی دو دو روپے جوڑ کر رکھنے میں اپنی زندگی ختم کر دیتی۔“ وہ اڑ جاتی۔ ”میں اس کی شادی بڑے آدمی سے کروں گی۔“
اور سولہ سال کا ہوتے ہی سانولی سلونی سی انم کے لیے بڑے آدمی کا رشتہ آ گیا۔
”لڑکے کی اپنی چلتی ہوئی پرچون کی دکان ہے۔“ کریم نے تصدیق کر دی۔
صدیقہ نے خوشی خوشی اس کے پیادہ کی تیاری شروع کر دی، غریبوں کی تیاری ہوئی ہی نکلتی ہے۔ چند جوڑے اور برتن۔۔۔۔۔ ایک مہینے میں اس کی شادی جیل سے ہو گئی۔
☆.....☆
”جیل کھوکھے کی جگہ دکان لینا چاہتا ہے۔ اس کا دوست دلوار ہا ہے مگر پیسے کم پڑ رہے ہیں، کہہ رہا ہے کہ زور سچ دوں۔“ شادی کے چھ مہینے بعد انم جیل کا پہلا مطالبہ لیے آئی تھی۔
”اس کی تو اپنی دکان ہے نا پہلے سے؟“ صدیقہ کو یہ مطالبہ عجیب لگا۔
”نہیں! پان کا کھوکھا ہے، خوب کمائی ہو جاتی ہے مگر خرچے بڑھ گئے ہیں اب۔“
”تیرے سسرال والوں نے جھوٹ بولا ہم سے، تو نے پہلے کیوں نہیں بتایا؟“
”پہلے پتا چل جاتا تجھے تو تو نے ہمیشہ کی طرح اس رشتے سے بھی منہ کر دینا تھا۔“ کریم سکون سے میں بولا، وہ کام پر کم جانے لگا تھا۔
”جھوٹ تو نے بولا؟“ وہ شاک میں تھی۔
”ہاں! میری ہڈیوں میں اتنا دم نہیں تھا اب کہ گلی گلی سبزی کا ٹھیلہ لے کر پھروں، تین لوگوں کی روٹی کمانا بوجھ ہو گیا تھا۔ تجھے یہ بات سمجھ ہی نہیں آتی تھی

کہ تیری معمولی بیٹی کے لیے کوئی شہزادہ نہیں آنے والا۔“
”تو نے مجھے کانوں کے چھلے دیے تھے وہ سچ دوں جیل کی وکان کے لیے؟“ انم کو کسی چیز سے فرق نہیں پڑتا تھا۔
”وہ واحد زور رہی تو بے تیرے پاس، وہ سچ دے گی تو کیا بچے گا پھر؟“
”ہاں سچ دے، دکان نہیں تھی تو کیا ہوا، اب ہو جائے گی۔ تیری ماں کی خواہش بھی پوری ہو جائے گی۔“
پھر زور پک گیا، جیل کا دوست رقم ہڑپ کر رفو چکر ہو گیا۔
”دکان کی کے چکر میں کھوکھا بھی ہاتھ سے گیا۔“ صدیقہ کو بہت صدمہ تھا۔
☆.....☆
”کیسے بے دردی سے مارا ہے میری بیٹی کو۔“ صدیقہ روٹی جاتی اور اس کے سر سے بہتے خون کو دوپٹے کے پلو سے صاف کرتی۔
”ایسی ہی حالت کر دی تھی تو نے اسامیل کی بھی۔“ انم کی آواز ٹھنڈی تھی، کسی بھی درد سے عاری۔
کریم بیمار بننے لگا تھا، صدیقہ کے بار بار بلانے پر بھی انم کم آتی تھی۔ صدیقہ ملنے لگی تو نشے میں دھت جیل دروازے پر اسے دھکا مارتے ہوئے چلا گیا۔
اندر لہو لہان انم کو دیکھ کر اس کی چیخ ہی نکل گئی۔
”بد بخت! میری بیٹی نے کیا بگاڑا تھا جو مار مار کر ادھ موا کر دیا اسے۔“ وہ چلائی۔
”تیری بیٹی نخوس ہے، اس کے آتے ہی میرا بیٹا کنگال ہو گیا۔“ جیل کی ماں تن کر کھڑی تھی، گویا وہ بھی اس ظلم میں شامل تھا۔
صدیقہ اسے گھر لے آئی۔
”میں واپس نہیں جھینے والی تجھے، جب تک یہاں آکر معافی نہ مانگ لے۔“ وہ اس کے زخم پر مرہم لگاتے ہوئے کہتی۔

اُم ہانی بھولا جو فرض



”وہ مجھے معاف کر دے گا نا؟“ وہ انہم سے پٹ گئی۔
”اللہ یا بندہ؟“
”دونوں.....“

”بندے سے معافی مانگتو تو اللہ بھی معاف کر دے گا مگر مجھے نہیں لگتا کہ وہ واپس آئے گا اب۔“
”وہ ضرور آئے گا۔“
صدیقہ اپنے انتظار کے ختم ہونے کا انتظار کرتی رہتی۔
”چاچی.....!“ برسوں بعد کسی نے اسے ایسے پکارا تھا۔

”اسامیل!“ وہ اس تک لڑکھڑاتی سننے لگی۔
”مجھے یقین تھا تو آئے گا۔“
”مجھے واپس آنا ہی تھا، میں احسان فراموش نہیں تھا چاچی۔“ اس کی آواز میں کتنا اعتماد تھا۔
”تیری زندگی برباد کر دی میں نے۔“

”تُو نے میری زندگی آباد کر دی، تُو نے میرے اندر اتنی برداشت پیدا کروادی کہ مالک کی لعنت و ملامت بھی بُری نہ لگی، نہ روکھی سوکھی پر بھی شکوہ کیا۔ سالوں اس کے پاس شاگرد بن کر کام سیکھتا رہا اور آج میرا اپنا گاڑیاں ٹھیک کرنے کا کیراج ہے۔“ وہ پرانے اسامیل جیسا بالکل نہیں لگ رہا تھا۔
”تُو تو بڑا آدمی بن گیا ہے۔“ انہم کے لبوں کو مسکراہٹ نے چھوا۔ اس گھر نے سالوں بعد یہ منظر دیکھا تھا۔

”اللہ کا احسان ہے۔ اس گھر سے جاتے ہوئے چاچی کے ہاتھ سو روپے لے کر بھاگا تھا، وہ قرض واپس کرنے آیا ہوں۔“
”مجھے معاف کر دے، میری انہم کو اپنا لے۔“
صدیقہ اس کے پیر پڑ گئی۔

”تیری بیٹی اتنی بے وقعت نہیں چاچی کی تُو بیروں میں پڑ کر اس کی خوشیوں کی بھیگ مانگے۔ میرے لیے اعزاز ہوگا اگر تُو فخر سے یہ میرا میری جھولی میں ڈالے۔“ وہ انہیں گلے لگائے کھڑا تھا۔
خوشیاں ان کے گھر میں رقصاں تھیں۔ گرہ کھل گئی تھی۔☆☆

معافی تلانی کی نوبت ہی کیسے آتی۔ جیل نے تو پٹ کر خبر ہی نہ لی۔ خبر ملی تو اس کی دوسری شادی کی اور انہم کو طلاق کی۔

”سنا ہے انہم بھی ماں کی طرح بڑی زبان درازی کرتی تھی جیل سے جیسی طلاق ہوگئی۔“
”اس کی دوسری بیوی بہت پیسہ لائی ہے اپنے ساتھ۔“

کریم کی موت پر محلے والے بھانت بھانت کی بولیاں بول رہے تھے۔
چند دن کی بات تھی، جس روکھی سوکھی پر گزارا ہو رہا تھا وہ بھی ختم ہو گیا۔ فضل دین کی بیوی نے انہم کو گھروں میں صفائی کا کام لگوا دیا۔ زندگی کی گاڑی پھر سے کھنکھائی۔

☆.....☆.....☆
ماہ و سال گزرنے لگے۔ پرانے گھروں کی جگہ نئے گھر بن گئے مگر صدیقہ کے گھر میں تو وقت سرک بھی نہیں رہا تھا۔ گھر میں دو زندہ نفوس کے ہوتے ہوئے بھی ہر وقت موت کا سنا سنا جھیا رہتا۔
”کریم کو گئے اتنے سال بیت گئے۔ تُو کب تک اس کا غم منائی رہے گی؟ انہم تیس سے اوپر کی ہونے والی ہے، اس کا کچھ سوچ، اگر تجھے کچھ ہو گیا تو اس غریب کا کیا ہوگا۔“ فضل دین کی بیوی روز اس کی دل جوئی کرنے آتی تھی۔

”لگتا ہے کہ کوئی گرہ ہی بندھ گئی ہے، کھلتی ہی نہیں۔“ وہ بڑبڑاتی رہتی۔
وہ بیمار رہنے لگی تھی مگر بیماری کی کوئی تشخیص ہی نہ ہوتی تھی، نہ چین ملتا تھا نہ سکون۔ سارا دن ٹوٹی چارپائی پر پڑی رہتی۔

”نرسین باجی کہہ رہی تھیں کوئی ہمارے ساتھ بُرا کرتا ہے تو دل میں گرہ بندھ جاتی ہے اور جب ہم کسی کے ساتھ بُرا کرتے ہیں تو.....“ انہم برتن اٹھاتے ہوئے بول رہی تھیں۔ ”ہماری زندگی میں گرہ بن جاتی ہے۔“
صدیقہ کے لیے جیسے پوری دنیا ٹھہر گئی۔

دروازے پہ پہل ہوئی تو نماز کے لیے جاتی ایشل نے گھڑی پہ وقت دیکھا۔ دوپہر کے دو بج رہے تھے۔ اس کا منہ فوراً پھول کر کھل گیا۔ اس وقت عقیلہ باجی کے سوا بھلا کون آ سکتا تھا۔ اسکول سے بچوں کو ساتھ لیے یہیں آ گئی ہوں گی۔ یہ ان کا ہر ہفتے میں لگائے جانے والا دوسرا چکر تھا جس کے بنا وہ رہ نہیں سکتی تھیں۔ اس نے تو اس دن سالن بھی نہیں بنایا تھا کہ ایک دن پہلے کا سالن اس کے کھانے کے لیے موجود تھا اور ایسی فونی پہ گئی ہوئی تھیں، ان کی واپسی رات میں ہی ممکن تھی۔ اب وہ باجی کو کیا اور کہاں سے کھلائے گی جو بنا بتائے کبھی بھی نازل ہو جاتی تھیں۔ انہی سوچوں میں غلطیاں وہ دروازے تک پہنچی اور کنڈی کھول دی۔ باہر اس کی توقع کے عین مطابق عقیلہ باجی گود میں اشعر اور ایشل تھیں جسے کل کو لیے گھڑی تھیں۔ بجل نے اپنا اور اشعر کا بیگ بھی تھام رکھا تھا۔ اسے بڑے بٹائی، بچوں سمیت اندر داخل ہوئیں۔

”تو یہ یار تھی گری ہے۔“ اندر داخل ہوتے ہی انہوں نے بڑے کمرے کا رخ کیا اور فوراً اسے اسی کا بٹن آن کر دیا۔ ”جلدی سے ٹھنڈا سا شربت تو پلا دو۔ بچے اسکول سے آتے ہی شربت پیتے ہیں۔“ اور بچے کب کیا کرتے ہیں تو اسے یوں بھی اذہر تھا کہ وہ اٹھتے بیٹھتے یہی گھنوا رہتی تھیں۔

ایشل نے ٹھنڈے شربت سے جگ بھر کر گلاس سمیت باجی اور بچوں کے سامنے رکھا جواب اس کے بیڈ پہ براجمان ہو چکے تھے اور اسے اب اپنے لیے نیچے میزٹس بچھانا تھا۔ کمرے میں ان کے آتے ہی جا بجا سامان بکھر چکا تھا۔ کہیں بچوں کا تبدیل کیا گیا یونی فارم پڑا تھا، کہیں بیگ، کہیں جوتے تو کہیں باجی کا سامان اور اس کے کمرے کی ہر چیز الگ، جواب اپنی جگہ سے ہٹ کر کسی اور جگہ پہنچ چکی تھی۔ اس کا منہ بننا ہی تھا لیکن کہا کچھ نہیں۔ چپ چاپ بھرا سامان بکھرا رہنے دیا کہ اٹھانے کا فائدہ ہی کیا تھا۔ کچھ دیر بعد پھر سے وہی حالت تھی تو ہو جانا تھی۔ اس کی طبیعت رات سے ناساز تھی اسی لیے وہ اسکول نہیں جا سکی تھی۔ صبح ہی اس نے

سارے کمرے کی سیٹنگ کی تھی اور اب پہلے سے بھی زیادہ ابتر حالت پیش کر رہا تھا۔ اب اتنی ہمت نہیں تھی کہ سارا پھیلوا دھیر سے بیٹھنے۔ وہ نماز کے لیے چلی گئی۔ نماز پڑھ کر لوٹی تو باجی دیے ہی لپٹی تھیں۔

”ابھی روٹی بناؤ گی تو ہم تینوں کے لیے دو روٹی بنا دینا۔“ ظاہر تھا اسے ہی روٹی بنانا تھی کہ وہ تو میکے آ کر بل تک پانی بھی پی لیتیں تو یوں گنوا تیں کہ جیسے پانی کولر سے نہیں، کنویں سے نکال کر پیا ہو۔

”روٹی تو میں بنا دوں لیکن سالن کا کیا کروں۔ ایک ہی بندے کے کھانے کا سالن فرخ میں پڑا ہے۔“

”توانڈے بنا دو۔ اس میں کیا ہے۔“

”ہے تو کچھ نہیں مگر آب آنے سے پہلے بتا دیتیں تو زیادہ اچھا ہوتا کہ میں کچھ بنا ہی دیتی۔“ اس کے اتنا کہنے کی دیر تھی کہ بس پھر تو عقیلہ باجی کو جو آگ لگی۔ فوراً سے بولنے لگیں۔

”ہاں بندہ اپنے بیٹے آتے ہوئے بھی سو سو بار سوچا کرے تاکہ جانے یا نہیں۔ لوگوں کی بیٹیاں کتنے کتنے دن آ کر رہتی ہیں، میں تو بیٹے میں ایک یا دو بار چند گھنٹے کے لیے آتی ہوں تو بھی ہلکتی ہوں تم لوگوں کو۔“

ایشل انہیں کھولتا اور بولتا ہوا چھوڑ کر چکن میں چلی آئی کیونکہ ان سے بحث کرنا بے کار تھا اگر وہ کسی بہرے کے کان میں سرگوشیاں کر لیتی تو وہ بھی سن کر سمجھ جاتا۔ اب وہ شام تک تو کیا اگلے دن کی تک یونہی اس پہ بولتی رہیں گی کہ وہ بد اخلاق ہے، ان کا آنا اسے ناگوار لگتا ہے، اس گھر کو اپنی ملکیت سمجھتے ہوئے حکومت کرتی ہے۔

☆☆☆

تو بات یہ تھی کہ عقیلہ باجی یوں تو اپنے سارے کاموں میں بڑی ماہر اور کھڑ تھیں لیکن بس اپنے گھر کی حد تک۔ اپنے میکے میں وہ یوں پھوہڑ بن جاتیں جیسے صفائی تھرائی کے قریب سے کبھی بھی ان کا گزر نہ ہوا ہو، جیسے کھانا پکانا جس چیز کا نام ہے وہ جانتی ہی نہ ہوں۔ وہ جب بھی آتیں اپنے ساتھ گھر کی تباہی لاتیں۔ جو کھانا، چدر کھانا برتن ادھر ہی پڑا رہے دیا۔ ساتھ ساتھ ایشل کو علم جاری کہ یہ یوں کر دروازہ دیر سے کیسے کر دو۔ کام کاج میں

ماں بہن کا کبھی ہاتھ نہیں بٹاتی تھیں بھلے کتنی ہی مجبوری بن جاتی۔ بچے جیسے جیسے چیزیں بھراتے جاتے اور کبھی جو عقیلہ باجی کو تو قیق ہوئی ہو کہ انہیں سمیٹ دیں۔ ان کے جانے کے بعد سارے گھر کا نقشہ ایشل اور امی کو مل کر درست کرنا پڑتا۔ پھر ہر کام میں ٹانگ اڑانا کہ یہ کام ایسے کیوں کیا گیا ہے، یہ چیزیں یہاں کیوں رکھ دی، فلاں کام کرنے سے پہلے ان سے اور ان کے شوہر سے کیوں مشورہ نہ کیا گیا، فلاں کام کے وقت انہیں کیوں ساتھ نہ لے جایا گیا۔

وہ اسی پہ ہی اکتفا نہیں کرتی تھیں، ایشل کی الماری حند کھول کر اپنی مرضی کے جوتے نکالے، جیولری نکالی، میک اپ نکالا، بغیر اجازت لیے اور یہ جاوہ جا۔ وہ بھاری بھر جسامت کی مالک تھیں، ایشل اور ان کی جسمانی ساخت میں فرق تھا ورنہ تو وہ اس کے کپڑے بھی لے جاتیں۔ اپنے بھدے پاؤں اس کے نازک جوتے میں جب پھنسا تیں تو اس کا ہر جوتا کھل جاتا اور پہننے پہ پاؤں سے نکلتا ہی رہتا۔ ایشل جب انہیں کھڑی کھڑی سنانے کا سوچتی تب تب مشال اسے روک دیتی۔

”شادی شدہ بہن ہیں۔ یوں باتیں سنانا اچھا نہیں لگتا۔“

”یا تو وہ خود کو مہمان سمجھیں اور گھر کی ہر چیز پہ حق سمجھنا، ہر بات میں ٹانگ اڑانا بند کریں۔ یا پھر بہن سمجھتی ہیں تو بہنوں کی طرح آئیں اور اس گھر کو اپنا سمجھتے ہوئے کم از کم اور نہیں تو اپنے بچوں کے کام کو نبھانا جایا کریں۔ امی سے کام کروانے کے بجائے ان کا کام کر جایا کریں۔ لیکن وہ دونوں صورتوں میں سے کسی ایک پہ بھی عمل نہیں کرتیں۔ جہاں اپنا مفاد دکھا بیٹی بن گئیں اور جہاں فائدہ نظر آتا تو مہمان۔“

”اب کیا سمجھایا جائے انہیں۔۔۔۔۔۔“

”سمجھتی سب ہیں بس کرتی نہیں ہیں۔ اپنے گھر کو تو ایسے سنا سورا کر رکھا ہوا ہے۔ کبھی جو کوئی چیز ادھر سے ادھر ہو جائے۔ بس سارا گند، مچانا ادھر آ کر یاد آتا ہے۔ تم بھی تو اب شادی شدہ ہو۔ کبھی بکھار آتی

ہو پھر بھی اتنے کام کرواتی ہو۔“

مشال جس کی حال ہی میں شادی ہوئی تھی تاسف سے سر ہلا کر رہ گئی۔ وہ شادی سے پہلے اور شادی کے بعد ہمیشہ چھوٹی، بہن کو سمجھاتی ہی رہی تھی کہ باجی کی حرکتوں کو نظر انداز کر دیا کرے لیکن دل سے وہ بھی اسی بات کی قائل تھی کہ ان کی حرکتیں کبھی بکھار نظر انداز کیے جانے کا قابل نہیں ہوتی تھیں۔

”اچھا اس بار میں آؤں گی تو ان کے سامنے کام کروں گی۔ ہو سکتا ہے کہ انہیں احساس ہو جائے اور وہ اپنا رویہ درست کر لیں۔“ لیکن ایشل کو ایسی کوئی امید نہیں تھی۔ اس کی یہ بہن کچھ زیادہ ہی خوش گمان تھی۔

☆☆☆

اگلی بار مشال میکے رہنے کے لیے آئی تو عقیلہ باجی بھی اس کے آنے کا سن کر آ گئیں۔ یوں تو مشال کا سسرال اسی شہر میں تھا لیکن وہ مہینے میں ایک آدھ بار ہی رہنے کے لیے آیا کرتی تھیں۔ عقیلہ باجی تو سسرال کے ساتھ رہتی نہ تھیں اس لیے آئے دن بن بلائے، بن بتائے آدھمکتیں۔

مشال جواب کی بار بار قیڑہ قیڑہ ماہ بعد میکے آ رہی تھی آتے ہی کاموں میں لگ جاتی، کھانے میں بیٹھا بنا کے رکھ دیا، امی مٹر پلاؤ بنا رہی تھیں تو اس نے آلو کے ٹکس ساتھ میں بنانا شروع کر دیے۔ صبح کے پڑے سارے برتن دھوئے اور بیٹھے۔ امی کو اس کے آنے سے بڑی تسلی ہو جاتی تھی کہ ایشل تو نوکری کی غرض سے اسکول گئی ہوئی اور دوپہر میں لوٹی تھی۔

رات تک وہ امی کے ساتھ بے شمار کام کروا چکی تھی۔ عقیلہ باجی دیکھ کر کبھی ایسی بنی رہیں کہ جیسے کچھ نظر نہ آتا ہو۔ رات میں صمیر بھائی عقیلہ باجی کو آ کر لے گئے تھے۔ اور وہ رات وہیں رک گئی تھی۔

”اب بتاؤ کوئی فرق پڑا باجی کو۔ کسی ڈھیٹ بنی بیٹی رہیں اور تمہیں لگا تھا کہ انہیں شرم آئے گی۔ احساس ہو گا مگر ایسا کوئی جذبہ انہیں چھو کر بھی نہیں گزرا۔“ مشال خاموش رہی تھی۔ ایشل اپنی جگہ ٹھیک تھی۔

☆☆☆

”ایک مصیبت بن جاتی ہے جب بھی آتی ہے۔ جہاں کھائے گی وہیں پلیٹ چھوڑ جائے گی، پانی پیے گی تو گلاس وہیں۔ میرے سے پوچھے بنا میرے دراز کھول کھول کر تلاشیاں لیتی ہے پھر جو چیز پسند آئے فوراً رکھ لے گی کہ بھابھی میں یہ لے رہی ہوں۔ اتنے اتنے دن آکر رہتی ہے مگر مجال ہے کہ گھر کا کوئی کام کر دے الٹا میں ہی سارا وقت چیزیں سمیٹتی رہتی ہوں بھاگ بھاگ کر۔“ اس روز وہ مشال سے فون پر اپنی چھوٹی نند کے دکھڑے رورہی تھیں جو ان کی طرف آئی ہوئی تھی۔

”تو آپ اسے پیار سے سہا دیا کریں۔“

”سمجھتی سب ہے، جان کر کرتی ہے۔ بھائی کے گھر آئی ہوئی ہے نا تو بھابھی مل گئی تو کرائی وہ بھی مفت کی۔“ مشال نے ایک پل لگایا فیصلہ کرنے میں اور ہمت کر کے بول پڑی۔

”وہ تو چلیں بھائی کے گھر آئی ہوئی ہے، بھابھی کو تو کرائی سمجھتی ہے لیکن آپ تو ماں کی طرف جا کر بہن اور ماں کو تو کرائی سمجھتی ہیں۔“

”کیا مطلب ہے؟ میں نے ایسا کیا کیا؟“

ایک دم ان کا لبہ ہلچل بدل گیا۔

”آپ کو نہیں پتا کہ آپ امی کی طرف جا کر کیا کرتی ہیں؟ آپ بھی تو بجائے ان کا ہاتھ بنانے کے ان کے کام بڑھا دیتی ہیں..... اور کچھ نہ سمجھ اپنے بچوں کی چیزیں ہی سمیٹ دیا کریں۔ بغیر پوچھے ایٹل کی چیزیں استعمال کے لیے لے جاتی ہیں اور ناقابل استعمال حالت میں لوٹاتی ہیں۔ جب آپ یہ سب کرتی ہیں اور آپ کو یہ سب جائز ہے تو جب یہی آپ کے ساتھ ہوتا ہے تو آپ مظلوم کیوں بن جاتی ہیں۔“ کچھ دیر پہلے جن باتوں پر وہ کسی کی شکایتیں کر رہی تھیں، وہی باتیں جب انہیں لوٹائی گئیں تو انہیں پتہ لگ گئے۔

”تمہیں ایٹل نے کہا ہے نا سب۔ اسے تو میں ایک آنکھ نہیں بھائی۔ ہر وقت میرے اور میرے بچوں کے پیچھے پڑی رہتی ہے۔“ غصے سے ان کی

آواز بھٹنے لگی۔

”ایٹل مجھے کیوں کچھ بتاتا۔“ میں خود بھی تو دیکھتی رہی ہوں شادی سے پہلے بھی درمیان میں۔

”ہاں تو میرا میکا ہے، کٹری دو۔“ امی پل جاتی ہوں تو کیا ہو گیا۔ تم بھی تو جانی ہو، اس کی چیزیں استعمال کرتی ہو۔ تم بھی وہ بولی ہے۔ مجھ سے ہی اسے شروع سے تکلیف ہے۔“

”آپ کو یہ نظر آ گیا کہ میں جاتی ہوں تو مجھ پر وہ کیوں نہیں بولتی لیکن یہ نہیں کہ میں وہاں جا کر امی اور اس کا کتنا ہاتھ پائی ہوں۔ اس کی کوئی چیز بناؤ مجھے استعمال نہیں کرتی۔ کبھی اس سے اپنا کوئی کام نہیں کروایا۔ کسی کام میں مداخلت نہیں کی۔ کیڑے نہیں نکالے۔“

”ہاں تو کیا ہو گیا اگر یہ سب کر دیا۔ میرا بھی اس گھر یہ اس گھر کی چیزوں پر حق ہے۔ بیٹی ہوں میں بھی اس گھر کی۔“

”بیٹی ہیں تو بیٹی بن کر بھی دکھائیں نا باجی۔ حق جتنا آپ کو یاد رہتا ہے فرائض کیوں یاد نہیں رہتے؟ بیٹیاں بھلے بیابانی ہی کیوں نہ ہوں، ان کے فرائض ماں باپ کی طرف سے ختم تو نہیں ہو جاتے۔ کبھی امی کو مدد نہیں کی، کبھی کسی کام میں دلچسپی نہیں لی۔ بس گلے شکوے کرنا یاد رہتا ہے آپ کو۔ اگر آپ یہ سب کرنا اپنا حق سمجھتی ہیں تو پھر آپ کی نند کا بھی حق ہے یہ سب کرنے کا اور آپ کو پھر کوئی حق نہیں ہے اس کے رونے، رونے کا۔“

عقلیہ باجی نے فون بند کر دیا تھا لیکن وہ باجی کی باتوں پر سوچ رہی تھی کہ ہر بندے سے اس کے فرائض کا سوال ہوتا ہے۔ لیکن اپنے فرائض پہ نظر ڈالنے کے بجائے ہم اپنے حقوق پہ نظر رکھتے ہیں اور دوسرے سے چاہتے ہیں کہ وہ اپنے فرائض پورے کرے۔ کاش کہ یہ بات ہم نسب کی سمجھ میں آ جائے کہ جو زیادتی ہم کسی کے ساتھ کرتے ہیں وہ کہیں نہ کہیں سے پلٹ کر ہمارے پاس ہی لوٹ آتی ہے۔

☆☆

دنیاوی اور اخروی زندگی

☆ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے خریدی ہے دنیاوی زندگی آخرت کے بدلے۔ لہذا نہ تو کسی کی جائے گی ان کے عذاب میں اور نہ ان کو کوئی مدد پہنچے گی۔ (سورۃ البقرہ آیت نمبر ۸۶)

☆ جو شخص ہے طلب گار آخرت کی کھیتی کا اضافہ کریں گے ہم اس کے لیے، اس کی کھیتی میں اور جو ہے چاہنے والا دنیا کی کھیتی کا دیتے ہیں ہم اسے اسی میں سے اور نہیں ہے اس کے لیے آخرت میں کوئی حصہ۔ (سورۃ الشوریٰ آیت نمبر ۲۰)

☆ اللہ فراخی دیتا ہے رزق میں جسے چاہے اور نپا تلا دیتا ہے (جسے چاہے) اور ممکن ہیں یہ دنیاوی زندگی میں اور نہیں ہے دنیاوی زندگی آخرت کے مقابلہ میں مگر ایک حق فائدہ (سورۃ الرعد آیت نمبر ۲۶)



حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”جس قوم میں غاشی کو ایسا فروغ ہوتا ہے کہ کھلم کھلا بے حیائی ہونے لگے تو ان میں طاعون کی وبا پھوٹتی ہے، اور ایسے ایسے درد پیدا ہوتے ہیں جو ان کے اسلاف میں نہیں تھے اور جو قوم ناپ تول میں کمی کرتی ہے، اسے قحط اور سخت مشکلات میں مبتلا کر دیا جاتا ہے اور ان کے حکمران ان پر ظلم توڑتے ہیں اور جو قوم اپنے مال کی زکوٰۃ ادا نہیں کرتی اس پر آسمان سے بارش بند کر دی جاتی ہے اور اگر چوپائے نہ ہوں تو ان پر بھی بارش نہ ہو، اور جو قوم اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کیے ہوئے عہد کو توڑتی ہے، اللہ تعالیٰ غیروں میں سے اس پر دشمن مسلط کر دیتا ہے جو ان کے ہاتھ کی پوٹی چھین لیتا ہے اور جب بھی کسی قوم کے حکام اللہ کی کتاب کے

شعاع عیبر



مطابق فیصلہ نہیں کرتے اور اللہ کے نازل کیے ہوئے احکام میں تردد کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کے درمیان خانہ جنگی پیدا کر دیتا ہے۔“ (ابوداؤد ماجہ، ترمذی ص ۳۲۱ ج ۲)

خلفاء راشدین

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے علم و تقویٰ کی دولت حاصل کرنے کے لیے بہت سی جماعتیں حاضر ہوئیں، ان میں ایک باوجہ ت خاص بھی موجود تھا جس نے سر پر سفید عمامہ باندھا ہوا تھا۔

اس نے سوال کیا۔ ”اے امیر المؤمنین! ہم آپ رضی اللہ عنہ کو خطبہ میں یہ کہتے ہوئے سنتے ہیں کہ ”اے اللہ! ہماری بھی اسی طرح اصلاح فرما جس طرح آپ نے خلفاء راشدین کی اصلاح فرمائی، ذرا بتائیے وہ کون تھے۔“

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں، ارشاد فرمایا: وہ دونوں میرے حبیب، ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہم ہیں، جو ہدایات کے امام اور اسلام کے شیخ ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد ان کی اقتداء کی جانی ہے۔ جو شخص ان کے اقتداء کرے گا محفوظ رہے گا اور جو ان کے نقش پا کی پیروی کرے گا اسے صراطِ مستقیم کی ہدایت حاصل ہوگی اور جو شخص ان کو مضبوطی سے تھام لے وہ اللہ کے گردہ میں سے ہے۔ (تاریخ الخلفاء..... ص ۲۸۵)

جواہر پارے

1- سمجھوتے میں زیر دستی کا عنصر ہوتا ہے۔ مان لینے کی کیفیت نہیں ہوتی سب کچھ جانتے ہوئے

سمجھوتا کرنا بڑا کرب ناک ہے مگر ماننے کے لیے جانا ضروری نہیں ہوتا۔

2- جو شخص زمین کا سفر کرتا ہے اس کے پاؤں میں آبلے پڑتے ہیں۔ اور جو آسمان کا سفر کرتا ہے اس کے دل میں آبلے پڑتے ہیں۔

3- بعض لوگوں کی زندگی میں اگر غم آجائیں تو قہقہوں میں شدت آجاتی ہے۔ کبھی شعوری طور پر کبھی لاشعوری طور پر۔

4- خوشی زیادہ ہو تو اسے سنبھالنا منہ زور گھوڑے کو سنبھالنے جیسا ہوتا ہے جو سب سے نہیں سنبھلتا۔

5- بڑا قدر کے گئے کام اور اس کے معیار سے ہوتا ہے۔ سمجھ کا تعلق عمر سے نہیں احساس سے ہوتا ہے۔

فوزیہ شربت..... مہجرات

باپ کا بیٹے کے نام خط

پیارے بیٹے! السلام علیکم۔ اگر تمہارا یہ خیال ہے کہ تمہارے ابو، امی اور بچہ تمہارے ساتھ ہمیشہ خوشی کرتے رہے ہیں اور اب تمہارے پاس کاروبار بھی بہت سخت ہے تو چند مہینے اور انتظار کر لو۔ ہم نے تمہاری شادی طے کر دی ہے۔ بیوی کے آتے ہی تمہیں ہم سب کی صحیح قدر معلوم ہو جائے گی۔

لفظ آپ کا غم گسار ابو
سمرت طارق..... مظفر آباد

اقوال خواتین

”میری زندگی میں ایسے لوگوں کو شامل نہ کریں جو آپ کو نیچے کی طرف لے جانے کا سبب بن رہے ہوں، اپنے وجدان پر بھروسہ رکھیں..... اچھے تعلقات اچھا احساس دلاتے ہیں، وہ دردناک نہیں ہوتے۔“ (مشعل اوباما)

”میں نے زندگی کے کئی سالوں سے یہی سیکھا

ہے کہ جب ذہن کسی بھی کام کے لیے تیار ہو جائے تو ذہن سے خوف خود بخود کم ہو جاتا ہے۔ جو کام ضرور کرنا ہوا ہے ڈر کے بغیر کرنا چاہیے۔“ (روز اپارکس)

”میں سمجھتی ہوں کہ جولائی خود پیسے کمانے اور ادا کرنے کے قابل ہو، اسے ایسے ہی خوش ہونا چاہیے جیسا کہ کوئی بھی شخص دنیا میں خوش ہوتا ہے۔ آزادی اور سلامتی کا احساس ہی بہت پیارا ہوتا ہے۔“ (سوہن بی انھونی)

”سوال یہ نہیں ہے کہ کون مجھے کام کرنے دے رہا ہے بلکہ یہ ہے کہ کون مجھے کام کرنے سے روک رہا ہے۔“ (آمین رائے)

سحر تبسم سحری..... مغل پورہ

غلاف

کعبے کا غلاف اس لیے کہ پتا چلے: یہ کوئی عام گھر نہیں اللہ کا گھر ہے۔

قرآن یہ غلاف اس لیے کہ پتا چلے: یہ کوئی عام کتاب نہیں اللہ کی کتاب ہے۔

عورت کا حجاب اس لیے کہ پتا چلے: یہ کوئی عام عورت نہیں مسلمان عورت ہے۔

(تبسم بشر حسین۔ ڈنگلہ)

اسطان باہو

اندر نکلے قل قل کردا عشق سکھایا کلمہ ہو چوداں طبق کلمے دے اندر قرآن کتاباں علماں ہو کانے کپ کے قلم ہتاواں لکھ نہ سکنا قلمناں ہو کلمہ جید پڑھایا یا ہو ذرا نہ رہیاں الماں ہو

بڑے لوگوں کی بڑی باتیں

☆ طبیب کی غلطی ایک دو انسان ہی مارتی ہے لیکن حکمران کی غلطیاں پورے ملک و قوم کو برباد کر دیتی ہیں۔ (افلاطون)

☆ جو آدمی ارادہ کر سکتا ہے اس کے لیے کچھ بھی ناممکن نہیں۔ (جیفرسن)

☆ میں ان سب لوگوں کا شکر گزار ہوں جنہوں نے میری مدد نہیں کی آج انہی کی بدولت میں نے سب خود کیا۔ (آن اسٹائن)

☆ تمہاری اصل ہستی تمہاری سوچ ہے، باقی تو صرف ہڈیاں اور خالی گوشت ہے۔ (مولانا جلال الدین رومی)

☆ اگر روزی کا انھار عقل مندی پر ہوتا تو دنیا کے بے وقوف بھوکے مر جاتے۔ (شیخ سعدی)

گائیں چو ہدری گل..... مہجرات

شکوئے

☆ آم، اسامیٹھی، شربٹ اور خستہ پیٹیز کھانے کا مہذب طریقہ ابھی تک ایجاد نہیں ہوا۔

(مشتاق احمد یوسفی)

☆ مہجرات اور بکھ رکھاؤ کی بھی لکھی اذیت ناک ذمہ داریاں ہوتی ہیں کہ انسان جو کرنا چاہے نہ کر سکے ضبط کر کے بیٹھا رہے (مستنصر حسین تارڑ)

☆ یہ نئی نسل نہایت ناخلف اور نالائق ہے بدراہی کی حرکتیں خود کرتی ہے اور ذمہ دار والدین کو ٹھہرائی ہے۔ کار بد تو خود کریں لعنت کریں شیطان پر۔ (ابن انشاء)

☆ ہر لڑکی کو کسی نہ کسی طرح یہ یاد کرادو کہ وہ بے حد حسین ہے۔ اس کے بعد وہ بقیہ جھوٹ بھی بچ مان لے گی۔ (شفیق الرحمان)

☆ کہنے لگے یوسفی۔ ”یہ بتاؤ عورت کی کشش اور زمین کی کشش میں کیا فرق ہے؟“

عرض کی ”کچھ خاص نہیں، دونوں ہی آدمی کو خاک میں ملا دیتی ہیں۔“

(صدف سمیع..... کراچی)

سلسلہ گفتار

کوفہ کے باشندوں نے خلیفہ مامون الرشید کے

پاس گورنر کی شکایت کی اور کہا کہ اس کا تبادلہ کر دیتے۔ مامون نے حیران ہو کر کہا۔ ”میں سمجھتا ہوں میرے گورنروں میں اس سے زیادہ عادل اور راست باز کوئی نہیں۔“

اس پر ایک شخص بولا۔ ”امیر المؤمنین! اگر ہمارا گورنر واقعی ایسا ہے تو آپ کو اہل ملک کے ساتھ انصاف کرنا چاہیے اور تھوڑے تھوڑے عرصے کے لیے اس سے ہر شے کو مستفید کرنا چاہیے۔ اگر ایسا کریں گے، تب بھی کوفہ کے حصے میں اس کے تین سال سے زائد نہیں آئیں گے۔“ مامون اس بات پر ہنس پڑا اور حاکم کا تبادلہ کر دیا۔

اسی طرح ایک اور شخص مامون کو راستے میں ملا اور کہنے لگا۔ ”میں ایک عرب ہوں۔“

”یہ کوئی عجیب بات نہیں۔“ مامون نے کہا۔ ”میں حج کرنا چاہتا ہوں۔“ وہ شخص بولا۔

”راستہ سامنے ہے، چلے جاؤ۔“ مامون نے جواب دیا۔

”میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔“ وہ کہنے لگا۔ ”پھر تو تمہیں فرس نہیں رہا۔“ مامون نے کہا۔

اس پر اس شخص نے برجستہ کہا۔ ”میں آپ سے فتویٰ نہیں، ہدیہ لینے آیا ہوں۔“

مامون ہنس پڑا اور اسے انعام سے نوازا دیا۔ (شامشہاد..... کراچی)

انکشاف

نہ وعدہ ہے کوئی تم سے، کوئی رشہ بھانے کا نہ کوئی اور ہی دل میں تہیہ یا ارادہ ہے! کئی دن سے مگر دل میں عجیب الجھن سی رہتی ہے! نہ تم اس داستان کے سرسری کردار ہو کوئی نہ قصہ اتنا سادہ ہے! تعلق جو میں سمجھا تھا کہیں اس سے زیادہ ہے!

☆☆

شام کی چائے

خالدہ جیلانی



عید اور پھر عید کے بعد کی مصروفیات کے بعد اب کہیں جا کر کچھ فراغت ملی ہوگی۔ تو کیوں نہ آج شام کی چائے کے ساتھ کچھ ہلکا ہلکا سا اہتمام کر لیا جائے۔ تو لیجیے، اہتمام کے لیے تراکیب حاضر ہیں۔ جھٹ جھٹ بنائیں اور اہل خانہ کے ساتھ مل کر بیٹھ خوب لطف اندوز ہوں۔

چکن فلیٹ رول

اشیاء:	چکن
(سینے کا پیس) آدھا کلو	نمک
ایک چائے کا چمچ	سرخ مرچ
ایک چائے کا چمچ	سفید زبرہ پاؤڈر
ایک چائے کا چمچ	لیموں کا رس
چار کھانے کے چمچے	شملہ مرچ
دو عدد	ہری پیاز
دو عدد	ٹماٹر
دو عدد	پراٹھے
چار عدد	گارلگ سوس
حسب ضرورت	مایونیز
آدھا کپ	ترکیب:

چکن دو حصوں میں کاٹ لیں۔ پھر اس میں لیموں کا رس، نمک، سرخ مرچ اور زبرہ کس کر کے 30 منٹ کے لیے میری میٹ کر لیں۔ ایک پٹیلی میں چکن فرائی کریں، جب براؤن ہو جائے، تو اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر لیں۔ اب پیاز، شملہ مرچ اور ٹماٹر (ان دونوں اجزاء کے چھ نکال دیں) لمبائی میں کاٹ لیں۔ جس پیالے میں چکن میری میٹ کی تھی، اسی میں چکن، ہنری، مایونیز ڈال کر اچھی طرح

وہجی ٹیل رول

رول پٹیاں	دو درجن
گاجر	دو عدد
شملہ مرچ	دو عدد
ہری پیاز	چار عدد
نوڈلز (پال لیں)	ایک کپ
بند گوشتی (کٹی ہوئی)	ایک کپ
کالی مرچ	ایک چائے کا چمچ
سرکہ	دو کھانے کے چمچے
سویا سوس	دو کھانے کے چمچے
کارن فلوور	دو کھانے کے چمچے
انڈے (صرف سفیدی)	دو عدد
پھینٹ لین)	تیل
حسب ضرورت	حسب ضرورت

ترکیب: بند گوشتی، گاجر، شملہ مرچ اور پیاز باریک کاٹ کر فرائی کر کے الگ باؤل میں نکال لیں اور اس میں نمک، کالی مرچ اور نوڈلز ڈال کر اچھی طرح کس کر لیں۔ اب اس آمیزے کو رول پیٹوں میں بھر کر، کنارے انڈے کی سفیدی سے بند کر دیں۔ گرم تیل میں فرائی کر کے تازہ، خستہ رولز گھروالوں کو کھلائیں اور خود بھی کھائیں۔

☆☆

بشری محمد



بر بادلوں کا سوگ منانا فضل تھا
بر بادلوں کا جشن منانا چلا گیا

جو مل گیا اسی کو مقدم سمجھ لیا
جو کھو گیا میں اس کو بھلاتا چلا گیا

غم اور خوشی میں فرق نہ محسوس ہو جہاں
میں دل کو اس مقام پہ لاتا چلا گیا

سیدہ لوبا سجاد کی ڈائری میں تحریر
مینر سبازی کی غزل

عم کی بارش نے بھی تیرے نقش کو دھویا نہیں
تو نے مجھے کھو دیا، میں نے تجھے کھو یا نہیں

نیند کا ہلکا گلابی سا خمار آنکھوں میں تھا
یوں لگا وہ شب کو دیر تک سویا نہیں

ہر طرف دیوار و دروازوں میں آنکھوں کے بھوم
کہہ سکے جو دل کی حالت وہ لب کو یا نہیں

جرم آدم نے کیا اور نسل آدم کو سزا
کاٹتا ہوں زندگی بھر، میں نے جو بھو یا نہیں

جاننا ہوں ایک ایسے شخص کو میں بھی مینر
غم سے بھر ہو گیا، لیکن کبھی دھویا نہیں

انوش البصار کی ڈائری میں تحریر
پروین شاکر کی غزل

کیا کرے میری مسیحتی بھی کرنے والا
زخم بھی یہ مجھے لگتا نہیں بھرنے والا

زندگی سے کسی سمجھوتے کے باوصف اب تک
یاد آتا ہے کوئی مارنے، مرنے والا

اس میں کو بھی تیرے کو بے یں گزار آئے ہیں
زندگی میں وہ جو لمحہ عطا سنورنے والا

اس کا انداز سخن سب سے جدا تھا شاید
بات لگتی ہوئی، لہجہ وہ ٹھکرتے والا

شام ہونے کو ہے اور آنکھ میں اک خواب نہیں
کوئی اس گھر میں نہیں رو سکتی کرنے والا

دسترس میں ہیں عناصر کے ارادے کس کے
سو بکھر کے ہی رہا کوئی بکھرنے والا

اس امید پہ ہر شام بھلاتے ہیں چراغ
ایک تار اہلے سربام آ بھرنے والا

سلیم رب نواز کی ڈائری میں تحریر
ساحر حبیب لوی کی غزل

میں زندگی کا ساتھ نہ بھاتا چلا گیا
ہر فکر کو دھوئیں میں اڑاتا چلا گیا

امن عالم کی ڈائری میں تحریر
صوفی بزم کی نظم
اپنی جاں نظر کروں، اپنی وفا پیش کروں
قوم کے مرد مجاہد تجھے کیا پیش کروں

لباب راجپوت، کی ڈائری میں تحریر
عبد اللہ سلیم کی غزل
کچھ دن تو بسو میری آنکھوں میں
نہر خواب اگر ہو جاؤ تو کیا

تو نے دشمن کو جلا ڈالا ہے شعلہ بن کے
اُجھڑا ہر گام پہ تو فح کا نعرہ بن کے
اس نجات کا تجھے کیا میں صلہ پیش کروں
عر بھر تجھ پہ خدا اپنی عنایت رکھے
تیری جرات، تیری عظمت کو لادے
جذبہ شوق شہادت کی دُعا پیش کروں
دل میں پیدا کیا اک جذبہ تازہ تو نے
میرے گیتوں کو نیا حوصلہ بخشا تو نے
کیوں نہ تجھ کو اپنی گیتوں کی نو پیش کروں
اپنی جاں نظر کروں، اپنی وفا پیش کروں
قوم کے مرد مجاہد تجھے کیا پیش کروں

کوئی رنگ تو دو میرے چہرے کو
پھر زخم اگر مہکاؤ تو کیا
جب ہم بھی نہ ہیکے پھر صاحب
تم بادِ کلبا کہلاؤ تو کیا
اک آئینہ تھا سو ٹوٹ گیا
اب خود سے اگر شراؤ تو کیا
تم آس بندھانے والے تھے
اب تم بھی ہمیں ٹھکراؤ تو کیا

شہساز فرزانہ کی ڈائری میں تحریر
فرحت عباس شاہ کی غزل
گردِ عجب کوئی چہرہ ہے تو دعا کے حوالے کیا
جا تجھے آج سے، تم نے اپنے خدا کے حوالے کیا

دُنیا بھی وہی اور تم بھی وہی
پھر تم سے آس لگاؤ تو کیا
میں تنہا تھا میں تنہا ہوں
تم آؤ تو کیا نہ آؤ تو کیا

ایک مدت ہوئی ہم نے دنیا کی ہاک مذہب چھوڑ دی
ایک مدت ہوئی ہم نے دل کو دھلکے حوالے کیا
اس طرح ہم نے تیری محنت زلزلے کے ہاتھوں میں
جس طرح گل نے خوشبو کو بادِ مصل کے حوالے کیا

جب دیکھنے والا کوئی نہیں
تجھ جاؤ تو کیا کہناؤ تو کیا
اک وہم ہے یہ دُنیا اس میں
کچھ کھوؤ تو کیا اور پاؤ تو کیا

یہ بس سی عجب زندگی میں اک
ہم نے چپ چاپ ہاتھوں کو دمِ حنک کے حوالے کیا
خون نے تیری یادیں سلگی ہوئی رات کو تیرے
آنسوؤں نے ترا دہ روگھی سول کے حوالے کیا

ہے یوں بھی زیاں اور یوں بھی زیاں
جی جاؤ تو کیا مر جاؤ تو کیا

شکستہ سیلاب



مائمہ سحر فیصل آباد
ابھی سے تھکنے لگے ہاتھ میرے رفوگر کے
ابھی تو جاگ میرے زخم کے پلے بھی نہیں
خنا کرن
زلمنے والوں سے چپ کر دینے کے دن نہیں ہیں
اے کہنا داس ہونے کے دن نہیں ہیں
میں جان سکتی ہوں وصل میں اصل تھک گیا ہے
مگر حقیقت شناس ہونے کے دن نہیں ہیں
شکستہ رانی
مجھے تھکاؤ مگر پھر بھی بکھر گیا محسن
وہ یزہ یزہ تھا مگر اپنے اختیار میں تھا
مالیہ خان اسلام آباد
ٹوٹا کئے نہ کسی روز وہ آوارہ مزار
کھول رکھتے ہیں اسی اس پہ در شام کے بعد
تو ہے سورج تجھے معلوم کہاں رات کا دکھ
تو کسی روز میرے گھر میں آرزو شام کے بعد
اساد کریم
زرد چہروں کی کتابیں ہیں کتنی فضول
ترجمے ان کے جہاں بھر کی کتابوں میں ملے
حننگ
رضیہ، رضوانہ شہر کورٹ
دُھوپ میں سایہ دلپاز سے ڈرجا ہوں
اُس سے ملتا ہوں تو کچھ اور کچھ ملتا ہوں
جس کی آنکھوں نے میرے عکس پہن رکھے ہیں
خود سے ملتا ہوں تو اُس شخص کے گھر جاتا ہوں
سرت طارق
رقائق سے مرا ہوں مسافروں سے نہیں
سفر ہی تھے مگر ہمسفر نہ تھے ایسے

شکستہ سیلاب
نہ کبھی تیرے غم کی سرداری
دل میں یوں روز انقلاب آئے
کر رہا تھا غم جہاں کا حساب
آج غم یاد ہے حساب آئے
اسیلا
عجبت میں ذرا سی بے وفائی مزدوری ہے
وہی اچھا بھی لگتا ہے جو دہرے توڑ دیتا ہے
یاسین ملک کراچی
بہت بڑھ چلا ہوں سستا تو لیں گے بل دیوں
اُلجھ گیا کہیں دامن تو کیوں چھڑائیں گے ہم
مصدق خان لاہور
بس جان گیا میں تری پہچان یہی ہے
ٹوٹل میں تو آتا ہے سمجھ میں نہیں آتا
انوش ایثار قائد اعظم روڈ
چلا تو ہوں ایک منزل خوش خبر کی جانب
عجب نہیں یہ سفر بھی ہونا تمام میرا
دلوں کو تاراج کرنے آ رہا تھا حنک سے
پلٹ گیا عجب کو دیکھ کر خوش خرام میرا
نورنا طرہ پورے والا
ہم ساوگی میں ٹھک گیا گئے
تم نے گرا ہوا ہی سمجھ لیا
دعا شاہد کراچی
پلے شکوہ تھا یہاں رونق بازار نہیں
اب جو بازار کھلے ہیں تو حیدر نہیں
سب کے ہاتھوں میں یہاں زہر کا پالہ ہے مگر
کوئی بچ بولنے کے واسطے متیار نہیں

موقع محل

ایک چری قبرستان میں چرس پی رہا تھا، پولیس آگئی تو چری نے چرس چھپا دی۔
پولیس: ”کیا کر رہے ہو۔“
چری: ”کچھ نہیں، اپنے والد کے لیے دعا کر رہا ہوں۔“
پولیس: ”مگر یہ تو کسی چھوٹے بچے کی قبر ہے۔“
چری: ”میرے والد بچپن میں فوت ہو گئے تھے۔“
شاکاشف..... ملتان

ووٹ

ایک بزرگ پولنگ بوتھ سے باہر نکل کر پولنگ ایجنٹ سے پوچھنے لگے۔ ”کیا میری بیوی بھی اپنا ووٹ ڈال گئی ہے؟“
اس نے لسٹ دیکھ کر بتایا ”ابھی کچھ دیر پہلے ہی ووٹ ڈال کر گئی ہیں۔“
بزرگ انہیں گے کہ ”کاش آج مل جاتی۔“
پولنگ ایجنٹ نے حیرت سے پوچھا ”کیا آپ ساتھ نہیں رہتے۔“
بزرگ نے کہا۔ ”نہیں اسے فوت ہوئے گیارہ سال ہو چکے ہیں لیکن الیکشن کے دن ووٹ ضرور ڈالتی ہے۔“
حور بن زینب..... کھرڈیکا

روتے ہیں چھم چھم نین

مجھے بوٹی ورٹی میں ایک لڑکی بہت پسند آئی مگر بات کرنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی ایک دن ایک دوست نے کہا کہ سو روپے کے نوٹ پر اپنا فون نمبر لکھ کر اسے دے دو۔
میں نے ایسا ہی کیا اور اس سے کہا۔ ”یہ آپ کا“

خودکش جیکٹ

شوہر نے بیوی سے پوچھا۔ ”میں دوسری شادی کر لوں؟“
بیوی نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”کر لو۔“
شوہر نے پھر پوچھا۔ ”تمہاری طرف سے اجازت ہے؟“

بیوی نے آرام سے کہا۔ ”کیوں نہیں۔“
شوہر نے کہا۔ ”ناراض تو نہیں ہوگی۔“
بیوی نے جواب دیا۔ ”بالکل بھی نہیں۔“
شوہر نے خوشی سے پوچھا۔ ”اچھا میری شادی والے دن کیا پہن کر آؤ گی۔“
بیوی نے سکون سے جواب دیا۔ ”خودکش جیکٹ۔“
گڑیا شاہ..... کھرڈیکا

فرق

باپ نے غصے سے بیٹے کو بولا۔ ”ایک کام نہیں ہوتا تم سے، تم کو دھیالانے کو بولا تھا اور تم پودینہ لے آئے ہو۔ تم کو دھیالانے میں فرق پتا نہیں چلتا۔ تم جیسے بے وقوف کو گھر میں رکھنے سے اچھا ہے کہ تم تو گھر سے نکل جاؤ۔“
بیٹے نے باپ سے کہا۔ ”ساتھ ہی چلے ہیں گھر سے۔“
باپ نے پوچھا۔ ”کیوں؟“
”کیونکہ امی کہہ رہی ہیں کہ یہ میٹھی ہے۔“ بیٹے نے جواب دیا۔

ام ہانی..... پاکستان شریف

شکایت

ایک صاحب کے گھر کچھ رشتہ دار ملنے آئے۔
بیوی نے بچن میں صاحب کو بلایا اور بتایا کہ گھر میں چینی نہیں ہے۔
ان صاحب نے بیوی سے کہا۔ ”پتی دودھ ہمیشہ کی طرح کم اور پانی زیادہ ڈال کر چائے بناؤ، باقی میں سنبھال لوں گا۔“
بیوی نے مہمانوں کو چائے پیش کی تو ان صاحب نے کہا۔
”اس میں سے ایک کپ میں چینی نہیں ہے وہ

جس کے حصے میں آئے گی ہم سب کل بیوی بچوں کے ساتھ اس کے گھر مہمان ہوں گے۔“
سب رشتہ داروں نے انتہائی خاموشی سے چائے پی لی اور چینی کے نہ ہونے کی شکایت نہیں کی۔
لاریب انم..... لاڑکانہ

محبت کی کہانی

محبت کا ”میم“ بھی کچھ نرالا ہے مل جائے تو ”میاں“ نہ ملے تو ”ماموں“
محبت کا ”ح“ بھی کچھ کم نہیں ہے مل جائے تو ”حقیقت“ نہ ملے تو ”حسرت“
محبت کا ”ب“ بھی کتنا نرالا ہے۔ مل جائے تو ”بیوی“ نہ ملے تو ”بابی“
محبت کا ”ت“ بھی لا جواب ہے مل جائے تو ”تقدیر“ نہ ملے تو ”توبہ“

شازیہ گزار..... بھکر

یہ عالم شوق کا

بچے کی پیدائش کے بعد ڈیلوری روم سے نکلے ایک گھنٹے بعد زچہ کو ہوش آیا۔ بدن میں طاقت بالکل ختم ہو گئی تھی..... کروٹ لینا تو دور کی بات ملنے میں بھی بے پناہ دقت ہو رہی تھی۔ اس نے بڑی مشکل سے داہنے ہاتھ کو حرکت دی۔ کچھ ٹولا، ہاتھ کو پتہ محسوس نہیں ہوا، پھر بائیں ہاتھ کو حرکت دینے کی کوشش کی کچھ نہیں ہاتھ لگا۔ بے چین ہو گئی..... دور کھڑی نرس کو اشارے سے بلایا..... ہونٹ ہلے پر کچھ الفاظ نہیں نکل سکے۔
نرس نے زچہ کی گھبراہٹ محسوس کر لی۔ اس کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں، آخر وہ بھی ماں تھی اور ماں کی تڑپ کو کیسے نہ سمجھ پائی۔ دو ڈاکٹر انکوبیٹر روم سے دوڑ کر نوزائیدہ کو لا کر ماں کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔
”میں سمجھ سکتی ہوں بہن الو..... جی بھر کے دیکھ لو۔“
زچہ اپنی تمام تر ہمت جٹا کر ہاتھ پٹیتے ہوئے پوئی۔
”میرا موبائل فون کہاں ہے میں یہ پوچھ رہی تھی!“
کشن چوہدری مل..... حیرات

محمود بابر فیصل نے یہ شگفتہ سلسلہ 1978ء میں شروع کیا تھا۔ ان کی یاد میں
یہ سوال و جواب مشائخ کی جارہے ہیں۔



میں جسے پیار کا انداز سمجھ بیٹھا ہوں
وہ تبسم، وہ تلم تری عادت ہی نہ ہو
بج۔ بالکل صحیح سمجھیں آپ، میری یہ عادت ہی
ہے۔ (تبسم اور تلم)

ریحانہ صابو کر..... ٹھٹھ
اس۔ بھیا! کیا صرف حوصلے سے انسان آگے
بڑھ سکتا ہے؟
بج۔ ہمارا یقین ہے اس پر۔

ممتاز یار محمد..... لاہور
س۔ نین جی! جن پر اعتماد ہوتا ہے، وہی لوگ
دھوکہ دے جاتے ہیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟
بج۔ اپنے ساتھ تو ابھی تک ایسا اتفاق نہیں ہوا۔
طاہرہ حمید..... حافظ آباد

س۔ گھریلو زندگی میں ضد کو ضد سے ضرب
دینے پر کیا حاصل ہوتا ہے؟
بج۔ بے سکونی۔



شاہدہ..... لاہور

س۔ اگر خوش قسمتی کا دیوتا آپ کا در کھٹکھٹاتا
رہے اور آپ مقفل کمرے میں گہری نیند کی وادیوں
میں گم رہیں تو بے داری کے بعد جب صورت حال کا
پتا چلے تو آپ کیا کریں گے؟
بج۔ مجھوں گا میری قسمت میں نہ تھا، ایسا کچھ۔

شاہدہ نورین..... رحیم یار خان
س۔ ذوالقرنین بھیا! یہ تو بتائیں کہ عورت اگر
سکون چاہے تو کیسے چلی جاتی ہے، لیکن اگر مرد سکون
چاہے تو کہاں جا سکتا ہے؟
بج۔ ہمیشہ کے لیے ملک سے باہر۔

فرزانہ سلیم..... میاں چنوں
س۔ بے یقین راستوں پر چلنے کا فائدہ؟
بج۔ یہ بڑس نہیں ہے کہ فائدہ اور نقصان دیکھا جائے۔

ام الدین سبحانی..... کراچی
س۔ انسان ہمت کب ہار بیٹھتا ہے؟
بج۔ جب مستقل نپلے پہ دہلا میں سوالوں کے
جواب دینے پڑیں۔

ساجدہ نورین..... راجن پور
س۔
تیری سانسوں کی تھکن، تیری نگاہوں کا سکوت
درحقیقت کوئی رنلین شرارت ہی نہ ہو

لہریا بنانا ہوا آتا تو اچھے اچھوں کے بیٹ ہاتھ کے
ہاتھ میں دھرے رہ جاتے۔

(مشائخ احمد یوسفی..... چراغ تلہ)
نوزیہ شربت..... گجرات

ثابت قدمی

خدا کے پاس ہمارے لیے جو کچھ ہوتا ہے،
اسے پانے کے لیے ہمیں ہمارے پاس جو ہوتا ہے،
وہ دینا ہوتا ہے۔ معجزے بھی ہماری ثابت قدمی پر ہی
ہوتے ہیں۔

(سمیر احمد..... رہ نور دوشوق)
(اقراء عزیز..... گاؤں دریا خان جالبانی)

انسانوں کی اقسام

زندگی بار بار نہیں آتی، صرف ایک بار آتی ہے
اور وقت سمندر کے کنارے پھیلی ہوئی ریت کی طرح
ہے۔ تم اس میں کتنی مٹھیاں بھر سکتے ہو ایک یا پھر دو،
وقت تو بس پچاس یا سو برس کا ہے مگر اس سے زیادہ
نہیں پھر سوچو اس ریت کو دوسروں کی آنکھوں میں جھونک
زیادہ تم اس ریت کو دوسروں کی آنکھوں میں جھونک
سکتے ہو اور بہت سے لوگ اپنی زندگی میں ایسا کرتے
ہیں، وہ لوگ ظالم ہوتے ہیں پھر کچھ لوگ جو اس
ریت کو دوسروں کی آنکھوں میں ڈالنے کے بجائے
اپنی آنکھوں میں ڈال لیتے ہیں وہ لوگ بزدل اور
اذیت پسند ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ اس ریت سے محل
بناتے ہیں وہ لوگ احمق ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ
نہایت احتیاط سے ریت کے ایک ایک ذرے کو گنتے
لگتے ہیں۔ وہ اس دنیا کے تجوس ہیں، کچھ لوگ اس
ریت کو اپنے سر پر ڈال لیتے ہیں ہنسنے لگتے ہیں وہ
لوگ اس دنیا کے بچے ہیں اور دنیا کی مصومیت ان
ہی کے نام سے قائم ہے۔

(کرشن چندر..... بادل پتے)
تبسم بشیر حسین..... ڈنگہ)

||

کچھ موقوفی چہ نہیں

ادارہ

اداسی کا سبب

میری اداسی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ لوگوں
نے سوچنا چھوڑ دیا ہے، اداس ہونا چھوڑ دیا ہے۔ وہ
لوگ بہت خطرناک ہوتے ہیں، جو نہ سوچتے ہوں
اور نہ اداس ہوتے ہوں۔ یہاں میں یہ بھی کہتا چلوں
کہ جو لوگ نہ سوچتے ہیں اور نہ اداس ہوتے ہیں وہ
فقط اپنی صورت اور ہیبت کے اعتبار سے انسان
ہوتے ہیں۔

(جون ایلیا..... خون کے گھونٹ)
افشاں مسیح..... کراچی

چکر باز بولر

مصیبت اصل میں یہی تھی کہ مخالف ٹیم کا لمبا ترنگا
بولر خدا جھوٹ نہ بلوائے پورے ایک فرلانگ سے
ٹھٹھٹھا ہوا آتا، ایک بارگی جھٹکے کے ساتھ رک کر کھٹکھٹاتا
پھر خلاف توقع نہایت تیزی سے گیند پھینکتا۔ اس کے
علاوہ حالانکہ وہ صرف دائیں آنکھ سے دیکھ سکتا تھا مگر
گیند بائیں ہاتھ سے پھینکتا تھا۔ مرزا کا خیال تھا کہ
اس بے ایمان نے یہ چکر دینے والی صورت انتظاماً بنا
رکھی ہے لیکن ایک مرزا ہی پر موقوف نہیں، کوئی بھی یہ
اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ گیند کیسے اور کہاں پھینکے گا بلکہ
اس کی صورت دیکھ کر کبھی کبھی تو یہ شبہ ہوتا تھا کہ اللہ
جانے پھینکے گا بھی نہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ اس نے گیند سے اتنے وکٹ
نہیں لیے جتنے پھینکنے کے انداز سے۔ بقول مرزا
”بولر سے کوئی خانف نہیں ہوتا، وہ زیادہ سے زیادہ
وکٹ ہی تو لے سکتا ہے، جان تو ناڑی سے نکلتی ہے۔
گیند پھینکنے سے پہلے جب وہ ڈھائی گھر کی چال سے

فضہ نور..... روہڑی

اس بار کرن 18 تاریخ بروز ہفتہ کو ملا کرن کے ہاتھ میں آتے ہی نامے میرے نام کا جائزہ لیا، شکر ہے لاچ رکھ لی آپ نے میری..... چلیے خیر خط کے جواب میں جواب بھی سن کیجیے کرن سے میری دوری ناگزیر..... کیونکہ میرا کرن سے تعلق بکٹ اور چاکلیٹ کی طرح ہے جو ایک دوسرے کے بغیر ذرا بھی اچھے نہیں لگتے اور رہی ناراضی کی بات تو یہ نامکمل باتوں میں سے ایک ہے۔ "نامے میرے نام" اقراء ممتاز غائب تھیں۔ شائد شہزاد کی طبیعت خرابی کا پڑھا اللہ آپ کو صحت و تندرستی دے۔ "شب نم کی سحر" رخ چو بدری نے بھی کہانی کو اک نیا ٹریک دے دیا، اب لگتا ہے کہانی میں دلچسپی بڑھ جائے ایک عورت نے دوسری کا گھر بچایا پر اس خبر سے سب اب تک بے خبر رہے ساجد کی دوسری شادی سے۔ سلیم منزل کی رونقیں دوبالا ہو گئیں پر شکستہ خاتون کے شکستہ مکالموں کو بہت مس کیا اس قسط میں۔

"ہوا میں رخ بدل گئیں" ربیکا حمزہ کو کھنکھاتی کی طرح اپنے اشاروں پر نچانا جاتی ہے حمزہ کو چاہیے کہ شہرینہ سے جلد از جلد شادی کر کے اور یہ تیور غزنی کی حقیقت کب افشاں کر رہی ہے گھٹت جی۔

مکمل ناول "لذت غم عشق" مبین نیازی کے اس شوخ رویے کے پیچھے کیا راز چھپا ہے۔ بہت الجھایا ہوا ہے، رائیٹر نے مانی اور دل آویز کے قصے میں۔

افسانے تینوں زبردست رہے رائیٹرز نے اس بار لڑکوں سے کام کروا ڈالے۔ عید کی مناسبت سے تینوں نے بہت ہنسایا "دل خوش فہم" شیر کی خوش فہمی اسے لے ڈوبی! مکتی آرا کا اپنے بیٹوں کو اس طرح کام کروانا پڑا کہ بہت ہنسی آئی۔ شادی کا لٹو جو کھائے وہ بھی پچھتائے جو نہ

کھائے وہ بھی پچھتائے شیر کی اس کا عملی مجموعہ لگا۔

"سچ کہوتا" تھوڑا سبق آموز تھا ارجمان اور عظیم نے اپنے بابا کا سر نیچا کر کے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی رشتے جھوٹ کی بنیاد پر بھی بھی بھائے نہیں جاسکتے ارجمان اور عظیم اپنی حقیقت سے آگاہ کر دیتے تو انہیں اپنے بابا کے سامنے شرمندہ نہ ہونا پڑتا۔

ناویہ احمد کا "بقرہ عید ٹریل" بہت مزا آیا پڑھ کر مزا دو بالا ہو گیا عید کا۔ نادیم نے درانداز چھو چھوکی بہت درگت بنوائی۔ دے بے بے گھر میں گھبراہٹ چھو چھوکی عقل ٹھکانے نہ لگ سکی۔ چاندنی اور انمول کی مکتی خوش اسلوبی سے انجام پائی پر اگلی بار اس مکتی کا ٹوٹے کا خطرہ ہے۔

مکمل ناول "آخری فتح" عالیان کا شایان کے لیے سب چیزوں کی قربانی دینے تک تو ٹھیک پر اپنی محبت سے دست برداری ٹھیک نہیں تھا، پر شائد شایان کو اپنی ذاتی حسد اور خود غرضی کا احساس اس طرح دلایا جاسکتا تھا۔

شایان نے سچے دل سے اعتراف کیا تھا اور اپنی غلطیوں پر تادم بھی ہوا جس کی بدولت فاطمہ حسن جیسی بیون ساچی اسے ملی کسی کو نیچا دکھانے اور خود کو پرفیکٹ سمجھنے سے انسان اپنی ہی نظروں میں گر جاتا ہے، ویری ویل ڈن گھٹت سیما۔

"غم ہے یا خوشی ہے تو" تنزیلہ جی نے اتش کے غرور کو خاک میں ملا دیا۔ اتش کو اندازہ ہو گیا یہ غرور اس کی ذات کو لے ڈوبا اتش کا رونا ہم سے برداشت نہیں ہوا، سونیا کو اتش کا ہمدرد بنادیں تنزیلہ جی اور زمین کو اس کے دل سے نکال دیں۔

مکمل ناول "نین تارا اور اک بھی کوکب" کوکب ہر بازی تو جیتی رہی پر اپنی دوستی ہار گئی۔ نین تارا کی تخلص دوستی کو دھوکا دے دیا خود اپنے مسائل کے جھنجھٹ سے نکلنے کے لیے نین تارا کی زندگی داؤ پر لگا دی اور ارسل بھی ایسا بے وقوف جسے وہ محبت سمجھتا رہا صرف آنکھوں کا دھوکا رہا اور جو بانی کی طرح شفاف تھی بالکل سامنے اسے نظروں سے اٹھل کر دیا۔ فشا کا انداز ہمیشہ متاثر کن رہا اس بار بھی عمدہ تحریر لے کر آئیں۔

"میں واری جاواں" سونیا کی خود غرضی کی حد

ہے اس نے بیٹی کو بھی سمجھنا چڑھا دیا۔ اپنی اولاد کی خوشی کو بھی نہ دیکھا اور باری صاحب بھی بیوی کے پلو سے لگے بیٹھے رہے پر بیٹی کے لیے کوئی قدم نہیں اٹھایا اینڈ تھوڑا ڈرامائی تھا۔ بانی ابھی شمارہ پڑھا نہیں طبیعت خرابی کی بنا پر صرف کہانیاں ہی پڑھی ہے اب اپنا خط اس بار خود ہی پوسٹ کر دیا اب آپ تک خیر و عافیت سے تاہم سے پہنچ جائے۔

ج: فضہ "کرن" کی کہانیوں پر اتنا جامع تبصرہ کرنے کا بے حد شکریہ۔

اقراء ممتاز..... سرگودھا

دوماہ کی غیر حاضری کے بعد لکھ رہی ہوں۔ بس آپ سے ناراض ہوں آپ نے جولائی میں مجھے ردی کی ٹوکری کی نذر کر دیا۔ سوچا تھا اس دفعہ نہیں لکھوں گی لیکن کرن کی کہانیاں ہمیشہ تبصرہ کرنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ اگست کا ٹائٹل ٹائٹل لگا۔ شامل خان عاصم محمود سے ملاقات اچھی رہی "مقابلہ ہے آئینہ" میں صائمہ سحر کے جوابات پرفیکٹ لگے۔ "ہوائیں رخ بدل گئیں" اس دفعہ کی قسط میں حمزہ پر ایک انکشاف تو ہوا کہ تیور غزنی پہلے سے شادی شدہ ہے اس دفعہ کی قسط بیسٹ تھی۔ اب دیکھیے کہ کیا خزینہ اپنا بچہ سارہ اور غزنی کو دے سکے گی؟

"لذت غم عشق" کیا انفاسک اسٹوری ہے عفاف اور مبین کی نوک جھوک سے بڑے لطف اندوز ہوئے۔

دل آویز کی باتیں ذرا بھی اچھی نہیں لگتیں۔

"آخری فتح" بہت ٹائٹل اسٹوری تھی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے گھٹت سیما محفل میں آئیں دوسروں کو متاثر نہ کر سکیں۔ عالیان اور شایان کی بعض حرکتوں نے مسکرانے پر مجبور کیا تو کہیں آنکھیں نم کر دیں۔ دونوں کی دوستی، پیار دیکھ کر خوشی ہوئی۔ کیا بھائی عالیان جیسے بھی ہوتے ہیں اپنی محبت کا گلا گھونٹ کر بھائی کو خوش کر دیا۔ لیکن شایان نے ہمیشہ عالیان کی پسند کو اس سے چھینا۔ بھائی ہو کر بھائی سے حسد کرتا رہا۔ لیکن کہانی نمبر دن رہی لکھتی "نین تارا اور کوکب" فشا محسن علی جب بھی لکھتی ہیں کچھ منفرد لکھتی ہیں۔ "غم ہے یا خوشی تو" میڈم تہینہ

پر بہت غصہ آیا۔ درزی ہونا کہاں کی شرمندگی ہے۔ انسان کو اپنا تین ڈھانچنے کے لیے اس درزی کا ہی سہارا لینا پڑتا ہے۔ اتش کا غرور تو نوٹا زمین یہ کسی محبت ہے؟ اینڈ پر اتش کا مقدر سونیا ہی ٹھہرے گی۔

"میں واری جاواں" ریحان آفتاب (نئی گریٹ ہو) سونیا نے اپنی خود غرضی سے اپنی ہی بیٹی کو کھو دیا۔ سونیا کی لاپرواہی اور اٹھل غازی کو ذور کرنے چلی تھیں، تمہاری ہی بیٹی نے تمہارا غرور پاش پاش کر دیا۔ ان دونوں کی لگن کتنی تھی۔ پھر کیوں نہ ایک دوسرے کا مقدر ٹھہرتے۔

علیہا اور اٹھل دونوں نام بہت پسند آئے۔

افسانہ "سچ کہوتا" سبق آموز کہانی تھی۔ ان کے بابا نے بروقت فیصلہ کر کے ان کو سبق سکھا دیا۔

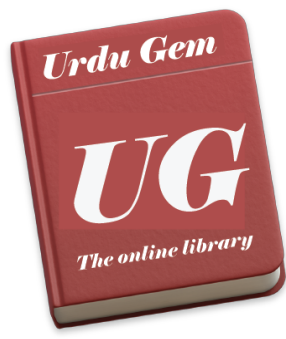
"دل خوش فہم" چاروں بھائیوں کو کام کرتے دیکھا کہ بہت خوش ہوئے۔ کتنی آراء نے اپنے بیٹوں کو کتیا کھڑ بنائے ہوا تھا ہا ہا۔ مسکرائی کر نہیں ہمیشہ کی طرح بیسٹ تھی۔

نامے میرے نام میں ساری بہنوں نے اچھا لکھا ہوا تھا۔ (حق ہا) اس دفعہ کرن کے ساتھ کرن کتاب دکھانے دی تھی۔ آئی جی اگر آپ نے اس دفعہ بھی میرا خط شائع نہ کیا تو میں ناراض ہو جاؤں گی پکی والی..... ہا ہا ہا۔

ج: اقراء جی ہمیں جو خط وقت پر مل جاتے ہیں ہم انہیں شائع ضرور کرتے ہیں۔ بعض اوقات آپ کے خط ہمیں دیر سے موصول ہوتے ہیں اس کے لیے ہم معذرت خواہ ہیں۔

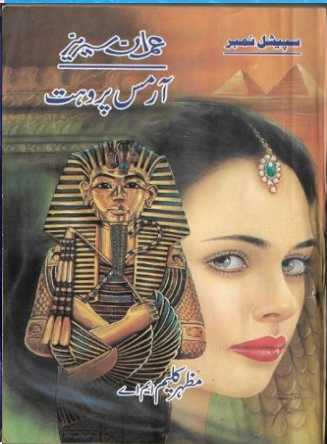
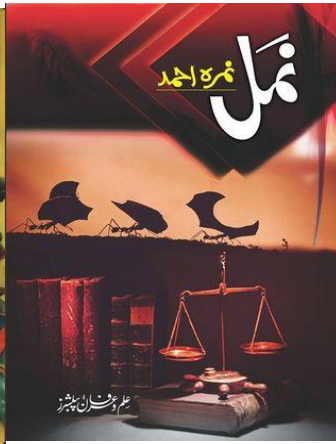
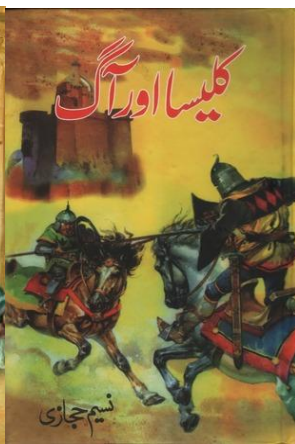
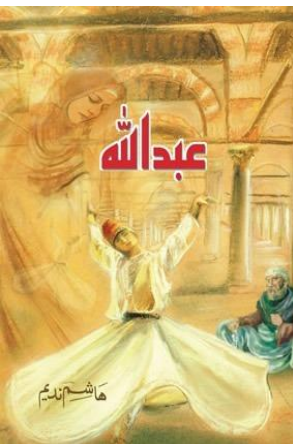
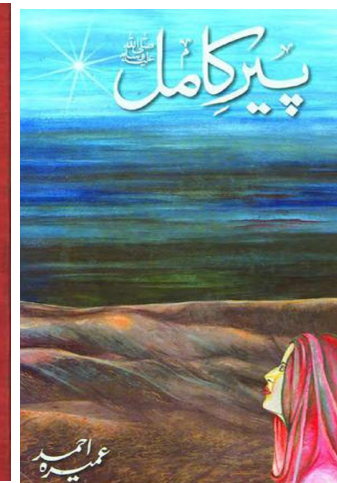
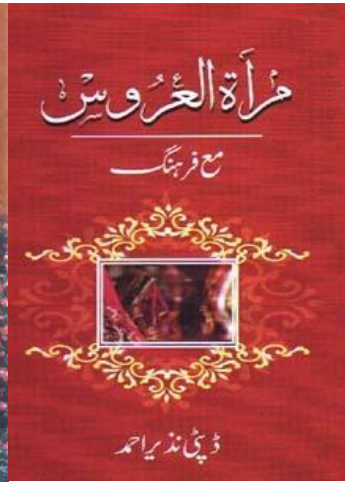
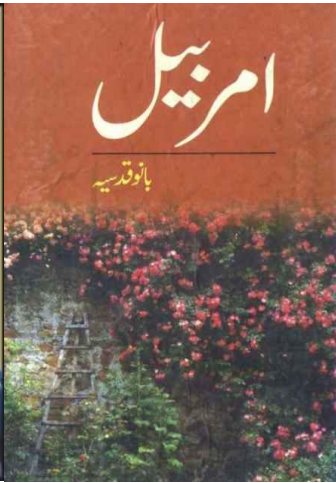
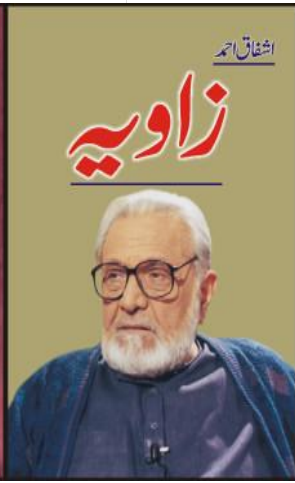
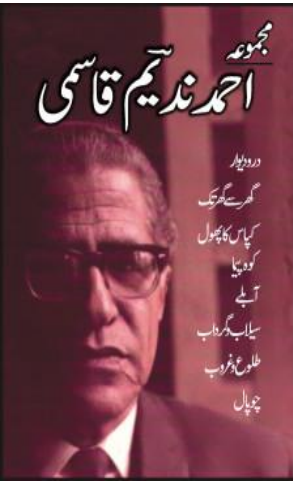
ماہیا شیر حسین..... ڈنگہ

کرن کی تعریف کے لیے الفاظ کم پڑتے ہیں یہ بہت معیاری رسالہ ہے۔ ہر ماہ کوشش کے باوجود میں خط نہیں لکھ پاتی کہ کاپی اور سستی آڑے آ جاتی ہیں۔ کیا کیا جائے۔ ٹائٹل پیارا تھا۔ تمام انٹرویوز بھی خوب رہے "مقابلہ ہے آئینہ" میں صائمہ سحر جانو تم سے ملاقات کر کے اچھا لگا۔ سلسلہ وار ناؤز دونوں میری امید یہ پورے نہیں اترے۔ مجھے تو یہ ناؤز کرن کے معیار کے مطابق ہی نہیں لگے۔ مکمل ناول میں "گھٹت سیما" ٹاپ پر ہیں جبکہ "فشا" نے اس دفعہ



UrduGem.com

URDU KA KHAZAANA





آئی بی ایل ٹریٹمنٹ جیسی فیر فیس

لیزر لائٹ ٹریٹمنٹ جیسا نکھار



بہترین فیر فیس کے لئے دنیا بھر میں جلد کے ماہرین لیزر ٹریٹمنٹ کی جدید ٹیکنالوجی کا استعمال کرتے ہیں۔ اگر بھی ٹریٹمنٹ صرف ایک کریم سے مل جائے تو؟
اب لیزر لائٹ ٹریٹمنٹ جیسی فیر فیس ملے "فیر اینڈ لونی ایڈوانسڈ ملٹی وٹامن" سے۔
اس کا علاقہ ورملی وٹامن فارمولہ لیزر لائٹ کی طرح جلد کی گہرائی تک جاتا ہے۔ سیاہ جھلیاں کو صاف اور روشن کر کے جلد کو نکھارتا ہے۔
تو لیزر لائٹ ٹریٹمنٹ جیسا نکھار کے لئے صرف فیر اینڈ لونی کا ہیٹ فارمولہ۔

Fair & Lovely

ADVANCED
MULTI VITAMIN™

"لیزر لائٹ ٹریٹمنٹ سے مراد جلد کے اندر کی آئی بی ایل (Intense Pulsed Light) ہے۔"

کچھ الگ ہی لکھ ڈالا ہے ایسا لگا کہ یہ کسی اور کا ناول ہے۔ صائمہ قریشی ڈیئر، ہم میں برداشت کا مادہ کم ہے تو پلیز زیادہ امتحان نہ لیں اور تیسری قسط آخری کریں۔ ناولٹ ریحانہ آفتاب کا بس سوسوہی لگا جبکہ تنزیلہ اپنے مخصوص انداز میں جکڑے ہوئے ہیں۔ یہ ماسٹر جی ہمیں ہمیشہ قصہ اتنا مختصر ہی کیوں سناتے ہیں؟ افسانے میں "فرح بھٹو" کا افسانہ دلچسپ رہا بانی بھی ٹھیک تھے "کرن کتاب" میں پلیز شوگرز کے مریض کے متعلق معلومات اور پرہیز کا بتائیے اور ایک اور بات کہ پرانی رائٹرز تو بھتی نہیں ہیں تو ان کی پرانی تحاریریں ہی لگا دیں ہم تو انہیں بہت پس کرتے ہیں پر شاید وہ ہمیں بھول گئی ہیں۔ سوچے گا ضرور۔

ج: پیاری بابا! پہلے تو آپ وعدہ کریں کہ اپنی سستی اور کاغذی کو ختم کر کے۔ ہر ماہ اپنی رائے سے آگاہ کرنی رہیں گی۔ "کرن کتاب" کے لیے آپ کی فرمائش نوٹ کر لی گئی ہے۔

تبسم بشیر حسین..... ڈنگلہ

اگست کا شمارہ 15 کوملا۔ ٹائیکل اگست کے حوالے سے ہونا چاہیے تھا۔ ادارہ بہت خوب، حمد و نعت ہمیشہ کی طرح لا جواب رہی فہرست میں اس دفعہ دو ناموں نے آٹھ جاند لگا دیے "تنگت سیما" اور "نشاء محسن علی" بہت شکریہ پیارے کرن جہاری پسندیدہ مصنفہ کو لانے کا۔ انٹرویو میں "نذرانہ عقیدت" قارئین سے سروے ہوتا تو حرا آتا کہ ایک عام بندے کے خیالات عام بندے جیسے فن کار کے خیالات انہی جیسے۔ خیر سچ اگر برا لگے تو سوری کہ جو دل پہ وہی زبان ہے۔ "شمال خان" سے ملاقات سو سوری۔ "میری بھی سینے" میں عاصم محمود کی سنی کیا واقعی یہ سچ ہے کہ حسین ذہین نہیں ہوتے؟ تو جناب عاصم آپ بھی.....؟ "مقابل ہے آئینہ" صائمہ سحر کے جوابات کمال کے تھے خیر میں اگر شرکت کرنی تو ایسے ہی جواب دیتی۔ "شب نم کی سحر" اسی لیول پہ ہے جہاں شروع میں تھا۔ جبکہ تنگت آپا تو جکڑے جا رہی ہیں۔ "لذت عم عشق" کی بانی کی اقساط آجائیں

کرن عمران احمد..... ساہیوال

سب سے پہلے کرن کے تمام نمبرز کو اور تمام قارئین کو گزشتہ عید مبارک۔ اب میں اپنا مدعا بیان کرنی ہوں مجھے آپ سے شدید قسم کا گلہ ہے کرن میگنیز میں یہ میرا چوتھا خط ہے مگر ایک خط کے علاوہ کسی کو بھی پڑی رانی نصیب نہیں ہوئی۔

کرن نے بہت سے نئے رائٹرز کو متعارف کروایا ہے اور ہر نئے لکھنے والے کو میگنیز میں جگہ دی جاتی ہے۔ اسی امید پر میں نے اپنے دو افسانے آپ کو بھیجے مگر افسوس ان کا کچھ پتا نہیں..... مگر میں ابھی بھی ناامید نہیں ہوئی ہیں اور نئی امید کے ساتھ آپ کو اپنا ایک اور افسانہ بھیج رہی ہوں ان شاء اللہ تعالیٰ ضرور جگہ ملے گی۔

اللہ پاک سب کے لیے آسانیاں پیدا فرمائے آمین۔

ج: کرن جی! آپ کا خط ہمیں موصول ہوتا تو شائع ضرور کرتے۔ یہ خط بھی آپ کا دیر سے ملا لیکن ہم نے کوشش کو کے آپ کی شکایت دور کر دی۔

☆☆

عقلمند